آپ بیتی

آغا خان

از

ہز ہائی نس دی آغا خان۔ پی سی۔ جی سی۔ ایس۔ آئی۔ جی سی۔ وی۔ او۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای

ترجمہ از

دی میمائرس آف آغا خان

سائمن اینڈ شسٹر نیویارک

شائع کردہ

اسماعیلیہ ایسوسی ایشن پاکستان

ہیرس روڈ۔ کھارادر کراچی ۲

مطبوعہ

عباسی لیتھو آرٹ پریس کراچی

۱۹۵۵ء

زندگی ایک بڑا اور شریف مشغلہ ہے۔ وہ کوئی ذلیل اور نیچی چیز نہیں ہے
جس کو جہاں تک ہو سکے مشکل کے ساتھ گھسیٹا جائے۔ بلکہ وہ ایک بلند
اور عزّت کے ساتھ مقرر کی ہوئی چیز ہے

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحات
	تمہید از ڈبلو سمرسیٹ موگھم	۴ تا ۱۳
	پہلا حصّہ بچپن اور جوانی	
۱	سالون پر ایک پُل	۱۴ 〃 ۲۰
۲	اسلام میرے مورثوں کا مذہب	۲۱ 〃 ۵۱
۳	ہندوستان میں لڑکپن کا زمانہ	۵۲ 〃 ۸۵
۴	میں مغربی دنیا کا سفر کرتا ہوں	۸۶ 〃 ۱۲۹
	دوسرا حصّہ بھری ہوئی جوانی	
۵	بادشاہ۔ سفیر اور سیاستدان	۱۳۰ 〃 ۱۴۹
۶	ایڈورڈ ہفتم کا دورِ سلطنت شروع ہوتا ہے	۱۵۰ 〃 ۲۲۸
۷	زار کے روس میں	۲۲۹ 〃 ۲۴۸
۸	پہلی عالمگیر جنگ	۲۴۹ 〃 ۲۶۹
	تیسرا حصّہ درمیانی سالوں کا زمانہ	
۹	سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ	۲۷۰ 〃 ۳۰۶
۱۰	قومی زندگی سے کچھ عرصہ کے لئے آرام	۳۰۷ 〃 ۳۳۰
۱۱	ہندوستان میں خود مختار حکومت کے آثار	۳۳۱ 〃 ۳۷۶
۱۲	لیگ آف نیشنز کی شخصیتیں اور وہاں کی پالیسیاں	۳۷۷ 〃 ۴۴۰
	چوتھا حصّہ ایک نیا زمانہ	
۱۳	دوسری عالمگیر جنگ	۴۴۱ 〃 ۴۹۸
۱۴	جنگ کے بعد والے سالوں میں دوستوں اور خاندان کے ساتھ	۴۹۹ 〃 ۵۱۳
۱۵	وہ آدمی جن سے میں واقف ہو چکا ہوں	۵۱۴ 〃 ۵۳۱
۱۶	مستقبل کی طرف	۵۳۲ 〃 ۵۴۷

تمہید

از

ڈبلو سمرسٹ موگھم

میں آغا خان کو بہت سالوں سے جانتا ہوں۔ وہ میرے مہربان اور مدد کرنے والے دوست رہے ہیں۔ جب میں نے ہندوستان میں ایک سردی کا موسم گذارا تھا تو انہوں نے مجھے کچھ تعارفی خطوط دئے تھے جن کی وجہ سے مجھ کو اُس عجیب ملک کے قیام میں جو وسیع تجربہ ہوا اُس سے مجھ کو بہت فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملا اور یہ فائدہ مجھ کو ان خطوط کے علاوہ کبھی نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس وجہ سے جب انہوں نے میری یہ عزت افزائی کی کہ مجھ سے اپنی سوانح عمری پر ایک تمہید لکھنے کے لئے کہا تو مجھے یہ موقع ملنے پر خوشی ہوئی کہ میں اُن کی یہ ناچیز اور دراصل غیر ضروری خدمت کر سکوں۔ یہ کتاب خود اپنی تعریف کرتی ہے۔ جب تک میں نے اس کو پڑھا نہیں تھا اُس وقت تک مجھے اس کا احساس نہ تھا کہ میں کیسا مشکل کام کرنے والا تھا۔ آغا خان نے ایک بھرپور زندگی بسر کی ہے، انہوں نے بہت سفر کیا ہے اور دنیا کے بہت کم حصے ایسے ہیں جہاں وہ نہیں گئے ہیں یا تو تفریح کے لئے یا اس لئے کہ اُن کے سیاسی اور مذہبی اغراض کے لئے وہاں جانا ضروری تھا۔

وہ بڑے تھیسٹر جانے والوں میں رہے ہیں۔ ان کو گانے والے ڈراما OPERA اور پارٹی والے ناچ BALLET سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ وہ بڑی محنت کے ساتھ مطالعہ کرنے والے آدمی ہیں۔ وہ ایسے معاملات میں مصروف رہے ہیں جن میں قوموں کی تقدیریں لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گھوڑوں کی پرورش کی ہے اور اُن کو دوڑایا ہے۔ شاہانہ خون کے شہزادوں اور بادشاہوں کے ساتھ۔ مہاراجاؤں، وائسراؤں۔ فیلڈ مارشلوں، ایکٹر مرد اور ایکٹر عورتوں، گھوڑوں کے سدھانے والوں، گولف کے پیشہ ور کھلاڑیوں۔ سوسائٹی کی خوبصورت عورتوں اور سوسائٹی میں تفریحی انتظام کرنے والوں کے ساتھ اُن کے تعلقات گہری دوستی کے رہ چکے ہیں انہوں نے ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اسمٰعیلیوں کے سردار ہونے کی حیثیت سے جو ایک

مرید اور دُور دُور تک پھیلا ہوا فرقہ ہے۔ وہ اپنی تمام عمر بہت محنت کے ساتھ اپنے بے شمار مریدوں کی روحانی اور مادی بہبودی کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس سوانح عمری کے آخر میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی زندگی میں اُداس نہیں ہوئے۔ صرف یہی واقعہ اس بات کے لئے کافی ہے کہ آغا خان کو بہ حیثیت ایک قابل قدر آدمی کے ممتاز اور مشہور کر دے۔

میں فوراً اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں آغا خان کی بعض مختلف اور ہمہ گیر مصروفیتوں اور کاموں کا حال بیان کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا ہوں۔ میں گھوڑوں کی دوڑ کے متعلق کچھ نہیں جانتا ہوں۔ مجھے اس سے اتنی کم دلچسپی ہے کہ ایک روز جبکہ میں آغا خان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اور یہ اُس زمانہ سے کچھ پہلے کی بات ہے جب ان کے گھوڑے تلیر (TULYAR) نے ڈربی کی دوڑ جیتی تھی (DERBY) تو اُس وقت ہم صرف ہندوستان کے متعلق باتیں کرتے رہے اور مجھے کبھی اس کا خیال نہ آیا کہ میں اُن سے یہ دریافت کروں کہ کیا اُن کے گھوڑے کے لئے دوڑ میں جیتنے کا کوئی امکان تھا۔ مجھے سیاست سے اِس سے زیادہ واقفیت نہیں ہے جتنی ایک معمولی اخبار پڑھنے والے کو ہوتی ہے۔ برسوں تک آغا خان کا سیاست سے گہرا تعلق رہ چکا ہے۔ اُن کی رائے برابر لی جاتی تھی اور عام طور پر وہ صحیح اور صائب ہوتی تھی۔ وہ اعتدال پسند رہے ہیں۔ اُنہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

> "قومی زندگی میں برسوں رہنے کے بعد ایک واقعہ پر مجھے پورا یقین ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ عارضی سمجھوتہ کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ایک مشکل وقت پر ایک قسم کا پل تیار کر کے دے دیتا ہے جس پل کو آئندہ چل کر استعمال کرنے کے بعد یہ اکثر ممکن ہو جاتا ہے کہ اِصلاحات کی وہ مکمل تجویزیں پوری طرح نافذ کر دی جائیں جو شروع میں ایک دم نامنظور کر دی جاتیں۔"

وہ اُن سیاست دانوں سے بخوبی واقف تھے جن کے فیصلوں پر گذشتہ پچاس سالوں میں بڑے بڑے واقعات کا انحصار رہا ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی ان سیاست دانوں کے متعلق کوئی سخت رائے قائم کرتے ہیں۔ وہ ان کی ایمان داری۔ ذہانت و حق پرستی۔ وسیع علم اور تجربہ کی بہت فیاضی کے ساتھ تعریف کرتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ان قیمتی خصوصیات کے باوجود اِن سیاست دانوں

نے ہم سب کو ایک ایسی افسوسناک مصیبت میں ڈالا ہے جس کے اندر ہم اسوقت اپنے آپ کو پاتے ہیں۔

آغاخان بہت نیک طبیعت والے آدمی ہیں۔ یہ بات اُن کی فطرت کے خلاف ہے کہ دوسروں کی بُرائی کریں۔ اُن کی اس کتاب میں صرف ایک ہی موقعہ ایسا آیا ہے جس پر اُنہوں نے تلخی کا اظہار کیا ہے۔ جب اُنہوں نے ہمارے ہموطنوں کے اُس برتاؤ کی طرف توجہ کی ہے جو اُن ملکی کے رہنے والوں کے ساتھ کیا گیا جہاں پر کسی نہ کسی طرح وہ اعلیٰ اور حکمرانی کی پوزیشن رکھتے تھے۔ مثلاً مصر میں۔ ہندوستان میں اور چین کے بندرگاہوں میں جن کے متعلق صلح نامے ہو چکے تھے۔ ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی زمانہ میں برطانیہ اور ہندوستان والوں کے درمیان تعلقات عام طور پر اچھے خوشگوار اور بلا کشیدگی کے تھے۔ آغاخان نے لکھا ہے کہ اگر یہ تعلقات اسی طرح رہتے جیسے کہ وہ جب تھے تو مجھے اس میں بہت شبہ ہے کہ سیاسی تلخی اتنی ترقی کر جاتی جتنی کہ اُس نے کی اور یہ ممکن تھا کہ ہندوستانی جمہوریت کا شاہانہ تعلق سے بالکل علیحدہ ہو جانا واقع نہ ہوتا بلکہ اس سے بہت کمتر درجہ کی اور کوئی چیز ہو جاتی۔" یہ بہت تکلیف دہ خیال ہے۔ آغاخان نے آگے چل کر لکھا ہے کہ " انگریز کے ساتھ جو کچھ واقعہ پیش آیا وہ میرے لئے اپنی تمام عمر میں بہت حیرت اور تعجب کا سبب رہا ہے۔ ایک دم ایسا معلوم ہونے لگا کہ انگریز کا وقار ایک شاہانہ حکمران قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے بالکل جاتا رہے گا۔ اگر وہ ان لوگوں کو جو اُس سے مختلف رنگ کے تھے۔ بنیادی طور پر اپنے برابر والے آدمیوں کی حیثیت سے منظور کر لے۔ رنگ کا فرق صرف جسمانی فرق خیال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس سے زیادہ خطرناک طریقہ پر اور آخر میں نہایت مصیبتناک طریقہ پر ایک دماغی اور روحانی فرق خیال کیا جاتا تھا۔ یہ مضر نظریہ سارے میں پھیل گیا کہ ایشیا کے سب رہنے والے دوسرے درجہ کی قوم رکھنے والے تھے اور گورے رنگ کے آدمیوں میں بعض اندرونی اور نا قابل مخالفت فوقیت پائی جاتی تھی۔" آغاخان کی رائے کے مطابق حکمران طبقہ نے جو رویہ اختیار کیا اس کی بنیادی وجہ خوف اور اندرونی خود اعتمادی کا نہ ہونا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ روز افزوں تعداد میں برطانوی بیویاں موجود تھیں جن کو ہندوستانیوں کے رواج اور نقطۂ نظر کا کوئی علم نہ تھا اور نہ اُس سے اُن کو کوئی دلچسپی تھی۔ وہ اس سے کم تنگ نظر اور صوبہ پرست نہ تھیں جیسا کہ وہ اس وقت تھیں جب اس زمانہ سے چالیس سال

بعد جب کہ آغا خان نے لکھا ہے میں خود ہندوستان گیا تھا۔ ان عورتوں کی اکثریت انگلستان کے معمولی دیہاتوں گھرانوں میں سے آتی تھی اور چونکہ وہاں پر سرکاری ٹیکس کافی دینا پڑتا تھا۔ اس لئے اُن عورتوں کے پاس زیادہ سے زیادہ ایک خادمہ ہوتی تھی جو گھر کی صفائی وغیرہ کا سارا کام کرتی تھی مگر اب یہ عورتیں بڑے کشادہ مکانوں میں اپنے آپ کو پاتی تھیں اور بہت سے نوکر اُن کا حکم بجالانے کے لئے موجود ہوتے تھے۔ ان باتوں سے ان عورتوں کا دماغ خراب ہوگیا JT WENT TO THEIR HEADS

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک سرکاری عہدہ دار کی بیوی کے ساتھ چا پی۔ یہ کوئی زیادہ بڑے عہدہ دار نہ تھے۔ انگلستان میں یہ عورت کوئی خادمہ یا اسٹینو گرافر ہوسکتی تھی۔ اُس نے مجھ سے میرے سفروں کے متعلق دریافت کیا اور جب میں نے اس کو بتایا کہ میں نے اپنا زیادہ وقت ہندوستانی ریاستوں میں گذارا تھا تو اس نے مجھ سے کہا:۔

"آپ کو معلوم ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے ساتھ اس سے زیادہ برتاؤ نہیں کرتے جو ہم کو مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ اُن کو ہمیشہ ایک گز کے فاصلہ پر رکھنا چاہیئے"

اُس کے پاس جو آدمی اُس وقت بیٹھے تھے اُن سب نے اُس کی اِس بات سے اِتفاق کیا۔

کلبوں میں ہندوستانیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں تک کہ لارڈ ولنگڈن (LORD WILLINGDON) کے اثر سے کچھ کلبوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ہندوستانیوں کو داخل کرلیں مگر جہاں تک میں نے دیکھا اُس سے کچھ فرق نہ ہوا چونکہ ان کلبوں میں بھی گورے اور کالے آدمی بہت نمایاں طریقہ پر الگ الگ رہتے تھے۔

جب میں حیدر آباد میں تھا تو ولیعہد ریاست نے مجھے کھانے پر بُلایا۔ میں کچھ وقت بمبئی میں گذار چکا تھا اور اپنے کلکتہ کے سفر کو روانہ ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ جب آپ بمبئی میں تھے آپ وہاں کے کلب کے اعزازی ممبر بنائے گئے تھے" جب میں نے ان کو بتایا کہ میں ممبر بنالیا گیا تو اُنہوں نے یہ اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کلکتہ میں بھی وہاں کے کلب کے اعزازی ممبر بنائے جائیں گے" میں نے جواب دیا کہ مجھے ایسی ہی امید ہے۔ پھر اُنہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ بمبئی کے کلب اور کلکتہ کے کلب میں کیا فرق ہے؟"

اس پر میں نے اپنا سر ہلایا کہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ " ان میں سے ایک کلب میں

کتوں کو اور ہندوستانیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور دوسرے کلب میں وہ کتوں کو تو اجازت دے دیتے ہیں۔"

میں عمر بھر یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس بات کو سُن کر میں کیا کہوں۔

مگر یہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں تھا کہ یہ ناخوشگوار حالات پھیلے ہوئے تھے چین میں جو بیرونی حکومتوں کی رعایتی آبادیاں (FOREIGN CONCESSION) تھیں وہاں پر بھی اسی قسم کی مغرور اور گہری ملک پرستی تھی اور چین والوں کے ساتھ جو عام رویہ برتا جاتا تھا وہ بھڑکانے والے رویہ سے کچھ ہی کم تھا۔ سب بہترین ہوٹلوں میں چین والوں کو داخل ہونے سے روکا کرتا تھا سوائے اُن گوشوں کے جو خاص طور پر اُن کے لئے الگ کر دیئے جاتے تھے۔ یہی حال ریسٹورانوں (RESTAURANTS) میں تھا۔ یورپین کلبوں سے چین والے بالکل خارج کر دیئے گئے تھے۔ دوکانوں پر بھی چینی گاہک ایک طرف کو کھڑا ہوتا تھا اور اس وقت تک سودا ملنے کا انتظار کرتا رہتا تھا جب تک کوئی یورپین یا امریکن جو اس کے بعد میں آیا ہو اور جس نے اپنی طرف توجہ دلائی ہو فارغ نہ ہو جائے۔"

جب آغا خان مصر گئے تھے اُس وقت لارڈ کرومر (LORD CROMER) برطانوی ریزیڈنٹ (BRITISH RESIDENT) تھے۔ اُنہوں نے وہاں معلوم کیا کہ برطانوی لوگ اس ملک میں صرف سیاسی قبضہ واختیار ہی نہ رکھتے تھے بلکہ وہ ایک سوشل فوقیت حاصل کر چکے تھے جس کو مصری لوگ عاجزی کے ساتھ تسلیم کرتے تھے۔" سوشل تعلقات کے لئے کوئی مشترکہ جگہ اور مشترکہ بنیاد نہ تھی۔ اس وجہ سے لازمی طور پر یہ ہوا کہ اس عاجزی اور انکساری کے پردہ (FACADE OF HUMILITY) میں وہ ناخوشگوار۔ گہری اور تقریباً ذاتی قسم کی ناراضگی ترقی کر گئی جس نے آگے چل کر بلا ضرورت مصری قومیت اور برطانیہ کے مفاد میں بحیثیت قابض حکومت کے جو اختلاف تھا اس کو زہر آلودہ کر دیا۔"

اب جب کہ چین میں بیرونی حکومتوں کی رعایتی آبادیاں (FOREIGN CONCESSIONS) موجود نہیں ہیں۔ اب جب کہ برطانیہ کے آخری سپاہی مصر چھوڑ رہے ہیں۔ اب جیسا کہ آغا خان نے لکھا ہے۔ وہ زمانہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت ختم ہو چکی ہے اور اس طرح گذر چکی ہے

ح تیز سورج کی روشنی کے سامنے سویرے صبح کا کہر غائب ہو جاتا ہے۔ اب برطانوی لوگ اپنے پیچھے ایک نفرت کی وراثت چھوڑ گئے ہیں۔ ہم بھی خود اپنے آپ سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ انگریزوں کو کیا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُنہوں نے ایسا عمل کیا جس سے ایسی مخالفت پیدا ہو گئی جو آخر کار اسی قسم کے نامناسب نتائج ضرور پیدا کرنے والی تھی۔ آغا خان نے جو وجہ اس کی بتائی ہے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ لارڈ ایکٹن (LORD ACTON) کے اُس پرانے مگر مستقل طور پر بھولے ہوئے مقولہ میں تلاش کرنی چاہئے۔ وہ مقولہ یہ ہے کہ "طاقت بگاڑتی ہے اور پوری طاقت پوری طرح بگاڑتی ہے"۔

بکھرے ہوئے دودھ پر رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم کو تقدیر پرستوں (DETERMINITS) نے یہی بتایا ہے۔ میں نے اس مضمون پر تفصیل کے ساتھ بات کی ہے اور یہ میں نے ارادتاً کی ہے۔ آجکل کی دنیا میں امریکہ والوں کو وہ درجہ حاصل ہے جو برطانیہ والوں کو اتنے عرصہ تک اور اُن کی ناکامیوں کے باوجود جو زیادہ بُری نہیں حاصل تھا۔ یہ بات امریکہ والوں کے لئے مفید ہوگی کہ وہ ہماری مثال سے سبق حاصل کریں اور ان غلطیوں کے کرنے سے اجتناب کریں جنہوں نے ہم کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ایک گندمی رنگ کا آدمی ایک اسٹین بندوق (STEN GUN) کو اسی طرح چلا سکتا ہے اور اسی طرح سیدھا نشانہ لگا سکتا ہے جس طرح کہ ایک گورے رنگ کا آدمی۔ ایک زرد رنگ کا آدمی بھی اسی طرح کامیابی کے ساتھ ایٹم بمب گرا سکتا ہے۔ (ATOM BOMB) اس سب کا کیا مطلب ہے؟ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اب رنگ کا فرق ایک مستقل حماقت اور مکمل ناممکن اور بے تُکی بات ہے (CRASS ABSURDITY)

برطانوی لوگ چاہتے تھے کہ اُن سے محبت کی جائے اور اُن کو یقین تھا کہ اُن سے محبت کی جاتی ہے امریکہ کے لوگ بھی چاہتے ہیں کہ ان سے محبت کی جائے مگر اُن کو اس بات کا بہت بے چینی اور تکلیف کے ساتھ احساس ہے کہ اُن سے محبت نہیں کی جاتی ہے۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات مشکل سے آتی ہے۔ اپنی غیر محدود فیاضی کے ساتھ امریکہ والوں نے اُن ملکوں میں روپیہ ڈال دیا ہے جن کو دو مصیبت ناک جنگوں نے مفلس بنا دیا تھا۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ امریکہ والے یہ امید رکھیں کہ یہ روپیہ اس طرح خرچ کیا جائیگا جس طرح وہ مناسب سمجھتے ہیں نہ ہمیشہ اس طرح

جیساکہ اس کے وصول کرنے والے اس کو خرچ کرنا چاہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ جو آدمی با۔
بجانے والے کو روپیہ دیتا ہے وہی خاص راگ کی فرمائش کرتا ہے۔ اگر وہ راگ ایسا ہو جس کو سننے
والے مشکل سے پسند کریں تو شاید یہ بات اُس باجہ والے کے لئے مناسب اور قابلِ نصیحت
ہوگی کہ وہ اپنے راگ کو جہاں تک وہ کر سکے ایسا ترمیم کرے کہ سننے والے اُس کو پسند کریں۔ اس
میں شبہ نہیں کہ دینا لینے سے زیادہ مبارک ہے مگر وہ زیادہ تر خطرناک بھی ہے۔ چونکہ آپ اپنی
بخشش کے وصول کرنے والے پر ایک احسان رکھتے ہیں اور یہ ایسی شرط ہے جس کو صرف بہت
زیادہ بڑی اور اونچی طبیعت والے آدمی ہی نیک نیتی کے ساتھ منظور کر سکتے ہیں۔ شکر گزاری ایسی
نیکی نہیں ہے جو آسانی سے انسانی قوم میں پیدا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا
جا سکتا کہ برطانیہ والوں نے اُن لوگوں کو بہت بڑے فائدے پہنچائے جن پر اُنہوں نے حکومت کی۔ مگر
اُنہوں نے اُن کو ذلیل سمجھا اور اسی وجہ سے اُن کی نفرت حاصل کی۔ امریکہ والوں کے لئے یہ بہت اچھا
ہوگا اگر وہ اس بات کو یاد رکھیں گے۔

یہ بات بہت کافی ہو چکی۔ آغا خان پیغمبر محمدؐ کی اولاد میں سے ہیں جو اُن کی بیٹی فاطمہ
سے ہوئی اور وہ مصر کے فاطمی خلفاء کی اولاد میں سے بھی ہیں۔ وہ اپنی شاندار وراثت پر بجا طور
پر فخر کرتے ہیں۔ اُن کے دادا جو آغا خان کہلاتے تھے اور جو وراثتاً اسمٰعیلیوں کے روحانی پیشوا
تھے۔ ایران کے ایک رئیس تھے۔ (NOBLEMAN) وہ ایران کے زبردست بادشاہ
فتح علی شاہ کے داماد تھے اور کرمان کے موروثی سردار تھے۔ ایک توہین سے تکلیف محسوس
کرکے جو اُن کے ساتھ کی گئی تھی اُنہوں نے ایک بعد والے بادشاہ کے خلاف جس کا نام محمد
تھا بغاوت کی جس میں اُن کو شکست ہوئی اور وہ مجبور ہوئے کہ اپنی جان بچا کر اور کچھ سوار ساتھ
لے کر بلوچستان کے جنگلوں میں ہوتے ہوئے سندھ کی طرف نکل جائیں۔ سندھ پہنچ کر انہوں نے
سواروں کی ایک ہلکی فوج بنائی اور مختلف انقلابات کے بعد آخرکار دو سو سوار۔ اپنے رشتہ دار
متعلقین اور مددگاروں کو لے کر بمبئی پہنچ گئے۔ وہاں پر انہوں نے ایک وسیع جائداد حاصل کی۔
جس میں اُنہوں نے مختلف محل اپنے متعلقین کے لئے بے شمار چھوٹے مکانات اور باہر کی
عمارتیں۔ باغات اور چشمے تعمیر کئے۔ وہ رئیسانہ ٹھاٹ سے رہتے تھے (FEUDAL STATE

اور اُن کے اصطبلوں میں کبھی سو سے کم گھوڑے نہ رہتے تھے۔ اُن کا انتقال اُس وقت ہوا جب اس کتاب کے مصنف بچہ ہی تھے۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے اُن کے جانشین ہوئے جو بہرحال تھوڑے عرصہ تک زندہ رہے اور اُن کے بعد یہ آغا خان جن کو ہم جانتے ہیں آٹھ سال کی عمر میں اُن کی روحانی اور مادی ذمہ داریوں۔ دولت اور خطابات کے وارث مقرر ہوئے۔ اُن کی تعلیم ایسی کرائی گئی جس سے وہ اس ذمہ واری کے لئے تیار ہو جائیں جو پیدائش کے بعد اُن پر عائد ہوتی تھی۔ اُن کو انگریزی۔ فرانسیسی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم دی گئی۔ مذہبی تعلیم اُن کو اسلامی علوم کے ایک مشہور استاد کے ذریعہ سے دلائی گئی۔ اُن کو کوئی چھٹی کے دن نہیں دیئے جاتے تھے۔ اُن کو کام سے فراغت صرف سنیچر کے دنوں کو ملتی تھی اور دعوت کے اُن دنوں میں جب وہ اپنے مریدوں سے ملتے تھے جو اُن کو نذرانے پیش کرنے اور اُن کی زیارت کرنے کے لئے آتے تھے۔

آغا خان جو اتنی کم عمر میں ایسی شہرت حاصل کر چکے تھے اس معاملہ میں خوش قسمت تھے کہ اُن کی والدہ ایک بہت بڑی تربیت یافتہ اور قابل عورت تھیں۔ وہ فارسی اور عربی شاعری میں گہری مہارت رکھتی تھیں۔ اور اسی طرح بعض وہ عورتیں تھیں جو اُن کی سہیلیاں تھیں۔ کھانے کے وقت اُن کی میز پر "جو باتیں ہوتی تھیں وہ ادب اور شاعری کے متعلق ہوتی تھیں۔ یا شاید ایسا ہوتا تھا کہ بڑی عمر کی خواتین میں سے ایک خاتون جو تہران کا سفر کر کے واپس آئی تھیں۔ شاہ ایران کے دربار میں اپنے تجربات کے متعلق بہت سی باتیں سنایا کرتی تھیں۔"

والدہ صاحبہ صوفی مزاج تھیں (MYSTIC) اور عادتاً اپنا بہت سا وقت روحانی تنویر حاصل کرنے اور خدا سے قربت حاصل کرنے کے لئے عبادت میں صرف کیا کرتی تھیں آغا خان نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنی والدہ کو ایک قسم کی وجدانی کیفیت کی حالت میں رومی یا حافظ کے بعض شعروں کو پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ جن کے اندر وہ اعلیٰ قسم کی تشبیہات وتمثیلات پائی جاتی تھیں جو خدا کے مبارک تصور اور دنیاوی حسن کے درمیان موجود ہیں۔ مثلاً پھولوں کے رنگوں میں۔ رات کے راگ اور جادو میں۔ ایرانی صبح کی عارضی شان وشوکت میں۔"

آغا خان بہت گہرے مذہبی آدمی ہیں۔ اس کتاب کے سب سے زیادہ دلچسپ باتوں میں ایک وہ بات ہے جس میں آغا خان نے اپنے ذاتی عقائد بیان کرنے کے بعد اسلام کا وہ مختصر خاکہ

پیش کیا ہے جو آجکل مانا جاتا ہے اور جس پر عمل کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ کرنے والوں کا کام ہے کہ اُن کو پڑھیں۔ میں اس سے زیادہ اس کے متعلق اور کچھ نہ کہوں گا کہ وہ پُر خلوص ہے اور مؤثر۔ (SYMPATHETIC & PERSUASIVE) یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بات اُن کے دل میں ہو (WILL OCCUR TO HIM) کہ انسان کے فرائض جو وہ قرآن کی آیتوں اور رسول کی حدیثوں سے معلوم کرتا ہے۔ اُن فرائض سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ جو وہ انجیل کے اُس حصہ سے معلوم کر سکتا ہے جو سرمن اون دی ماؤنٹ (SERMON ON THE MOUNT) کے نام سے مشہور ہے مگر انسان ایک کمزور مخلوق ہے جو اپنے جذبات کے رحم پر رہتا ہے اور اس بات سے کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اُن فرائض کی پابندی اکثر مسلمان بھی اسی طرح نہیں کرتے ہیں جس طرح کہ عیسائی نہیں کرتے ہیں۔

عام لوگ آغا خان کو بہ حیثیت ایک گھوڑ دوڑ والے آدمی کو جانتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ اِس کتاب کا مطالعہ کرنے والا جب اُن صفحات کو یاد کرے گا جن میں آغا خان نے اپنے وہ تجربات بیان کئے ہیں جو اُن کو گھوڑوں کی اچھی نسل پیدا کرنے والے (BREEDER OF BLOOD STOCK) اور بہت سی مشہور دوڑوں میں خوش قسمت جیتنے والے کی حیثیت سے حاصل ہوئے ہیں تو وہ اس محرک۔ پُر مغز اور پُر خلوص باب کو پڑھ کر کچھ پیچھے کو ہٹے گا اور تعجب کرے گا۔ (TRIFLE TAKEN ABACA BY) مگر اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ایسا کرے۔ چونکہ شکار کھیلنا ایرانی رئیسوں کا خاص مشغلہ تھا جن کی اولاد میں آغا خان ہیں۔ یہ اُس وراثت کا حصہ ہے جو اُن کو ملی ہے اور اس ماحول کا نتیجہ ہے جس میں اُن کی پرورش کی گئی۔ اُن کے دادا اور اُن کے والد کے پاس شکاری کتّے تھے۔ شکاری باز تھے اور ایسے بہت زیادہ تیز اور اعلیٰ قسم کے گھوڑے تھے جو کبھی روپیہ سے خریدے جا سکیں یا جن کو وہ امکانی طور پر تیار کر سکتے تھے اُن کے والد کی وفات کے وقت صرف بیس یا تیس گھوڑے اُن نوّے گھوڑوں میں سے جو اُن کے پاس تھے رکھ لئے گئے اور وہ آغا خان کے بچپن کے زمانہ میں آغا خان کے نام سے اور اُن کے نشان کے ساتھ تمام مغربی ہندوستان میں دوڑائے جاتے تھے۔ گھوڑوں کو دوڑانا اُنکی فطرت میں شامل ہے۔ مگر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اُن کے اندر یہ بات ہے کہ وہ اسلام کے

ایک فرقہ کے روحانی پیشوا ہیں جس فرقہ کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اُن کو اس مذہب میں پختہ عقیدہ ہے جو اُن کے بڑے مورثوں کا تھا اور وہ ہمیشہ اس مقدس فرض سے باخبر ہیں۔ اور اُن بڑی ذمہ داریوں سے جو اس فرض سے پیدا ہوتی ہیں اور جو پیدائشی حق کی وجہ سے خاص اُن ہی پر عائد ہوتی ہیں ہم میں سے کوئی بھی بالکل ایک قسم سے بنا ہوا نہیں ہے۔ آغا خان نے کسی موقعہ پر کہا ہے کہ ہم سب مختلف اور ایک دوسرے کے برعکس عناصر سے بنے ہوئے ہیں۔ یہ بات بہت کم آدمیوں کے متعلق اتنی صحت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے جتنی کہ خود آغا خان کے متعلق۔ مگر اس لحاظ سے وہ خوش قسمت ہیں کہ اُن کے اندر جو عناصر ہیں وہ صرف ظاہری طور پر ہی مختلف ہیں اور وہ اختلافات اُن کے کیریکٹر کی مضبوطی اور استقلال کی وجہ سے دُور ہو گئے ہیں۔

پہلا حصّہ۔ بچپن اور جوانی

سالوں پر ایک پُل

کسی انسان کے متعلق سچی باتیں بیان کرنا افسانہ۔ کہانی یا جھوٹی داستان سے زیادہ بہتر ہے۔ یہی حال کسی ملک یا ادارہ کے متعلق ہے۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں جس کے متعلق افسانہ کا ایک پورا جال خود میری ہی زندگی میں بچھا دیا گیا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں مجھ سے اکثر اخبارات کے ایڈیٹروں اور کتابوں کے شائع کرنے والوں نے بہت اصرار کیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے حالات لکھوں یعنی اپنی آپ بیتی۔ اپنی زندگی کے تجربے۔ اپنے عقائد اور خیالات اور وہ سب باتیں اور طریقے جن کی وجہ سے میری رائے اور میرے خیالات قائم ہوئے۔ میرے دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ یہ ایک بڑا فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے جس کا اثر اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں باقی رہے گا کہ میں جس طرح مشہور ہوں اس کے متعلق سچی باتیں جو واقعی مجھ پر گذری ہیں ظاہر کر دوں اور اپنے متعلق اُن سب جھوٹی اور غلط باتوں کی تردید کر دوں جو عام طور پر رائج ہو گئی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میرے دوستوں کا یہ اصرار محض میری خوشامد اور مجھے خوش کرنے کے لئے کیا گیا ہو۔ یہ اصرار خوشامدانہ ہو سکتا ہے مگر نیت میں ضرور نیک تھا۔ مگر مجھے اس کا یقین ہے کہ اُن کا ارادہ بھلائی کے لئے تھا اور اُن کی نیت نیک تھی۔

میرے متعلق چند ایسے کھلے ہوئے جھوٹ اور پورے افسانے ہیں جن کو صحیح کرنا ضروری ہے۔ مثلاً میری اور میرے خاندان کی دولت کا بہت بڑا اور غلط اندازہ۔ میری آمدنی اور میرے سرمایہ کے متعلق میں نے ایسی غلط رقمیں دیکھی ہیں کہ ان میں سے ایک صفر نہیں بلکہ دو صفر دور کر دینے چاہئیں۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرا جب میری ایک سوانح عمری شائع کی گئی۔ اس میں اتنی غلطیاں تھیں کہ تاریخوں کے متعلق ایک سال سے لے کر دس سال تک کی غلطیاں موجود تھیں۔ اگر سیدھے سادے اور آسانی سے تحقیقات کئے جانے والے واقعات کے متعلق میری زندگی میں لوگوں کی اطلاعات

اتنی غلط ہو سکتی ہیں کہ سالہا سال کا فرق ہو جائے تو دوسرے معاملات میں جو زیادہ وسیع۔ زیادہ گہرے اور زیادہ پوشیدہ ہوں میرے متعلق کس قسم کی صحت کا امکان ہو سکتا ہے۔

میری زندگی بہت سے طریقوں میں ایک قسم کا پل ہے جو مختلف زمانوں پر باندھ دیا گیا ہے اگر میری زندگی کو اس وقت مغربی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میں ملکۂ وکٹوریہ کے زمانہ میں پوری زندگی بسر کر چکا ہوں اور اب پھر ایسی ہی پوری زندگی موجودہ ملکہ الیزبتھ کے زمانہ میں بسر کر رہا ہوں جب میں نوجوان تھا تو میں ملکہ وکٹوریہ کے پاس ایک ڈنر پارٹی میں بیٹھا ہوا تھا اور اُن سے برابر باتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک اور دن میں ملکہ الیزبتھ ثانی کے پاس ایک ٹی پارٹی میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہوں اور اُن سے بھی برابر جب تک پارٹی ختم ہوئی گفتگو میں مصروف ہوں۔ میری جوانی کے زمانہ میں یہ اسٹیم کا انجن بالکل ابتدائی اور محض تجربات کی منزل پر تھا۔ اور موٹر کا ذکر کرنے پر تو لوگ ہنسی اُڑایا کرتے تھے اور اس کو صرف مذاق سمجھتے تھے۔ مگر اب دیکھئے کہ ہم آواز کی رفتار سے زیادہ تیز چلنے والے ہوائی انجن معمولی بات سمجھتے ہیں اور اس کا وجود سنتے ہی مان لیتے ہیں۔ آجکل ایک ستارے سے دوسرے ستارے میں سفر کرنے کے امکانات پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جاتی ہے اور غور کیا جاتا ہے مگر اس زمانہ میں جب میں اچھا خاصہ جوان ہو گیا تھا اور اپنی زندگی کا کافی اور مصروف زمانہ بسر کر چکا تھا میں نے دیکھا کہ لوگ ہوا پر اُڑنے کی معمولی کوشش کو بھی قابل توجہ خیال نہیں کرتے تھے (اور اس پر اس سے بہت کم غور کرتے تھے جتنا آجکل چاند وغیرہ میں پہنچنے والے روکٹ پر کیا جاتا ہے) مجھے لارڈ کیلون (LORD KELVIN) کی ملاقات کا فخر حاصل ہے جو اپنے زمانہ میں دنیا کے سب سے بڑے سائنسدان تھے۔ موصوف نے مجھے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اور غور کرنے کے بعد یقین دلایا کہ انسان کے واسطے ہوا پر اُڑنا بالکل ناممکن ہے اور یہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ انگلستان کے مشہور ناولسٹ ایچ۔ جی ویلس (H. G WELLS) نے بھی اپنی پہلی کتاب اینٹی سی پیشنز (ANTICIPATIONS) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہوا پر قابو پانا اور ایٹمی طاقت کا معلوم کر لینا دو یا تین صدیوں سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ نے دیکھا کہ یہ سب باتیں اور اس سے بھی زیادہ آدھی صدی کے مختصر زمانہ میں واقع ہو گئیں۔

گذشتہ نصف صدی کے زمانہ میں میری زندگی ایسی گذری ہے کہ میں واقعات کو صرف

دور سے کھڑے ہو کر نہیں دیکھتا رہا ہوں۔ بلکہ اپنی پیدائشی خصوصیات کی وجہ سے میں نے سب معاملات میں ایک کام کرنے والے کی حیثیت سے حصہ لیا ہے۔ جو انقلابات میں نے دیکھے ہیں اُن کا پورا اندازہ اس وقت نہیں ہو سکتا مگر ان کے اثرات انسان کی زندگی کے بہت سے درجوں پر نظر آتے ہیں۔ مغربی دنیا میں زندگی کا سارا طریقہ بڑی گہری اور دور تک پہنچنے والی تبدیلیوں سے گذر چکا ہے۔ ان میں سب سے بڑی تبدیلی شاید یہ ہوئی ہے کہ انسانی عمر کا اندازہ تقریباً بیس سال پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ مغرب میں مرد اور عورت دونوں کا بڑھاپا تقریباً دس سے بیس سال تک اُس زمانہ کی نسبت اب دیر میں آتا ہے جب میں جوان تھا۔ ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک میں بھی عام طور پر اسی قسم کی توسیع عمر جو فی الحال مغرب سے بہت کم ہے پائی جاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں یہ توسیع عمر بہت واضح ہے۔ آجکل وہاں پہلے سے زیادہ بہت سے ایسے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں پائی جاتی ہیں جو زندہ ہیں اور خوب کام کرنے کے لائق ہیں پکڈلی (PICADILLY) جیسی کسی مشہور سڑک پر یا پیرس کے کسی اور مقام کی چوڑی سڑک پر ٹہلتے وقت میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ میری عمر کا آدمی کس طرح پہلے اور اب کے زمانہ میں فرق محسوس کرتا ہے۔ یورپ میں اونچے طبقے اور درمیانی طبقے میں خاندانوں کے افراد کی تعداد اب بہت محدود ہو گئی ہے۔ ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۸۹۹ء تک کے جن خاندانوں میں سات یا آٹھ بچے ہوا کرتے تھے وہ اب بالکل ختم ہو گئے ہیں۔

یورپ کے کسی ملک میں طلاق اب کوئی غیر معمولی چیز نہیں رہی ہے۔ جب میں جوان تھا تب طلاق اتنی بری سمجھی جاتی تھی کہ چارلس ڈلک (CHARLES DILKE) اور چارلس اسٹیورٹ (CHARLES STEWART) جیسے مشہور اور معزز آدمی محض اس وجہ سے عوام کی نظروں سے گر گئے اور پبلک زندگی سے نکال دئے گئے کہ انہوں نے چند طلاق کے مقدمات میں حصہ لیا تھا۔ آجکل یورپ میں یہ حال ہے کہ وہ آدمی جن کے متعلق صحیح قانونی لفظ "مجرم پارٹی" استعمال کیا جا سکتا ہے اُن لوگوں میں پائے جائیں گے جو حکومت میں بڑے اونچے اور ذمہ دار عہدوں پر مقرر رہیں۔ اُن لوگوں پر صرف یہ سزا مقرر دی جاتی ہے کہ اُن کو ایسکٹ (ASCOT) کے شاہی حلقے میں (ROYAL-ENCLOSURE) داخل نہیں کیا جاتا مگر یہ ایسا امتیاز ہے جس کے متعلق میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ بہت کم لوگ اس کی کسی صورت میں پروا کرتے ہیں۔

عورتوں کی حیثیت میں رہنے سہنے اور مالی اعتبار سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ بہت زبردست ہیں۔ پچاس ساٹھ سال سے پہلے عورتوں کے لئے اگر کوئی زندگی ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ وہ شادی کرے یا کسی اور طریقہ سے مرد کی حفاظت میں رہے۔ مگر آجکل یہ حال ہے کہ عورتوں کے لئے بے شمار باعزت اور فائدہ مند پیشوں کے دروازے کھل گئے ہیں اور وہ اپنی زندگی یقین کے ساتھ اپنے آپ پر بھروسہ کرکے گذار سکتی ہیں جنس پرستی (HOMOSEXUALITY) یعنی مرد کی مرد سے یا عورت کی عورت سے نفسانی محبت اور شہوت رانی پہلے زمانہ میں ایسا برا مرض سمجھا جاتا تھا جیسے جذام یا کوڑھ کا مرض۔ مگر آجکل یورپ کے اکثر ملکوں میں یا تو فرائیڈ (FREUD) کی قابلِ رحم۔ شہوت پرستی پائی جاتی ہے یا مختلف بہانوں کے ساتھ اینڈرے گائیڈ (ANDRE GIDE) جیسے آدمی یا اور حضرات اس قسم کی نفسانیت کو کھلم کھلا حق بجانب سمجھتے ہیں۔ گو وہ اس کو قابلِ فخر نہ سمجھتے ہوں۔

میں پرانی دنیا میں اچھی خاصی عمر کا آدمی تھا۔ اور مجھے امید ہے کہ اس نئی دنیا میں میرا دوسرا بچپن ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ (یعنی میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوگیا ہوں کہ میرے بچپن کا زمانہ پلٹ آئے اور میں بچوں کی سی باتیں کرنے لگوں) اس وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا فرض ہے کہ میں تفصیل کے ساتھ ان تجربات کو بیان کروں جو میں نے اس طویل اور اہم زمانہ میں حاصل کئے ہیں اور میں اپنے ذاتی تعلقات بلکہ در اصل اکثر اس سچی اور گہری دوستی کا حال لکھوں جو میں نے ان لوگوں سے پیدا کی جن کی وجہ سے اس دنیا میں بہت بڑی سیاسی۔ اخلاقی اور تمدنی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔

انگلستان کا ذکر اکثر اس زمانہ میں بھی ہوا کرتا تھا جب میں نوجوان تھا اور یہ انگلستان اس وقت ایک عجیب اور شاندار الگ تھلگ زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ حالات اس قسم کے تھے کہ جن سے انگلستان کے آدمیوں میں ایسا گہرا اور زبردست فخر اور غرور پیدا ہوتا تھا جو بیسویں صدی اور سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک کے انتہا پسند امریکہ والوں کے نرالا پن (ISOLATIONISM) سے بہت زیادہ قابلِ فخر تھا۔ اس زمانہ کے انگلستان کی نظر میں فرانس اس کا موروثی دشمن تھا اور جرمنی سارے یورپ میں اس کا اکیلا اور پکا دوست تھا۔ بہت تھوڑے مٹھی بھر آدمی مثلاً سر چارلس ڈلک

(SIR CHARLES DILKE) دوسرے شاہ پرست مثلاً ایڈمارل میکس (ADMIRAL MAXSE) اور چند اصول پسند (RADICAL) چھوٹے انگلستانی (LITTLE ENGLANDERS) ایسے تھے جو فرانس کی دوستی اور جرمنی پر بے اعتباری کی ترغیب دلاتے تھے۔

مشرق کے وسیع ملکوں میں انگلستان کی سرداری اور سیاسی لیڈرشپ بالکل مانی ہوئی تھی اور اس میں کسی کو مطلق اختلاف نہیں تھا۔ اُس کی ہندوستانی سلطنت اس زمانہ کی سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ پائیدار سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی۔ لارڈ کرزن (LORD CURZON) جیسے آدمی بلکہ دراصل مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ برطانوی حکمران طبقہ کے ننانوے فی صدی آدمی اس خیال سے بالکل خوف زدہ ہو جاتے کہ کبھی ہندوستانی ریپلک (INDIAN REPUBLIC) قائم ہو جائے گی یا جو کچھ اس کا لازمی نتیجہ ہو سکتا ہے اور یہ لوگ اس امید سے اور بھی زیادہ پریشان ہوتے جو ان کے لئے بالکل ناممکن اور ناقابل فہم معلوم ہوتی تھی کہ کسی زمانہ میں ہندوستان کی لمبی چوڑی سلطنت تقسیم ہو جائے گی اور اس میں سے دو مضبوط قومی حکومتیں پیدا ہو جائیں گی جو اپنی اپنی جداگانہ تاریخی شخصیت کی مالک ہوں گی۔ ۱۹۳۰ء تک بھی یہی خیال قائم رہا جب کہ ڈومینین اسٹیٹس (DOMINION STATUS) کا آخری وعدہ کیا گیا تھا اُس وقت بھی برطانیہ کا یہی حکمران طبقہ اپنے آپ کو اس قسم کے بچوں والے دھوکے میں ڈالے ہوئے تھا کہ ہندوستان کی سلطنت جو اُن کے بزرگوں نے بنائی تھی ایک جائیداد کی طرح جو مرنے کے بعد مالک کے وارثوں کو مل جاتی ہے۔ انگریزوں کے جانشینوں کو اس طرح دیدی جائے گی کہ اس کی عارضی وحدت اور اس سارے ملک کا ایک ہونا ضرور باقی رہے گا گویا کہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں دراصل سچا اتفاق اور اتحاد ہے جس کی جڑ روحانی اور طبعی بنیادوں پر قائم ہے۔ ۱۹۴۰ء میں بھی لارڈ ویول (LORD WAVELL) جیسے آدمی اور دوسرے حضرات یہ امید رکھتے تھے اور اس کا اُن کو یقین تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی یہ ممکن ہے کہ ایک متحدہ ہندوستانی فوج قائم رہے۔ یورپ کی اور دوسری نوآبادیات رکھنے والی حکومتیں بھی اسی قسم کے لغو دھوکے میں پڑی ہوئی تھیں۔ اب سے کچھ کم بیس سال پہلے فرانس کا یہ پکا خیال تھا کہ ہند چینی کی تینوں ریاستیں کسی زمانہ میں عاجزی کے ساتھ اور ایک جونیر حصہ دار کی طرح ایک فرانسیسی یونین (FRENCH UNION) میں شامل ہو جائیں گی جس کا مرکز اور جس کا

دل و دماغ پیرس (PARIS) میں ہوگا۔

میں نے عرصہ تک دیکھا ہے کہ ایشیا کس طرح یورپ کی حکومت کے خلاف برابر بہت دنوں سے انقلابات پیدا کرتا چلا آرہا ہے۔ سن ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۹ء تک یہ انقلاب ایک چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا تھا جو آدمی کی ہتھیلی سے بڑا نہ تھا۔ اُس وقت اُسکی کیا اہمیت معلوم ہوتی تھی؟ اس وقت اس قسم کی شورش کچھ معمولی سرکاری عہدوں کی امید یا کچھ اعزازی خطابات پر منحصر تھی۔ مگر آجکل ایشیا کا انقلاب مکمل ہوگیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ (MIDDLE EAST) کے شرق میں ہر جگہ یورپ کی حکومت کا دراصل اور نام ونمونہ کے لئے بھی خاتمہ ہو رہا ہے۔ اور میری عمر اتنی کافی ہوگئی ہے کہ میں نے یہی حال افریقہ کے اندر برابر شروع ہوتا ہوا دیکھا ہے۔ مگر وہاں پر یورپ کے حکمران طبقہ نے ایشیا کے حالات سے سبق حاصل کیا ہے۔ مغربی افریقہ میں برطانیہ۔ کونگو (CONGO) میں بلجیم (BELGIUM) اور وسط افریقہ کے مقبوضات میں فرانس اب یہ تیاری کر رہے ہیں اور اس کے منصوبے بنا رہے ہیں کہ وہ اپنے اُن اختیارات کو منتقل کر دیں جن کے لئے وہ ایشیا میں کبھی تیار نہیں تھے۔

ان سب تبدیلیوں میں میرا حصہ رہا ہے مگر میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ میں نے قومی کاموں میں جو کچھ حصہ لیا اور ہندوستان اور دوسرے ممالک کی سیاسی ترقیوں میں جو کام کیا اُن میں سے کوئی بھی دراصل میرا خاص کام یا میرا فرض نہ تھا۔ میرے بچپن ہی سے میرا خاص کام اور میری خاص ذمہ داری دراصل وہ بڑا چارج ہے جو مجھ کو وراثتاً ملا ہے اور وہ مسلمانوں کے شیعہ فرقہ کی اسمٰعیلی شاخ کے امام کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کسی دوسری جگہ میں تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ میرا مندرجہ بالا بیان سے کیا مطلب ہے۔ یہاں پر میں صرف اس کی تائید کرتا ہوں کہ اس کام میں جو فرائض مجھ پر عائد ہوتے ہیں وہ ہمیشہ سے میرے لئے سب سے پہلے فرائض شمار کئے گئے ہیں۔ ان فرائض کی ادائیگی میں میری روزانہ زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوتا رہا ہے۔ اس کی بہت سی صورتیں رہی ہیں مثلاً بہت مختلف اور لمبی چوڑی خط وکتابت کرنا۔ اپنی ذاتی اور مذہبی محبّت و اخوت کے بے شمار رشتوں کو قائم رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ جو کچھ میں نے کیا ہے یا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ میں نے زندگی کا لطف اٹھایا ہے یا تکلیف اٹھائی ہے وہ سب میرے لئے لازمی طور پر دوسرے درجہ کی باتیں شمار ہوئی ہیں۔ اِس اہم خصوصیت کو

صفائی کے ساتھ روشن کر دینے کے بعد میرا خیال ہے کہ میں آسانی سے بہت سے دوسرے قسم کے واقعات اور اپنی زندگی کے تجربات بیان کر سکتا ہوں۔

جب میں اپنی پچھلی زندگی پر نظر کرتا ہوں تو مجھے ایک بات یاد آتی ہے جو میرے ذاتی علم کا ایک حصہ ہے اور جو زیادہ سے زیادہ خوشی پیدا کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں نے ذاتی طور پر تقریباً تیس ہزار سے چالیس ہزار تک اونچی ذات کے ہندوؤں کو مسلمان کیا ہے۔ ان میں سے بہت سے اعلیٰ اور پیشہ ور طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ لوگ سب بے عقیدہ تھے اور ان کو عقیدہ حاصل ہوگیا۔ نہ میرے والد نے اور نہ میرے دادا نے کبھی اتنے بڑے مذہبی کام کی کوشش کی۔ اس کام کی تکمیل سے ایک بہت اہم اور دلچسپ نتیجہ ضرور نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نومسلموں کی زیادہ تعداد اس ملک میں آباد تھی جو اب پاکستان بن گیا ہے۔ اگر یہ لوگ ہندو رہتے تو غالباً ان سب کو اس مکمل جلاوطنی کا شکار بننا پڑتا اور وہ سب خوفناک تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑتیں جو ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے باعث پیدا ہوئیں

میں نے جتنے عرصہ اپنا زمانہ قومی کاموں میں صرف کیا میں برابر کوشش کرتا رہا کہ میں اپنا کام بہترین طریقہ پر انجام دوں جہاں تک میرے امکان میں تھا۔ مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنی کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کا صحیح تخمینہ لگا سکوں۔ اس پر آخری فیصلہ دینا اور لوگوں کا کام ہے۔

میں نے اس عرصہ میں انسانی دلچسپی اور انسانی تجربہ کے ہر شاخ کی تیز رفتار اور ہمہ گیر تبدیلی کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً اس زمانہ کی صنعتی ترقی اور مشینی انقلابات۔ قدرتی وسائل اور قدرتی طاقتوں پر انسان کا روز افزوں قبضہ۔ اندرونی اور غیر محسوس قوتوں کی اہمیت کا احساس۔ انسانی عمر میں نمایاں اضافہ۔ نئے اخلاقی معیاروں کا پیدا ہونا اور اُن کی وجہ سے انسان کے نقطۂ نظر میں گہری تبدیلیاں۔ ایسی زبردست سیاسی اور ملکی تبدیلیاں جو میری جوانی کے زمانہ میں خواب میں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ ان سب انقلابات کی بنا پر میرا ارادہ ہے کہ میں اس کتاب کے آئندہ بابوں میں ہر زمانہ کی ایک تصویر پیش کروں۔ ایسی تصویر جو اُس آدمی کی نگاہ کے سامنے اور اُس آدمی کے ذہن اور دل میں آتی رہی ہے جو عام طور پر اُس کو ایک تماشہ بین کی طرح کھڑا ہوا دیکھتا رہا ہے مگر جس نے کبھی کبھی ایک کام کرنے والے کی طرح اُس تصویر کے بننے میں بھی حصہ لیا ہے۔

باب نمبر ۲

اسلام میرے مورثوں کا مذہب

انسان کے مذہبی احساسات کی بنیاد اُس چیز میں پائی جاتی ہے جس کو ہم آجکل "سائنس" کہتے ہیں جن لوگوں نے پرانے، فسانوں کا علم (MYTHOLOGY) اور شروع زمانہ کی ابتدائی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ "جادو" نے مختلف شکلوں میں شروع زمانہ کے آدمی کے اندر خیالات کی مختلف صورتیں پیدا کیں جن کے ذریعہ سے اُس نے اُن قدرتی حالات کا جو وہ اپنے چاروں طرف دیکھتا تھا ایک معقول اور سمجھ میں آنے والا علم حاصل کیا۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات معقول معلوم ہوتی تھی کہ یہ حالات اور یہ سب واقعات مثلاً سورج کا نکلنا اور ڈوبنا۔ موسموں کا آنا جانا۔ پھولوں کا کھلنا۔ پھلوں کا پکنا۔ ہوا اور بارش۔ سب دیویوں اور اعلیٰ ہستیوں کی وجہ سے ہوتے تھے اور یہ سب اُن ہی کے قبضہ و اختیار میں تھے۔ شروع زمانہ کا مذہبی تجربہ اور شروع زمانہ کی علمی اور سائنس کی بحثیں جادو اور سحر کاری کی صورت میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ اِس طرح پر ایک ہی وقت میں محسوسات کی دُنیا میں انسان کے تجربات نے جن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش اس نے اپنی عقل کے ذریعہ سے کی۔ سائنس اور مذہب دونوں کو پیدا کیا۔ یہ دونوں پُرانے اور تاریخ سے قبل کے زمانہ میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے رہے اور اسی طرح اُن ابتدائی سلطنتوں کے دور میں رہے جن کا ہم کو علم ہے۔ اُس وقت یہ مشکل تھا کہ اس چیز کو جسے مذہب کی چیز کہتے تھے اُس سے جدا کر سکیں سے سائنس کی چیز کہتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں جس طرح دو چشمے بہتے ہیں۔ کبھی وہ مل جاتے ہیں اور کبھی علیحدہ ہو جاتے ہیں مگر ہمیشہ برابر چلتے رہتے ہیں۔

رومن (ROMAN)* اور یونانی تخیل اور کلچر کا پس منظر یہ ہے جیسا کہ قدیم ایرانی اور ہندو فلاسفی کا عیسوی سال کے شروع ہونے سے پہلے رہا ہے (ARISTOTLE) ارسطو نے

بہرحال اِس آمیزش کو ایک زیادہ علمی رنگ دیا۔ چونکہ اُس نے وہ نظریات اور تصورات (CATEGORIES AND CONCEPTS) پیدا کئے جن کا تعلق خاص طور پر عقل اور سمجھ سے تھا اور اُس نے اُن تمام مذہبی رعب اور مذہبی راز کی علامتوں کو دور کر دیا جو افلاطون میں پائی جاتی ہیں۔

رومن سلطنت (ROMAN EMPIRE) کے تنزل پر اور تہذیب کے اُس بڑے اور مفصل نظام کے ختم ہونے پر جو رومن قانون (ROMAN LAW) اور رومن حکومت نے اتنی صدیوں تک قائم رکھا تھا۔ یورپ میں تاریک زمانہ چھا گیا۔ عیسوی سال کی ساتویں صدی میں روحانی اور دماغی دنیا دونوں کے اندر جہات کی خواہش اور نئی تحقیقات نے انسانی طاقتوں میں تیزی کے ساتھ ایک نئی اور شاندار ترقی پیدا کر دی تھی۔ وہ ترقی عرب میں شروع ہوئی میرے مقدس مورث پیغمبر محمد نے اُس کی ابتدا کی اور اُس کو عروج پر پہنچایا ہم اس کو اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے اثر کی لہر عرب سے چل کر بہت تیزی اور زور کے ساتھ شمالی افریقہ اور وہاں سے اسپین تک پہنچ گئی۔

اِبن رشد نے جو ایک بڑے مسلم فلسفی تھے اور جن کو یورپ میں ایوروس (AVERROES) کے نام سے جانتے ہیں۔ انسانی قابل فہم تجربہ کی دو قسموں کے درمیان جو بڑا فرق ہے اُس کو صفائی کے ساتھ قائم کیا۔ ایک طرف تو قدرتی اشیاء کا وہ تجربہ ہے جس کا علم ہم کو اپنے حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور جہاں سے ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ ناپ تول کر سکیں اور گنتی کے ذریعہ سے چیزوں کی شمار کر سکیں (اس طاقت کے ساتھ وہ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جو نئے واقعات اور نئی باتوں کے سمجھنے میں آتی ہیں) دوسری طرف ہمارا وہ فوری اور اندرونی تجربہ ہے جو ایسی چیز سے متعلق ہے جو زیادہ اصلی اور حقیقی ہے اور جو ہمارے خیال اور دماغی عمل پر کم منحصر ہے بلکہ جس کا علم ہم کو براہِ راست ہوتا ہے اور جس کو میں "مذہبی تجربہ" کہتا ہوں۔ چونکہ ہمارا دماغ قدرتی طور پر مادی ہے اور اُس کے تمام افعال اور اُن افعال کے تمام نتائج مادی ہیں اس لئے جب کبھی ہم کسی خیال کو یا روحانی تجربہ کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کرتے ہیں تو دماغ کی یہ مادی ساخت روحانی تجربہ کے سب سے اعلیٰ اور ادراک سے بہت بالا (TRASCENDENT) حالت کو بھی ایک مادی شکل لازمی طور پر دیدیتی ہے مگر انسان اُن لوگوں کے روحانی اور اندرونی تجربات

کا بیرونی دنیا میں مطالعہ کرسکتا ہے جن کو بغیر مادی امداد کے روحانی روشنی حاصل ہو چکی ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہم خدا کے ساتھ رہتے ہیں اور حرکت کرتے ہیں اور ہمارا وجود خدا کے اندر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال قرآن شریف میں اکثر ظاہر کیا گیا ہے ان الفاظ میں نہیں جو اوپر بیان کئے گئے بلکہ اسی طرح کے خوبصورت اور اس سے زیادہ موزوں الفاظ میں۔ مگر جب ہم اس قول کے معنی کو سمجھ لیتے ہیں تو ہم دراصل خود کو اُس عطیہ کے حاصل کرنے کے لئے تیار کر رہے ہیں جو براہ راست تجربہ حاصل کرنے کی طاقت ہے۔ رومی اور حافظ نے جو فارسی کے بڑے شاعر تھے ہم کو اپنے اپنے مختلف طریقہ پر بتایا ہے کہ بعض آدمی ایسی قدرتی روحانی طاقتیں اور ترقی کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ اُن کو اُس بڑی محبت اُس ہمہ گیر اور ہمہ سوز (ALL CONSUMING) محبت کا براہِ راست تجربہ ہوتا ہے جو حقیقت سے براہ راست اِتصال اور تعلق پیدا ہونے پر انسانی روح کو حاصل ہوتا ہے۔ حافظ نے کہا ہے کہ ایسے آدمی جیسے کہ عیسٰے مسیح اور ایسے مسلم صوفی جیسے کہ منصور اور بایزید وغیرہ اس بڑی محبت کی روحانی طاقت رکھتے تھے۔ اور یہ کہ ہم میں سے ہر شخص وہ طاقت رکھ سکتا ہے جو حضرت عیسٰے رکھتے تھے بشرطیکہ وہ روح مقدس[1] (HOLY SPIRIT) جو ہمیشہ موجود ہے ہم کو وہ روشنی عطا فرمادے جس سے مستفیض ہونے پر وہ طاقت آتی ہے۔ مگر انسانوں کی بہت زیادہ اکثریت کے لئے یہ بڑی محبت عملی طور پر حاصل کرنے کے لئے امکانی چیز نہیں ہے۔ بہر حال اپنی زندگیوں میں اس محبت کی عدم موجودگی سے جو کمی واقع ہوتی ہے اس کو ہم اِس طرح پورا کرسکتے ہیں کہ اس دنیا میں دوسرے انسانوں کے ساتھ انسانی محبت پیدا کریں اس سے ہم کو ایک حد تک وہ روشنی مل جائے گی جو روح مقدس (HOLY SPIRIT) کی امداد کے بغیر نہیں مل سکتی۔ جو لوگ ایسے خوش قسمت ہیں کہ اس دنیاوی انسانی محبت کو جانتے ہیں اور اس کو محسوس کرتے ہیں اُن کو چاہیئے کہ شکریہ کے ساتھ اس کا جواب دیں اور اس کو ایک نعمت شمار کریں اور اُس کو اپنی جگہ پر فخر کرنے کا ذریعہ سمجھیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ایک حد تک اعلیٰ تجربات کے لئے انسان

---

[1] یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام میں روح مقدس (HOLY SPIRIT) کا جو مفہوم ہے وہ عیسائیوں کے اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو تثلیث کی تیسری شخصیت کے متعلق ہے

اس طرح تیار ہو سکتا ہے کہ وہ مادی دنیا میں کسی دوسرے انسان کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہو جائے۔ (ABSOLUTE DEVOTION) اور اس کی طرف اپنی توجہ کمل اور مطلق طریقہ پر کر لے۔ اس طرح پر خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے اور اعلیٰ روحانی زندگی کا کوئی تجربہ نہ ہونے پر ہماری سفلی اور مادی روح ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اس زندگی کی ساری دولتیں اور وہ تمام چیزیں جو شہرت مال اور صحت سے حاصل ہوتی ہیں اُس خوشی کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہیں جو اُس محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور باقی رہتی ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہو جاتی ہے۔ یہ بڑی نعمت ہم روز مرہ کی زندگی میں دیکھ سکتے ہیں جب کہ ہم اپنے چاروں طرف اپنے دوستوں اور آشناؤں کے درمیان نظر ڈالتے ہیں۔

لیکن جس طرح انسانی محبت کی خوشیاں اُن سب باتوں سے سبقت لے جاتی ہیں جو دولت اور طاقت سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ بڑی روحانی محبت اور روشنی جو حقیقت کو براہِ راست دیکھنے کے اعلیٰ تجربہ کا پھل ہے اور جو صرف خدا کا عطیہ اور نعمت ہے ان سب چیزوں سے سبقت لے جاتی ہے جو بہترین اور زیادہ سے زیادہ بھی انسانی محبت دے سکتی ہے اس نعمت کے لئے ہم سب کو ہمیشہ دعا مانگنی چاہئے۔

اب مجھے اس کا یقین ہے کہ اسلام کے ذریعہ سے اور اللہ کے اُس نصب العین کے ذریعہ سے جو مسلمانوں نے پیش کیا ہے انسان اس براہِ راست تجربہ کو حاصل کر سکتا ہے جس کو کوئی الفاظ ظاہر نہیں کر سکتے لیکن وہ اُس کے لئے قطعی اور یقینی حقیقت کی چیزوں میں سے ہے میں نے اس قسم کے تجربہ پر غیر مسلموں سے بحث نہیں کی ہے۔ مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ بدھ مذہب والے۔ برہمن۔ آتش پرست اور عیسائیوں (اس کے متعلق میں نے اسپانوزا (SPINOZA) کے علاوہ اور یہودیوں سے نہیں سنا) کو بھی یہ براہ راست اور صوفیانہ دیدار حاصل ہو چکا ہے۔ (VISION) مجھے یقین ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو اور مجھے یقین ہے کہ خود مجھ کو اس قسم کی روشنی اور اس قسم کے علم کے لمحات آچکے ہیں جن کو ہم دوسروں پر الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کر سکتے چونکہ وہ ایسی چیز ہے جو خود بخود دی جاتی ہے نہ کہ ایسی چیز جو کوشش سے لی جائے۔

ایک حد تک میں نے یہ معلوم کیا ہے کہ قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت نے مجھے اور دوسرے مسلمانوں کو بہت مدد اور سمجھ عطا فرمائی ہے جب تک کہ اُس آیت کو خالص غیر مادی مفہوم کے ساتھ سمجھا جائے۔ اُن سب لوگوں کو جو اس آیت کو پڑھتے ہیں میں متنبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی مادی اور نکتہ چین نقطۂ نظر کو اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ اس چیز میں جو مثال اور تشبیہ دے کر بیان کی گئی ہے کوئی لغوی اور لفظی مفہوم تلاش کریں۔ میں ہر پڑھنے والے سے خواہ وہ مسلمان ہو یا نہ ہو اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس آیت کی اسپرٹ (SRIRIT) کو پورے طور پر تسلیم کرتے۔ وہ آیت حسب ذیل ہے:۔

"اللہ زمین اور آسمان کا نور ہے۔ اس کا نور اس طرح ہے کہ جیسے کہ کوئی طاق ہو جس کے اندر ایک چراغ رکھا ہو اور وہ چراغ ایک شیشے کے اندر بند ہو اور وہ شیشہ ایسا ہو جیسے کوئی چمک دار ستارہ۔ وہ چراغ ایک مبارک درخت سے روشن ہوتا ہے اور وہ درخت زیتون کا ہے جو نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں۔ اس کا تیل روشنی دیتا ہے گو اس میں کبھی آگ نہ لگائی جائے۔ یہ نور کے اوپر نور ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اللہ انسانوں کے واسطے تشبیہی مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔" (سورہ ۲۴- نور- آیت ۳۵)

اپنے ذاتی عقائد کے اس مختصر بیان کے بعد میں جہاں تک مجھ سے ممکن ہے اسلام کی وہ مختصر اور غیر متنازعہ تفصیل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو آجکل سمجھی جاتی ہے اور جس پر عمل کیا جاتا ہے بنی نوع انسان کی موجودہ حالت اپنے تمام خطرات اور تمام دعووں کے باوجود یقینی طور پر وہ موقعہ بھی رکھتی ہے کہ وہ نہ صرف مختلف قوموں کے درمیان مادی صلح (MATERIALPEACE) قائم کرے بلکہ اس زمین پر وہ بہتر خداوندی امن وسکون (PEACE OF GOD) قائم کرے۔ اس کوشش میں اسلام اپنا مفید اور بنانے والا حصہ ادا کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے اور اُس کی روحانی اور اخلاقی طاقت کو تسلیم کر لیا جائے اور اس کی عزت کی جائے اس لئے میں کوشش کروں گا کہ مختصر پیمانہ پر اسلام کے بنیادی اصول کا ایک صاف خاکہ پیش کروں جس سے میرا مطلب وہ اصول، وہ مذہبی عقائد اور وہ طریق زندگی ہیں جو مسلمانوں کے

سب فرقوں میں عام طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ پہلے میں ان اسلامی اصول کی تفصیل کروں گا جو مشترکہ طور پر سنیوں کی بڑی جماعت اور شیعوں کے درمیان بھی مانے جاتے ہیں۔ اس طرح پر اُس مذہب کو اتنا واضح کر دینے کے بعد جتنا کہ مجھ سے ممکن ہے اور جو ہم سب کو بہ حیثیت مسلمان کے متحد کرتا ہے میں شیعہ اصول کا مختصر خاکہ پیش کروں گا اور پھر ان خاص اصول کا ذکر کروں گا جس کو تبعوں کا وہ ضمنی فرقہ مانتا ہے جو اسمٰعیلی کہلاتا ہے اور جس فرقہ کا میں امام ہوں۔

پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ باوجودیکہ یہ بنیادی تصورات عام طور پر سب مسلمانوں میں تسلیم کئے جاتے ہیں تاہم اسلام میں مطلق اور قطعی فیصلہ کرنے کی کوئی سند اور کوئی شخصیت نہ اب موجود ہے اور نہ اس سے پہلے کبھی موجود رہ چکی ہے۔ ہمارے یہاں پوپ کے نافذ کردہ احکام کی (PAPAL ENCYCLICAL صورت میں کوئی چیز نہیں ہے جن سے کسی عقیدہ کی تفصیل با منظوری دی جائے جس طرح رومن کیتھولک (ROMAN CATHOLIC) مذہب میں موجود ہے اور ہمارے ہاں اس قسم کے اُنتالیس عقیدوں کی فہرست (THIRTY-NINE ARTICLES) بھی نہیں ہے جس طرح کہ انگلستان کے گرجا (CHURCH OF ENGLAND) میں اُس کی مذہبی پوزیشن (DOCTRINAL POSITION) بنانے کے لئے پائی جاتی ہے پیغمبر محمد کے پاس دو ذریعے سند اور اختیار (AUTHORITY) حاصل کرنے کے تھے۔ ان میں سے ایک مذہبی تھا جو ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا اور دوسرا دنیاوی تھا جو اُن کی زندگی کے حالات اور واقعات کی وجہ سے مذہب میں اُنکے لازمی اور خدا کے دئے ہوئے اختیار سے ملا جلا ہو گیا تھا۔

سنیوں کے اسکول کے مطابق جو مسلمانوں کی اکثریت رکھتا ہے پیغمبر کی مذہبی حکومت (RELIGIOUS AUTHORITY) اُن کی وفات پر ختم ہو گئی اور اُنہوں نے اپنا کوئی جانشین اپنی دنیاوی حکومت کے لئے مقرر نہیں کیا۔ سنیوں کی تعلیم کے بموجب پیغمبر کے وفاداروں نے اُن کے صحابیوں نے اور اُن پر ایمان رکھنے والوں نے ابوبکر کو ان کا جانشین اور اُن کا خلیفہ منتخب کر لیا۔ مگر ابوبکر نے صرف قانونی اور دنیاوی اختیار حاصل کیا۔ کسی کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اُس مذہبی فضیلت کا جانشین بنے جو براہ راست خدا کے الہام اور وحی پر منحصر تھی۔ چونکہ پیغمبر محمد اور قرآن نے قطعی طور پر یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ محمد خدائے مطلق کے آخری پیام بر ہیں (FINAL MESSENGER

اِس وجہ سے سنّی لوگ کہتے ہیں کہ یہ ناممکن تھا کہ کوئی ایسی حکومت قائم کی جائے جیسی کہ پوپ کی حکومت ہوتی ہے (PAPACY) یہ بات مسلمانوں کے لئے چھوڑ دی گئی کہ وہ قرآن کی (INTERPRET) پیغمبر کی زندگی اور اُن کے اقوال کی تفسیر کریں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اُس کے ذریعہ سے صرف اسلام کو سمجھ لیں بلکہ اس لئے کہ صدیوں تک اسلام کی ترقی کو یقینی بنا دیں خوش قسمی سے قرآن نے خود اس کام کو آسان کر دیا ہے۔ چونکہ اس میں بہت سی آیتیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اللہ انسان سے تشبیہ اور تمثیل دے کر باتیں کرتا ہے۔ اِس طرح پر قرآن نے سب قسموں کی تاویلات کے امکانات کا دروازہ کھلا ہوا چھوڑ دیا ہے اور کوئی تفسیر یا تاویل کرنے والا دوسرے کو غیر مسلم کا الزام دینے کے قابل نہیں ہے۔ اسلام کے اس بنیادی اصول کا کہ قرآن ہمیشہ تشبیہی تاویل کے لئے کھلا ہوا ہے ایک مبارک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مقدس کتاب صدیوں تک اپنے معتقدین کے خیالات کی ایسی رہنمائی کرنے اور ان کو ایسا روشن کرنے کے قابل رہی ہے

جو اُن حالات اور حدود کے مطابق ہیں جو دنیا میں انسانی دماغ پر خارجی اثرات کے پڑنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اِس سے مسلمانوں میں بڑی فیاضی بھی پیدا ہو گئی ہے چونکہ کوئی سخت اور خشک قسم کی تاویل نہ ہونے پر مسلمانوں کے سب نظریاتی اسکول اس دعا میں متفق ہو کر شریک ہو سکتے ہیں کہ وہ قادر مطلق اپنی غیر محدود رحیمی کی وجہ سے مذہب میں کسی ایسی غلط تاویل کو معاف کر دے جس کی وجہ ناواقفیت یا غلط فہمی ہو۔

میں اپنے مغربی مطالعہ کرنے والوں کے سامنے اسمٰعیلی فرقہ کے عقائد پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہوں جس سے میرا تعلق ہے۔ نہ شیعہ عقائد کے۔ نہ اسلامی تصوف کے اُس صوفی اسکول کے متعلق جو جلال الدین رومی اور بایزید بسطامی جیسے آدمیوں کا ہے۔ نہ اُن چند موجودہ سنی مفسروں کے متعلق جو بعض عیسائی فرقوں کی طرح قرآن میں ایسی لفظی ہدایات تلاش کرتے ہیں جیسی کہ ان فرقوں کے عیسائی قدیم اور نئی انجیل میں (OLD & NEW TESTAMENTS) تلاش کرتے ہیں بلکہ میں سنی روشن خیال کے اُس خاص مرکزی پہلو کو بتاؤں گا جس کی بنیاد اس اسکول کے خیالات میں پائی جاتی ہے جو الغزالی نے قائم کیا اور جس کے اثرات اور تعلیم ایک صدی سے لے کر دوسری صدی تک برابر جاری رہے ہیں۔

سب سے پہلے ہم کو خود یہ سوال کرنا چاہیئے کہ بنی نوع انسان کے لئے مشیّتِ ایزدی کا یہ آخری اور قطعی ظہور کیوں عطا کیا گیا اور اُس کے اسباب کیا تھے؟ اسلام کے سب نظریاتی اسکول اُس کو ایک بنیادی اصول کی طرح تسلیم کرتے ہیں کہ صدیوں تک اور محمد کے ورود سے ہزاروں سال پہلے تک اس زمین کی ان قوموں کے واسطے اور ان کے درمیان جو اپنے ذہنی اور دماغی اعتبار سے اتنی کافی ترقی کر چکی تھیں کہ اس پیام کو سمجھ سکیں۔ ایسے پیام بر مختلف وقتوں میں آتے رہے جو رحمتِ الٰہی سے منوّر تھے۔ اس طرح پر ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ اور اسرائیل کے سب پیغمبروں کو اسلام تسلیم کرتا ہے۔ مسلمان درحقیقت صرف اسرائیل کے پیغمبروں تک خود کو محدود نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہدایت کئے ہوئے پیام بر آئے تھے۔ مثلاً گوتم بدھ۔ شری کرشن۔ شری رام ہندوستان میں۔ سقراط یونان میں۔ چین میں وہاں کے قدیم عقلمند آدمی اور ان کے علاوہ بہت سے بزرگ اور خدا پرست آدمی جو اُن قوموں اور مہذب زمانوں میں تھے جن کا ہم کو اب کچھ پتہ نہیں رہا۔ اس طرح پر انسانی روح کو کبھی بغیر ایک خاص طور پر ہدایت کئے ہوئے پیام بر کے نہیں چھوڑا گیا اور وہ ہدایت اُس عالمگیر روح کی طرف سے ہوتی تھی جو ساری دنیا میں موجود ہے۔ ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اور جو دراصل خود کل عالم ہے (UNIVERSE) پھر اس کی کیا ضرورت تھی کہ محمد کے لئے خدا کی طرف سے کوئی وحی نازل کی جائے؟ اسلام میں اس کا جواب مختصر اور صاف ہے۔ اپنی بڑی روحانی طاقت کے باوجود یہودیوں کی وحدانیت میں دو خصوصیات باقی ہیں جو اس کی وحدانیت کو اسلامی وحدانیت سے بنیادی طور پر مختلف کر دیتی ہیں۔ یہودیوں کے نزدیک خدا باوجود تمام باتوں کے اسرائیل کی اولاد کے لئے ایک قومی اور ملکی خدا بن کر رہ گیا ہے اور اس کا وجود اس کے اعلیٰ مظاہر سے جو کل عالم کی صورت میں ہیں بالکل جدا ہو گیا ہے۔

دُور افتادہ ملکوں میں جیسے کہ ہندوستان اور چین ایک خدا پر عقیدہ رکھنے کی خالص صورت شرک (POLYTHEISM) بت پرستی اور ہمہ پرستی (PANTHEISM) کی وجہ سے ایسی خراب ہو گئی تھی کہ وہ الحاد (ATHEISM) سے جدا نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ عام آدمیوں میں رائج اور قصہ کہانی والے مذاہب اُس مذہب سے بہت کم مشابہت رکھتے تھے جو سچّے اور صاف

توحید (GODHEAD) کے تصور سے پیدا ہوتا تھا۔ عیسائیت کا اثر اور مفہوم مسلمانوں کے لئے اس وجہ سے زائل ہو گیا کہ اس نے اپنے بڑے اور شاندار بانی کو انسان کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ خدا کی حیثیت سے جو انسان کا مجسمہ بن گیا تھا اور وہ خدا جو گوشت و پوست کی صورت میں ظاہر تھا۔ اس وجہ سے اس بات کی قطعی ضرورت پیش آئی کہ خود محمد کے پاس جو دوسروں کی طرح آدمی تھے خداوندی احکام (DIVINE WORLD'S REVELATIONS) کی وحی نازل کی جائے جو خدا کے وجود کے متعلق ہو اور اس کے متعلق ہو کہ کل عالم سے جو خدا نے پیدا کیا ہے خدا کا کیا تعلق ہے۔ انسان نے جب ایک مرتبہ اس طرح وجود کی اصلیت کو سمجھ لیا تو چونکہ وہ خود اپنی روح کی اصلی قیمت جانتا ہے اس کے لئے یہ فرض باقی رہتا ہے کہ وہ اپنے لئے ایک سیدھا راستہ لگالے جس کے ذریعہ سے اس کی روح اس عالمگیر روح کی طرف برابر ہدایت پائے گی اور اس سے مل جائے گی جس کے غیر محدود مظاہر میں سے ایک مظہر وہ کل عالم ہے جس کو ہم اپنی محدود نگاہ سے جتنا ممکن ہے دیکھتے رہیں۔ اس پر اسلام کے بنیادی اصول کی تعریف صرف اس حیثیت سے ہو سکتی ہے کہ وہ حقیقت پرستی ہے (MONOREALISM) نہ یہ کہ وہ وحدت پرستی ہے (MONOTHEISM) اسلام کی ہر دعا کے اس افتتاحی جملہ پر غور کیجئے۔ اَللّٰہُ اَکبَر۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس جملہ کا دوسرا لفظ اللہ کی خصوصیت کو (MATRIX) ایک ایسی چیز سے مشابہ کر دیتا ہے جس میں سب چیزیں شامل ہیں اور جو ہر چیز کو جو غیر محدود ہے وجود میں لاتی ہے۔ فضا کو۔ وقت کو۔ کل عالم کو۔ سب محرک اور خاموش طاقتوں کو جو خیال میں آ سکتی ہیں۔ زندگی کو اور روح کو۔ امام حسن نے خدا اور کل عالم کے متعلق اسلامی عقیدہ کو ایک تشبیہ دے کر سمجھایا ہے اور وہ تشبیہ سورج کی ہے اور اس کے عکس کی جو کسی چشمہ کے تالاب میں پڑ رہا ہو۔ تالاب میں یقینی طور پر سورج کا عکس اور اس کی تصویر موجود ہوتی ہے مگر وہ کیسی کمزور ہوتی ہے اور اس میں اصلیت کتنی کم ہوتی ہے۔ وہ مشابہت کتنی کم اور کمزور ہوتی ہے جو اس بغیر چھوٹی ہوئی تصویر میں اور اس وسیع۔ چمکدار۔ نورانی فضا کی گرم اور سفید روشنی میں ہوتی ہے۔ اللہ سورج ہے اور کل عالم جس کو ہم اس کی تمام وسعت۔ تمام وقت اور طاقت کے ساتھ جانتے ہیں اس سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں ہے کہ وہ چشمہ کے آئینہ میں اس مطلق وجود کا عکس ہے۔
(REFLECTION OF THE ABSOLUTE)

یہودیوں کے اور اسلام کے تصورِ مخلوق (IDEA OF CREATION) میں بنیادی فرق ہے۔ اسلام کے بموجب دنیا کی مخلوق اس طرح پیدا نہیں ہوئی کہ ایک وقت مقررہ میں ایک عجیب کام کر دیا گیا بلکہ وہ ایک دوامی اور مسلسل جاری رہنے والا واقعہ ہے اور خدا ہر وقت ہر وجود کو اپنے ارادہ اور اپنے خیال سے پیدا کرتا ہے اور قائم رکھتا ہے۔ اس کے ارادہ اور اُس کے خیال کے باہر کچھ بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ چیزیں بھی جو ہم کو قطعی طور پر بدیہی معلوم ہوتی ہیں مثلاً خلا اور وقت۔ اللہ صرف ارادہ کرتا ہے اور دنیا وجود میں آجاتی ہے تمام مظاہر عالم خداوندی ارادے کے گواہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کافی طور پر وہ فرق سمجھا دیا ہے جو خدا کی توحید کے متعلق اسلامی عقیدہ میں ہے اور ایک طرف تو خدا کے متعلق ان خیالات میں ہے جن کی بنیاد قدیم انجیل پر ہے اور دوسری طرف اُن ہمہ پرست اور دوگانہ خیالات میں ہے (DUALISTIC IDEA) جو ہندوستانی مذہب میں پائے جاتے ہیں اور جو دوسری طرف زردشت کے مذہب میں ہیں۔ مگر حقیقت سے آگاہ ہونے پر مطلق وجود کا (ABSOLUTE) علم ہونے پر اور یہ بات سمجھنے پر کہ کل عالم واقعات کا ایک غیر محدود سلسلہ ہے جو خدا کے ارادے کے مطابق ہے ہم کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا اخلاقی قانون ہو۔ ایسا ضابطۂ عمل ہو جو ہم کو اس قابل بنا سکے کہ ہم اس نصب العین تک ترقی کر جائیں جو خدا نے ہمارے واسطے مقرر کیا ہے۔

اب ہم کو انسان کے اُن فرائض کا مطالعہ کرنا چاہیئے جن کو مسلمانوں کی اکثریت قرآن کی آیات اور رسول کی حدیثوں کے مطابق مانتی ہے۔ سب سے پہلے خدا کے ساتھ انسان کے تعلقات سمجھنا چاہیئے۔ اسلام میں کوئی پادری یا خانقاہوں میں رہنے والے تارک الدنیا مذہبی آدمی نہیں ہیں (MONKS) گناہوں کا اقبال کر کے ان کی معافی نہیں دی جاتی سوائے اس کے کہ براہِ راست خدا کے سامنے گناہوں کی مغفرت طلب کی جائے۔

جو آدمی شادی نہیں کرتا ہے جو باپ ہونے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ جو گھر بنانے اور خاندان پیدا کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے اُس کو بہت سختی کے

ساتھ بُرا کہا جاتا ہے۔ اسلام میں انتہا درجہ کی ترک دنیا اور ترک لذات وتعلقات نہیں ہے۔ کوئی رہبانیت نہیں ہے۔ فاقہ کشی کر کے جسم کو گھلانا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جسم کو مطیع بنانے کے لئے کسی قسم کی جسمانی تکلیف پہنچانا۔ کوڑے مارنا نہیں ہے۔ اسلام کے مطابق انسان کا تندرست جسم (TEMPLE) ایسا ہے جس میں (HOLY SPIRIT) روح مقدس کا شعلہ روشن ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اس کا مستحق ہے کہ اصول کے ساتھ اُسکی صفائی کر کے اور صحت کے ذاتی اصول پر عمل کر کے اُس جسم کی عزت کی جائے۔ عبادت کرنا روزانہ کی ضروریات میں داخل ہے۔ وہ انسانی جسم کی چنگاری کا اس عالمگیر شعلہ سے براہِ راست تعلق پیدا کرتا ہے۔ ہر سال ایک مہینہ کے لئے مناسب روزہ داری کرنا بشرطیکہ انسان کی صحت اس سے کمزور نہ ہوجائے جسم کی تربیت کے لئے ایک ضروری اور بنیادی چیز ہے جس کے ذریعہ سے جسم کو یہ عادت ہوجاتی ہے کہ وہ تمام ناپاک خواہشوں کو چھوڑ سکے۔ زناکاری شراب خواری۔ غیبت کرنا۔ اپنے ہمسایہ کا بُرا چاہنا۔ ان سب باتوں کو خاص طور پر اور بہت سختی کے ساتھ بُرا کہا جاتا ہے۔ سب آدمیوں کو خواہ وہ امیر ہوں یا غریب ایک دوسرے کی مدد مادی طور سے اور ذاتی طریقہ پر ضرور کرنی چاہیئے۔ اس کے قاعدے تفصیل کے لحاظ سے مختلف ہیں مگر عام طور پر مسلم برادری میں عالمگیر باہمی امداد کے اصول کو سب تسلیم کرتے ہیں یہ برادری قلبی اور مکمل ہے اور اس میں سب رنگوں اور سب قوموں کے آدمی شامل ہیں۔ کالے۔ گورے۔ پیلے۔ گندمی رنگ کے سب آدمی اپنے جسم کے اعتبار سے حضرت آدم کے بیٹے ہیں اور وہ اپنے اندر خداوندی نور (DIVINE LIGHT) کی چنگاری رکھتے ہیں۔ ہر شخص کو جہاں تک اُس سے ممکن ہو کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ چنگاری جو اس کے اندر ہے بجھنے نہ پائے بلکہ وہ ترقی کر کے اس مکمل "آسمانی وصال" (COMPANIONSHIP-ON-HIGH) کے درجہ تک پہنچ جائے جس کا تصور رسول اسلام نے اپنے آخری الفاظ میں اپنے بستر مرگ پر ظاہر کیا تھا اور جو اُس مبارک حالت کا تصور تھا جس کو انہوں نے صاف طور پر دیکھ لیا تھا کہ اُن کو حاصل ہونے والی ہے۔ اسلام میں خداوندی عدل وانصاف پر مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور اُن کو یقین ہے کہ قسمت پرستی اور انسان کی آزادی کے ہر بڑے مسئلہ کا حل اس طرح پر

ہو جاتا ہے کہ خدا کو سب علم ہے کہ انسان کیا کرنا چاہتا ہے یا وہ کیا کرے گا مگر انسان اُس کے کرنے یا نہ کرنے کے لئے آزاد ہے۔

جنگوں کی بُرائی کی جاتی ہے۔ صلح اور امن عالمگیر ہونا چاہیئے۔ اسلام کے معنے ہیں صلح اور امن۔ گویا انسان کے ساتھ خدا کی صلح اور انسانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ صلح۔ سود خوری کو بُرا کہا جاتا ہے۔ مگر آزادی اور ایمانداری کے ساتھ ہر قسم کی تجارت اور زراعت کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ چونکہ ان سے خداوندی خدمت کا اظہار ہوتا ہے اور اُن جائز پیشوں کے جاری رکھنے اور اُن کو ترقی دینے پر انسان کی بہبودی منحصر ہے۔ سیاست کے اعتبار سے جمہوری قسم کی گورنمنٹ سب سے زیادہ مناسب اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اسلام کے ممالک میں جہاں مطلق العنان بادشاہوں کی حکومت پائی گئی ہے جن میں سب اختیارات جمع ہو گئے تھے۔ وہاں بادشاہ کا انتخاب ہمیشہ ایک بے جان چیز اور بیکار طریقہ پر دہ چکا ہے جس سے صرف طاقت غصب کرنے کو حق بجانب اور قانونی طور پر صحیح بنایا گیا ہے۔

موت کے بعد خداوندی انصاف انسان کے عقیدہ۔ اس کی عبادت اور اس کے اعمال کا جائزہ لے گا۔ جو نیک بندے ہیں اُن کے لئے دوامی زندگی اور خداوندی دیدار کی روحانی خوشی حاصل ہوگی۔ جو بُرے لوگ ہیں اُن کے لئے دوزخ ہے۔ جہاں وہ افسوس کے ساتھ جلائے جائیں گے چونکہ انہوں نے یہ معلوم نہیں کیا کہ خداوندی رحم کی برکتوں اور اُس کی بخشش حاصل کرنے کا استحقاق حاصل نہ ہو۔

اسلامی عقیدہ اور دوسرے بڑے مذہبوں سے اس بارے میں بہت آگے چلا جاتا ہے کہ وہ روح کی موجودگی کو ہر چیز میں تسلیم کرتا ہے۔ مادہ کے ہر وجود میں اپنی ابتدائی حالت میں خواہ وہ کتنا ہی کم ہو مگر پھر بھی روح موجود ضرور ہے۔ صورتوں میں، درختوں میں اور خود فضا کے اندر ہر چیز میں روح موجود ہے۔ ہر شخص۔ ہر ذرہ یا ایٹم (ATOM) خود اپنا روحانی تعلق خدا کی قادر مطلق روح کے ساتھ رکھتا ہے۔ مگر انسان مرد ہو یا عورت چونکہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اس لئے وہ اُن ہستیوں کی غیر محدود تعداد سے جن کا کام کو

علم سے بہت زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اسلام میں فرشتوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ بڑی روحیں ہیں جو انسانی روح کے سب سے اعلیٰ درجہ تک اور اس سے بھی زیادہ ترقی کر چکی ہیں اور جو اُن طاقتوں کے مرکز ہیں جو کُل عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام عیسائیوں کی حد تک تو نہیں پہنچتا ہے مگر وہ بُری روحوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ جو اپنے خفیہ اثرات کے ذریعے سے ہم کو بھلائی سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اُس سخت راستہ سے ہٹانے کی جو خدا نے سب سے چھوٹے اور سب سے بڑے آدمیوں کی جیسے ابراہیم مسیح اور محمد کی دوامی خوشی کے لئے اپنا اشارہ کر کے بتا دیا ہے۔

اب تک میں نے اسلام کے وہ اصول بیان کئے ہیں جو سب مسلمان خواہ وہ کسی فرقہ یا اُس کی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں تسلیم کرتے ہیں اور مشترکہ طور پر اُن کو مانتے ہیں۔ خیالات کی روش میں جو اختلاف پیدا ہوا ہے اب میں اُس کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ سنی لوگ سنت یا روایت (TRADITION) کے لوگ ہیں۔ اُن کا کلمہ یا اُن کے عقیدہ کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ "کوئی خدا نہیں ہے مگر صرف ایک خدا ہے اور محمد اُس خدا کے رسول ہیں" اس میں شیعہ لوگ یہ الفاظ اور شامل کرتے ہیں" اور علی جو محمد کے ساتھی تھے خدا کے نائب ہیں" (VICAR OF GOD) لفظی اعتبار سے شیعہ کے معنی یا تو چشمہ یا شاخ کے آتے ہیں یا فرقہ کے۔

رسولِ اسلام کی وفات بغیر کوئی خلیفہ یا جانشین مقرر کئے ہوئے ہو جاتی ہے شیعوں کے نظریاتی اسکول کا یہ عقیدہ ہے کہ حالانکہ رسول کی وفات پر براہِ راست خداوندی وحی بند ہوگئی مگر خداوندی ہدایت کی ضرورت بدستور باقی رہی اور یہ ہدایت اُن لاکھوں فانی انسانوں پر نہیں چھوڑی جا سکتی جو اپنے توہمات اور نفسانی خواہشات کے زور سے دبے ہوئے ہیں جو اپنی مادی ضروریات کے ماتحت ہیں اور جو فوری طور پر اور افسوس کے ساتھ اس قابل ہیں کہ لالچ۔ زد یہ تقریر یا مادی فائدہ کی فوری خواہش سے گمراہ ہو جائیں۔ یہ خطرات اس وقت بھی ظاہر تھے جو ہمارے مقدس پیغمبر کی وفات کے فوراً بعد آیا۔ محمد جیسا کہ میں نے بتایا ہے دنیوی اور روحانی دونوں قسم کے بادشاہ تھے۔ اُن کے خلیفہ یا جانشین کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان دونوں حیثیتوں سے اُن کے قائم مقام بنیں۔ ان کو "امیر المومنین" بھی ہونا تھا یعنی

"سچے مومنوں کے کمانڈر" اور "امام المسلمین" بھی ہونا تھا یعنی "معتقدین کے روحانی پیشوا" لاطینی مغربی دنیا کی ایک تشبیہ شاید اس بات کو زیادہ صاف کر دے گی۔ یعنی وہ خلیفہ "سپریم پونٹیف" (SUPREME PONTIFF) بھی ہوگا اور "ایمپریٹر" (IMPERATOR) یا دنیاوی حکمران بھی ہوگا۔

علی جو رسول کے چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ جو رسول کی اس پیاری بیٹی فاطمہ کے شوہر تھے جو رسول کے بعد زندہ رہیں۔ جو سب سے پہلے ایمان لائے۔ جو بہت سی لڑائیوں میں رسول کے بہادر ساتھی رہے۔ جن کے متعلق رسول نے اپنی زندگی میں کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے لئے ایسے ہوں گے جیسے ہارون موسیٰ کے لئے تھے۔ جو ان کے بھائی اور دست راست والے آدمی تھے۔ ان کی اولاد کی رگوں میں خود پیغمبر کا خون جاری ہونے والا تھا۔ ایسا شخص صحیح جانشین ہونے کے لئے طے کیا ہوا معلوم ہوتا تھا اور یہی اسلام کی طرف سے عام امید ہو چکی تھی اس وجہ سے شیعوں کا ہمیشہ سے یہی عقیدہ رہا ہے کہ رسول کی وفات کے بعد خداوندی اختیار ہدایت اور لیڈری نے اپنا اظہار حضرت علی کے اندر کیا جو معتقدین کے پہلے امام اور روحانی پیشوا تھے۔ سنی لوگ ان کو بہر حال چوتھا خلیفہ شمار کرتے ہیں جو دنیوی حکومت کے خلیفوں کا سلسلہ ہے اس طرح پر امام مذہبی حیثیت سے رسول کا جانشین ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کی اطاعت لازمی ہے۔ اور جو ان آدمیوں میں زندگی بسر کرتا ہے جن سے وہ روحانی اطاعت حکماً حاصل کرتا ہے سنیوں کا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ یہ حکومت صرف دنیاوی ہے اور مادی اور اس کا نفاذ صرف سیاسی حلقہ میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کا عقیدہ ہے کہ یہ حکومت ملک کے کسی سیاسی سردار کے متعلق ہو سکتی ہے جو قانوناً بنایا گیا ہو جو کہیں کا گورنر ہو یا کسی جمہوریت کا صدر ہو۔ مگر شیعہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکومت ہمہ گیر ہے اور اس کا تعلق روحانی معاملات سے بھی ہے اور یہ حکومت رسول کے خاندانی وارثوں کو موروثی حق کے ذریعہ سے منتقل کی جاتی ہے۔

یہ کس طرح واقع ہوا۔ اس بات کو مسٹر جسٹس ارنالڈ کے الفاظ بہترین طریقہ پر بیان کرتے ہیں جو ان کے اس فیصلہ میں ہیں جو بمبئی کے ہائی کورٹ میں ۱۲ نومبر ۱۸۶۶ء کو صادر کیا گیا۔ وہ فیصلہ اس بڑے مقدمہ کے متعلق تھا جو میرے دادا کے خلاف دائر کیا گیا تھا اور

جس کا ذکر میں کسی دوسری جگہ کروں گا۔ فیصلہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

"عائشہ کے اثر نے جو محمد کی جوان اور منظور نظر بیوی تھی اور جو فاطمہ اور علی کی کینہ ور دشمن تھی۔ خود اپنے باپ ابوبکر کا انتخاب حاصل کر لیا۔ ابوبکر کے بعد عمر جانشین ہوئے اور اُن کے بعد عثمان جن کی وفات پر ۶۵۵ء میں علی آخر کار خلیفہ مقرر کئے گئے۔ وہ اُس وقت بھی بغیر مخالفت کے نہیں ہوئے۔ عائشہ کی مدد سے معاویہ نے جو اُمیّہ کے خاندان سے تھے علی کے ساتھ خلافت کا جھگڑا پیدا کیا۔ اور اسی زمانہ میں جب کہ اس جھگڑے کے متعلق شبہات موجود تھے ۶۶۱ء میں علی کو ایک خارجی یا مسلم مذہبی دیوانہ نے کوفہ کی مسجد میں قتل کر دیا۔ کوفہ اُس وقت دریائے فرات کے داہنے یا مغربی کنارہ پر مسلمانوں کا خاص شہر تھا۔ وہ عرصہ سے ویرانہ پڑا ہوا تھا اور وہ بابیلون (BABYLON) کے ویرانوں سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔

مسٹر جسٹس ارنالڈ کا فیصلہ (MR. JUSTICE ARNOLD) بہت واضح اور مؤثر طریقہ پر بیان کرتا ہے کہ اِس قتل کا اثر مسلمانوں کی زندگی اور خیالات پر کیا ہوا اور اس کے بعد دوسرے قتلوں کا یعنی اپنے باپ کی موت سے نو سال اور بیس سال بعد علی کے دونوں بیٹے حسن اور حسین کے قتل ہونے کا کیا اثر ہوا۔ یہ پیغمبر کے پیارے نواسے تھے جن کو پیغمبر نے اپنی زندگی میں یہ خطاب عطا فرمایا تھا کہ "یہ بہشت کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔" اس کے بعد اُس تلخ اور افسوسناک دشمنی اور غلط فہمی کا کیا اثر ہوا جو مسلمانوں کے دو خاص فرقوں میں ترقی کر گئی اور وہ تمام غم اور جھگڑا جس نے آئندہ نسلوں کو مصیبت میں ڈالا کس طرح پیدا ہوا۔

شیعوں کی بہت سی ضمنی قسمیں ہیں۔ اُن میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ یہ روحانی سرداری یہ امامت جو حضرت علی سے متعلق تھی اُن کی چھٹی نسل میں اُن کے ذریعہ سے اسمٰعیل کو پہنچی جن کی اولاد میں ہونے اور جن سے امامت حاصل کرنے کا میں خود دعویٰ کرتا ہوں۔ دوسرے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امامت کا سلسلہ زید سے چلتا ہے جو امام حسین کے پوتے تھے اور امام حسین پیغمبر کے وہ نواسے تھے جو کربلا میں شہید ہوئے۔ ان کے علاوہ دوسرے شیعوں کا جن میں ایران کے لوگوں کی اور ہندوستان کے شیعوں کی بڑی اکثریت شامل ہے یہ عقیدہ ہے

کہ امامت کا تعلق اب ایک زندہ امام سے ہے جو علی سے دسویں نسل میں ہیں جن کی وفات کبھی نہیں ہوئی۔ جو زندہ ہیں۔ جو گذشتہ تیرہ سو سال سے ہمارے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتے ہیں مگر وہ ہم کو دیکھتے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے وہ اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ خود اسمٰعیلی لوگ دو پارٹیوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سے ایک پارٹی اُس زمانہ سے پیدا ہوئی جب میرے مورث مصر کی فاطمی خلافت کے مالک تھے۔ ایک پارٹی میرے مورث نزار کو مصر کے خلیفہ مستنصر کا جائز وارث تسلیم کرتی ہے اور دوسری پارٹی ان کے دوسرے بیٹے خلیفہ مستعلی کو امام مانتی ہے

اُس زمانہ کے بعد سے اسمٰعیلوں کی تاریخ یعنی میرے مورثوں اور مریدوں کی تاریخ بہت سی پیچیدگیوں میں ہو کر گذرتی ہے جو صدیوں تک اسلامی تاریخ کے اُتار چڑھاؤ کی کہانی رہی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ گبن (GIBON) مورخ نے ایشیائی نسل نامہ (PEDIGREE) کی تاریکیوں کو صاف کرنے کا کام خلاف امید اور ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیا۔ بہرحال ان شخصیتوں اور حالات کے حال کا مطالعہ کرنے میں بے انتہا مسرت (FASCINATION) ہے جو مختلف زمانوں تک پھیلا ہوا ہے اور جو اس زمانہ میں ہم کو تمام گذشتہ شان و شوکت۔ افسوسناک واقعات اور پُر اسرار حالات سے متعلق اور وابستہ کرتا ہے۔ میرے مورثوں کا مذہب جس کو اکثر تکلیف پہنچائی گئی اور جس کے ساتھ اکثر ظلم کیا گیا کبھی ختم نہیں کیا گیا۔ بعض اوقات وہ بہت کامیاب رہا جیسا کہ فاطمی خلفاء کے زمانہ میں بعض اوقات وہ تاریکی میں رہا اور اس کے متعلق بہت کم واقفیت رہی۔

مصر میں فاطمی خلافت ختم ہونے کے بعد میرے مورث پہلے تو شام اور لبنان سے کے (SYRIA AND LEBANON) پہاڑی علاقوں کی طرف منتقل ہوگئے۔ پھر وہاں سے وہ مشرق کی طرف ایران کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ وہاں پر انہوں نے البرز (ELBURZ) پہاڑوں کے درمیان الموت (ALMUT) کی چٹانی چوٹی پر ایک قلعہ بنالیا یہ وہ پہاڑی قطار ہے جو اُن صوبوں کو جو بحر کاسپین (CASPIAN) کے جنوب میں واقع ہیں ایران کے باقی علاقہ سے جدا کرتی ہے۔ اس موقع پر افسانہ اور تاریخ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں۔ جب اس کوہستانی پیرِ کہنہ یا شیخ الجبل (OLD MAN OF THE MOUNTAINS) کا عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے اور نظام قاتلان کے اُن موروثی آقایانِ عظیم (بانِ عماد حشاشین) کا جنہوں نے تقریباً دو سو سال تک

الموت کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ (HEREDITARY GRAND MASTERS OF THE ORDER OF THE ASSASSINS)

اس زمانہ میں اسمٰعیلی مذہب شام میں۔ عراق میں۔ عرب میں اور وسطی الشیا میں دُور دور تک کافی مشہور تھا۔ ایسے شہر جیسے سمرقند اور بخارا اُس وقت اسلامی تعلیم و اسلامی خیالات کے بڑے مرکز تھے۔ کچھ عرصہ بعد عیسائی سال کی تیرھویں صدی میں اسمٰعیلی مذہبی پروپیگنڈا وہاں تک پہنچ گیا جو آجکل سنکیانگ (SINKIANG) اور چینی ترکستان کہلاتے ہیں۔ تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں ایک ایسا زمانہ آیا تھا۔ جب اسمٰعیلی عقیدہ شیعہ نظریاتی اسکول میں سب سے زیادہ مؤثر اور خاص عقیدہ شمار کیا جاتا تھا۔ مگر اس کے بعد ایران میں صفوی حکومت (SAFFEVI DYNASTY) کے عروج پر (خاص طور پر اُس کے شمالی مغربی صوبہ آذربائی جان (AZERBAIJAN) میں) اثنا عشری یا بارھویں امام کے مذہب نے اپنی فوقیت قائم کرلی اسمٰعیلی مذہب کے اثرات پختگی کے ساتھ باقی رہے اور وہ اب بھی الشیا۔ مشرقی افریقہ اور ایران کے بہت سے حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ اسماعیلی مذہب کے تاریخی مرکز درحقیقت ساری اسلامی دنیا میں وسعت کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً شام کے پہاڑی علاقوں میں دروز لوگ (DRUZES) پائے جاتے ہیں جو جبل دروز (JEBEL DRUZE) کے اندر رہتے ہیں۔ جو دراصل اسماعیلی ہیں مگر جنہوں نے مصر سے جلا وطن ہونے کے بعد میرے خاندان کی پیروی نہیں کی بلکہ وہ میرے مورث الحاکم کی یاد مناتے رہے جو مصر کے فاطمی خلیفہ تھے اور جنہوں نے اپنے عقائد شام کے اسماعیلیوں کے طریقہ پر قائم کئے جو اس زمانہ میں میرے مرید ہیں۔ اسی قسم کے اسماعیلی "جزیرے" جنوبی مصر میں۔ یمن میں اور عراق میں موجود ہیں۔ ایران میں ان کے مرکز محلات کے چاروں طرف ہیں۔ مغرب کی طرف ہمدان اور تہران کے جنوب کی طرف ہیں۔ دوسرے مرکز شمال کی طرف خراسان میں ہیں اور مشرق میں یزد (YEZD) کے چاروں طرف اور کرمان کے چاروں طرف۔ جنوب کی طرف خلیج فارس کے کنارہ کنارہ بندر عباس سے لے کر پاکستان اور سندھ کی سرحد تک اور بلوچستان کے اندر تک پائے جاتے ہیں۔ دوسرے مرکز افغانستان میں ہیں۔ خاص کابل میں ہیں۔ بہت سے روس اور وسطی الشیا میں ہیں۔ یارقند۔ کا شغر کے چاروں طرف

اور سنکیانگ کے بہت سے دیہات اور وہاں کی آبادیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بعض ہندو قبیلے ان داعیوں (MISSION ARIES) کے ذریعہ سے جو میرے مورث شاہ اسلام شاہ نے بھیجے تھے مسلمان ہوگئے اور اُن کا نام 'خوجہ' (KHOJA) رکھا گیا۔ اسی طرح حال ہی میں اُنیسویں صدی کے اندر۔ برما میں مسلمان ہونے کا واقعہ پیش آیا۔

اب چونکہ میں اسماعیلی تاریخ کے اس مختصر بیان۔ اس کی تبدیلیاں اور اس کے جابجا انقلابات کو موجودہ دنیا کی نظر کے سامنے لے آیا ہوں۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں کچھ تفصیل کے ساتھ اپنے دادا کی زندگی اور کارناموں کا حال بیان کروں جو پہلی مرتبہ آغاخان کے نام سے مشہور ہوئے اور جو عیسائی سال کی انیسویں صدی کے شروع میں تاریخ کی روشنی کے اندر ظاہر ہوئے۔ اُن کی زندگی (جیسا کہ مسٹر جسٹس ارنالڈ نے بیان کیا ہے) مہمات سے بھری ہوئی اور قدیم افسانوں والی زندگی تھی (ADVENTERONS AND ROMANTIC) وہ کرمان کے مشہور شہر میں موروثی سردار تھے اور وہ ایران کے زبردست اور قابل بادشاہ فتح علی شاہ کے داماد تھے۔ اُن کے پاس اسماعیلیوں کی موروثی امامت کے علاوہ کافی زمینداری کی جائداد تھی۔ ۱۸۳۸ء میں اُس وقت کے حکمران شہنشاہ محمد شاہ سے وہ ایک مخالفت اور جھگڑے میں پھنس گئے جس کی بنا پر مسٹر جسٹس ارنالڈ نے مندرجہ ذیل واقعہ بیان کیا ہے:۔

"حاجی مرزا رہاسی جو محمد شاہ کے اتالیق رہ چکے تھے اپنے شاہی شاگرد کی حکومت کے تمام زمانہ میں (۱۸۳۴ء سے لے کر ۱۸۴۸ء تک) ایران کے وزیر اعظم رہے ایران کا ایک بہت ادنیٰ ذات کا آدمی جو پہلے آغاخان کی ملازمت رہ چکا تھا اس سب اختیار رکھنے والے وزیر کا خاص منظور نظر اور خوشامدی ٹھو (MINION) بن گیا تھا۔ اس آدمی نے اپنے مربی کے ذریعہ سے یہ گستاخی کرنے کی جرأت کی کہ اُس نے اپنے بیٹے کے لئے آغاخان کی ایک بیٹی سے جو مرحوم شہنشاہ کی نواسی تھی شادی کرنا چاہا۔ ایرانی مورخ کا بیان ہے کہ اس واقعہ کو آغاخان نے اپنے لئے بہت بڑی توہین محسوس کیا اور وہ درخواست جو وزیر اعظم نے بہت زور کے ساتھ پیش کی تھی بہت غصہ کے ساتھ نامنظور کر دی گئی۔

اِس طرح پر ایران کے سب سے زیادہ طاقتور آدمی کو اپنا جانی دشمن بنانے کے بعد آغاخان نے غالباً یہ محسوس کیا کہ اُن کی حفاظت کا بہترین موقعہ اسی میں تھا کہ وہ ہتھیار لے کر مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ یہ وہ طریقہ تھا جو غیر منظم ایران کے بڑے زمینداروں میں غیر رواجی نہ تھا۔ کرمان کو اپنا صدر مقام بنا کر وہ مختلف نتائج کے ساتھ ۳۹-۱۸۳۸ء کے سالوں میں اور ۱۸۴۰ء کے کچھ حصہ میں برابر لڑائی جاری رکھنے میں مصروف معلوم ہوتے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں فوج کی تعداد سے مغلوب ہو کر اُن کو مجبوراً بھاگنا پڑا اور وہ مشکل سے اپنی جان بچا کر اور چند سوار اپنے ساتھ لے کر بلوچستان کے جنگلات میں ہوتے ہوئے سندھ آ گئے۔

اپنی آوارہ گردی کے زمانہ میں جو آئندہ چند سالوں تک رہی میرے دادا نے برطانوی لوگوں کو زبردست مدد دی جو پنجاب سے مشرق اور مغرب کی طرف کو اُن کی فوجی اور شاہانہ ملکی توسیع کے سلسلہ میں تھی۔ سندھ میں میرے دادا نے ہلکے سواروں کی ایک فوج بنا کر قائم کی (ان لوگوں کی اولاد میرے لئے آئندہ سالوں میں بہت سخت تکلیف کا باعث رہی) اور جنگ افغان کے آخری مرحلوں میں ۱۸۴۱ء و ۱۸۴۲ء میں وہ اور ان کے سوار قندہار میں جنرل نوٹ کے (GENERAL NOTT) اور جنرل انگلینڈ (GENERAL ENGLAND) کے بہت کام آئے جب وہ جنرل نوٹ کے شریک ہونے کے لئے سندھ سے باہر روانہ ہوئے۔ ان خدمات کے صلہ میں اور دوسری خدمات کے صلہ میں جو انہوں نے ۱۸۴۳ء میں سندھ فتح کرنے کے لئے سر چارلس نیپیر (SIR CHARLES NAPIER) کو ادا کیں۔ میرے دادا کو برطانوی حکومت سے پنشن عطا ہوئی۔

۱۸۴۵ء میں میرے دادا بمبئی پہنچے جہاں پر جیسا کہ مسٹر جسٹس ارنالڈ نے ظاہر کیا ہے "اِس شہر اور اُس کے آس پاس کی تمام خوجہ جماعت نے اُن کا بڑے پُر خلوص احترام کے ساتھ استقبال کیا۔ ۱۸۴۶ء سے ایک یا دو سال بعد تک وہ کلکتہ میں بہ حیثیت سیاسی نظر بند کے رہے چونکہ محمد شاہ نے برطانوی حکومت سے ایسے بندرگاہ میں اُن کی موجودگی پر اعتراض و مخالفت کی تھی جیسا کہ بمبئی تھا جہاں سے کہ ایران کو بہت جلد اور آسانی کے ساتھ آمد و رفت ہو سکتی تھی۔ بہر حال ۱۸۴۸ء میں محمد شاہ کی حکومت ختم ہو گئی اور میرے دادا اطمینان سے

بمبئی میں مقیم ہوگئے اور وہاں پر درخانہ قائم کیا یعنی اپنا صدر مقام۔ یہ صرف ایک عاقلانہ اور خوشگوار ذاتی فیصلہ ہی نہ تھا بلکہ اس کا تمام اسماعیلی دنیا کی مذہبی اور قومی زندگی پر قابلِ تعریف اثر پڑا۔ اس سے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سخت تکلیف اور مجنونانہ دشمنی کا بھاری بوجھ جو اسماعیلیوں نے اتنے طویل عرصہ تک برداشت کیا تھا دور ہوگیا تھا۔ بمبئی میں ایسے دُور دراز مقامات سے وفد آتے تھے جیسے کہ کاشغر۔ بخارا۔ ایران کے تمام مقامات۔ شام۔ یمن۔ افریقہ کا ساحل اور اُس کے پیچھے والا وہ علاقہ جو اُس وقت کم کم آباد تھا۔

اُس زمانہ سے اسماعیلیوں کی طرزِ زندگی میں یا اُن طریقوں میں جن پر میرے مرید اپنے مذہب کی پیروی کرسکتے ہیں کوئی بنیادی یا سخت تبدیلی نہیں ہوئی آجکل روس سے کوئی وفد نہیں آتا ہے مگر روس اور وسطی ایشیا میں اسماعیلی لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں دی جاتی اور وہ اپنی مذہبی زندگی میں بالکل آزاد ہیں۔ وہ قدرتی طور پر نذرانہ نہیں بھیج سکتے جو صرف ایک قسم کا دکھاوے کا نذرانہ ہے (TOKEN BUTE) اور وہ کبھی اس قسم کا جرمانہ یا جبریہ تاوان (MULCTING) نہیں رہا ہے جیسا کہ اسماعیلیوں کے بعض مجنوں دشمنوں نے اُس کو ظاہر کر رکھا ہے۔

آجکل سنکیانگ۔ کاشغر اور یارقند سے ہماری کوئی آمدورفت نہیں ہے چونکہ وہاں کی سرحد بند ہے مگر یہ صرف اسماعیلوں کے خلاف ہی ایسی سخت نہیں ہے جیسی کہ ان کے علاوہ دوسرے شخصوں کے لئے ہے۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہیں اور وہ بڑے پختہ اور عقیدت مند اسماعیلی ہیں جن کے اندر خود اعتمادی بہت زیادہ ہے اور جن کے اندر یہ احساس ہے کہ وہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ اہم اسماعیلی جماعت کے آدمی ہیں۔ ایران سے نمائندے اور کمیشن آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ شام سے وہ برابر پابندی کے ساتھ ہندوستان آیا کرتے تھے مگر اب مختلف اوقات میں میرے خاندان کے افراد شام کو (SYRIA) چلے جاتے ہیں یا میرے شام کے مرید مصر میں آکر مجھ سے مل لیتے ہیں زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ میں دمشق گیا تھا (DAMASCUS) جہاں پر میرے مریدوں کی بڑی تعداد میری زیارت کرنے کے لئے آئی۔ تقریباً ان تمام مقامات میں نذرانہ کا بڑا حصہ جو امام کو دیا جاتا ہے۔ اسکولوں۔ عبادت خانوں اور مختلف مذہبی اور سوشل

اداروں کے انتظام کرنے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ مقامی ذمہ داری بڑی حد تک پھیلی ہوئی ہے۔
مثلاً شادی اور طلاق کے معاملات پوری طور پر امام کے مقامی نمائندے کے سپرد ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اسماعیلیوں کی خوشحال جماعتیں اس قسم کے حالات میں اپنے سے کمتر جماعتوں کی مدد کرتی ہیں۔ میں تمام ہدایات اور احکام جاری کرتا ہوں۔ مگر روزمرہ کا اصلی انتظامی کام جو ہر مقامی جماعت میں ہوتا ہے وہ امام کے نمائندہ اور مقامی سردار کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے یہ مقامی سردار تمام وسط ایشیا میں اکثر موروثی ہوتے ہیں۔ مگر ان کے لئے عام طور پر کوئی باضابطہ طریقہ نہیں برتا جاتا۔ کبھی بیٹا اسکا وارث ہوتا ہے کبھی پوتا۔ کبھی وہ وزیر کے خطاب سے مشہور ہوتے ہیں۔ کبھی کامدار کے خطاب سے (یہ خطاب مسلسل استعمال سے اب بگڑ کر کمریارہ گیا ہے) کبھی وہ رئیس یا راعی کہلاتا ہے۔ شام میں امام کے نمائندے امیر کہلاتے ہیں وسط ایشیا کے بعض حصوں میں جیسے کہ ہنزہ میں (HUNZA) امیر کا لفظ وہاں کی مقامی بول چال اور محاورہ میں داخل ہو گیا ہے اور مختصر کر کے 'میر' کر دیا گیا ہے۔

کسی مذہبی جماعت کی سرداری جو دنیا کی سطح پر کافی حصوں میں پھیلی ہوئی ہو (CAP TOWN) کیپ ٹاؤن سے لے کر کاشغر تک اور شام سے لے کر سنگاپور تک۔ کسی سخت اور خشک ضابطہ کے مطابق قائم نہیں کی جا سکتی۔ اخلاقی حالات۔ مادی سہولتیں قومی میلانات اور نقطہ نظر اور بہت زیادہ مختلف تاریخی پس منظر۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے اور ان کے مطابق ضروری مزاجی تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں (MENTAL ADJUSTENTS)

اس وجہ سے انتظامی معاملات میں بہت سی تبدیلی اور بہت لچک پائی جاتی ہے مشرقی افریقہ کی برطانوی۔ پرتگالی (PORTUGES) اور فرانسیسی (FRENCH) کالونیوں میں یوگنڈا میں۔ پرتگالی مشرقی افریقہ میں۔ میڈیگاسکر میں (MADA GASCAR) نیٹال میں اور کیپ کالونی میں اسماعیلی کانسلوں کا بہت ترقی یافتہ اور مہذب انتظامی نظام ہے۔ تعلیم کے منتظمین۔ جائداد کے ایجنٹ۔ ایگزیکٹیو اور جوڈیشل کونسلیں سب روزانہ انتظامی کام بے انتہا مقدار میں انجام دیتے ہیں اور میرے عام احکام کے مطابق مالیات کا وسیع انتظام بھی کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں اسی قسم کا انتظامی طریقہ موجود ہے۔ مگر وہ اتنا زیادہ

ترقی یافتہ نہیں ہے اور ڈھیلی شکل میں ہے۔ برما اور ملایا میں یہ تنظیم افریقہ کے اسماعیلیوں کی تنظیم سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ شام ایران اور پاکستان کا شمالی و مغربی سرحدی صوبہ (N.W.F.P.) سب ایسے ملک ہیں جن کی اہمیت اور جن کا تاریخی پس منظر اور قدیم روایات بہت زیادہ مشہور ہیں۔ یہ تاریخی تبدیلیاں جو صدیوں تک ہوتی رہیں بہت سی دور اور الگ رہنے والی جماعتوں تک رسائی کا ہونا یا نہ ہونا اور میرے خاندان اور میرے مریدوں کے درمیان آمد و رفت کا ترقی کرنا۔ ان سب باتوں نے اپنا اثر کیا ہے۔

وسطی ایشیا میں اسماعیلیوں کی لیڈرشپ بعض خاندانوں کے ہاتھ میں موروثی طریقہ پر چلی آتی ہے اور صدیوں سے مسلسل نسلاً بعد نسلاً چلی آئی ہے۔ یہی حال میرے مریدوں کا افغانستان روس اور چینی ترکستان میں ہے جہاں پر بعض خاندان جب سے وہ مسلمان ہوئے ہیں منتظم اور امام کے نمائندے ہوتے چلے آئے ہیں۔ مقامی لیڈرشپ ایک نسل سے دوسری نسل تک رشتہ کے قریبی تعلق کی بنا پر منتقل ہوتی ہے۔ کبھی وہاں کا موروثی سردار اور بعض مرتبہ جیسا کہ ہنزہ (HUNZA) میں ہے۔ وہاں کا دنیوی بادشاہ وہ شخص ہوتا ہے جو مذہبی برادری کا منتظم ہوتا ہے

ان تمام دور دراز پھیلی ہوئی جماعتوں سے میں جو خط و کتابت کرتا ہوں اُس پر مقامی حالات کا اثر ہوتا ہے۔ بغداد میں میرے خاص نمائندے ہیں جو عرب کے معاملات طے کرتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر اُن خاندانوں کے افراد ہیں جنہوں نے موروثی طریقہ پر غالباً اُس زمانہ سے جب سے ان کا تعلق میرے خاندان سے ہوا مقامی اسماعیلی لیڈر پیدا کئے ہیں۔ شام میں اِس قسم کے نمائندوں کا ایک ایسا خاندان ہے جس کا مسلسل تعلق میرے خاندان سے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے چلا آرہا ہے۔

اسماعیلی مذہب اب تک دنیا میں زندہ رہا چونکہ وہ رواں اور چلنے والا مذہب ہے۔ سختی اور نہ بدلنا ہمارے تمام طریق زندگی اور نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ اس میں دراصل کسی قسم کے سخت اور خشک قواعد نہیں رہے ہیں۔ قواعد کا وہ مجموعہ بھی جو مقدس قوانین (HOLY LAWS) کے نام سے مشہور ہے صرف طریق عمل کی ہدایات ہیں اور وہ اُن نتائج کے متعلق مفصل احکام نہیں ہیں جو اُن سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض ملکوں میں مثلاً

ہندوستان اورافریقہ میں اسماعیلیوں نے کاؤنسل کا طریقہ قائم کر رکھا ہے (COUNCIL SYSTEM) جس کے مطابق ان کے مقامی کاؤنسلروں پر تمام اندرونی انتظامی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ اپنے کاموں کی رپورٹ میرے پاس بھیجتے ہیں۔ شام۔ وسطی ایشیا اور ایران میں جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں لیڈرشپ موروثی لیڈروں یا سفارش کردہ لیڈروں اور سرداروں کے سپرد ہوتی ہے جو امام کے نمائندے ہوتے ہیں اور مختلف جماعتوں اور انجمنوں کے انتظام کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اسماعیلی دنیا کے سب حصوں سے جن سے مسلسل تعلق رکھنا سیاسی طور پر ممکن ہے آمد و رفت اور خط و کتابت برابر جاری رہتی ہے اور وہاں سے میرے پاس رپورٹیں آتی رہتی ہیں۔ ان سب پر توجہ کرنا۔ اُن کے جوابات دینا۔ اس دُور دراز پھیلی ہوئی مذہبی جماعت اور مذہبی انجمن کا موروثی امام ہونے کی حیثیت اُس کے فرائض انجام دینا۔ یہ میری زندگی کا کام ہے اور یہی کام اُس وقت سے چلا آرہا ہے جب میں لڑکا تھا۔

اسماعیلی کاؤنسلوں اور امام کے نمائندوں کا زیادہ کام آجکل خالص طور پر سوشل قسم کا ہے اور اس کا تعلق ایسے معاملات کے مناسب (CONTRACTUAL ARRANGEMENT) باہمی انتظام سے ہے جیسے کہ شادی اور طلاق۔ اس موضوع کے متعلق مجھے یہ کہدینا چاہئے کہ دنیا میں کسی جگہ پر جہاں اسماعیلی آجکل آباد ہیں ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جاتی اور ان کے مذہب اور رسوم کے ساتھ کوئی مداخلت نہیں کی جاتی سوائے اُن مقامات کے جہاں عام قوانین ایسی رسموں کے خلاف ہیں جیسے کہ ایک سے زیادہ بیوی رکھنا۔ اس بات کو عام طور پر بھول جاتے ہیں کہ اسماعیلیوں میں کوئی شخص دوسری بیوی نہیں رکھ سکتا اور نہ اپنی پہلی بیوی کو صرف وہم پر طلاق دے سکتا ہے نہ ایسے کمزور اور بے تکے عذر (ERRATIC PRETEXT) پر طلاق دے سکتا ہے جس کے متعلق مغرب میں غلط خیال ہے کہ ایسا ہوتا ہے ہمارے طرز خیال کے مطابق ان میں سے کسی ایک کام کے لئے بہت اچھے وجوہ عام طور پر ہوتے ہیں۔ بچوں کا پیدا کرنا ہر شادی کے لئے ایک مناسب ضرورت اور خواہش ہے۔ اگر شادی ہونے کے بہت سال بعد تک کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا تو خود بیوی اکثر یہ

خواہش رکھتی ہے کہ اپنے گھر کو بچوں کی موجودگی سے بھرا دیکھے (BRIGHTENED جس کے ساتھ وہ ساری ہنسی خوشی امیدیں اور گہرا سکون حاصل ہو جو بچوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مثالیں ایسی ہیں جن میں شوہر اور بیوی کے درمیان کیریکٹر کا ایسا گہرا فرق ہوتا ہے کہ دونوں فریق کی خوشی کے لئے طلاق ہی سب سے بہتر حل معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہر حالت میں خواہ دوسری شادی کی جائے یا طلاق دی جائے مختلف کاؤنسلوں یا (جہاں پر کاؤنسل نہ ہوں) امام کے نمائندوں کا یہ قطعی فرض ہے کہ وہ بیوی کے مفاد کی حفاظت کریں۔ اگر دوسری بیوی سے شادی کی جاتی ہے تو یہ دیکھنا ہے کہ پہلی بیوی کے لئے پورا مالی تحفظ یقینی طور پر کیا جائے یا اگر طلاق دی جاتی ہے تو یہ دیکھنا ہے کہ روپیہ کی ادائیگی فیاضانہ، پوری پوری اور مناسب طریقہ پر کی جائے۔

یہ بات بہت اہم ہے کہ غیر مسلموں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ شادی کی رسم کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر۔ اور اس کے متعلق جو کچھ ہے مثلاً طلاق۔ ایک سے زیادہ بیوی رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سب صرف ایک باہمی معاہدہ کا سوال ہے رضا مندی کا سوال ہے۔ مقررہ اور ایک دوسرے کی منظور کی ہوئی ذمہ داریوں کا سوال ہے۔ شادی کا مذہبی اور عقیدتمندانہ تصور (SACRAMENTAL CONCEPT) اسلام میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے براہِ راست طریقہ پر اُس میں مذہبی شان اور مذہبی اہمیت کا کوئی سوال نہیں ہے اور اُس کے لئے کسی مذہبی رسم کی ضرورت نہیں ہے جو اُس کو وہ سنجیدگی اور خصوصیت عطا کرے جو شادی کے ساتھ دوسرے مذہبوں میں مثلاً عیسائیت اور ہندو مذہب میں وابستہ ہیں۔ وہ بالکل اسی کے مشابہ ہے جس کو مغرب میں مکمل سول میرج (CIVIL MARRIAGE) یا دنیاوی شادی کہتے ہیں جو رجسٹری کے دفتر میں یا جج کے سامنے ہوتی ہے۔ دعائیں درحقیقت مانگی جاسکتی ہیں۔ خوشی کے لئے دعائیں، خوشحالی اور اچھی صحت کے لئے دعائیں۔ مگر ان کے علاوہ کوئی مذہبی رسم نہیں ہوسکتی اور یہ اس میں درحقیقت صرف ذاتی پسند کا معاملہ ہوتی ہیں اس وجہ سے اسلام میں یا اسماعیلیوں کے درمیان اور کسی قسم کی شادی نہیں ہے سوائے اُس

شادی کے جو باہمی رضامندی اور باہمی سمجھوتے کی شادی ہو۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ہماری تمام اسماعیلی جماعتوں میں اسماعیلی کاؤنسلوں اور امام کے نمائندوں کا زیادہ تر کام یہی ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ شادیوں کا اندراج رجسٹر میں ٹھیک طرح پر ہو گیا ہے اور یہ کہ طلاق۔ گو وہ گناہ نہیں ہے۔ اس طرح پر دی جائے کہ اس سے کسی فریق کے مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ یہ کہ عورت کے تحفظ پر اتنی توجہ دی جائے جتنی کہ ممکن ہے اور ان سب سے زیادہ چھوٹے بچوں کی پرورش کا تحفظ کرنے پر توجہ دی جائے۔

گذشتہ ستر سال میں اسماعیلیوں نے جہاں کہیں وہ آباد ہوئے ہیں مسلسل اور مستقل ترقی کی ہے سلطنت عثمانیہ کے ماتحت سلطان عبدالحمید کی حکومت میں کافی مقدار میں تکلیف پہنچائی جاتی تھی۔ اُن کی سلطنت میں دوسری اقلیت والی جماعتوں کی طرح اسماعیلیوں نے بہت مصیبت اٹھائی اور اُن کے بہت سے لیڈر اس کی مطلق العنان حکومت میں قید کے اندر رہے۔ نوجوان ترک انقلاب کے آنے پر وہ تکلیف کا زمانہ ختم ہو گیا اور اب وسیع سیاسی تبدیلیاں اور انقلابات کے باوجود جو دنیا میں ہو چکے ہیں میرا خیال ہے کہ یہ مناسب طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اسماعیلیوں کی عام حالت تمام دنیا میں اچھی خاصی قابلِ اطمینان ہے۔ جہاں کہیں وہ آباد ہیں اُن کی جماعتیں وہاں کی سوسائٹی کے خوش۔ باعزت قانون کے مطابق کام کرنے والے اور محنتی عنصر میں شامل ہیں۔

اپنے مریدوں کے ساتھ میری پالیسی کیا رہی ہے ؟۔ ہمارا مذہب اپنا مذہب ہے آپ اُس پر عقیدہ رکھئے یا نہ رکھئے۔ آپ کسی مذہب کو چھوڑ سکتے ہیں مگر آپ اُس مذہب میں رہ کر اُس کی اصلاح کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ اُس کے اصول و عقائد کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ آپ اُن اصول کو چھوڑ سکتے ہیں مگر آپ اُن کو بدلنے کی کوشش نہیں کر سکتے اور پھر بھی آپ یہی اقرار کرتے رہیں کہ آپ کا تعلق اُس خاص فرقہ سے ہے جو وہ اصول رکھتا ہے بہت سے آدمیوں نے اسماعیلی مذہب کو چھوڑ دیا ہے جیسا کہ دوسرے آدمی مختلف زمانوں میں اس میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ لاکھوں میں سے بیس آدمیوں کے قریب یعنی کراچی اور ہندوستان کا ایک چھوٹا سا طبقہ خود کو اسماعیلی ظاہر کرتا تھا اور اسماعیلی

بنتا تھا مگر وہ اپنے آپ کو "اصلاح کرنے والے" کہتے تھے۔ اس وجہ سے سچے اسماعیلیوں نے اُن کو اپنی برادری سے خارج کر دیا۔ اسماعیلی مذہب کو بدلنے کا کبھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ یہ مذہب ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے اور اس کو لازمی طور پر ایسا ہی رہنا چاہیئے جن لوگوں کا عقیدہ اُس پر نہیں رہا ہے اُنہوں نے صحیح طور پر اس کو چھوڑ دیا ہے۔ ہم کو اُن سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور ہم اُن کے خلوص اور صداقت کی عزت کرتے ہیں۔

سیاسی ہدایات کے متعلق کیا رہا ہے؟۔ میرے مورثوں کا یہ رویہ رہا ہے جس کی میں نے سختی سے پابندی کی ہے کہ اسماعیلیوں کو یہ نصیحت کی جائے کہ وہ اس حکومت کے ساتھ پوری طرح وفادار اور اس کی عقیدت مند رعایا بنے رہیں جس کے وہ شہری ہیں اُس حکومت کا نظام خواہ کچھ ہی ہو۔ خواہ وہ کسی بادشاہ کی حکومت ہو یا جمہوری حکومت ہو۔ نہ میرے مورثوں نے اور نہ میں نے کبھی اس بات کی کوشش کی کہ اپنے مریدوں پر اس طرف یا اُس طرف کوئی اثر ڈالیں بلکہ ہم نے اُن کو یہ بتایا ہے کہ کسی ملک کی باقاعدہ قائم کی ہوئی قانونی حکومت جس میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں اُن کی مکمل اور مطلق وفاداری کی لازمی طور پر مستحق ہے۔ اس طرح پر اگر کوئی حکومت مجھ سے مدد چاہتی ہے کہ میں اُس کی رعایا کو کوئی نصیحت کروں تو یہ نصیحت ہمیشہ یہی ہوتی ہے جیساکہ میرے والد اور میرے دادا کی طرف سے ہوا کرتی تھی کہ رعایا کو لازمی طور پر وفادار اور قانون کے مطابق کام کرنے والی ہونا چاہیئے۔ اگر اس کو کوئی سیاسی شکایت ہے تو اُن کو اپنی اُس حکومت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو قانوناً قائم ہے اور وفاداری اور اطاعت کے ساتھ رجوع کرنا چاہیئے۔ اِس اصول کی تکمیل کے لئے اپنے مریدوں کو میری تمام تعلیم اور ہدایت یہی رہی ہے کہ "جو چیزیں خدا کے متعلق ہیں وہ خدا کے سپرد کرو اور جو چیزیں قیصر یا دنیوی بادشاہ کے متعلق ہیں وہ اُس کے سپرد کرو"۔

سوشل اصلاحات کے معاملات میں میں نے اپنا اثر اور اختیار بہت ہوشیاری کے ساتھ ہولے ہولے استعمال کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ میرے والد اور میرے دادا کے زمانہ میں اسماعیلی لوگ کسی اور مسلمان فرقہ کے مقابلہ میں سخت پردہ ختم کرنے کے متعلق اُن ملکوں میں بھی جو بے انتہا قدامت پسند تھے

بہت آگے پہنچ گئے تھے۔ میں نے اُس کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ آجکل آپ کسی اسماعیلی عورت کو نقاب ڈالے ہوئے (WEARING THE VEIL) نہیں دیکھیں گے۔ شروع ہی سے ہر مقام پر میں نے لڑکیوں کی اسکولوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ اُن علاقوں میں بھی جہاں پر اس سے پہلے اُن کو بالکل کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے اسمٰعیلی مرید اس سوشل بہبودی کے معاملہ میں کسی اور مسلمان فرقہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ آگے ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ممکن ہے کہ بعض آدمی انفرادی حیثیت سے اُن کے برابر ترقی کر گئے ہوں مگر بہ حیثیت جماعت کے میرا یقین ہے کہ ہمارے سوشل حالات لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے تعلیم کا انتظام۔ شادی اور خانگی نقطۂ نظر اور رسوم۔ طلاق پر کنٹرول۔ طلاق ہونے پر بچوں کے لئے انتظام کرنا اور اسی طرح اور بہت سی باتیں بہت زیادہ ترقی کر گئی ہیں۔ دایہ کا کام جاری کرنے کے معاملہ میں (MIDWAIFERY) ہم سب سے آگے رہے ہیں اور مشرقِ وسطیٰ میں کسی دوسری مسلمان جماعت سے بہت پہلے ہم عورتوں کو (NURSES) بچہ پیدا کرنے کی تعلیم و تربیت دے چکے تھے۔ ہندوستان میں لیڈی ڈفرن (LADY DUFFERIN) انجمن امداد زچگان (NURSING ASSOCIATION) کی مدد اور سہارے سے میں اس قابل ہوا کہ اُس وقت جب کہ ان معاملات میں عام حالات بہت تو ہمنائی کے ساتھ صحت کے خلاف تھے۔ نہ صرف ہندوستان اور برما میں بلکہ افریقہ میں اور (جہاں تک عام حالات نے اجازت دی) شام اور عراق میں ٹرینڈ دائیوں کی مدد سے بچہ پیدا کرنے کے معاملہ میں ایک جدید نقطۂ نظر پیدا اور رائج کردوں۔

افریقہ میں جہاں پر میں اس قابل ہوا کہ عملی امداد اور نصیحت دے سکوں۔ ہم نے مختلف افراد اور مختلف جماعتوں کے روپیہ کو پوری طرح ایک محفوظ بنیاد پر جمع کر دیا ہم نے ایک انشورنس کمپنی قائم کی یعنی جوبلی انشورنس (JUBILEE INSURANCE) جس کے حصوں کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہم نے ایک اور ادارہ بھی قائم کیا جس کا نام ہم نے انویسٹمنٹ ٹرسٹ (INVESTMENT TRUST) رکھا۔ جو دراصل ایک وسیع جماعت اس کام کے لئے ہے کہ روپیہ جمع کرے اور پھر اُس کو ہلکی شرح سود پر قرض کی صورت

میں اسماعیلی تاجروں اور اُن لوگوں کو تقسیم کرے جو اپنے لئے مکانات خریدنا یا بنانا چاہتے ہیں۔

میری ذاتی دولت کے متعلق بہت کچھ خرافات لکھی جا چکی ہے (NONSENSE) امریکہ میں سینکڑوں آدمی ایسے ہیں جن کے پاس مجھ سے زیادہ سرمایہ کی دولت ہے اور یہی حالت یورپ میں ہے۔ مگر شاید امریکہ میں بھی ایسے آدمی زیادہ نہ ہوں گے جو انکم ٹیکس دینے کی وجہ سے آمدنی پر وہ کنٹرول رکھتے ہوں جو میں رکھتا ہوں مگر اس کنٹرول کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ایک غیر تحریری قانون کی صورت میں مجھے اپنے اسماعیلی مریدوں کے مختلف قومی سوشل اور مذہبی اداروں کو قائم رکھنا پڑتا ہے اور آخر میں اس آمدنی کا صرف ایک قلیل جزو اگر باقی رہا ہو۔ میرے اور میرے خاندان کے افراد کے لئے بچتا ہے۔

جب میں اُن "لاکھوں پونڈ سالانہ" آمدنی کے متعلق پڑھتا ہوں جو لوگوں کا خیال ہے کہ میرے پاس ہے تو میں صرف یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر میری آمدنی اتنی بڑی ہوتی تو مجھے اپنے اوپر شرم آتی۔ اینڈرو کارنیگی (ANDREW CARNEGIE) کے اِس مقولہ میں بہت زیادہ صداقت پائی جاتی ہے۔ "جو آدمی دولت مند مرتا ہے وہ ذلیل ہو کر مرتا ہے" میں اس میں یہ اضافہ اور کروں گا۔ "جو آدمی دولت مند کی زندگی بسر کرتا ہے وہ ذلیل آدمی کی زندگی بسر کرتا ہے" دولت مند کی زندگی سے میرا یہ مطلب ہے کہ جو آدمی اِس طرح رہتا ہے کہ اپنی خوشی کے لئے اُس ملک میں جہاں کا وہ شہری ہے۔ زندگی کے اُس پیمانہ اور اس شرح سے زیادہ خرچ کرتا ہے جو اس سے زیادہ ہے جس کا رواج آجکل اُس طبقہ میں ہے جس کو "آمدنی کا اوپر والا طبقہ" کہتے ہیں میں کمیونسٹ (COMMUNIST) نہیں ہوں۔ نہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ پرائیویٹ زندگی کا بلند معیار کوئی گناہ ہے اور سوسائٹی کے ساتھ گستاخی ہے۔ مجھ میں شرم کی کوئی جھلک محسوس نہیں ہوتی اگر میرے پاس تین یا چار موٹر کار ہوں۔ ہندوستان میں جہاں پر بہت سے آدمی باہر سے آتے جاتے رہتے ہیں میں ہمیشہ اُن کے استعمال کے لئے اس سے زیادہ موٹر کاریں رکھتا ہوں۔ نہ مجھے اِس میں شرم آتی ہے کہ میں ایک بڑے گھوڑ دوڑ کے اصطبل کا مالک ہوں

جس کے متعلق میں آئندہ باب میں کچھ ذکر کروں گا۔ گھوڑے کے شوق سے (HORSEMANSHIP) اُس کی سب شکلوں میں میرے خاندان کا ایک طویل معزز اور پرخلوص تعلق رہا ہے۔ اگر میں اس کا خیال کرتا کہ اپنے زیرتربیت گھوڑوں کی بڑی تعداد کو نہ رکھوں یا اُن کو فائدہ کے لئے تجارتی اصول پر چلاؤں تو اس میں شبہ نہیں ہے کہ میں کسی دن اپنے گھوڑوں کی کافی تعداد فروخت کرکے اُس کو ایک نفع کی تجارت میں منتقل کرسکتا تھا۔ نہ میرے دادا نے نہ میرے والد نے اور نہ میں نے کبھی اپنی گھوڑدوڑ کو صرف روپیہ کمانے کا ذریعہ شمار کیا ہے۔ بلکہ اُس کو ایک قسم کا کھیل اور تفریح سمجھا ہے جو ہوشیاری کے ساتھ توجہ دینے اور سمجھ داری کے ساتھ انتظام کرنے کے بعد ایسا ہوسکتا ہے کہ خود اپنا خرچ چلا سکے اور وہ نہ صرف ہمارے لئے بہ حیثیت مالکان کے تفریح کا مستقل ذریعہ بن جائے بلکہ اُن ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے لئے جو گھوڑدوڑ کے میدان میں ہمارے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اور ہم نے اپنے گھوڑوں کو اپنے تربیت دینے والے اصطبلوں کو اُن ملکوں کے لئے دولت کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ جہاں پر وہ قائم کئے گئے ہیں اور وہ گھوڑوں کی اچھی نسل بڑھانے اور اس کو قائم رکھنے کے لحاظ سے عملی طور پر بہت مفید ہیں۔

ہمارے خاندان کے خلاف فضول خرچی کرنے کا ایک خاص الزام اُس زمانہ میں لگایا گیا تھا جب کہ جیسا میں کسی دوسری جگہ بیان کرچکا ہوں۔ تقریبًا دو ہزار آدمی روزانہ ہمارے گھر رہتے ہیں اور ہمارے خرچ پر کھانا کھاتے تھے۔ یہ دو ہزار آدمی بہر حال اُن لوگوں کے متعلقین اور اولاد میں سے تھے جو میرے دادا کے ساتھ ایران سے جلاوطن ہوکر آئے تھے اور جنہوں نے اپنے مکانات اور اپنی جائدادیں وہیں پر چھوڑ دی تھیں۔ اُس زمانہ کے حالات کے مطابق ہم اسمٰعیلی جماعت کے سردار ہونے کی حیثیت سے اُن کی بہبودی اور اُن کے خرچ کے ذمہ دار تھے جتنی جلد مجھ سے ہوسکا اور جتنی اچھی طریقہ سے میں کرسکا میں نے اِس معاملہ کو طے کردیا یہاں تک کہ اب اُن لوگوں کی اولاد پہلے کی نسبت بہت زیادہ خوش اور اپنے آپ پر بہت زیادہ بھروسہ کرنے والی ہوگئی ہے۔ جس طریقہ پر میں نے اس معاملہ کو طے کیا اُس کے متعلق میرے ضمیر پر کوئی خلاف اثر نہیں ہے۔

اگر میرے پاس اس افسانہ والی دولت کی مقدار کا دسواں حصہ بھی ہوتا جس کے متعلق لوگوں کا کہنا ہے کہ میرے پاس ہے تو میں ایک بہت ناخوش آدمی ہوتا چونکہ اس وقت میں عمر بھر یہ محسوس کرتا رہتا کہ میں ایک بیکار اور مردہ بوجھ اپنے ساتھ لئے ہوئے پھر رہا ہوں جو میرے خاندان کے لئے۔ میرے دوستوں کے لئے اور اسی وجہ سے میرے مریدوں کے لئے یکساں طور پر بیکار ہوتا۔ ایک حد سے آگے بڑھ کر دولت اور وہ مادی فائدے جو اُس سے حاصل ہوتے ہیں سوسائیٹیوں کے لئے اور افراد کے لئے نفع کی نسبت نقصان زیادہ کرتے ہیں۔

جہاں تک میرے مریدوں کی طرزِ زندگی کا تعلق ہے میں نے کوشش کی ہے کہ اُس ملک اور حکومت کے مطابق جس میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں اُس نصیحت اور مشورہ کو بدلتا رہوں جو میں اُن کو دیتا رہتا ہوں۔ اس طرح پر مشرقی افریقہ کی برطانوی کالونی میں اُن کے لئے میرا یہ اصرار رہا ہے کہ وہ انگریزی کو اپنی پہلی زبان بنائیں۔ اپنے خاندان اور اپنی خانگی زندگی کی بنیاد انگریزی طریقوں پر رکھیں اور عام طور پر برطانوی اور یورپین رسم ورواج اختیار کریں۔ سوائے اس کے وہ شراب نہ پیئیں اور تمباکو کے بُری طرح عادی نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چونکہ اُن کو ایک ایسی سوسائٹی میں لازمی طور پر زندگی بسر کرنی ہے جو مختلف قوموں سے بنی ہوئی ہے اِس لئے اس قسم کی سوشل زندگی اور اس کی ایسی تنظیم ہونی چاہیئے جس سے ان کو زیادہ سے زیادہ موقعے اس بات کے ملیں کہ وہ اپنی شخصیتوں کو ترقی دے سکیں اور جو اُن کے لئے عملی طور پر سب سے زیادہ مفید ہے اور وہی زندگی ایسی ہے جس پر اُن کو عمل کرنا چاہیئے۔ اسکے علاوہ اُن لوگوں کو جو برما میں رہتے ہیں میں نے اسی قسم کی نصیحت اور مشورہ دیا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اُن لوگوں کو کسی اور طریق زندگی کے مقابلہ میں برما کا طریق زندگی اختیار کرنا چاہیئے مسلمان ملکوں میں مثلاً شام۔ مصر۔ عراق اور ایران میں قدرتی طور پر کسی قسم کی مشکلات نہیں ہیں خود میرے خاندان کی خانگی اور سوشل زندگی ہمیشہ سے ایرانی مسلم نمونہ پر عمل کرتی ہوئی چلی آئی ہے اور اُس میں جہاں کہیں میں رہا ہوں کسی قسم کی سخت یا بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی ہے یہاں تک کہ اُن یورپین خواتین نے جن سے میں نے یکے بعد دیگرے شادی کی ہے۔ درحقیقت نہایت آسانی

اور خوشی کے ساتھ ایرانی مسلم نقطۂ نظر اور طرز زندگی حاصل کرلیا ہے۔

افریقہ میں بہر حال میرے مریدوں کو ایک بہت زیادہ سخت مسئلہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ وہاں پر ایشیائی عادات اور ایشیائی نمونۂ زندگی لے کر آئے تھے۔ مگر اُن کو ایسی سوسائٹی سے واسطہ پڑا جو ترقی کے دور سے گذر رہی تھی اور جو اگر کچھ ہو سکتی ہے تو یورپین افریقن سوسائٹی ہی ہو سکتی ہے زبان۔ عادات اور لباس کے معاملہ میں ایشیائی نقطۂ نظر کا قائم رکھنا اُن کے لئے بہت پیچیدگی کا باعث ہوتا اور وہ آئندہ کے لئے افریقہ کی سوسائٹی میں پُرانی اور دقیانوسی باتوں کا ایک مردہ بوجھ شمار کیا جاتا (DEAD WEIBHT OF ARCHAISM) پاکستان اور موجودہ بھارت میں اسماعیلی لوگ آئندہ زمانہ میں شاید دو بالکل مختلف کلچر قبول کریں گے۔ مغربی پاکستان میں وہ غالباً اردو بولیں گے یا وہ زبان جس کو ہندوستانی کہتے تھے اور اُن کی سوشل عادات اور رسم و رواج اسی کے مطابق بن جائیں گے۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی لباس اور بنگالی زبان اسماعیلیوں کی زندگی میں زیادہ حصہ لے گی۔ بھارت میں جو زبانیں وہ بولیں گے وہ غالباً گجراتی اور مرہٹی ہوں گی اور اُن کا نقطۂ نظر اور طرز زندگی اسی طرح پر گجراتی مرہٹی شکل اختیار کرے گا تاہم مجھے یقین ہے کہ جب تک وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے اسلام کی برادری اُن مختلف سوشل نقطۂ نظر اور مختلف نمونۂ زندگی رکھنے والے لوگوں کو ایک کر کے متحد اور وابستہ رکھے گی۔

باب نمبر۳

ہندوستان میں لڑکپن کا زمانہ

سب سے پہلی چیز جو مجھے یاد ہے اسوقت واقع ہوئی جب میں ساڑھے تین سال کا بچہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بوڑھے آدمی جو تقریباً اندھے تھے ایک سفید عرب گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور دوسرے گھوڑوں کی ایک قطار کو جو سدھانے کے لئے دوڑائی جارہی تھی۔ اپنی چندھی آنکھوں سے گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ یہ واقعہ بمبئی کا تھا اور زمانہ فروری یا مارچ ۱۸۸۱ء کا تھا۔ یہ بوڑھے آدمی میرے دادا تھے۔ آغاخان۔ جن کا نام، خطاب، حقوق اور ذمہ داریاں مجھ کو ورثتاً ملنے والی تھیں۔ میں بھی ایک ٹٹو پر بیٹھا ہوا تھا جو میرے دادا کے پاس کھڑا ہوا تھا اور مجھ کو زین پر دونوں طرف سے ایک ایک آدمی پکڑے ہوئے تھا۔

میرے دادا شیعہ مسلمانوں کے اسماعیلی فرقہ کے موروثی امام اور روحانی سردار تھے جس طرح کہ میں اب ہوں اور گذشتہ تقریباً ستر سال سے رہ چکا ہوں۔ وہ ایران کے رئیس تھے اور اس زمانہ کے حکمران خاندان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ وہ اپنی طرف سے بھی اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ شاہانہ خون سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ ہمارا خاندان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ پیغمبر کی براہِ راست اولاد میں سے ہے جو اُن کی بیٹی فاطمہ اور ان کے چہیتے داماد علی سے پیدا ہوئی اور ہم مصر کے فاطمی خلفاء کی اولاد میں بھی ہیں۔

اس کتاب میں دوسرے مقام پر میں اسلام کے متعلق اپنے عام تصور کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ اس کے اصول اور اس کا طریق عمل۔ اُس طریقہ کا بیان جس پر وہ تاریخ کے اندر ترقی پاتا رہا اور خاص طور پر امامی اسماعیلیوں کا نقطۂ نظر جن کا میں روحانی سردار ہوں۔ فی الحال میں اتنا بتاتا ہوں کہ ایران صدیوں تک اسلام کی شیعہ شاخ

یا شیعہ فرقہ کا مرکز رہ چکا ہے جو سنیوں سے علیحدہ ہے۔ میرے مورث جو شروع زمانہ سے شیعہ اصول اور عمل کی اشاعت کرنے میں بہت مشہور تھے۔ عرصہ سے ایران میں آباد ہو گئے تھے۔ جہاں پر وہ اسماعیلیوں کی روحانی قیادت کرنے کے علاوہ زمینداری اور جاگیر رکھنے والے سردار بھی تھے۔

عیسائی سال کی اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی کے زمانہ میں ایران کبھی کبھی تنزل کر کے انتظامی اور سوشل برہمی و برتری کے قریب ہو جاتا تھا۔ یہ تنزل کے دور عام طور پر کسی بڑے بادشاہ کی موت کے بعد آیا کرتے تھے۔ سخت قسم کے اندرونی جھگڑے صرف بادشاہ کے ورثاء کے درمیان ہی پیدا نہ ہوتے تھے بلکہ اہم سرداروں کے درمیان بھی ہو جاتے تھے۔ ان تلخ۔ طویل اور اکثر خونریز جھگڑوں کے نتیجہ میں میرے دادا نے پہلے اپنے خاندان کے بہت سے آدمی اور اپنے متعلقین کی کافی تعداد اپنے آگے باہر بھیج دی اور پھر خود ایران سے جلاوطن ہو کر چند سال کی آوارہ گردی اور مختلف انقلابات کے بعد بمبئی اور پونا میں مقیم ہو گئے۔

میں کراچی میں ۲ر نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوا۔ مگر بمبئی اور پونا میں میرے لڑکپن اور جوانی کا سارا زمانہ صرف ہوا۔ اُس زمانہ کا بمبئی بے شمار اعتباروں سے اس وسیع۔ بارونق اور صنعتی شہر سے جو آجکل کا بمبئی ہے بے انتہا مختلف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک بڑا اور کامیاب بندرگاہ تھا بمبئی پریزیڈنسی کا دارالسلطنت تھا جو برطانوی ہندوستان کے بڑے صوبوں میں سے ایک صوبہ تھا۔ گورنر اور اس کے انتظامی عملہ کا اور ایک شاندار عدالت کا صدر مقام تھا اور فوج کی ایک اچھی خاصی تعداد کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اُس بمبئی میں اور آجکل کے بمبئی میں جو فرق ہے وہ دراصل دو لفظوں میں یعنی "برٹش انڈیا" میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی راج کا مرکز اور دارالسلطنت اُس زمانہ میں اگرچہ کلکتہ کے اندر تھا جو شمال و مشرق کی طرف سینکڑوں میل کے فاصلہ پر تھا (اور جو گرمیوں کے موسم میں شملہ کے پہاڑی قصبہ میں ہوتا تھا) مگر بمبئی کے ساتھ برطانیہ کے ایک طویل اور قریبی تعلق کی قدیم روایت چلی جاتی تھی۔ کیا چارلس دوم کی میری آف موڈینا (MARY OF MODENA) کے

جنہیں کی صورت میں بمبئی برطانوی تاج کی مقبوضات میں سب سے پہلے شامل نہیں کیا گیا تھا؟ درمیانی انیسویں صدی کا بمبئی جس میں میرے دادا مقیم ہوئے آجکل کے بمبئی سے بہت زیادہ چھوٹا اور گھنی آبادی کا شہر تھا۔ میرے خاندان کا مسکن یا مکانات موجودہ زمانہ کے بمبئی میں زیادہ تر اُن مقامات پر تھے جہاں زیادہ گھنی آبادی تھی اور جو بمبئی کے زیادہ خوش حال حصے تھے۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیان میرے بچپن کے زمانہ میں بھی وہ ایک وسیع اور پھیلا ہوا مقام تھا جو موجودہ شہر کے دو حصوں کو یعنی مزگاؤں اور بائیکلا کو گھیرے ہوئے تھا اور نسبت روڈ سے حسن آراباد تک جہاں میرے دادا کا مزار ہے پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ لندن کے مغربی گوشہ کا ایک بڑا حصہ یا نیچے والا قصبہ منہاٹن (MANHATTAN) ایک واحد احاطہ کی ہوئی ریاست بنا دی جائے۔ یا پیرس کی مثال لے کر سمجھائے تو ایسا ہوگا کہ وہ ایسا احاطہ تھا جو لمبائی میں میڈیلن (MADELEINE) سے لے کر اوپرا (OPERA) کے آگے دو تک اور چوڑائی میں میڈیلن سے لے کر پونٹ ڈی لینا (PONTD'LENA) تک پھیلا ہوا تھا۔ اس قصبہ میں بہت سے بڑے محل تھے اور بے شمار چھوٹے مکانات اور باہر کے کوارٹر۔ وہاں باغات تھے اور چشمے اور ایک چھوٹا سا جانوروں کا عجائب خانہ بھی تھا (200) وہاں پر اصطبل بھی تھے جہاں ریاست کے گھوڑوں کو رکھا جاتا تھا۔ یہ میرے دادا کے موروثی اور مستقل شوق اور محبت کا ثبوت تھا جو اُن کو گھوڑوں کے دوڑانے اور گھوڑوں کی نسل کشی کے لئے تھا۔ ان گھوڑوں کی تعداد کبھی سو سے کم نہ رہتی تھی۔

انسانوں کی آبادی قدرتی طور پر بہت زیادہ تھی اور اسکی بے شمار شاخیں تھیں جنکی تقسیم مختلف حصوں میں اور چھوٹے ٹکڑوں میں ہوئی تھی۔ وہ ایک سیاسی دھوکے بازی کے (اس لفظ کے صحیح معنے کے لحاظ سے) رہنے کا مقام تھا جس کی قدر و منزلت مسلمہ تھی۔ ایران سے جلاوطن ہونے پر میرے دادا اپنے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ آدمی لائے تھے۔ رشتہ دار۔ متعلقین۔ معتقدین۔ مصاحب۔ ذاتی اور سیاسی مددگار۔ جن میں درجہ کے اعتبار سے چھوٹے سے چھوٹا خدمت گار یا ملازم سے لے کر شاہانہ حیثیت کے آدمی تک شامل تھے۔

جو دہلی کے مشہور نادر شاہ کے براہِ راست قریبی اولاد میں سے تھے اور جنہوں نے ایران کے جھگڑوں اور فسادات میں میرے دادا کی طرف سے حصہ لیا تھا اور ان کے ساتھ جلا وطن ہو کر نکلے تھے۔

زمانہ کے گذرنے پر بہر حال یہ جلا وطنی باقی نہ رہی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ نے (جو ۱۲ نومبر ۱۸۶۶ء کو مسٹر جسٹس ارنالڈ نے صادر کیا اسماعیلی مذہب کی ابتدا، اور میرے خاندان کی شروعات کا ایک نہایت مفصل اور قابل قدر بیان موجود ہے) میرے دادا کے حقوق اور خطابات کو مستقل اور مسلمہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنے فرقہ کے مسلمہ اور باعزت لیڈر تھے۔ برطانوی راج اور ہندوستان میں اُن کے نمائندوں نے اُن کو شہزادوں کا درجہ عطا کر رکھا تھا۔ آغا ہال جو بمبئی میں ہمارا مکان تھا اُن کے رہنے کی خاص جگہ تھی مگر اُن کے پاس پونا میں ایک دوسرا محل یا محلوں کا سلسلہ بھی تھا جہاں ہم سب موسم کے اعتبار سے منتقل ہوا کرتے تھے۔ اُن کی زندگی اور اُن کی دنیا یعنی وہ زندگی اور دنیا جس کے اندر میں پیدا ہوا اس قسم کی رئیسانہ انداز کی تھیں جو آجکل کے آدمیوں سے بہت دور تھیں اور جس کو آجکل کے آدمی درحقیقت بالکل نہیں سمجھتے ہیں وہ اطاعت اور وابستگی کے ایک ڈھیلے مگر واضع طور پر سمجھے ہوئے نظام کے سردار اور مرکز تھے۔ جہاں کہیں وہ جاتے تھے اُن کا مکان گو وہ عارضی ہی ہوتا تھا۔ وفاداری اور احترام کا مرکز بن جاتا تھا جو اسماعیلی دنیا میں " درخانہ" کہلاتا ہے اور وہ ایسی زیارت گاہ ہوتی تھی جہاں پر مختلف اوقات میں اُن کے مصاحبین اور مددگاروں کی جتنی تعداد ممکن تھی جایا کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے ایک بڑے ادارے کے قیام کی ضرورت ہوئی اور اس ضرورت میں اُن واقعات نے اور اضافہ کر دیا جو میرے دادا کی ایران سے روانگی کے متعلق تھے۔ اور اُن متعلقین کی تعداد کی وجہ سے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

اُن کا خاندان، اُن کے متعلقین، اُن کے بیٹے اور اُن کی بیویاں، اُن کے اہل کار، ملازم اور پیرو بمبئی اور پونا دونوں مقامات پر اُن کے گھر کے چاروں طرف مکانات اور محلات کے ایک سلسلہ میں آباد کر دئے گئے تھے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اُن کے

بہت سے ایرانی مریدوں نے ہندوستانی بیویوں سے شادیاں کرلیں جن میں سے اکثر اسماعیلی خاندانوں سے تھیں۔ وہ اور اُن کے بچے میرے دادا کی نگرانی میں رہے جب میرے دادا کا انتقال ہوا تو جائداد کی ایک غیر سرکاری اور فوری طور پر معمولی تقسیم کرلی گئی۔ مگر مذہبی لیڈرشپ اور ذمہ داری کی کوئی تقسیم نہ ہوئی۔ اور یہ تقسیم میرے والد کے درمیان جو بہ حیثیت امام کے میرے دادا کے واحد جائز وارث تھے اور میرے مختلف چچاؤں اور پھوپھیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ مسلم قانون کے مطابق میں اپنے والد کا واحد اور یکتا وارث تھا۔ مگر میرے والد میرے دادا کے مقابلہ میں ایسے نہ تھے۔

اپنے ابتدائی بچپن ہی سے مجھے ایسی ترتیب دی گئی کہ میں اپنی وراثت اور اس کی ذمہ داریوں کی وسعت کو محسوس کروں۔ میری زندگی کے ابتدائی سال مختلف طریقوں پر مشکل بلکہ نہایت سخت تھے۔ میں ہی تنہا وارث رہ گیا تھا جو زندہ بچا تھا چونکہ میرے دو حقیقی بھائی دونوں بچپن میں مرچکے تھے اور میرے دو سوتیلے بھائی اپنی ابتدائی جوانی کے زمانہ میں گذر گئے تھے۔ میں نازک اور کمزور سمجھا جاتا تھا چونکہ متعدد انگریز ڈاکٹروں نے متفق ہو کر یہ غم آلود پیشین گوئی کردی تھی کہ میں پچیس سال کی عمر تک بھی زندہ نہ رہوں گا اس وجہ سے میری والدہ بے انتہا ہوشیاری اور خوف کے ساتھ میری نگرانی کیا کرتی تھیں۔ خدمت گار عورتیں۔ دودھ پلانے والی دائیاں اور میری والدہ کی سہیلیوں کی ایک جماعت مجھ پر بہت لاڈ کرتی تھی اور انہوں نے مجھ کو بگاڑ دیا تھا۔ اُن میں سے بہت سی عورتیں کافی عمر کی تھیں جن کی نظر میں میرا وجود ایک "چھوٹے لاڈلے شہزادہ" کی طرح تھا۔ میرے دادا کی وفات کے کچھ اوپر چار سال بعد میرے والد کی اچانک موت نے جو نمونیا کے مرض میں ہوئی میرے بچپن کے زمانہ کو غمگین اور پیچیدہ بنا دیا۔ میرے دادا کا شکار کا شوق اور تفریحی دلچسپیاں میرے والد کو پوری طرح پر وراثتاً حاصل ہوئی تھیں یہ صرف گھوڑوں کی نسل کشی اور دوڑانے کے متعلق ہی نہ تھیں بلکہ بہ حیثیت ایک نشانہ باز کے اور بہ حیثیت شیر کا شکار کرنے والے کے تھیں۔ اِس دوسری تفریح میں وہ بے انتہا ہوشیار اور بالکل بے خوف تھے چونکہ برسوں تک اُن کے شکاری کھیلے میں

ہزاروں ہرن ہی نہ پائے جاتے تھے اور ہر قسم کے شکار کا پرند بلکہ بہت سے چیتے بھی ہوتے تھے۔ شیر یا چیتے کا شکار کرنے میں اُن کی ہمّت اتنی بڑی تھی جتنی کہ اُن کی ہوشیاری۔ جب پرنس آف ویلز (جو بعد میں شاہ ایڈورڈ ہفتم ہوئے) اپنے سرکاری دورہ پر ہندوستان آئے تو میرے دادا نے آغا ہال میں اُن کی دعوت کی اور اُنہوں نے دلچسپی کے ساتھ چیتے کی بہت سی کھالوں پر جو اُن کو دکھائی گئی تھیں رائے زنی کی۔ اُنہوں نے دریافت کیا کہ یہ کھالیں میرے والد کو کس طرح حاصل ہوئیں اس موقع پر مجھے یہ بتا دینا چاہیئے کہ ہندوستان میں عام طور پر شیر کا شکار یا تو (شمالی ہندوستان میں) ایک خاص طور پر سدھائے ہوئے ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر کیا جاتا ہے یا (ہندوستان کے دوسرے حصوں میں) ایک اونچے مقام سے کیا جاتا ہے جو کسی پیڑ پر بنایا جاتا ہے اور وہ پیڑ شیر کے معلومہ یا مشتبہ جائے قیام یا جائے آمد و رفت کے قریب ہوتا ہے۔

پرنس آف ویلز نے دریافت کیا "کیا آپ درخت کے اوپر چلے جاتے ہیں؟"
پرنس آف ویلز مضبوط آدمی تھے اور اُن کو حال میں یہ افسوسناک بات بلاشبہ یاد تھی کہ وہ اس شکار میں جو بڑے شکار کی سب قسموں میں بہت زیادہ سنسنی خیز اور رئیسانہ قسم کا ہے درختوں کے اوپر مشکل کے ساتھ چڑھائے گئے تھے

میرے والد نے جن کا سینہ اتنا چوڑا نہ تھا جتنا کہ اُن کے مہمان کا تھا۔ گو وہ کافی کشادہ تھا۔ جواب دیا "نہیں۔ میں پیڑ پر کام کرنے کے لئے زیادہ موٹا ہوں۔ میں پیڑ کے اوپر نہیں چڑھ سکتا ہوں۔ میں نیچے کھڑا رہتا ہوں اور وہیں سے نشانہ لگاتا ہوں۔"
میرے والد کی موت کسی بُرے واقعہ سے نہیں ہوئی جب کہ وہ چیتے کے شکار کے لئے باہر گئے ہوئے تھے بلکہ اگست ۱۸۸۵ء میں پونا کے قریب سارے دن مرغابی کا شکار کرنے میں ہوئی۔ کئی گھنٹے تک سخت بارش ہو چکی تھی۔ پانی کے نیچے جانا بہت مشکل اور تر کرنے والا تھا اور میرے والد کے سب جسم میں پانی سرایت کر گیا۔ اُن کو سخت سردی لگ گئی جو بہت جلد ہلاک کرنے والے نمونیا کی صورت میں منتقل ہو گئی۔ آٹھ دن بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اب اندازہ ہے کہ یہ میری زندگی کا سب سے پہلا بڑا جذباتی اور روحانی صدمہ تھا۔ اُس سے وہ خاص فکر سے خالی زمانہ جو مجھے کبھی نصیب ہوا تھا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد فوراً یہ محروم اور مہربان کوشش کی گئی کہ میں اپنی والد کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کروں یا اس پر ناخوش نہ رہوں۔ مگر گہری تعزیت اور غمگینی کے بڑھنے والے احساس نے اُس آٹھ سال کے لڑکے کو جو میں اُس وقت تھا بالکل گھیر لیا۔ بہ حیثیت اُن کے وارث کے میں ایک طریقہ پر ایک بڑے نئے اور ضروری احساس ذمہ داری کا فوری مرکز بنا ہوا تھا ہمارا خاندان۔ ہمارے متعلقین جو جلاوطن ہو کر آئے تھے ساری اسلامی دنیا میں ہمارے اسماعیلی مددگار میرے والد کی موت پر بہت گہرا سوگ منا رہے تھے۔ مگر وہ سب میری طرف بھی متوجہ ہوئے۔ گو میں اُس وقت بچہ ہی تھا اور اس کے بعد میری تمام زندگی میں انہوں نے مجھے وہ مقدس کام سپرد کیا جس کے لئے میں پیدا ہوا تھا۔

میرے حالات میں جو تبدیلی ہوئی وہ بہت جلد اور بہت استقلال کے ساتھ مجھ پر واضح ہو گئی۔ میرے والد کی لاش مصالحہ لگا کر محفوظ کی گئی۔ اور اس کو پونا سے بمبئی لایا گیا۔ اور وہاں سے وہ نجف کو دفن ہونے کے لئے بھیج دی گئی جو دریائے فرات کے مغربی کنارہ پر کوفہ کے قریب اور ہمارے مورث امام علی کے مزار کے قریب واقع ہے اور جو شیعوں کے لئے دنیا کے سب سے زیادہ مقدس مقامات میں سے ہے۔ جب یہ رسمیں ختم ہو گئیں تو میرے لئے ایک نیا دورِ حکومت فوراً شروع کیا گیا۔

وہ قدرتی طور پر میرے نئے عہدہ کا براہِ راست نتیجہ تھا مگر میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ اُس برتاؤ کی وجہ سے جو میرے ساتھ کیا جاتا تھا میری موت کیوں واقع نہ ہوئی یا میں بالکل احمق بن کر کیوں نہ رہ گیا۔ ان ذمہ داریوں اور کاموں کے لئے جو مجھ کو وراثتاً ملے تھے میری تعلیم بہت اہم اور محنت والی تھی اور وہ ہمارے خاندان کے موسمی سفر کے باضابطہ نظام کے مطابق بنائی جاتی تھی۔ سردی کے موسم میں نومبر سے اپریل تک ہر سال ہم بمبئی میں رہا کرتے تھے۔ اپریل اور مئی میں ہم مہابلیشور رہتے تھے۔ جون سے اکتوبر تک ہم پونا میں رہتے تھے اور اکتوبر میں ہم کچھ عرصہ کے لئے

کسی چھوٹے پہاڑی مقام پر چلے جاتے تھے۔ اور پھر وہاں سے بمبئی واپس آجاتے تھے۔ دس سال تک ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء تک یہ نظام بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہا اور اُس میں میرے لئے کوئی چھٹی کا دن ملنے کی گنجائش نہ تھی۔ ایک مہینہ۔ پندرہ روز یا ایک ہفتہ بھی کام سے الگ رہنا۔ یا زیادہ سے زیادہ کبھی شاذ و نادر ایک دن۔ میں نہایت بے رحمی کے ساتھ برابر کام میں لگایا جاتا تھا۔

یہ میری زندگی کا مخصوص اور نہ بدلنے والا نمونہ تھا۔ میں چھ اور ساڑھے چھ بجے کے درمیان صبح کو اٹھا دیا جاتا تھا اور اپنا ناشتہ کرتا تھا۔ یعنی ہلکی چاء۔ روٹی۔ مکھن۔ جیم اور کسی قسم کی ایرانی مٹھائی۔ سات بجے خواہ میں چاہوں یا نہ چاہوں مجھے ایک گھنٹہ گھوڑے کی سواری کرنی پڑتی تھی۔ پونا کے دوڑ کے میدان میں یا گھوڑ دوڑ کے مقام پر یا بمبئی میں سمندر کے کنارہ پر مجھے گھوڑے کو کبھی ہلکا اور کبھی تیز سرپٹ دوڑانا پڑتا تھا۔ آٹھ سے ساڑھے گیارہ بجے تک میں اپنے انگریز اور فرانسیسی استادوں کے پاس پڑھتا تھا پھر میں اپنا لنچ کھاتا تھا اور دو بجے تک آزاد رہتا تھا۔ اس کے بعد مجھے تین گھنٹہ تک عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر گاڑی میں ہوا خوری کو جانا۔ یا باغ میں ٹینس کھیلنا یا اور کسی قسم کا آرام کرنا۔ ان کی اجازت شام کو سات بجے کھانے کے وقت تک مل جاتی تھی۔ کھانے کے بعد سب سے زیادہ خطرناک چیز آتی تھی۔ مجھے دو گھنٹہ تک خوش خطی کی مشق کرنے کے لئے بٹھایا جاتا تھا جو بے انتہا اُداس کرنے والی اور روح گھلانے والی ہوا کرتی تھی۔ عربی اور فارسی کے عالموں اور ملّاؤں کے مشورہ کا میری والدہ پر اثر ہوا تھا اور وہ مشورہ احمقانہ ثابت ہوا۔ اُنہوں نے اُن کو یقین دلایا تھا کہ پرانے فارسی اور عربی کے رسم خط کی مشق کرنا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور انہوں نے اُن کو یہ بھی بتایا کہ میرے دو سوتیلے بھائی جن کا انتقال ہو چکا تھا دونوں بہت اچھے خوشنویس تھے۔ میری والدہ۔ میرے چچا اور ہمارے گھر کا ہر آدمی مجھ کو اس خطرناک خوشنویسی کے لئے مجبور کرنے پر متفق ہو گیا تھا۔ یہ میرے لئے درحقیقت ایک صحیح موت تھی۔ چونکہ کسی نے اس بات کا اندازہ نہ کیا تھا کہ میں پیدائش سے ہی ایسا کم نظر تھا کہ پڑھتے یا لکھتے وقت میں کتاب یا کاغذ کو اپنی ناک سے صرف ایک

یا دو انچ کے فاصلہ پر رکھتا تھا اور ان دو انچوں سے دور والی دنیا میں میری نگاہ کے لئے کوئی مقررہ چیز نہ تھی اور اس سے مجھے کوئی خوشی نہ ہوتی تھی چونکہ ہر چیز جو میں دیکھتا تھا۔ باغات۔ پہاڑیاں سمندر یا جنگل میرے لئے دھندلی تھیں۔ میری مصیبت کی غمگینی اور اس کی سادگی کی برسوں تک کسی کو خبر نہ ہوئی اور آخر میں اس کی درستی کس طرح ہوئی اس کا ذکر میں آئندہ کروں گا۔

جو تربیت مجھ کو دی جاتی تھی وہ بہت سخت تھی۔ وہ تھوڑا سا خالی وقت جو مجھ کو ملتا تھا وہ بھی خالی نہ رہتا تھا۔ چونکہ یہ میرا فرض تھا۔ گو میں کم عمر ہی تھا کہ میں اپنے اُن مریدوں سے ملوں جو ہمارے مکان پر اپنے وفادارانہ احترام کی نذر پیش کرنے کے لئے آتے تھے سنیچر کے دن اور دعوت کے دن عام طور پر اُن ملاقاتوں کا موقعہ ملتا تھا۔ میرے مہمان باغ میں بیٹھ جاتے تھے جہاں وہ جھک کر تعظیم دیتے تھے اور تحفے لاتے تھے وہیں پر اُن کو دعائیں اور تبرکات اور اُن کے شکریہ کے جوابات دئے جاتے تھے۔ ان رسموں میں جو حصہ مجھ کو لینا پڑتا تھا وہ بہت شاندار تھا اور اس کو قدیم روایات نے مقرر کر رکھا تھا۔ مگر ایک بچہ اس واقعہ پر ناراض ہوتا تھا کہ یہ باتیں اُس تھوڑے سے خالی وقت میں کی جاتی تھیں جو اُس کے پڑھنے لکھنے سے بچتا تھا اور وہ کبھی اُس کے سبق کے وقت میں نہ کی جاتی تھیں۔

یہ وہ نظام حکومت تھا جس کے ماتحت مجھے آٹھ سال کی عمر میں کام کرنا پڑتا تھا شاید یہ مناسب ہوگا کہ میں اس موقعہ پر اس طریق زندگی کا حال بیان کروں جو میرے لئے بعد کے سالوں میں رہا۔ گو میں نے اپنے نقطۂ نظر کے بنیادی اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے مگر میری زندگی کے نمونہ میں بظاہر نمایاں ترمیمات ہو چکی ہیں جس آغاخان نے ۱۸۹۸ء میں ملکۂ وکٹوریہ کے ساتھ کھانا کھایا وہ بالکل ایسا ہی آدمی نہ تھا جس نے ۱۹۵۳ء میں ملکہ ایلزبتھ کے ساتھ چاء پی۔ مگر اس طویل زمانہ میں میں نے اپنے روزانہ معمول میں سے چند گھنٹے نظم۔ افسانہ۔ اخبارات اور ادبی و تنقیدی رسالے پڑھنے کے لئے اسی طرح بچا رکھے تھے جس طرح کہ میں اب بچا لیتا ہوں۔ یہ گذشتہ ساٹھ سال سے

میری زندگی کا مستقل پہلو رہ چکا ہے۔ اسی طرح میں نے روزانہ اپنے وقت کا کچھ حصہ جسمانی ورزش کے لئے دیا ہے۔ تقریباً پچاس سال کی عمر تک جو وقت میں جسمانی ورزش کے لئے دیتا تھا وہ مکہ بازی (BOXING)۔ سینڈو کی ورزش۔ ہندوستانی مگدر۔ دور تک ٹہلنا۔ اور اس صدی کے شروع سالوں میں فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی اور دوسرے یورپ کے ملکوں میں سائیکل پر لمبے سفر کرنا۔ ان کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ جب میری عمر پچاس سال کی ہوگئی تو مجھے ان سخت قسم کی ورزشوں کی جگہ ٹینس اور گولف کو مقرر کرنا پڑا۔ اور جب میں ساٹھ سال کا ہوگیا تو مجھے اپنے آپ کو صرف گولف اور ٹہلنے تک محدود کرنا پڑا۔ میری سوشل زندگی بھی قدرتی طور پر بدلی ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں خود زیادہ عمر کا ہوگیا ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے دنیا کے جو اقتصادی حالات تھے وہ آجکل کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ ان حلقوں میں جہاں میں اب سے چالیس سال یا اس سے زیادہ بیشتر رہتا تھا سوشل مصروفیت بہت زیادہ تھی روزانہ نہیں تو ہفتہ میں چار یا پانچ دن ضرور ڈنر پارٹیاں یا لنچ پارٹیاں ہوا کرتی تھیں جہاں کہیں مجھے رہنے کا اتفاق ہوتا تھا اور اسی طرح تھیٹر اور اوپرا کی پارٹیوں کا دور رہتا تھا۔ دو سال کے اندر زندگی کا یہ حصہ بہت کم ہوگیا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ سوشل مصروفیتیں سو میں بیس کے تناسب سے کم ہوگئیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے یہ سوشل مصروفیتیں بالکل مرجھا گئی ہیں۔ سوائے اس کے کہ میں یا میری بیوی کبھی کبھی اپنے چند دوستوں کو جہاں کہیں میرا قیام ہو لنچ یا اوپرا یا تھیٹر کے لئے مدعو کرلیں۔ وہ سوشل زمانہ جو سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی شروع ہونے کے درمیان تھا بڑا سوشل زمانہ تھا۔ میں یورپ کے شاہی خاندانوں کے بہت سے افراد کو جانتا تھا جن سے میری ملاقات بار بار ہوتی تھی اور ان رئیسوں اور عوام کے حکمرانوں کے ساتھ ہوتی تھی جو لندن یا پیرس۔ روم۔ برلن۔ مونٹے کارلو (MONTECARLO) یا کینس (CANNES) نیس یا سینٹ مورٹز (NICE or ST MORITZ) میں اس طرح رہتے تھے جس طرح بڑے سیاروں کے

چاروں طرف چھوٹے ستارے گھومتے رہتے ہیں۔ وہ سوشل زندگی اب میرے لئے ایک پچھلے زمانہ کی چیز ہوگئی ہے۔ دراصل وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہونے پر ختم ہوگئی چونکہ وہ سوسائٹی جو مجھ کو ان دو جنگوں کے درمیان ملی وہ بنیادی طور پر بہت مختلف ہوگئی تھی۔

اُس سوشل تبدیلی کا اندازہ کرانے کے لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان میں سو میں سے ننانوے موقعوں پر مہمان ہوا کرتا تھا اور صرف ایک فیصدی میزبان رہتا تھا۔ ان دو جنگوں کے درمیان یہ تناسب پچاس فیصدی رہ گیا اور پھر آہستہ آہستہ یہ کم ہوتا چلا گیا اور گذشتہ جنگ کے بعد سے میں دیکھتا ہوں کہ دس میں سے نو موقعوں پر مجھ کو ہی میزبان ہونا پڑتا ہے۔

گذشتہ تقریباً ساٹھ سال کے زمانہ میں اپنی زندگی اور اس سوسائٹی کی تبدیلیوں کا مختصر اندازہ کرنے کے بعد جس کے اندر میں رہتا ہوں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اب کس طرح رہتا ہوں۔ جب کبھی میں اپنے گھر پر کینس (CANNES) کے مقام پر اپنے بنگلہ میں رہتا ہوں۔ جب کبھی ہم اپنے مکان پر بمبئی میں ہوتے ہیں یا جب کبھی ہم لندن یا پیرس۔ بیئنس۔ جنیوا یا ایوین (EVIAN) کے ہوٹلوں میں رہتے ہیں جن میں ہر سال تقریباً آٹھ مہینے گذر جاتے ہیں۔

میرے لئے دن صبح کے چار بجے شروع ہوتا ہے جس طرح وہ میری شروع جوانی سے اب تک ہوتا رہا ہے۔ میں اُس وقت خود بہ خود جاگ اٹھتا ہوں اور پہلا گھنٹہ چار اور پانچ کے درمیان گہری عبادت میں صرف کرتا ہوں۔ میرے سونے کے کمرہ میں کوئی بُت وغیرہ نہیں رکھے ہوئے ہیں۔ ایک خاص جانماز ہمیشہ سے تیار رہتی ہے اور میری تسبیح ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ پانچ بجے میں پھر سو جاتا ہوں اور آٹھ یا نو کے درمیان جاگتا ہوں اور اس وقت فوراً ناشتہ کرتا ہوں جس میں توس چاء اور شہد ہوتا ہے مگر مکھن نہیں ہوتا ہے۔ دس بجے تک میں اخبار پڑھ چکتا ہوں اور اس وقت نہا دھو کر اور کپڑے پہن کر عام طور پر ٹہلنے کے لئے باہر چلا جاتا ہوں۔

تقریباً ایک اور دو میل کے درمیان ٹہلنا ہوتا ہے۔ یا میں گولف کے نو ہاتھ کھیل لیتا ہوں (NINE HOLES) اگر بارش ہو رہی ہو تو میں باہر نہیں جاتا ہوں۔ پھر ایک بجے دوپہر تک میں اپنے سکریٹریوں کے ساتھ کام کرتا ہوں جس میں خط وکتابت مختلف تحریریں اور مختلف کاروبار کے معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ میں کسی کام کو بغیر کئے ہوئے دوسرے دن کے لئے چھوڑ دوں اور عام طور پر میرے پاس بہت کم بقایا کام رہتا ہے۔ ایک یا ڈیڑھ بجے میں لنچ کھاتا ہوں۔ جب ہم کینس کے مقام پر ہوتے ہیں تو اپنے گھر پر لنچ کھاتے ہیں لیکن جب کسی اور جگہ ہوتے ہیں تو کسی ریسٹورنٹ میں یا دوسری جگہ کھاتے ہیں۔ شاذ و نادر ہوٹل والے ریسٹورنٹ میں کھاتے ہیں۔ لنچ دن میں میرا خاص کھانا ہوتا ہے اور اس میں یہ چیزیں ہوتی ہیں مچھلی۔ انڈا گوشت۔ مگر ان تینوں میں سے صرف ایک چیز اور یہ تینوں چیزیں کبھی ایک ساتھ جمع نہیں کی جاتی ہیں۔ چاول روزانہ پابندی کے ساتھ۔ دو قسم کی ترکاری اور پکے ہوئے پھل۔ آئس کریم یا کبھی کبھی پوڈنگ۔

جب میں پیرس یا لندن میں ہوتا ہوں تو کبھی کبھی دوپہر بعد میں گھوڑ دوڑ کی میٹنگ میں چلا جاتا ہوں یا میں ایسی مصروفیتوں میں لگ جاتا ہوں جیسے کہ میری امسلت یا میرا مطالعہ۔ پانچ یا چھ بجے شام کو چار کی ایک پیالی پیتا ہوں اور پھر سات یا آٹھ بجے تک میں عام طور پر کوشش کرتا ہوں کہ مطالعہ کروں اور نظم۔ افسانہ کی کتابیں تنقیدی مضامین کے رسالے پڑھتا ہوں اور میں صبح اور شام کے اخبارات بہت غور سے ساتھ پڑھتا ہوں۔ رات کے کھانے میں صرف تازہ پھل ہوتے ہیں۔ میں رات کے وقت کبھی کوئی پکی ہوئی چیز یا نمکین چیز نہیں کھاتا ہوں۔ اگر اچھے پھل نہ ہوں تو سلاد لے لیتا ہوں (SALAD) جب کبھی کسی موقعہ پر میں ڈنر پر مدعو ہوتا ہوں تو میں عام طور پر اپنے میزبان سے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے سلاد (SALAD) اور پھل دے دیں یا ایسی کچی ترکاری دے دیں جیسے سیلری (CELERY) ٹماٹر وغیرہ۔

میری بیوی اور میں دونوں تھیٹر اوپرا اور بیلے (BALLET) کے بہت

دلدادہ ہیں۔ لندن اور پیرس جیسے مقامات پر ہم ہفتہ میں چار پانچ مرتبہ ان میں سے کسی نہ کسی تفریح کے لئے جاتے ہیں اور عام طور پر چند دوستوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ کینس جیسے مقام پر (CANNES) ہم کبھی کبھی وہاں کے مقامی تھیٹر میں جو خاص موسم کے لحاظ سے ہوتا ہے چلے جاتے ہیں کبھی کبھی نیس کے اوپرا میں (NICE OPERA) یا مونٹے کارلو (MONTECARLO) میں یا دوسرے اسی قسم کے مقامات میں چلے جاتے ہیں۔ میں عام طور پر تھیٹر سے واپس آنے کے بعد بہت جلد سو جاتا ہوں میری زندگی میں ساری عمر کے تجربہ نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ سونا ٹہلنے کی طرح ہوتا ہے۔ آپ چار یا پانچ گھنٹہ کی نیند سے وہی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جو آٹھ یا نو گھنٹہ کی نیند سے کر سکتے ہیں۔ جس طرح بیس منٹ کی تیز رفتار سے آپ کو وہی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جو دو گھنٹہ تک گلیوں میں گھومنے اور سڑک کی دوکانوں کو دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ آپ یا تو سستی کے ساتھ سوتے ہیں یا تیزی کے ساتھ سوتے ہیں۔ میں تیزی کے ساتھ سونے پر پختہ عقیدہ رکھتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ میں جب کبھی سوتا ہوں واقعی سوتا ہوں۔ میں جب سونے کے لئے جاتا ہوں تو میرا کچھ وقت بھی ضائع نہیں ہوتا ہے۔ اگر مجھے کسی کام کے لئے جگایا جائے تو میں فوراً پھر سو جاتا ہوں اور اپنی ساری زندگی میں مجھے کبھی خواب نظر نہیں آتے میرا خیال ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ میں نے اپنی نیند کو باضابطہ بنا لیا ہے جس طرح میں نے اپنی ورزش کو باضابطہ بنا لیا ہے۔ جن لوگوں کو خواب دیکھنے کا مرض ہے ان کو اس سے کچھ اطمینان حاصل ہو سکتا ہے اور وہ اپنی جسمانی اور ذہنی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں اگر وہ اپنی عادتوں کو اس طرح سے بنالیں کہ جو کام ان کو فوراً کرنا ہے اس پر اپنی پوری توجہ لگا دیں اور سب طرف سے اپنے خیالات کو ہٹا کر اسی ایک کام پر جما دیں۔

اب میں اپنے جوانی کے زمانہ کا کچھ ذکر کرتا ہوں۔ میرے لئے تین برطانوی استاد مقرر کئے گئے تھے۔ ایک مسٹر گیلا گھر (Mr. GALLAGHER) تھے

جو آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔ ایک مسٹر لارنیس تھے (MR. LAWRENCE) اور ایک دوسرے آئرلینڈ کے رہنے والے تھے جن کا نام مسٹر کینی تھا (MR. KENNY) یہ تینوں اُستاد میرے لئے بمبئی کی جیسوائٹ (JESUIT) عیسائی جماعت نے مہیا کئے تھے۔ یہ تعجب کی بات معلوم ہوگی کہ مغربی امور میں میری تعلیم کے لئے میرے خاندان والوں نے جیسوائٹ عیسائیوں کی طرف توجہ کی۔ مگر بمبئی اور پونا دونوں مقامات پر بہت بڑے اور اہم جیسوائٹ اسکول قائم ہیں اور دونوں اس مقام سے بالکل قریب تھے جہاں ہم رہتے تھے سینٹ میری (ST MARY) کا اسکول بمبئی میں اور سینٹ ونسینٹ کا اسکول پونا میں (ST. VINCENT) ہمارے بڑے وسیع خاندان کے تمام بچے میرے دادا کے حالی موالی لوگوں کی روز افزوں اولاد۔ ان کے پنشن پانے والے ملازم ان کے رشتہ دار اور پُرانے سپاہی ۔ یہ سب کے سب ان ہی جیسوائٹ اسکولوں میں جایا کرتے تھے۔ ہمارا سارا خاندان ان جیسوائٹ کے پادریوں کو خوب جانتا تھا اور اس سے زیادہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ ان کا مشورہ اور مدد حاصل ہو جائے۔

معمولی طور پر اس بات کا کبھی کوئی اشارہ بھی نہ پایا گیا کہ اُن لوگوں نے یہ کوشش کی ہو کہ ہمارے مسلمان بچوں میں سے کسی کو اپنے مذہب میں تبدیل کریں۔ وہ اسلام کی عزت کرتے تھے اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ ظاہری طور پر دلیلوں سے یا کسی اشارہ سے یا کسی ترغیب سے انہوں نے کسی مسلمان کے مذہب کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہ اُن باتوں میں سے ہے جو کہ بچپن کے زمانہ سے مجھے بہت اچھی طرح یاد ہیں اور میں نے یہی حال موجودہ زمانہ کے مصر اور پاکستان میں دیکھا ہے۔ ایک دن چند سال گذرے میں نے اس موضوع پر ایک مشہور جیسوائٹ سے گفتگو کی جو اسپین کے رہنے والے تھے۔ اور میں نے اُن سے اِس طرح پر جرح کی :۔

"یہاں آنے اور اپنا وقت ضائع کرنے سے تم کو کون سے بھوت کی ضرورت ہے؟ اور تمہاری اس سے کیا غرض ہے؟ تم مشنری ہو اور تم کو اپنا مشنری کام کرنے کے لئے یہ سب موقعے ملے ہیں مگر تم کبھی کسی لڑکے کا مذہب بدلنے کی کوشش نہیں کرتے ہو۔ پھر تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ استادوں اور

عمارتوں پر اتنی بڑی رقمیں خرچ کرنے سے تم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟"
وہ جیسوائٹ (JESUIT) جو میرا پرانا دوست تھا اپنا منہ ایک طرف کو کرکے مسکرایا اور کہنے لگا: "کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہم کو اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے!" میں نے کہا کہ نہیں۔ پھر اُس نے اِس طرح بتایا "تم دراصل ہم کو دے رہے ہو۔ ہم ہر مسلمان اور غیر عیسائی لڑکے کو بہترین تعلیم جو ہم دے سکتے ہیں دیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں ہم اُن سے اس سے زیادہ وصول کرتے ہیں جو لوگ ہم کو دیتے ہیں ان کے لئے ہمارے اسکول کی فیسیں بہت بڑھی ہوئی ہیں مگر ہمارے کیتھولک فرقہ کے بچے اپنی تعلیم مفت پاتے ہیں۔ اس طرح پر آپ لوگ بلاواسطہ اُن بچوں کی تعلیم کا خرچ دے رہے ہیں اور ہمارے غریب بچے آپ کے خرچہ پر اول درجہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔"
جہاں تک میرا تعلق تھا وہ تین استاد جو جیسوائٹ عیسائیوں نے میرے لئے مہیا کئے سب بہترین اور اعلیٰ قسم کے آدمی تھے۔ جو تعلیم و تربیت انہوں نے مجھے دی وہ کسی صورت میں بھی تنگ اور محدود نہ تھی۔ انہوں نے میرے ذہن کو وسیع پیمانہ پر بلند کیا۔ انہوں نے میری آنکھیں بیرونی دنیا کے لئے کھولیں۔ وہ عقلمند اور کشادہ خیال کے آدمی تھے جن کے اندر ایک شوق دلانے والے علم کا مذاق موجود تھا اور ان میں اس کی اہلیت تھی کہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائیں۔ خواہ وہ سائنس کا علم ہو یا تاریخ کا یا سیاسیات کا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے میرے اندر خود مطالعہ کرنے کا شوق پیدا کیا اور اُس وقت سے جب میری عمر دس سال یا اس کے قریب تھی میں اپنی وسیع لائبریری میں جس کے اندر انگریزی۔ فرانسیسی۔ فارسی اور عربی کی کتابیں موجود تھیں بہت آزادی کے ساتھ چھان بین کرتا رہتا تھا۔ میرے تین استادوں نے مجھے علم کی کنجی دے دی تھی اور اس کے لئے میں ہمیشہ مسٹر گلاگھر (Mr. GALLAGHER) مسٹر لارینس (Mr. LAWRENCE) اور مسٹر کینی (Mr. KENNY) کا بے انتہا ممنون رہا ہوں۔
ان استادوں کے متعلق میں سوائے اچھی بات کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں مگر افسوس ہے کہ اُس آدمی کے متعلق جو میری عربی اور فارسی کی تعلیم اور تمام اسلامی امور

کی تعلیم کے ذمہ دار تھے۔ میرے پاس سوائے برائی کے اور کچھ کہنے کو نہیں ہے۔ وہ بے انتہا تعلیم یافتہ تھے۔ بڑے بھاری عالم تھے۔ عربی ادب اور اسلامی تاریخ کا بہت گہرا اور وسیع علم رکھتے تھے۔ مگر ان کی تمام تعلیم نے ان کے دماغ کو وسیع یا اُن کے دل کو گرم نہیں بنایا تھا۔ وہ متعصب فرقہ پرست تھے اور ان کے وسیع مطالعہ کے باوجود اُن کا دماغ اتنا زیادہ تاریک اور تنگ تھا جس کا مجھ کو اپنی عمر میں کبھی واسطہ پڑا ہو۔ اگر اسلام فی الواقع ایسا ہی ہوتا جیساکہ انہوں نے مجھے سکھایا تو یقینی طور پر خدا نے محمدؐ کو ساری بنی نوع انسان کے لئے ایک رحمت اور نعمت بنا کر نہیں بھیجا تھا بلکہ ایک لعنت اور مصیبت بنا کر بھیجا تھا۔

اُن کی گفتگو کو غور سے سننا بہت غمگین بنانے والا اور ایک اعتبار سے بہت خوف دلانے والا ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر آدمی میں یہ احساس پیدا کرتے تھے کہ خدا نے انسانوں کو صرف دوزخ میں ڈالنے اور دوامی عذاب میں مبتلا رکھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ اُن کا علم کتنا ہی گہرا اور معینہ کیوں نہ ہو اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان دونوں اعتباروں سے وہ بے مثل تھا مگر وہ تلخی اور نفرت میں بدل کر تباہ ہو گیا تھا۔ کچھ سال بعد وہ تہران واپس چلے گئے جہاں پر وہ اسلامی تعلیمات کے بڑے اور مشہور استاد ہو گئے اور تمام ایران میں انہوں نے سب سے زیادہ فاضل عالموں میں سے ایک عالم کی شہرت حاصل کر لی۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ وہ آخر تک اسی قسم کے متعصب رہے ہوں گے جن کو میں جانتا تھا۔

شاید میرا یہی ابتدائی تجربہ تھا جس نے میرے اندر میری بقیہ زندگی میں مذہب کے پیشہ ور آدمیوں کے خلاف ایک قسم کا تعصب پیدا کر دیا۔ خواہ وہ ملا ہوں یا مولوی۔ چھوٹے پادری ہوں یا بڑے پادری۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اُن میں سے بہت سے بڑے اچھے نمونے کے آدمی ہوتے ہیں۔ سادہ مذہبی آدمی۔ فرانس میں گاؤں کے پادری۔ اٹلی کے دیہات میں منکسر مزاج پادریوں کی جماعت۔ ساری دنیا میں شفاخانوں کے اندر عاجز نیک اور شریف خدمت کرنے والی عورتیں۔ ان سب سے میں واقف ہو چکا ہوں اور ان کی تعریف کرتا ہوں اور اُن کی قدر کرتا ہوں۔ انگلستان میں عمر بھر کو ایکر (QUAKERS)

لوگوں میں میرے بہت سے دوست رہ چکے ہیں اور ان کے ساتھ ذہنی اور روحانی اتصال کا ایک اطمینان بخش احساس میرے اندر پایا جاتا ہے چونکہ ایک دوسرے کے عقائد کے لئے ہم دونوں کا باہمی احترام۔ یعنی میرا احترام ان کے کوایکر مذہب کے لئے (QUAKERISM) اور ان کا احترام میرے اسلامی مذہب کے لئے بالکل مکمل اور قطعی ہے۔ ساری دنیا میں مسلمان عقیدہ رکھنے والوں کی اکثریت بہت فیاض اور سخی ہے۔ اور ان لوگوں کے ساتھ جو دوسرے مذہب کے ہیں بہت شریفانہ برتاؤ کرتی ہے اور مسلمان سب کے لئے خدا کی مغفرت اور رحم کی دعا کرتے ہیں۔ ایران اور عراق میں بہر حال مذہبی قانون کے عالموں کا ایک ایسا اسکول پیدا ہوا جس کا نقطۂ نظر اور مزاج جس کی عدم رواداری۔ تعصب اور روحانی زیادتی میرے پرانے اُستاد کی خصوصیات سے مشابہت رکھتی تھی۔ دنیا میں اپنے سفر کے دوران میں اِس قسم کے بہت سے آدمیوں سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ عیسائی۔ مسلمان اور یہودی جو بڑے جوش اور ظاہرداری کے ساتھ خدا کی تعریفوں کے گیت گاتے ہیں مگر پھر بھی اس کا شوق رکھتے ہیں کہ سوائے اُن لوگوں کے جو بالکل انہیں کے عقائد رکھتے ہیں اور سب آدمیوں کو دوزخ اور دوامی عذاب میں ڈال دیں۔ میں اس کا اقبال کرتا ہوں کہ میرے لئے برسوں سے اس قسم کا آدمی ایسا ہے جس سے دُور رہنے کی میں نے کوشش کی ہے۔

یہ تعجب کی بات تھی اور یہ بے محل بھی تھی کہ ایسے لڑکے کو جس کا وطن ایسا تھا اور جس کی تربیت ایسی ہوئی تھی جیسی کہ میری جوان ہو کر اس قسم کی تنگ اور رسمی اسلامی تعلیمات کا درس دلایا جائے۔ چونکہ میرا ابتدائی ماحول وسیع ترین رواداری کا ماحول تھا۔ ہمارے گھر میں کبھی ہندو یا ہندو مذہب کے خلاف کوئی تعصب نہ پایا جاتا تھا اور ہمارے بہت سے خدمت گار اور ملازم۔ ہمارے مالی۔ ہمارے ہرکارے۔ سپاہی۔ چوکیدار اور ان میں سے بہت سے آدمی جن کا کام خرید و فروخت سے بازار کے کام سے۔ اور کرایہ وصول کرنے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ سب ہندو تھے۔

اس کے علاوہ میری والدہ۔ خود مسلم روایات کے مطابق اصلی صوفی تھیں جس طرح

اُن کے بہت سے قریبی ساتھی تھے۔ وہ عادتاً اپنا بہت سا وقت عبادت میں صرف کرتی تھیں جو روحانی نور اور خدا سے قرب حاصل کرنے کے لئے ہوا کرتی تھی۔ اس قسم کی ذہنیت میں تعصب کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ بہت سے دوسرے صوفیوں کی طرح میری والدہ کے اندر ایک گہرا شاعرانہ ذوق موجود تھا۔ میں نے اُن کو تقریباً وجدانی حالت میں رومی اور حافظ کے بعض اشعار پڑھتے ہوئے سنا ہے جن کے اندر وہ اعلیٰ تشبیہات ہوتی تھیں جو انسان کے متبرک تصور باری تعالیٰ اور اس عارضی حسن کے درمیان پائی جاتی ہیں جو پھولوں کے رنگوں میں رات کے راگ اور جادومیں اور ایرانی صبح کی عارضی سج دھج میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد مجھے اپنی تاریک چکی پیسنے کے لئے اپنے اتالیق کے پاس جانا پڑتا تھا اور اُن کے منہ سے جیساکہ اُن کی عادت تھی۔ لعنت وملامت اور بُری باتیں سنتا تھا۔ چونکہ وہ تنگ ترین نقطۂ نظر کے شیعہ تھے اس لئے ان کی انتہائی خطرناک نفرت صرف غیر مسلموں تک ہی محدود نہ تھی نہ صرف اُن لوگوں تک جنہوں نے پیغمبر اسلام کو تکلیف پہنچائی بلکہ اُن کی نفرت خلفاء اور رسول کے صحابیوں تک پہنچتی تھی۔ رسول کی بیٹی اور دو نواسے۔ رسول کے داماد علی اور حضرت علی کے تقریباً چار یا پانچ قریبی ساتھیوں کے علاوہ اور سب آدمی خدا اور اس کے رسول کے دشمن تھے جنہوں نے رسول کی وفات پر لوگوں کو گھیرنے کی کوشش کی اور پھر اُن کی وفات کے بعد وحشیانہ طریقہ پر علی کو قتل کیا جو پیغمبر اسلام کے متبنٰی اور قدرتی وارث تھے علی کے بیٹوں کو جو پیغمبر کے چہیتے نواسے تھے قتل کیا۔ اس قسم کے شیعہ خیالات محرم کے مہینے میں اپنے انتہائی عروج پر پہنچ جاتے ہیں جس میں ماتم اور سوگواری اور خوفناک لعنت وملامت کی جاتی ہیں۔ اُس کی نفرت۔ عدم رواداری اور تعصب کے خلاف میرے ردِّ عمل نے میں جانتا ہوں کہ میری ساری زندگی پر اثر ڈالا ہے اور مجھے اس کا جواب اس سیدھی سادی دعا میں مل جاتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی غیر محدود رحمانیت کی وجہ سے سب مسلمانوں کے گناہ معاف کردے گا۔ خواہ وہ قاتل ہوں یا مقتول۔ اور یہ سب بہشت میں ایک آخری اور قطعی نجات حاصل کرکے ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔" میں یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ سب آدمی جو خدا پر سچا اور

پُرخلوص عقیدہ رکھتے ہیں۔ خواہ وہ عیسائی ہوں۔ یہودی ہوں۔ بدھ ہوں یا برہمن ہوں۔ جو نیک کام کرنے اور بُرے کاموں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو شریف اور مہربان ہیں۔ یہ سب بہشت میں ایک جگہ ہو جائیں گے اور اُن کو آخری معافی اور سکون عطا کیا جائے گا۔ میری خواہش ہے کہ دوسرے مذہبوں کے سب آدمی بھی مسلمانوں کے ساتھ اسی قسم کی فیاضی دکھائیں مگر ان چند معززہ اور سادہ مستثنیات کے علاوہ جن کا میں نے ذکر کیا ہے یہ وہ طرزِ عمل نہیں ہے جس کا تجربہ مجھ کو عیسائی خدا پرستوں میں ہو چکا ہے۔ اِس بات کا کہنا بہت غمناک اور سخت ہے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل سچ ہے کہ عام طور پر جس آدمی کا رتبہ مختلف گرجا گھروں میں جتنا زیادہ بلند ہو گا اس کا رویّہ مسلمانوں کے ساتھ اور اسلام کے متعلق اتنا ہی زیادہ سخت اور کم مہربان ہو گا۔

وہ گھر جس میں میری پرورش ہوئی آپ دیکھتے ہیں کہ علمی ذوق رکھنے والا گھر تھا میں اپنی والدہ کے شاعرانہ مذاق کا حوالہ دے چکا ہوں۔ وہ فارسی اور عربی ادب کی بڑی گہری معلومات رکھتی تھیں جس طرح پر بعض اُن کی سہیلیاں تھیں اور وہ عورتیں جن سے اُن کے قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ میری والدہ کو بہت سے اشعار حفظ یاد تھے اور اُن میں یہ ملکہ تھا کہ مناسب موقعہ پر پُرانے استادوں کا کلام سنا دیا کریں۔ یہ ایسا ملکہ تھا جس کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی ساری طویل زندگی میں باقی رہا۔

جب اُن کی عمر تقریباً نوّے سال کی تھی اس وقت بھی اُن کو اِس میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی کہ موقعہ پر صحیح اور مناسب اشعار پڑھ دیں اور وہ اشعار صرف ایسے بڑے شاعروں کے ہی نہ ہوتے تھے جیسے کہ حافظ فردوسی یا رومی بلکہ بہت سے چھوٹے اور غیر معروف شاعروں کے بھی ہوتے تھے۔

ایک چھوٹا سا واقعہ اس کی مثال کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اُن کی موت سے کچھ عرصہ قبل میرے ایک رشتہ کے بھائی نے ایک رات کو کھانے کے وقت فارسی کا ایک شعر پڑھا جو بہت کم سننے میں آتا ہے۔ اس خیال سے کہ میری والدہ اس سے پریشان نہ ہوں یا اس کے متعلق کچھ فکر کریں۔ میں نے کہا کہ وہ شعر حافظ کا ہے۔ اس پر میری والدہ

نے فوراً کہا کہ ہرگز نہیں۔ یہ شعر حافظ کا نہیں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس شعر کا پتہ دیا اور اُس تقریباً گمنام شاعر کا نام بتایا جس نے وہ شعر کہا تھا۔

اِس خصوصیت کا نتیجہ یہ تھا کہ کھانے کے وقت میری والدہ کی میز پر بیکار گپ بازی یا فضول باتوں کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ ہماری گفتگو علم ادب اور شاعری پر ہوا کرتی تھی۔ یا ایسا ہوتا تھا کہ کوئی زیادہ عمر والی خاتون جو تہران کا کافی سفر کر چکی تھی یا تہران سے آئی تھی بادشاہ ایران کے دربار میں اپنے تجربات کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔

(ان واقعات سے) میرے لڑکپن کے اس پہلو پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ کیا میں خوش رہتا تھا یا ناخوش رہتا تھا؟ میں اِس اعتبار سے تنہا تھا کہ میرے پاس میری عمر کا کوئی ساتھی نہ تھا سوائے میرے چچیتے رشتہ کے بھائی آغا شمس الدین اور اُن کے بھائی عباس کے۔ جن کی عمر اور نقطۂ نظر ایک سا تھا اور جو میری جوانی کے سب سے زیادہ گہرے اور قریب دوست تھے۔ مگر مجھے اتنی کم چھٹیاں ملتی تھیں اور میرے پاس اتنا کم خالی وقت تھا کہ دوستوں کی جماعت کے ساتھ میں کیا کر سکتا تھا؟۔ ایک واقعہ بے حد وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں بہت محنت کرتا تھا اس سے بہت زیادہ سخت محنت جو بہت سے نو عمر اسکول کے لڑکے کرتے ہیں۔

جب میری عمر تیرہ سال کی تھی میں انگریزی۔ معمولی فرانسیسی۔ مکمل فارسی اور اچھی خاصی عربی پڑھ سکتا تھا اور لکھ سکتا تھا۔ رومن تاریخ (ROMAN) اور اسلامی تاریخ کا صحیح علم رکھتا تھا۔ سائنس کے کم از کم مبادیات سے مجھے اچھی واقفیت تھی یعنی کیمسٹری اور فزکس۔ بوٹنی۔ بایولوجی اور زوالوجی کے مبادیات سے۔ (علم کیمیا۔ طبیعیات۔ علم نباتات علم حیات اور علم حیوانات) ہمارے ہر ایک گھر میں ایک لائبریری ہوا کرتی تھی اور روزانہ مقررہ وقت پر مجھے لائبریری میں عملی اور تجرباتی کام کرنا پڑتا تھا۔

جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں میرے اندر بہت کم عمر میں مطالعہ کا ایسا ذوق پیدا ہو گیا تھا جس کو پوری تسکین نہ ہوتی تھی۔ وہ اس وقت سے تیزی کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔ جب میری عمر دس سال یا اس کے قریب تھی اور جب بہر حال عارضی طور پر میں اپنی لائبریری کی چیزوں کا

اندازہ لگا چکا تو میں نے دوسری جگہ دیکھنا شروع کیا۔ میں اپنے لئے کتابیں خریدنا چاہتا تھا مگر اس کے لئے ایک چھوٹی سی رکاوٹ تھی۔ وہ یہ کہ میری والدہ مجھے کوئی جیب خرچ نہ دیتی تھیں۔ میں نے اور میرے رشتہ کے بھائی نے اپنے لئے اس مشکل کو دور کرنے کا ایک شاندار طریقہ نکالا۔ ہم میں سے ہر ایک نے ایک عبا پہنی (وہ ایک وسیع اور سب بدن ڈھکنے والا لبادہ ہوتا ہے جو اب بھی اور پہلے بھی ایران اور عرب ملکوں میں عام طور سے لباس کی طرح استعمال کیا جاتا ہے) اس طرح لباس پہن کر ہم بمبئی کی ایک مشہور کتابوں کی دوکان پر گئے ہم میں سے ایک نے دوکاندار کو دلچسپ گفتگو میں مصروف کرلیا اور دوسرے نے کچھ کتابیں اپنی عبا کے لپیٹوں میں چپکے سے کھسکا لیں۔ ہماری یہ چھوٹی سی ترکیب بہت جلد ظاہر ہوگئی اور دوکان کے مالک نے میرے چچا اور میری والدہ سے اس کا ذکر کیا۔ قدرتی طور پر ہمارا بل فوراً ادا کر دیا گیا مگر ہمارے خاندان نے یہ طے کیا کہ ہم کو اس واقعہ سے کچھ سبق سکھانا چاہئے۔ ہم سے کوئی بات نہ کہی گئی اور ہم نے بدستور اپنا چھوٹا سا شرارت کا کھیل جاری رکھا۔ ہم ایک دن اسی کھیل میں مصروف تھے کہ میرے چچا دوکان کے اندر داخل ہوگئے۔ انہوں نے سختی سے حکم دیا" اپنی عبا اتارو"۔ جب ہم نے ایسا کیا تو وہ کتابیں جو ہم نے چرا رکھی تھیں فرش پر گر پڑیں۔ ہماری شرم اور ہماری روحانی تکلیف فوراً مکمل طریقہ پر ظاہر تھیں۔ اس دن سے آج تک مجھے خیال ہے کہ میں نے اتنا بھی نہیں کیا کہ ایک پھول بھی کسی دوسرے کے باغ سے بغیر اس کی اجازت کے توڑ لوں۔

میں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ مگر وہ مسروقہ کتابوں کے ساتھ نہ تھا۔ اس کے ایک یا دو سال بعد میرا مطالعہ اور درحقیقت زندگی کے متعلق میرا تمام نقطۂ نظر ایک مختصر اور عاقلانہ فیصلہ کی وجہ سے بہت گہرے اور مستقل طریقہ پر تبدیل ہوگئے۔ وہ چیز جو اس وقت تک تکلیف اور مصیبت بنی ہوئی تھی میرے لئے خوشی اور فرحت بن گئی۔ میری تندرستی فوراً بہتر ہوگئی اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ سالوں کی زیادہ تکلیف اور بدقسمتی سے مجھے نجات مل گئی۔ مسٹر کینی (KENNY) جو میرے یورپین استادوں میں سے تیسرے اور سب سے آخری استاد تھے کسی زمانہ میں چشمہ فروشوں کی ایک فرم پر ملازم رہ چکے تھے۔ جب انہوں نے مجھے کام کرتے

ہوئے دیکھا اُن کو اندازہ ہوگیا کہ وہ تکلیف کتنی سخت اور خطرناک تھی جو مجھ کو روزانہ اور ہر گھنٹہ برداشت کرنی پڑتی تھی۔ یہ تکلیف میری پیدائشی کم نظری کی وجہ سے تھی اور ان معاملات پر اُن لوگوں کی غفلت کی وجہ سے تھی جو میرے چاروں طرف رہتے تھے۔

اس واقعہ کو اب یاد کرنا بہت عجیب اور غمناک مسٹر کینی (KENNY) کے آنے سے پہلے کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اپنے گھر والے کا یا اپنے دوستوں میں سے کسی کا چشمہ جو مجھے کسی جگہ پڑا ہوا مل جاتا تھا اُس کو میں کھیل کے طور سے اُٹھا کر اپنی آنکھوں پر لگالیتا تھا۔ جونہی میں اُس کو لگاتا تھا مجھے ایک نئی اور دل خوش کُن دنیا کی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ ایسی دنیا جس میں آدمیوں کی مختلف اور متفرقہ شکلیں۔ سبز درخت اور سبز رنگ کے پھول۔ تیز اور عمدہ روشنی موجود تھی۔ بجائے اس کے کہ مستقل طور پر ایسا دُھندلا پن اور کہر ہو جس میں دنیا کی چیزیں کناروں پر سے مٹی ہوئی نظر آئیں۔ چونکہ یہی وہ سب کچھ تھا جو ایک انتہائی کم نظر لڑکا دیکھ سکتا تھا۔ مگر وہ خوشی کے چند منٹ بہت کم وقت ہوتے تھے اور در اصل وہ میرے لئے ممنوع تھے چونکہ ملازموں کو حکم تھا کہ وہ عینک کو مجھ سے الگ رکھیں۔ اسلئے کہ میرے خاندان والوں کو اس کا یقین نہ تھا کہ کوئی بچہ بھی کم نظر ہوسکتا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ میں تفریحاً ایسا کرتا تھا اور یہ میری حماقت تھی۔ مسٹر کینی (KENNY) نے فوراً میری موجودہ مصیبت کا اور میرے مستقبل کے لئے جو اس کے نتائج تھے اس کا اندازہ کرلیا انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے چشمہ فروشوں کی اُس فرم پر لے جائیں جہاں وہ ملازم رہ چکے تھے۔ انہوں نے میری آنکھوں کا معائنہ کرایا اور میرے لئے مناسب چشمہ تیار کرادیا۔ جو دونوں کاموں کے لئے یعنی پڑھنے اور دور سے دیکھنے کے لئے تھا میرے چچا نے اس پر دخل دینے کی کوشش کی مگر مسٹر کینی بہت سخت بنے رہے ان کے ساتھ ان کا مغربی اثر اور وقار موجود تھا اور اسی وجہ سے ان کو کامیابی ہوئی۔ اس معقول اور مہربانی کے کام نے مجھے بیحد تکلیف اور کوفت سے نجات دلائی اور مجھے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا دے دی۔

وہ کس قسم کی دنیا تھی جس کو دیکھنے کے لئے میری لڑکپن کی آنکھیں اس طرح پر کھلی تھیں؟ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ میں موروثی طور پر

اسلامی دنیا کی ایک معقول تعداد والی بے انتہا مختلف اور دور دور رہنے والی جماعت کا لیڈر اور روحانی سردار تھا۔ جونہی میں اس کے قابل ہوا مجھے ذمہ داری سنبھالنی پڑی اور فیصلے دینے پڑے۔ میں ۱۸۸۵ء میں امامت کی گدی پر بٹھایا جب میری عمر آٹھ سال کی تھی۔ اس رسم کا ایک فوٹو موجود ہے جو گذرے ہوئے زمانہ کی یاد کو اچھی طرح تازہ کرتا ہے کچھ سال بعد میں نے دیکھا کہ بمبئی کے اندر ایک خاص اہمیت والے معاملہ میں اپنا اثر اور اختیار استعمال کر رہا تھا وہ معاملہ ایسا تھا جس کو ہم آجکل حفاظت کی تدبیر کہتے ہیں ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ کے شروع سالوں میں بمبئی میں ایک وحشیانہ فرقہ وارانہ مادہ ہو گیا تھا میں نے اپنے مریدوں کو سخت احکام جاری کئے کہ وہ اس فساد میں کوئی حصہ نہ لیں میرے حکم کا نتیجہ یہی نہ ہوا کہ وہ اس شرکت سے رُک گئے بلکہ یہ ہوا کہ اُس سے بمبئی کے اندر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان امن کو دوبارہ قائم کرنے اور غصہ کو کم کرنے میں بہت مدد ملی۔ میرے اس پہلے آزاد سیاسی کام نے بمبئی میں گورنر اور کمشنر پولیس کا شکریہ حاصل کیا۔ اور گو میں اُس وقت بھی لڑکا ہی تھا مگر اس کام کی وجہ سے ایسا ہوا کہ سب فرقوں کے سیاسی لیڈر میری عزت کرنے لگے۔

اس زمانہ میں میرے خاندان کے آدمی۔ میرے مرید۔ مددگار۔ رشتہ دار اور متعلقین بمبئی کی آبادی میں ایک اہم عنصر شمار ہوتے تھے اور (جیسا کہ میں عنقریب بیان کروں گا) اُنہوں نے اپنے لئے خود ایک حفاظت کا مسئلہ پیدا کر لیا تھا۔ میرے دادا کو اس کا احساس تھا کہ وہ ایران سے جلا وطن ہو کر آئے ہیں اور شاید اس کا بھی اُن کو احساس تھا کہ بمبئی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد اُن کی زندگی کا بڑا حصہ جو مہم پسند اور پُر جوش تھا ختم ہو گیا تھا اس وجہ سے انہوں نے ہندوستان کی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لیا۔

میرے والد نے سر جیمس فرگوسن (SIR JAMS FERGUSON) کی گورنری کے زمانہ میں بمبئی کی لیجسلیٹو کاؤنسل کی ممبری قبول کر لی تھی۔ میرے جوان ہونے پر میری سیاسی دلچسپیاں اور خیالات مجھے بہت دور لے جانے والے تھے مگر وہ میدان جس میں ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیانی آخری سالوں میں اور ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی ابتدائی سالوں

میں میری تربیت ہو رہی تھی ایسا تھا جس کے سیاسی۔ انتظامی۔ تمدنی اور اقتصادی مسائل اور پریشان کن حالات بذات خود موجود تھے۔

میرے دادا پونا اور بمبئی دونوں مقامات پر اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ بڑی حد تک علیحدہ اور یک سوئی کی زندگی بسر کریں جو اپنے طرز اور نمونہ کے اعتبار سے قدیم زمانہ والی زندگی تھی اور جس کے مطابق زندگی بسر کرنا عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایران سے اُس زمانہ کے ایرانی رئیسوں کی تفریحات کا سامان لائے تھے اور اُن تفریحات کا انتظام کرنے کے لئے وہ شاندار اور رئیسانہ طریقہ بھی لائے تھے۔ میدان کے کھیل اور تفریحات اس سوسائٹی میں جس کے اندر اُن کی زندگی گذری بڑی شوق کی چیزیں تھیں۔ گھوڑ دوڑ کے اصطبل بہت فضول خرچی کے ساتھ قائم کئے جاتے تھے۔ شکاری کتوں کا جھنڈ پالا جاتا تھا اور اُن بہترین شکاری بازوں کی مسلسل تلاش رہتی تھی جو ایران اور عراق میں پائے جاتے تھے۔ یہ تمام دلچسپیاں وہ اپنے ساتھ جلا وطنی کی حالت میں لائے اور اپنے پیروی کرنے والوں کا ایک بڑا مجمع۔ جو ان سب باتوں سے متفق تھا اُن کے ساتھ آیا۔ جب وہ بمبئی میں مقیم ہو گئے تو انہوں نے گھوڑے خریدے اور اُن کو دوڑانا شروع کیا۔ عرب گھوڑے۔ انگلش گھوڑے آسٹریلیا کے اور ترکمان کے گھوڑے بھی۔ انہوں نے شکاری باز اور شکاری کتے از سر نو جمع کئے۔ اُن کی زندگی کا نمونہ ان تفریحات کے چاروں طرف قائم ہو گیا تھا۔ اُن کا دن صبح کے چھ بجے سے شروع ہو جاتا تھا۔ جو یا تو ہرن کے شکار کے ساتھ شروع ہوتا تھا یا پرندوں کے پیچھے شروع ہوتا تھا یا گھوڑ دوڑ کے موسم میں وہ اس سدھانے کے میدان میں چلے جاتے تھے جہاں وہ اپنے ان گھوڑوں کو دیکھیں جن کے قدم نکالے جاتے تھے۔ نو بجے تک وہ مکان پر واپس آ جاتے تھے۔ اُس وقت وہ پر اوزن دار ناشتہ کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے۔ دوپہر بعد وہ سو کر اُٹھتے تھے اور کسی گھوڑ دوڑ کی میٹنگ میں چلے جاتے تھے۔ یا شام تک پھر مزید شکار میں لگ جاتے تھے اس کے بعد وہ مکان پر واپس آتے تھے اور رات کا وقت وہ اپنے کاموں میں اپنی جماعت کا سردار ہونے کی حیثیت سے صرف کرتے تھے۔ اپنے مریدوں سے ملاقات کرتے تھے۔ خط و کتابت کرتے تھے۔ اپنے مالی معاملات اور اسی قسم کی دوسری باتوں کی طرف

متوجہ ہوتے تھے۔ رات کے نو بجے وہ اس سے فارغ ہو کر اپنا اچھا خاصا بھاری کھانا کھاتے تھے اور پھر صبح کے پانچ بجے تک کام کرتے رہتے تھے۔ اس وقت وہ اپنا روزانہ معمول شروع کرنے سے پہلے کچھ ہلکا کھانا کھاتے تھے۔ یہ وہ عادتیں تھیں جن سے وہ آشنا ہو گئے تھے۔ اور یہی عادتیں ایران اور افغانستان میں اُن کے زمانہ کے بہت سے دوسرے آدمیوں کی تھیں جو حکمران طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو اس کی کوئی وجہ نہ معلوم ہوئی کہ وہ اپنی آخری زندگی کے ماحول میں ان عادتوں کو کیوں نہ قائم رکھیں۔

برسبیل تذکرہ میں یہ کہتا ہوں کہ میرے دادا کو ہندوستانی گھوڑدوڑ میں بحیثیت مالک کے گذشتہ صدی کے اُس زمانہ میں جو ۱۸۵۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان تھا۔ بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور وہ کامیابی اُس کامیابی سے بہت مشابہ تھی جو مجھ کو انگلستان اور فرانس میں اس صدی کے اس زمانہ میں ہوئی جو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان تھا۔

میرے والد نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں زندگی کے اس طریقہ کو زیادہ تر اُسی طرز پر جاری رکھا۔ وہ اپنے اصطبل کو برابر وسیع کرتے رہے اور اُس کو ترقی دیتے رہے اپنے شکاری بازوں اور شکاری کتّوں کو اس طریقہ اور اس پیمانہ پر منظم کرتے رہے جس کی ہر وہ شخص جو اُن معاملات کو سمجھتا تھا تعریف کرتا تھا۔ مثلاً یورپ سے آنے والے آدمی اور برطانیہ کے حکمران طبقہ کے آدمی جو ہندوستان میں بڑے سرکاری عہدوں پر مامور تھے یہ میرے حصہ میں آیا کہ میں اس نقطۂ نظر اور طرزِ زندگی سے ساز کروں اور اس کو بدلتے ہوئے زمانہ کے مطابق ترمیم کروں۔

یہ بات ضروری تھی کہ میری نابالغی کے زمانہ میں برطانوی حکومت اور بمبئی میں اُسکے نمائندے میری بہتری اور میری تربیت میں گہری دلچسپی لیں۔ میرا لڑکپن اس زمانہ میں تھا جو بلاشبہ ہندوستان میں برطانوی سرپرستی کا بہترین زمانہ تھا۔ برطانوی راج بلاکسی کوشش کے بالکل محفوظ اور ناقابل جنبش معلوم ہوتا تھا۔ اس کے نمائندے اور اس کے افسر بہت اطمینان کے ساتھ اپنے اوپر بھروسہ رکھتے تھے۔ ان میں اکثر لوگ روشن خیال اور آزاد طبیعت والے آدمی تھے جن کے دماغ ملکہ وکٹوریہ کے اس بلند دورِ حکومت کے

مزاج سے ہم آہنگ تھے جس کے اندر وہ پرورش پاکر پختہ ہوئے تھے۔ اُن کے کام اور اُن کے فیصلے اُس دماغی اور روحانی قوت پر منحصر تھے جس کو اُن کے جانشین کھونے والے تھے غدر کا زمانہ بہت دور کی پُرانی یاد ہو کر رہ گیا تھا اور دراصل اس کا اثر بالکل شمالی ہندوستان تک محدود معلوم ہوتا تھا۔ قوم پرستی نے اُس وقت تک زمانہ کے پیٹ میں صرف کلبلانا شروع کیا تھا۔ کانگریس موجود تھی جو ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیانی ابتدائی زمانہ میں ایک برطانوی آئی۔سی۔ایس کی محنت اور کوشش کی وجہ سے وجود میں آئی جن کا نام مسٹر ہیوم تھا۔ (MR HUME) اسی قسم کا ایک مسلم ادارہ کچھ عرصہ بعد قائم ہوا اور میرے بڑے سوتیلے بھائی اُن کے بانیوں میں سے تھے۔ مگر اس وقت کسی کو یہ یقین نہ ہو سکتا تھا کہ یہ باتیں آئندہ سالوں کے تمام جوش اور طوفان کی علامات تھیں۔

برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات عام طور پر اچھے خوشگوار اور بغیر کسی کشیدگی کے تھے۔ اس زمانہ کے بمبئی کے گورنر لارڈ رے (LORD REAY) گلیڈ اسٹون کی پارٹی کے لبرل (LIBERAL) تھے۔ وہ بہت بلند اصول والے۔ فیاض اور خوش مزاج آدمی تھے۔ اور اُن کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں اپنی دلفریب اور قابل بیوی سے بہت مدد ملتی تھی۔ بمبئی کا فوج کا کمانڈر کوئی اور نہ تھا بلکہ ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف کیناٹ تھے۔ (H.R.H. DUKE OF CONNAUGHT) جو ملکۂ وکٹوریہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ جنہوں نے سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی تھی جو آرتھر (ARTHUR) کے ہم نام اور متبنّٰی کے مناسب تھا یعنی ڈیوک آف ولنگٹن (DUKE OF WELLINGTON)۔ شروع سے میرے لئے یہ خاص خوش قسمتی تھی کہ ڈیوک اور ڈچز آف کیناٹ کو مجھ سے بڑی گہری محبت آمیز اور مسلسل دلچسپی ہو گئی۔ وہ سال میں کئی مرتبہ ہمارے مکان پر چاء پینے کے لئے آتے تھے۔ میں بچہ ہونے کی حیثیت سے اکثر ان کے مکان پر بلایا جاتا تھا اور وہاں پر لاڈ میں بگاڑا جاتا تھا اور مجھ کو شاید زیادہ مقدار میں مٹھائی اور چاکلیٹ (CHOCLATE) دے دئیے جاتے تھے۔ جو بہ حیثیت مجموعی میرے لئے مفید نہ ہوتے تھے۔ اُن کے مکان پر اس طرح جانا اور آنا میرے لئے بہت اچھا اور دل خوش کرنے والا تھا۔ پونا اور مہا بلیشور میں

ڈیوک ہمارے بہت قریبی پڑوسی تھے۔ روزانہ اور کبھی کبھی دن میں کئی مرتبہ ہم گھوڑے پر سوار ہو کر اُن سے ملنے جاتے تھے اُس وقت ہم رک جاتے تھے اور ڈیوک مجھ سے بات کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح پر ایک طریقہ سے میری پرورش برطانوی شاہی خاندان کے نزدیک ہوئی اور بعد کے سالوں میں جب میری ملاقات ملکۂ وکٹوریہ سے ہوئی تو انہوں نے فوراً مجھ سے کہا کہ اُن کو یاد ہے کہ انہوں نے میرے اور میرے خاندان کے متعلق اپنے بیٹے سے سب باتیں سُنی تھیں۔

اسی طرح کی اکثر اور غیر رسمی ملاقاتیں میرے خاندان اور گورنر کے درمیان ہوا کرتی تھیں۔ رے (REAY) کے زمانہ میں ایک لڑکے کی حیثیت سے مجھے اکثر گورنمنٹ ہاؤس میں چاء پینے کے لئے لے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں ان تعلقات کے اندر کسی قسم کی کشیدگی کا احساس نہ تھا۔ نہ کوئی علیحدگی کی بات تھی اور نہ کوئی توہین اور کمتری کا احساس تھا۔ یہ تعلقات بہت پُر خلوص اور بھروسہ والے تھے اور وہ ان تعلقات سے بہت مختلف تھے جو بعد کے سالوں میں پیدا ہو گئے۔ وہ تنگ، غیر رواداراور "شہنشاہی پرست" نقطۂ نظر جو کپلنگ (KIPLING) کے نام سے وابستہ ہے۔ اور جس کے ساتھ اس کے بعض افسوسناک مقولے مشہور ہیں (مثلاً یہ کہنا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے اور یہ دونوں جوڑواں بھائی کبھی نہ ملیں گے) اُس وقت تک ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اگر برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان تعلقات اور سوشل زندگی ایسے ہی رہتے جیسے کہ وہ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیانی زمانہ میں تھے تو مجھے اس میں بڑا شبہ ہے کہ سیاسی تلخی اس حد تک ترقی کر جاتی جس حد تک کہ وہ در اصل کر گئی اور یہ ممکن تھا کہ کوئی ایسی چیز آسانی سے وجود میں آجاتی جو اُس سے بہت کم ہوتی کہ ہندوستان کی جمہوریت شاہانہ تعلق سے بالکل علیحدہ ہے۔

ملکۂ وکٹوریہ در اصل خود ان ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھتی تھیں جو صرف سیاسی ہی نہ تھیں بلکہ ذاتی اور تمدنی تھیں اور جو ہندوستان کی ملکہ کا خطاب حاصل کرنے پر انہوں نے اپنے اوپر عائد کی تھیں۔ وہ اس بات پر زور دیتی تھیں کہ ہندوستان کے شہزادوں اور ہندوستان کے شرفاء کی وہی عزت کی جائے اور ان کو وہی شاندار رتبہ دیا جائے جو اُس زمانہ میں یورپ کے شہزادوں اور شرفاء کو دیا جاتا تھا۔ ڈیوک آف کیناٹ

(DUKE OF CONNAUGHT) اُس زمانہ میں جب وہ ہندوستان میں تھے بہت وفاداری کے ساتھ ان اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ وائسرائے اور اُن کی بیگم یعنی لارڈ اور لیڈی ڈفرن (LORD AND LADY DUFFERIN) بہت مہربان اور شریفانہ احساس کے آدمی تھے۔ اور وہ گرم دل والے اور بااخلاق برتاؤ والے آدمی تھے جس طرح کہ لارڈ اور لیڈی رے تھے۔ (LORD AND LADY REAY) ایک رنگ جو اس طرح جما دیا جائے اپنا اثر زائل نہیں کرتا۔ ہے اور ہندوستان و برطانیہ کے تعلقات عام طور پر اسی نمونہ کے تھے۔ دعوتوں کے موقع پر گھوڑ دوڑ کے میدان میں اور پولو گراؤنڈ میں بہت خوشگوار ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور سوشل میل جول میں کوئی کشیدگی اور رکاوٹ نہ تھی۔

ایک بڑا واقعہ اس وقت مجھے یاد آتا ہے وہ یہ تھا کہ سر جمسیٹ جی جیجی بھائی (SIR JAMSETJE JEE JEEBHOY) نے جو پارسی فرقہ کے ایک مشہور آدمی تھے ایک دعوت کی جس میں وائسرائے اور اُن کی بیگم۔ لارڈ اور لیڈی رے۔ ڈیوک اور ڈچز آف کیناٹ مدعو تھے۔ بمبئی کے سب فرقوں کے تمام سر برآوردہ نمائندے موجود تھے جیسا کہ انگلستان یا کسی دوسرے ملک میں رواج تھا۔ سر جیجی بھائی بہ حیثیت میزبان کے اپنا بازو لیڈی ڈفرن کے بازو میں ڈال کر کھانے کے کمرہ میں داخل ہوئے اور اُن کے پیچھے وائسرائے اپنی میزبان بیگم لیڈی جیجی بھائی کے ساتھ گئے۔ اور سب باقی آدمی اُس کے بعد باری باری سے اندر گئے۔ اس واقعہ کے کچھ سال بعد اور پھر اس کے بعد والے زمانہ میں ہندوستانی سلطنت ختم ہونے تک یہ بات ناقابلِ قیاس شمار ہوتی کہ وائسرائے جو برطانوی شاہی خاندان کا ایک شہزادہ تھا۔ اور برطانوی ہندوستان کے ایک بڑے صوبہ کا گورنر کسی پارسی رئیس کے مکان پر دعوت میں چلے جائیں خواہ وہ رئیس کتنا ہی ممتاز ہوتا۔ اور پھر وہ اپنے میزبان کو اس کی اجازت دے دیں کہ وہ وائسرائے کی بیگم کو اپنے ساتھ کمرے کے اندر لے جائے اور پھر خود اپنی میزبان بیگم کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے داخل ہوں۔ اخلاق کے آسان اصول کی بجائے سخت قوانین اور سخت طریق عمل جاری ہو گیا جس سے صرف سوشل زندگی کو ہی بڑا نقصان نہ پہنچا بلکہ آخر میں ایسی چیز کو جو بہت زیادہ اہم تھی مگر اُس خوشی کے

زمانہ میں سلطنت کے معنی "شہنشاہیت" کے نہ تھے نہ سوشل کمینہ پن کے اور اس سے بھی بدتر سوشل زیادتی اور سوشل ظلم کے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض کلب ہندوستانیوں کے لئے بند تھے۔ مگر اس واقعہ میں وہ مریضانہ خصوصیت نہ تھی جو اس میں بعد کو پیدا ہو گئی۔ کوئی شخص اس بات کا خیال نہ کرتا تھا کہ یورپین لوگ اپنے لئے ایک چھوٹا سا الگ حلقہ بنائے ہوتے ہیں۔ چونکہ اس کے باہر سوشل تعلقات بالکل آزاد مساوات کی بنیاد پر تھے۔

ایک عجیب واقعہ جس میں کچھ تمسخر کا رنگ بھی شامل ہے یہ تھا کہ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیانی زمانہ میں بہت سی ہندوستانی خواتین اپنی مرضی سے پردہ کے باہر آ رہی تھیں اور یورپین مردوں کو اپنے گھروں میں پُرخلوص مہماں نوازی کے ساتھ مدعو کرتی تھیں۔ یہ ہندوستانی خواتین میں ایک عام احساس کا نتیجہ تھا کہ وہ پابندی دور ہونے کے بعد نئی تہذیبی کی عام فضا میں پیچھے نہیں رہ سکتیں۔ اگر یہ فضا قائم رہتی تو یہ ممکن تھا کہ کم از کم مغربی ہندوستان میں پردہ رفتہ رفتہ اعلیٰ طبقہ کے درمیان اُس زمانہ سے برسوں پہلے ختم ہو جاتا جس زمانہ میں کہ وہ دراصل ختم ہوا۔

یہ بڑی خوشی کا زمانہ تھا جس کا رنگ اور نقطۂ نظر میں نے کچھ تفصیل کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ اُس کے بعد جو سخت اور کشیدگی کے سال آئے اُن میں اُس زمانہ کو لوگ بھول گئے۔ یہ تبدیلی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۹۰ء میں بہت تیزی کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ ڈیوک آف کناٹ اپنے وطن واپس چلے گئے اور سب سوشل معاملات میں اچھا برتاؤ کرنے کے لئے اُن کا بڑا اثر جاتا رہا۔ اُن کی جگہ بہ حیثیت فوج کے کمانڈر کے جنرل سر جارج گریوز مقرر کئے گئے (SIR GEORGE GREAVES) (کپلنگ (KIPLING) کی کتاب "اے کوڈ آف مارلس" (A CODE OF MORALS) میں یہ دراصل جنرل بنگس (GENERAL BANGS) کے نام سے مشہور ہیں۔

اس واقعہ کے برسوں بعد جب اُن کو ریٹائرڈ ہوئے عرصہ گذر چکا تھا میری ملاقات جنرل گریوز سے ڈوور کیلے جہاز پر ہوئی (DOVER - CALAIS) وہ تنہا تھے۔ میں نے اخلاقاً یہ رسمی سوال کیا کہ "کیا لیڈی گریوز بھی آپ کے ساتھ پیرس کو جا رہی ہیں"۔ اس کا جواب اس فوجی آدمی نے اس طرح دیا کہ "میں جب کبھی کسی دعوت میں جاتا ہوں تو اپنے ساتھ قیمہ بھری کچوری (HAM SANDWICH) نہیں لے جاتا ہوں"۔

لارڈ رے (LORD REAY) بھی پنشن پر چلے گئے تھے اور اُن کی جگہ لارڈ ہیرس آئے تھے۔ (LORD HARRIS) وہ مشہور اور جوشیلے کرکٹ کے کھلاڑی تھے مگر وہ نئی شہنشاہیت کے ترقی کرنے والے حلقۂ خیال کے آدمی تھے اور کنزرویٹو پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ (CONSERVATIVE) گورنمنٹ ہاؤس سے ہمارے تعلقات گو پوری طرح دوستانہ تھے مگر وہ پہلے سے زیادہ باضابطہ اور کم بے تکلفی کے ہوگئے۔ تعلقات کا سارا انداز سخت ہوگیا دعوتوں اور ملاقاتوں میں پہلے کی طرح آسانی کے ساتھ اور بکثرت سب فرقوں کے آدمی شریک نہ ہوتے تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں صرف چند گارڈن پارٹیاں ہوا کرتی تھیں جو سختی کے ساتھ رسمی اور باضابطہ ہوتی تھیں اور جن میں سوشل میل جول کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یورپین لوگ ہندوستانیوں کو اپنے گھروں پر مدعو کرنا کم کرتے گئے اور بہت جلد ایسا ہوگیا کہ شاذونادر لنچ یا ڈنر کی میزوں پر گھوڑ دوڑ والے آدمیوں کو ملنے کا موقع ملے۔ ایسے موقعوں پر جہاں سختی کے ساتھ علیحدہ رہنا بظاہر ناممکن تھا جیسا کہ گھوڑ دوڑ کی میٹنگ میں وہاں رنگ کے اختلافات ظاہر ہونے شروع ہوگئے۔ جداگانہ فرقے بنائے گئے۔ جو ذاتی میلان یا عدم میلان کے قدرتی اصول کی بنیاد پر نہ بنے تھے بلکہ قومیت اور رنگ کی عارضی اور مفر بنیاد پر بنے تھے۔ یہ وہ نقطۂ نظر تھا جس کے خلاف میرا ردِ عمل بہت سخت رہا۔ چونکہ میں نے اپنا سب سے زیادہ اثر پذیر زمانہ اس سے بالکل مختلف فضا میں بسر کیا تھا۔

سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ میں سب سے پہلے جن لوگوں کو تکلیف پہنچی وہ شاید پارسی لوگ تھے۔ مضبوط۔ قابل۔ تمدنی اور تجارتی اعتبار سے خداداد اہلیت رکھنے والے اور اس کے لئے بہت موزوں ہونے کی حیثیت سے انہوں نے برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو خوشگوار اور ہموار بنانے میں بہت اہم حصہ لیا۔ اب اُنکا حال اُس دَلال کا سا ہوا جس کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ دونوں طرف کے آدمی اُن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اور وہ صرف اپنی ہی جماعت میں علیحدہ ہوکر رہنے لگے یا بعض ترقی یافتہ ہندو اور مسلمان خاندانوں کے ساتھ ملنے لگے۔ یورپین لوگ اُن سے ملنا پسند نہ کرتے تھے چونکہ وہ ایشیائی تھے۔ ہندو اور مسلمان یہ خیال کرتے تھے کہ ان لوگوں نے پہلے اپنی تقدیر

یورپین لوگوں کے ساتھ آزمائی تھی اور پھر وہ باہر نکال کر پھینک دیئے گئے۔ یہ بہت افسوسناک اور غیر منصفانہ زبوں حالی تھی۔

اس سے زیادہ ناخوشگوار تبدیلی جس کے نتائج بہت زیادہ دور رس تھے برطانوی سرکاری نقطۂ نظر میں پیدا ہوئی جو اس وقت کے سیاسی احساسات کے متعلق تھا۔ کانگریس جس کی ہمت افزائی بہت فیاضی کے ساتھ ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیانی زمانہ میں اس کے شروع ہونے پر کی گئی تھی اور جس کے متعلق یہ خیال تھا (جو غالباً صحیح تھا) کہ وہ اس بڑے شاہی خاندان کے ایک یا زیادہ ممبروں کی ترقی کرنے کی علامت تھی۔ اب اس کانگریس کے متعلق یہ خیال کیا جانے لگا کہ وہ ایک مخالف سیاسی ادارہ تھا جس کا آخری مقصد صرف یہ ہو سکتا تھا کہ برطانوی تعلق کو کمزور اور تباہ کر دے۔ برطانیہ کے حکمران طبقے کی (یا بہرحال اُن لوگوں کی زیادہ تعداد کی جو ہندوستان نیچے جاتے تھے) ہندوستان کے تعلیم یافتہ حلقوں سے بیزاری اور علیحدگی جن کی تعداد اور قابلیت روزانہ بڑھ رہی تھی دونوں قسم کی تھی یعنی وہ علیحدگی ذہنی اور دماغی اعتبار سے بھی تھی اور روحانی اعتبار سے بھی تھی۔ جہاں پر پہلے گرمی تھی وہاں پر اب سردی اور انجماد تھا اور اس طریق عمل میں آئندہ کی تلخی کے تمام بیج بوئے جا رہے تھے۔

> انگریزوں کو کیا ہو گیا تھا؟ یہ بات میرے لئے میری تمام عمر ایک تعجب اور حیرت کا سبب بنی رہی ہے۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ انگریز نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اگر اُس نے اُن لوگوں کو جو اُس سے مختلف رنگ کے تھے بنیادی طور پر اپنے برابر تسلیم کر لیا۔ تو ایک شاہانہ اور حکمران قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے اُس کا وقار زائل ہو جائے گا۔

رنگ کا فرق صرف جسمانی اختلاف ہی شمار نہ کیا جاتا تھا بلکہ وہ نہایت خطرناکی کے ساتھ اور آخر میں نہایت منحوس مصیبت کے ساتھ۔ ایک دماغی اور روحانی اختلاف شمار کیا جانے لگا۔ جب تک ان ہندوستانیوں کی تعداد کم رہی جو یورپین طرز زندگی کو تسلیم کرتے تھے اور اس کی نقل کرتے تھے اُس وقت تک ایک سرکاری ملازم اور برطانوی راج کے

قائم رکھنے والے آدمی کے لئے یہ محسوس کرلینا ممکن تھا کہ اُس کی نرالی پوزیشن اور اُس کا یکتا مرتبہ بے تکلفی کی وجہ سے ختم نہیں ہو جائے گا اور ہندوستانیوں کی کثرت تعداد اُس پوزیشن اور مرتبہ کو دور نہیں کر دے گی۔ مگر اب قوم پرستی دونوں طرف سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر تی گئی۔ بہت جلد ایسا ہوا کہ یہ معاملہ صرف برطانوی حاکم اور ہندوستانی محکوم کے تعلقات کا معاملہ نہ رہا۔ بلکہ یہ مفر نظریہ سارے میں پھیل گیا کہ سب ایشیائی دوسرے درجہ کی قوم والے تھے اور یہ کہ "گورے رنگ کے آدمیوں" میں کچھ اندرونی اور ناقابل مخالفت۔ فوقیت موجود تھی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس پھیلنے والی بیماری کے اثرات میں مضحکہ خیز پہلو بھی تھے بمبئی میں ٹرکی کا کونسل جنرل اتفاقاً بوسنیا کا رہنے والا تھا (BOSNIAN) جس طرح عثمانیہ ٹرکی میں بہت سے حکمران اور سرکاری طبقہ کے آدمی تھے۔ وہ سلاؤ قوم کا آدمی تھا جو سو فی صدی یورپین قوم ہے مگر چونکہ وہ مسلمان تھا اس وجہ سے جاہلانہ تعصب کی بنیاد پر اُس کو ایک ایشیائی کی حیثیت سے نیچے گرا رکھا تھا۔ اُن کے بعض انگریز دوست اُن کو اپنے ایک کلب میں لے گئے۔ کلب کے دوسرے ممبروں نے اس پر ایسا شور مچایا کہ کونسل جنرل نے صاف طور پر کہا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور ایک نیم ایشیائی سلطنت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اُن کے ساتھ قومیت کی وجوہ پر بہت بداخلاقی اور توہین کا برتاؤ کیا گیا۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا۔ کہ وہ بہ حیثیت کونسل جنرل کے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے مگر بمبئی میں انگریزوں سے اُن کے تعلقات آئندہ کے لئے سختی کے ساتھ سرکاری طریقہ کے ہوں گے اور وہ اُن سے کسی قسم کے ذاتی تعلقات قائم نہ رکھیں گے۔ ایران کے کونسل (CONSUL) کو بھی یہی تجربہ ہوا اور ان کے جذبات بھی اسی طرح کے تھے۔ جاپان کے لوگ جو بیرونی تعلقات سے اپنی طویل علیحدگی کو دور کر رہے تھے۔ بہت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ چل رہے تھے۔ پہلے انہوں نے اپنے تجارتی ادارے قائم کئے تاکہ جب اُن کا کونسل (CONSUL) وہاں آئے تو اُس کو جاپانی کلب اور ان کی سوشل جماعتیں منظم حالت میں مل جائیں اور وہ خود کو تنہا محسوس نہ کرے یا یہ محسوس نہ کرے کہ وہ اینگلو انڈین جماعت کے

اچھے برتاؤ کا محتاج ہے۔ یہ اینگلو انڈین کا لفظ اُس کے پُرانے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

اس نئے رویہ کا اصلی سبب خوف تھا اور خود اعتمادی کا نہ ہونا ایک اور وجہ سے بھی اس میں اضافہ ہوا اور وہ کثیر تعداد میں انگریز بیویوں کی موجودگی تھی جن کو ہندوستانیوں کے رواج اور نقطۂ نظر سے کوئی واقفیت نہ تھی نہ اُن کو اُس میں کوئی دلچسپی تھی۔ خوف لوگوں کو تجارت اور لین دین کے معاملات میں ایسا ہی پریشان کرتا تھا جیسا کہ وہ سرکاری عہدہ داروں کو کرتا تھا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ کرتا ہو۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ تعلقات کا شگاف زیادہ گہرا اور چوڑا ہوتا گیا۔ (انگریزوں کے خیال کے مطابق) رنگ کا فرق بہت سختی کے ساتھ اور قطعی طور پر قائم رکھنا ضروری تھا (خوف نے ان لوگوں کو جو اُس کی پکڑ میں آگئے تھے اسی طرح بہکایا) ورنہ خرابی اور تباہی کا ایک پُراسرار طریقہ شروع ہو جائے گا۔ اور اُن کا یہ عقیدہ کہ اُن کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے اور ان کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ گویا اُن کا اخلاقی۔ دماغی اور حیاتی حق۔ زائل ہو جائے گا۔

یہ مریضانہ اور مجنونانہ رویہ تھا جو پہلے زمانہ کے اس رویہ سے مختلف تھا جب ایسے آدمی جیسے سرجون میلکوم (SIR JOHN MALCOLM) سرماؤنٹ اسٹوارٹ ایلفنسٹن (SIR MOUNTSTUART ELPHINSTON) اور اس کے بعد لارڈ رپن (LORD RIPON) اور لارڈ رے (LORD REAY) نے یہ بات نہایت عالی ظرفی کے ساتھ مسلمہ طور پر مان رکھی تھی کہ انگلستان کا فرض پورا وقت گذر جانے پر یہ ہوگا کہ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہو جائے جب ہندوستان میں اس نے امن۔ اتفاق اور خوش حالی پیدا کر دی ہو اور اُس کے آدمیوں کو آزاد حکومت کے بھید سکھا دئے ہوں۔ اُس وقت مرتبہ نوآبادیات کا کوئی ذکر نہ تھا (DOMINION STATUS) مگر کنیڈا (CANADA) اسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کی تیزی کے ساتھ ترقی کرنے والی نوآبادیوں کی مثالیں صاف طور سے نظر آرہی تھیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ تک اس قسم کے تمام خیالات کو دور پھینک دیا جاتا تھا چونکہ وہ برطانوی راج کے تحفظ کے خلاف تھے اور غیر وفادارانہ اور باغیانہ شمار کئے جاتے تھے۔

مجھے اس وقت ایک ناشتہ کی دعوت یاد آتی ہے جو میں نے بمبئی میں برطانوی سینئر عہدہ داروں کے لئے کی تھی۔ میرے ایک دوسرے مہمان میرے رشتہ کے ایک بھائی تھے جو ملکہ معظمہ کے دلدادہ اور وفادار رعایا کے آدمیوں میں سے تھے اور وہ بہت زیادہ انگریزوں کے طرف دار تھے۔ مگر وہ تاریخ کے طالب علم تھے۔ انہوں نے اس واقعہ پر گفتگو کی کہ ایک ایشیائی قوم یعنی عرب لوگوں نے اسپین پر پانچ سو سال تک حکومت کی تھی اور اپنے چلے جانے کے بعد انہوں نے تمام جنوبی اسپین میں اپنی تہذیب کے ناقابلِ محو اور شاندار اثرات چھوڑے تھے اور اس واقعہ کا ذکر بھی کیا کہ دوسری ایشیائی قوم یعنی ترک لوگوں نے بلقان میں اور مشرقی بحر روم کے چاروں طرف ایک بڑی سلطنت قائم کر لی تھی اور وہاں پر وہ اب بھی چند صدیاں گذر جانے کے بعد حکومت کر رہے ہیں۔ میرے برطانوی مہمانوں نے ان باتوں کو ایک قسم کی گستاخی شمار کیا اور وہ کہنے لگے کہ "ہم اس قسم کا مقابلہ کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ ہماری حکومت مستقل ہے اور وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ صرف چند صدیوں تک باقی رہے اور پھر ختم ہو جائے۔ ایسا خیال کرنا بھی جیسا کہ آپ کرتے ہیں وفاداری کے خلاف ہے"۔

سنہ ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد موجودہ زمانہ میں اس قسم کے خیالات درحقیقت بہت عجیب معلوم ہوتے ہیں جب ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت اس طرح غائب ہو گئی اور گذر گئی جس طرح صبح کا کہر تیز سورج کی روشنی کے سامنے ختم ہو جاتا ہے۔ مگر یہ وہ وقت تھا جس میں میرے لڑکپن کا آخری زمانہ گذرا اور اس میں گہرے اختلاف اور روز افزوں غلط فہمی اور دشمنی کا ناخوشگوار اور غم آلود احساس موجود تھا۔

باب نمبر ۴

میں مغربی دُنیا کا سفر کرتا ہوں

جوانی شروع ہونے پر میری زندگی اپنے نئے طریقوں پر بنتی گئی۔ وہ فرائض اور فیصلہ کرنے کے اختیارات جو میرے موروثی مرتبہ کی وجہ سے میرے اندر پائے جانے تھے زیادہ سے زیادہ صورت میں مجھ پر عائد ہو گئے۔ میں درحقیقت کسی ریجنٹ (REGENT) کا ماتحت نہ تھا۔ اُس معنی میں جو اس کے لئے مسلمہ ہیں۔ جتنا فیصلہ دینے کے لئے میری اہلیت بڑھتی گئی اُتنا ہی میری والدہ اور میرے چچاؤں نے ذمہ داری سنبھالنے کے لئے میری ہمت افزائی کی۔ میری والدہ جنہوں نے میرے ابتدائی لڑکپن میں میری تعلیمی تربیت پر زور دیا تھا اتنی زیادہ ہوشیار اور نگرانی کرنے والی تھیں جتنی کہ وہ محبت کرنے والی تھیں۔ وہ اور میں دونوں سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ محبت والے خلوص کے ساتھ رہتے تھے اور اسی طرح پر ہم اُن کی ساری طویل زندگی میں رہے۔ اُس زمانہ میں ہر رات کو میں اُن کے کمرہ میں چلا جاتا تھا اور اُن کے ساتھ عبادت میں شریک ہو جاتا تھا۔ وہ عبادت جو اتحاد کے لئے اور ملاء اعلیٰ کی مصاحبت کے لئے (COMPANIONSHIP ON HIGH) ہوتی ہے اور جو مسلم مذہب کی جان ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مشترکہ تجربہ نے ہم دونوں میں وہ قوت پیدا کی جس سے ہم اپنی دماغی اور روحانی تھکاوٹ اور بے چینی کے بوجھ کو جوان مشکل سالوں میں کسی طریقہ پر ہلکا نہ تھا آسانی سے اُٹھا سکیں۔ مگر میری والدہ کا مذہب نہایت مستقل طریقہ پر عملی قسم کا بھی تھا۔ اُن کے نزدیک ایمان میں بغیر عمل کے کوئی نیکی نہ تھی اور اپنی قومی زندگی کی ابتدا سے میں نے ان اصولوں کو تسلیم کر لیا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی۔

میری تعلیم اس وقت تک جاری رہی جب میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ مسٹر کینی (MR KENNY) نے ایک مرتبہ پھر اپنا مفید اثر استعمال کیا اور میرے بزرگوں پر زور ڈالا کہ

میں اپنی خوشنویسی کی سخت مشق کو چھوڑ سکوں۔ میرا دماغ تیزی کے ساتھ نئی باتوں کے لئے کھل رہا تھا۔ اپنے مطالعہ میں میرا دائرہ انگریزی اور فرانسیسی میں اور نیز فارسی اور عربی میں زیادہ وسیع ہونا شروع ہوا۔ مل کے اصول منطق میں (MILL) مجھے دماغی فرحت حاصل ہوئی جو اس کی صحت اور وضاحت کی وجہ سے تھی۔ میں تاریخ اور سوانحعمری کا مطالعہ بہت زیادہ کرتا تھا اور اپنے رشتہ کے بھائی شمس الدین کے ساتھ میں ناول پڑھنے کا ایسا شوقین ہوگیا جس کو کبھی تسلی نہ ہوتی تھی یہ ایسا شغل تھا جس کی فرحت میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک کم نہیں ہوئی ہے۔

میرے والد کی وفات کے بعد اُن کے گھوڑوں کے اصطبل میری ملکیت میں آگئے اور باوجودیکہ میں نابالغ تھا۔ میرے گھوڑے ہر سال میرے نام سے دوڑائے جاتے تھے۔ اور اس زمانہ سے بہت پہلے جب میں اُنیس سال کی عمر سے نکل چکا تھا۔ ہز ہائی نس دی آغاخان کے (HIS HIGHNESS THE AGAKHAN) گھوڑے مغربی ہندوستان کی گھوڑ دوڑ میں کافی مشہور ہوگئے تھے اور وہ بھی کامیابی کے ساتھ۔ میرے موروثی اور میرے ماحول کے اثرات وہاں پر شروع ہی سے ظاہر ہونے لگے۔ میرے تمام خاندان کے آدمی جن میں میری والدہ بھی شامل تھیں گھوڑ دوڑ کی سب قسموں کے بہت زیادہ شوقین تھے۔ انگریزی اور ہندوستانی بھی دونوں قسموں کے۔ انگریزی گھوڑ دوڑ کے متعلق ہماری معلومات بہت زیادہ تھی۔ مثلاً ارمنڈ کی (ORMONDE'S) کامیابیاں ہمارے لئے ایسی ہی باعث دلچسپی تھیں جیسی کہ وہ اُن لوگوں کے لئے تھیں جو انگلستان کے گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں بازی لگاتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو جس شخص کو ہمارے ٹٹوؤں کی دوڑ میں فتح ہوتی تھی وہ اس دن فریڈ آرچر (FRED ARCHER) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آرچر کی موت نے جو نہایت افسوسناک حالات میں ہوئی۔ ہم سب کو بڑے رنج اور اداسی میں ڈبو دیا تھا۔ اس سے تقریباً ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے کسی گہرے دوست نے خودکشی کرلی ہے۔

بہ حیثیت گھوڑوں کے مالک کے میری کامیابیاں کچھ معمولی نہ تھیں۔ میں یہ

دعویٰ کرسکتا ہوں کہ ایک زمانہ تک میں اور میرے رشتہ کے بھائی آغا شمس الدین جو بہت سے اعلیٰ درجہ کے گھوڑوں میں مالکانہ حیثیت سے میرے شریک تھے۔ مغربی ہندوستان کی گھوڑ دوڑ میں بہت سربرآوردہ تھے۔ چار مرتبہ مسلسل میں نے نظام کا جام زریں (NIZAM'S GOLD CUP) جیتا۔ جو مغربی ہندوستان میں سب سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر دوڑ شمار ہوتی تھی۔ ان ہی سالوں میں اور پھر اُس کے کچھ عرصہ بعد میرے ایک گھوڑے نے جس کا نام یلدز (YILDIZ) تھا گورنر کا کپ جیتا (GOVERNOR'S CUP)

میں نے شکار کھیلنا شروع کیا۔ وہ لومڑی کا شکار نہیں جو انگلستان میں کھیلا جاتا ہے بلکہ بمبئی اور پونا دونوں مقامات پر گیدڑ کا شکار کھیلا۔ ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے کبھی انگلستان میں لومڑی کا شکار نہیں کیا۔ مگر میں یہ بات صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک گیدڑ کے شکار سے زیادہ کوئی اور پُرلطف اور دل خوش کُن شکار نہیں ہے۔ جو بمبئی میں جاڑوں کی سرد صبح کے وقت جانوں کے کھیتوں میں کیا جاتا ہے۔ جب ہوا اچھی ہوتی ہے گیدڑ کا پتہ اُس کی بُو سے اچھی طرح چل جاتا ہے اور شکاری کتے مکار گیدڑ کے پیچھے کافی دُور تک دوڑتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے ہندوستان میں ایک دوسرے کھیل کو جاری کیا۔ یعنی ہاکی کو، جو آجکل ہندوستان اور پاکستان دونوں میں خاص قومی کھیل شمار کیا جاتا ہے۔ میں نے ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ میں اس کھیل کو اپنے رشتہ کے بھائی اور اپنے ہم عمر دوسرے دوستوں کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ میں نے اس کھیل میں دلچسپی پیدا کی اور اس کے لئے انعامات مقرر کئے۔ میں نے ہندوستانی فوج کو یہ کھیل کھلایا۔ بمبئی کی مختلف جماعتوں میں اُس کی ٹیمیں قائم ہوئیں اور اُس کے مقابلہ کے میچ سارے ہندوستان میں کھیلے گئے۔ ہاکی اور کرکٹ ہندوستان میں ایک ہی وقت پر جاری ہوئے۔ کرکٹ کو اُس وقت کے گورنر بمبئی لارڈ ہیرس نے

(LORD HARRIS) ترقی دی اور اس کے متعلق ہمت افزائی کی۔ نوجوان ہندوستانی جو اپنی تعلیم کا کچھ حصہ پورا کرنے کے لئے انگلستان جاتے تھے۔ وہ اپنے وطن واپس آنے پر اس کھیل کو جاری رکھتے تھے اور اس کھیل نے ایسا شوق پیدا کیا جو اب تک زائل نہیں ہوا ہے۔ جو ہندوستان اور پاکستان کے حلقوں میں وسیع تر ہوتا چلا گیا اور آجکل یہ دونوں ملک ایسی ٹیمیں بناتے ہیں جو مقابلہ کے میچوں میں کھیلنے کی قابلیت اور خصوصیت رکھتی ہیں۔

جب میری عمر اٹھارہ اُنیس سال کے قریب تھی میں نے مکہ بازی کی مشق شروع کی (BOXING) اور یوجین سینڈو (WUGENE SANDOW) کے طریقہ ورزش جسمانی کا گہرا مطالعہ کیا اور اس پر عمل کیا۔ میں اپنی تمام عمر جسمانی صحت کے سادہ اور سیدھے اصولوں کا بڑا حامی اور اُن پر عمل کرنے والا رہا ہوں۔ میں ہمیشہ سے باضابطہ اور مسلسل ورزش کا قائل رہا ہوں۔ میں بہت ٹہلنے والا آدمی تھا۔ میں نے گولف کھیلنا پچاس سال کی عمر کے بعد شروع کیا۔ اور اخبار نویس میرے متعلق جو خاص جملے استعمال کرتے تھے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ "میری دو بڑی خواہشیں یہ تھیں کہ میں ڈربی کی دوڑ جیتوں اور گولف کے کھیل میں اول نمبر آجاؤں۔" میں ڈربی کی دوڑ جیت چکا ہوں اور ایک مرتبہ سے زیادہ جیت چکا ہوں۔ میری دوسری خواہش (اگر وہ اخبار نویسوں کی ایجاد کے علاوہ کبھی کوئی اصلیت رکھتی تھی) ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہے مگر اس معاملہ میں میری رکاوٹ برسوں تک 'بارہ' کا ہندسہ رہا۔ میں جس طرح کہ بہت سے انگریز مانتے ہیں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ بہت سی ورزش چند گھنٹوں میں ہفتہ کے ختم ہونے پر زبردستی کرلی جائے اور پھر باقی ہفتہ میں بہت کم ورزش کی جائے یا بالکل نہ کی جائے۔ روزانہ کچھ باضابطہ ورزش کرلینا میری عادت میں داخل رہا ہے۔ ایسی ورزش جو ایک مصروف دن کے پروگرام میں مناسب طریقہ پر شامل کرلی جائے۔

میرے لڑکپن کے آخری زمانہ میں ایک قابل یادتجربہ یہ ہوا کہ مارک ٹواین سے

(MARKTWAIN) میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن کی صحبت میں دو پہر بعد کا سارا وقت صرف کیا اور پھر بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں (WATSON'S HOTEL) جہاں وہ ٹھیرے ہوئے تھے ان کے ساتھ رات کا کھانا کھا کر وہ صحبت ختم کی اُن کے اندر ایک خوشگوار اور بالکل بلا تصنع کے دلکش اثر موجود تھا اور اُن کے اخلاق میں ایسا دوستانہ انداز تھا جس نے ایسے سنجیدہ طبیعت والے لڑکے کو مسخر کرلیا جیساکہ میں تھا۔

مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کافی دولت جمع کی تھی اور پھر اُس کو بُری طرح سٹہ بازی میں تباہ کردیا تھا۔ اب بڑھاپے کی عمر میں اُن کو پھر از سر نو اپنی روزی کمانا شروع کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے وہ دنیا کا سفر کر رہے تھے اور راستے میں لوگوں سے ملاقات کرتے جاتے تھے۔ اُن کے اندر اپنی بدقسمتی کے خلاف کوئی تلخی یا ناراضگی کے آثار نہ پائے جاتے تھے۔ وہ مجھے بہت پیارے۔ شریف اور نیک آدمی معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایسے غمگین اور بے انتہا شرمیلے اور متحمل مزاج تھے جو اتنا بڑا اور مشہور ذہین آدمی نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ بعض ایسے نازک سفید پھول ہوتے ہیں جو اتنے حسّاس ہوتے ہیں کہ جب کبھی آپ اُن کو چھوتے ہیں تو وہ پیچھے کو ہو جاتے ہیں اور اپنی صاف اور نرم پتّیوں کو سکوڑ لیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنے شرمیلے اور دور رہنے والے ہیں کہ ہلکی سے ہلکی گدگدی کو بھی برداشت نہیں کرسکتے۔

جوں جوں میری عمر تیرہ سال کے بعد بڑھتی گئی میری روزانہ مصروفیت زیادہ ہوتی گئی۔ مجھے گہرا احساس تھا کہ میری ذمہ داری دوہری تھی۔ بلکہ شاید میرے پاس دوہرے موقعے تھے۔ پہلا موقعہ ہندوستان میں تھا جو مسلمانوں کی وسیع جماعت کے ایک بااثر فرقہ کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے اس زمانہ میں ملا تھا جب سیاسی

ے برسبیلِ تذکرہ وہ ہماری اس ملاقات کا حوالہ اپنی کتاب میں دیتے ہیں۔ جو انہوں نے بعد میں لکھی اور جس کا نام نیو انوسینٹس ایبروڈ (NEW INNOCENTS ABROAD) ہے۔

اُمنگیں حرکت میں آ رہی تھیں۔ اور دوسرا موقعہ ایک دور تک پھیلی ہوئی بین الاقوامی جماعت کا سردار ہونے کی حیثیت سے تھا۔ ایسا روحانی سردار جس کا اثر اور اختیار ایک باریک مگر حساس جال کی صورت میں بہت سے ملکوں اور بہت سی قوموں کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ میں کبھی صرف ہندوستانی قوم پرست نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ۱۸۹۲ء کے بعد سے اور ایسے عقل مند اور نیک آدمیوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے جیسے سر فیروز شاہ مہتا اور مسٹر بدرالدین طیب جی۔ میں نے اس زمانہ کی اعتدال پسند ہندوستانی قومیت کے نقطۂ نظر کو قبول کر رکھا تھا۔

ایسی دنیا میں جہاں آنے والے جھگڑوں کے سب سے پہلے اشارے اور علامات نظر آ رہے تھے میرا نرالا کام یقینی طور پر بین الاقوامی تھا۔ میرے مرید برما میں موجود تھے۔ جنوب و مشرقی ایشیا میں موجود تھے۔ مشرقی افریقہ کے سمندر کے کنارے پر مومباسا سے لے کر ایسٹ لندن تک (EASTLONDON) اور جنوبی افریقہ میں اندر کی طرف بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ شام میں۔ ایران اور افغانستان میں چینی ترکستان میں روس کے ملکوں میں جو وسط ایشیا کے درمیان واقع ہیں۔ ٹرکی کے میسوپوٹیمیا کے صوبوں میں جو بعد میں عراق کے نام سے مشہور ہوئے۔ میرے مرید موجود تھے۔ میرا وطن لازمی طور پر ایسا تھا جو تمام اسلامی دنیا کے لئے خیالات اور عقائد کا۔ امید اور خوف کا۔ اور سب قسم کی اُمنگوں کا سرچشمہ تھا۔ میری ابتدائی نصیحت جو دراصل میرے اُن مریدوں کے لئے میرا فرمان تھا۔ جو مختلف ملکوں کے شہری تھے۔ اس وقت بھی یہی تھا اور ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ وہ وفاداری جو اُن کو میرے گھرا اور میری ذات سے ہے وہ روحانی اور غیر دنیاوی وفاداری ہے اور ان کی دنیاوی اطاعت پوری طرح پر اس حکومت کے ساتھ وابستہ ہے جس کے وہ شہری ہیں اور یہ ان کا خاص اور قطعی فرض ہے کہ وہ اچھے شہری ثابت ہوں میرا سارا کام جو میں نے اپنی تمام عمر سیاست اور بین الاقوامی مصلحت بینی میں کیا ہے اس دوہری ذمہ داری کی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جو میری ابتدائی عمر سے مجھ پر عائد کی گئی ہے۔

سنہ ۱۸۹۵ء کے آخر اور سنہ ۱۸۹۶ء کے شروع میں میری جوانی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میری زندگی کے کاموں کی باگ ڈور اس وقت پوری طرح میرے ہاتھ میں تھی میرے استاد رخصت ہو چکے تھے اور وہ میری زندگی کے راستہ سے باہر ہو گئے تھے۔ مشرق میں اپنے بہت سے ہم عمر نوجوانوں کی طرح میں نے شادی کرنے کا خیال کیا اور قدرتی طور پر میں نے اپنے چاروں طرف اس مختصر اور محدود خاندانی حلقہ پر نظر ڈالی جس میں میری پرورش ہوئی تھی۔

میرے بچپن میں سب سے پہلے میرے ساتھ کھیلنے والوں میں میرے رشتہ کی بہن شہزادی بیگم تھی جس کے والد آغا جنگی شاہ میرے چچا تھے اور میرے ابتدائی صلاح کاروں میں سے تھے اور اُن لوگوں میں سے تھے جو میرے سامنے زندگی کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ جیسا کہ ہمارے زمانہ اور ہماری سوسائٹی کا رواج تھا۔ ہم دونوں نے جوان ہو کر ایک دوسرے کو بہت کم دیکھا یا بالکل ہی نہ دیکھا۔ مگر جب میں جوانی کے قریب پہنچا تو مجھے اپنے رشتہ کی بہن کے حسن اور کشش کا تیزی کے ساتھ احساس ہونے لگا اور مجھے اس سے محبت ہو گئی میری پہلی شادی کے متعلق یہ بات بہت ظلم اور بے انصافی کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ وہ ایک قسم کی "سرکاری شادی" تھی جو میری رشتہ کی بہن اور میرے درمیان ہمارے والدین نے جائداد کے وجوہ پر طے کی تھی۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ میں ایک نوجوان تھا جس کو محبت ہو چکی تھی اور اس تجربہ کو تلاش کر رہا تھا جس میں خوشی اور تکلیف ملے ہوئے ہوتے ہیں اور جو ایک لڑکے کو جوان آدمی بنا دیتا ہے۔ اس شادی کے لئے میری اور صرف میری ہی تحریک تھی۔ میں نے اپنی والدہ سے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور اُن سے التجا کی کہ وہ میری طرف سے میرے چچا اور اُن کی بیوی کے پاس جائیں اور اُن سے اجازت حاصل کریں کہ میں شہزادی بیگم سے شادی کر لوں۔ یہ تجویز پیش کی گئی اور میری باضابطہ درخواست منظور کر لی گئی۔ ہماری شادی اسی سال کے اندر ہونے والی تھی۔ اس اثنار میں میرے چچا اور چچی اپنی بیٹی اور اپنے بھائی شاہ عباس کے ساتھ حج کے لئے مکہ کو روانہ ہو گئے۔ حج کرنے کے بعد یہ لوگ اپنے وطن کو روانہ ہوئے اور راستہ میں کچھ عرصہ کے لئے جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا جدہ میں ٹھیر گئے۔ جو بحر قلزم پر ایک بندرگاہ ہے اور جہاں ہو کر حاجیوں کی بڑی اکثریت مکہ کو آتی جاتی ہے۔ میرے چچا اور

چچازاد بھائی نہایت وحشیانہ اور خوفناک حالات میں قتل کر دئیے گئے اور میری چچی اور اُن کی بیٹی اس وقت مکان کے اندر موجود تھیں جس وقت یہ دونوں قتل کئے گئے۔ اُس زمانہ میں پولیس کی تحقیقات جس طرح مغربی اصول پر کی جاتی ہے جدہ میں نہیں کی جاتی تھی۔ ذرائع آمد و رفت بہت کم اور ناقابل اعتبار تھے۔ بمبئی کی پولیس نے واپس ہونے والے حاجیوں سے بہت گہرے سوالات کئے اور باوجودیکہ اس سانحہ کے متعلق بہت کچھ اُس وقت اور اُسکے بعد ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رہا ہے۔ اور باوجودیکہ قاتلوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یا تو فوراً زہر کھالیا یا ان کو خوف زدہ ملازموں اور آس پاس کے آدمیوں نے زدوکوب کر کے جان سے مار ڈالا۔ یہ بات کم از کم ظاہر ہے کہ میرے چچا اور اُن کے بیٹے بزدلانہ مذہبی جنون کے شکار ہو گئے۔

اس خوفناک سانحہ نے مجھ پر جسمانی اور جذباتی دونوں اعتبار سے گہرا اثر ڈالا۔ میں اُس سارے گرمی کے موسم میں سخت بیمار رہا۔ بخار کی باریاں برابر آتی رہیں جس کے ساتھ گٹھیا کی تکلیف دہ علامات موجود تھیں۔ اکتوبر کے مہینے میں جب گرمیوں کے موسم کی سخت گرمی ختم ہو گئی تھی اور مونسون (MONSOON) کی بارش گذر چکی تھی۔ میں نے اپنا پہلا سفر شمالی ہندوستان کی طرف کیا۔ اس وقت تک مغربی اور جنوبی ہندوستان سے باہر میرا سفر بے انتہا محدود رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں بغداد کو۔ بوشہر اور مسقط کو چلا گیا تھا۔ اُس وقت مجھ میں سفر کرنے کا ذوق پیدا ہو گیا جو یقینی طور پر اب تک مجھ میں سے دور نہیں ہوا ہے۔ میں نے اپنے اس پہلے سفر میں آگرہ۔ دہلی اور لاہور کے اندر مسلم ہندوستان کے بڑے مرکز اور مقدس مقامات دیکھے یعنی اسلامی تہذیب اور کلچر کی یادگاروں کا وہ شاندار مجموعہ۔ مثلاً تاج محل۔ دہلی کا لال قلعہ۔ جمعہ مسجد۔ دہلی اور آگرہ کی موتی مسجدیں جو نہایت اعلیٰ قسم کے جواہرات ہیں۔ میں راستہ میں علی گڑھ اینگلو مسلم کالج میں بھی گیا (جیسا کہ وہ اُس زمانہ میں تھا) اور وہاں پر میں سر سید احمد اور نواب محسن الملک سے ملا۔ یہ اس چیز کی ابتدا تھی جو بعد میں بہت سے سالوں تک میری زندگی کی خاص اور اہم وابستگیوں میں رہ چکی ہے۔ یعنی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کو ترقی اور وسعت دینا اور خاص طور پر اس کالج کو

اور علیگڈھ میں یونیورسٹی کو۔

اُس زمانہ میں اس کالج کی بہتری کے لئے میں نے ایسے گرم جوش کے ساتھ کام شروع کیا جس کا مجھ کو کبھی افسوس نہیں ہوا ہے۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ کا علیگڈھ ایک قابلِ تعریف ادارہ تھا مگر روپیہ کی کمی اور سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے اُس کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ کیا اس وقت مجھے اس کا اندازہ ہوگیا تھا گو میں نوجوان ہی تھا کہ اُس کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ آئندہ چل کر وہ اسلامی خیالات اور کلچر کا ایک بڑا ذخیرہ اور سرچشمہ بن جائے گا جو اسلامی روایات اور تعلیمات کے بالکل مطابق ہوگا۔ اور اس کے باوجود وہ ہمارے موجودہ زمانہ کے نقطۂ نظر اور اصطلاحات سے ساز کرے گا؟ اس وقت کوئی شخص ان واقعات کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا تھا جو دراصل بعد میں پیش آئے مگر میں خوب جانتا ہوں کہ میں علیگڈھ کے میدان کو زیادہ فراخ کرنے اور اس کی افادیت کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے اور اگر ضرورت ہو تو کسی آسان اور جلد ہونے والے اسباب کے ذریعہ سے اس کے لئے روپیہ جمع کرنے کے لئے ایسا بے چین تھا جیسے کہ میرے بدن میں آگ لگ رہی ہے۔ میں نے اپنی نوجوان عجلت میں یہ سوچا کہ کسی بڑے امریکی بہی خواہ کے پاس کیوں نہ چلا جائے۔ مثلاً مسٹر روک فیلر (MR. ROCKEFELLER) یا مسٹر کارنے جک (MR. CARNEGIC) اور ان سے ایک بڑی رقم کا عطیہ طلب کیا جائے۔؟

میرے نئے دوست مجھ سے عمر میں بڑے اور مجھ سے زیادہ عقلمند تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں چھ یا سات کروڑ مسلمانوں کی جماعت کے اندر یہ ہماری ہی ذمہ داری تھی کہ ہم علیگڈھ کے لئے روپیہ کا انتظام کریں۔ اگر ہم باہر کے آدمیوں سے مدد لینے کی کوشش کریں گے خواہ وہ مدد امریکہ کے سب سے زیادہ مالدار اور سب سے زیادہ انسانی بہبودی کا خیال کرنے والے کروڑپتی آدمیوں کی طرف سے ہو۔ تو ہم ہمیشہ کے لئے بے عزت ہو جائیں گے۔ وہ درحقیقت بالکل صحیح کہتے تھے۔ چونکہ یہ وہ زمانہ تھا جس نے دو عالمگیر جنگوں کا تجربہ حاصل نہیں کیا تھا اور جس نے "چوتھے نقطہ" کے متعلق کبھی نہ سنا تھا (POINT FOUR)۔ مگر اُس فیصلہ کی وجہ سے اور اُس جوش کی وجہ سے جو میرے اندر اُس کام کے لئے پیدا ہوگیا

تھا (جیساکہ اس قسم کے فیصلوں کا عام طور پر نتیجہ ہوتا ہے) ہم کو برسوں تک بہت سخت اور ہمہ گیر محنت کرنی پڑی۔ مختلف مقامات کے سفر کرنا۔ تقریریں کرنا۔ کمیٹیوں میں شریک ہونا۔ لوگوں کی بے رُخی کے خلاف جنگ کرنا اور اُن لوگوں سے بہت طویل بحثیں کرنا جو اعلےٰ رتبہ رکھتے تھے۔ یہ سب باتیں کرنی پڑیں جو ان لوگوں کی قسمت میں ہوتی ہیں جو کسی ایسی مہم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

مہذب ملکوں کی تاریخ میں کسی قوم کے دماغی اور روحانی احیا اور اس کی نئی زندگی کے لئے یونیورسٹی نے ایک سرچشمہ کا کام کیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ قسطنطنیہ میں امریکہ کے رابرٹ مشنری کالج (ROBERT MISSIONARY COLLEGE) کی وجہ سے بلگیریا (BULGARIA) ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے دوبارہ پیدا ہوگیا۔ بیروت میں (BEIRUT) امریکہ کی یونیورسٹی کے قیام کا جو اثر عرب قومیت پر ہوا اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ علیگڈھ اس کلیہ قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے مگر ہم فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ علیگڈھ صرف ہماری کوششوں کا نتیجہ تھا اور وہ کسی بیرونی فیاضی کا نتیجہ نہ تھا۔ اور یقین کے ساتھ اس بات کا بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی آزاد اور خود مختار قوم علیگڈھ کی مسلم یونیورسٹی کے اندر پیدا ہوئی۔

سفر کرنے کی وجہ سے تندرستی بحال کرنے اور دوبارہ طاقت حاصل کرنے کے بعد میں اس سال کے آخر میں اپنی شادی کی رسومات ادا کرنے کے لئے وطن کو واپس آیا۔ اُس وقت دو شادیاں ہو رہی تھیں۔ چونکہ اُسی زمانہ میں شہزادی کے بھائی یعنی میرے بھروسہ کے دوست آغا شمس الدین کی شادی ہماری ایک دوسری رشتہ کی بہن سے ہوئی تھی۔ ہماری شادیاں سب مناسب رسومات اور تفریحات کے ساتھ رچائی گئیں۔ اور اُس کے بعد رنج و غم نے مجھے اور میری دُلہن کو گھیر لیا۔

نوجوانی کی ناخوشگواری کی یہ ایک پُرانی گذری ہوئی کہانی ہے اور اُس کو مختصر طور پر اور غمگینی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہم دونوں ناواقف اور بے گناہ تھے۔

ہماری لاعلمی اور معصومیت نے ہم دونوں کے درمیان ایسی خلیج پیدا کر دی تھی جس کو عقلمندی اور احترام کے ساتھ استعمال کیا ہوا علم پاٹ سکتا تھا۔ ہم دونوں ایسے شرمیلے تھے کہ وہ علم حاصل نہ کر سکے اور ایسے سیدھے اور معصوم تھے کہ ہم یہ بھی معلوم نہ کر سکے کہ اس علم کو حاصل کرنے کے لئے کس طرح کام کریں۔ نرم دلی اور پھیلی ہوئی محبت ہماری تباہ شدہ حالت کے لئے کسی کام کی نہ تھیں۔ باوجودیکہ میری بیوی کے پاس وہ سب کچھ تھا جو میں اس کو دے سکتا تھا۔ ہماری حالت کچھ کم افسوسناک نہ تھی چونکہ اس زمانہ کے سخت اور آہنی رسوم کے مطابق وہ حالت عام طور پر پائی جاتی تھی اور وہ پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس رنج اور غلط فہمی کے لئے جو ہم کو تکلیف پہنچا رہی تھی سارا الزام میرے اوپر تھا اور اس سے اپنی بیوی کے لئے میری محبت بہت گہری ہو گئی۔ مگر اس کے لئے جو مایوس اور پریشان ہو چکی تھی وہ محبت جو میں نے ظاہر کی کوئی بدل یا معاوضہ نہ بن سکی۔ مجبور ہو کر ہم دونوں الگ ہو گئے۔ وہ ناراضگی اور لعنت و ملامت کے ایک پرائیویٹ گوشہ میں جو اس کے گناہوں کی تلافی کر سکے زندگی بسر کرنے لگی اور میں بیرونی دنیا کی مصروفیتوں اور دلچسپیوں میں لگ گیا۔

میرے لئے سکون جائز طور پر بہت آسان تھا۔ چونکہ میری سرکاری اور سیاسی زندگی بہت جلد مکمل اور زوردار ہو گئی اور میرے لئے بہت کافی سخت محنت کا کام کرنے کے لئے موجود تھا۔ اگرچہ میری شادی ایک تکلیف دہ ڈھکوسلا ثابت ہوئی مگر اُس سال ۱۸۹۷ء میں میرے فرائض اور میری ذمہ داریاں بہت حقیقی اور پرخلوص تھیں۔

اس سے ایک سال پہلے یہ منحوس افواہ شروع ہوئی کہ گلٹی والے طاعون کی وبا ایشیا میں مغرب کی طرف بہت سختی اور بے رحمی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ ہانگ کانگ میں یہ بیماری بُری طرح ہو رہی تھی۔ مغرب میں دور دور تک یہ بیماری مختلف مقامات پر ظاہر ہو رہی تھی۔ جب ۱۸۹۶ء کی گرمیوں کے آخر میں اس بیماری کا حملہ بمبئی پر ہوا تو عام طور پر لوگوں کا یہ قدرتی میلان تھا کہ اس بیماری کی خطرناکی کا یقین نہ کریں مگر تھوڑے عرصہ میں ہم سب اس بات کو ماننے کے لئے مجبور ہو گئے کہ یہ بیماری درحقیقت تباہ کُن

مقدار کی وبا تھی۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ میں طاعون کی اصلیت اور اسباب کا علم اُس وقت تک بے انتہا نامکمل تھا۔ بمبئی کے حفظانِ صحت کے افسر اس مصیبت کی وسعت اور اُس کی پیچیدگی سے پریشان ہو گئے تھے جو اس شہر پہ نازل ہوئی تھی۔ اسپر ان کا ردِ عمل بہت محتاط اور قدامت پسند تھا۔ ان کے پاس اس کا علاج تو تھا نہیں اور جو کچھ بچاؤ کی تدبیر وہ بتاتے تھے وہ عام صحت کے اصول پر ڈر ڈر کر بتاتے تھے۔ جس کی تعریف بے سوچے سمجھے کی جاتی تھی مگر وہ اس خاص مسئلہ کے لئے غیر موزوں تھی جس سے اُن کو واسطہ پڑا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کھُلی فضا میں رہو۔ اپنی اُن چھوٹی جھونپڑیوں میں، جھگیوں میں اور کوارٹروں میں ہَوا اور روشنی کو خوب آنے دو جن میں بمبئی پریذیڈنسی کے لاکھوں مزدور اور کاشتکار پیشہ چھوٹے طبقہ کے آدمی رہتے تھے۔ اور جب ہوا خوب اندر آجائے تو اُن میں تیز بو دار بیماری کو دور کرنے والی دوا چھڑک دو جتنی کہ چھڑک سکتے ہو۔ یہ احتیاطی تدبیریں صرف بے اثر ہی نہ تھیں بلکہ وہ ہندوستانی عوام کی جمی ہوئی اور مستقل عادتوں کے خلاف تھیں۔ اگر ان تدبیروں سے کچھ فائدہ ہوتا تو اُن کے متعلق کچھ بے پروائی نہ برتی جاتی۔ مگر چونکہ انہوں نے کچھ کام نہ کیا اور موتوں کی تعداد بہر روز بڑھتی گئی۔ اس لئے یہ بات لازمی تھی کہ اُن کے خلاف ناراضگی کے جذبات بڑھتے گئے۔

یہ بہت خطرناک زمانہ تھا۔ طاعون نے اپنا برا اور روایاتی اثر عوام کی ذہنیت پر ڈالا تھا۔ قانون اور نظام حکومت کے لئے احترام بُری طرح غائب ہو گیا تھا۔ لوٹ مار اور وحشیانہ حرکتیں ہونے لگیں۔ شراب خواری اور بدکاری بڑھ گئی اور گورنمنٹ کے خلاف اُس بے تکے اور بے اثر طریقہ کی وجہ سے جس پر وہ اس نازک موقعہ کا مقابلہ کر رہی تھی بہت تلخ جذبات پیدا ہو گئے۔ یہ حالت اپنی انتہائی حد کو اُس وقت پہنچ گئی جب ایک سینیئر برطانوی عہدہ دار کو قتل کر دیا گیا (جب وہ گورنمنٹ ہاؤس کے کسی رسمی جلسہ سے اپنے مکان کو واپس آرہا تھا)، جو اُن احتیاطی تدابیر کا ذمہ دار تھا۔ جو اُس وقت کی جا چکی تھیں ایسا اتفاق ہوا کہ بمبئی کی گورنمنٹ کے پاس ایک مشہور سائنس دان اور ریسرچ کا کام

کرنے والا آدمی تھا (RESEARCH WORKER) یعنی پروفیسر ہیفکن (HAFFKINE) جو روس (RUSSIA) کا ایک یہودی تھا۔ جو ہیضہ کے متعلق مسائل پر کام کرنے کے لئے آیا تھا۔ جس نے سرکاری افسروں کو اس بات کی ترغیب دی تھی کہ ہیضہ کا علاج عام طور پر سب لوگوں کے ٹیکہ لگانے سے کیا جائے اور اُس کو اس معاملہ میں کافی کامیابی ہو چکی تھی۔ وہ ایک مستقل مزاج اور مضبوط آدمی تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ٹیکا لگانا ایسا طریقہ تھا جس سے گلٹی والے طاعون کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اس نے بمبئی کے سرکاری حلقوں میں اپنے خیالات زور کے ساتھ ظاہر کئے مگر اس کو پوری کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے چاروں طرف اختلافی بحث زور پکڑ گئی اور اس کو بہت کم موقعہ ملا کہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنائے۔ اس اثنا میں لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے تھے اور اُن میں میرے بہت سے مرید تھے۔

مجھے احساس تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ علاج ضرور کرنا چاہئے۔ اور مجھے اس کا احساس بھی تھا کہ لازمی طور پر مجھے اس معاملہ میں ابتدا کرنی چاہئے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں میری سائنس کی معلومات بالکل مفقود نہ تھی مجھے فرانس میں پاسٹیور کے کام سے کچھ واقفیت ہو چکی تھی (PASTEUR) مجھے یقین تھا کہ سرجن جنرل (SURGEON GENERAL) کا محکمہ غلط طریقوں پر کام کر رہا تھا۔ میں نے اُس کو چھوڑ دیا اور پروفیسر ہیفکن (HAFFKINE) سے براہ راست خطاب کیا۔ اُن کے اور میرے درمیان ایک فوری تعلق اور دوستی پیدا ہو گئی جو اس خطرناک کام تک محدود نہ تھی جو ہم کو اس وقت کرنا تھا۔ یہ کام اس وقت بہت کافی ضروری ہو گیا تھا۔ میں ان کے لئے فوراً کم از کم یہ کر سکتا تھا کہ اُن کے ریسرچ اور لیبو ریٹری کے کام کے لئے سہولتیں پیدا کر دوں۔ (RESEARCH AND LABORATORY) میں نے اپنا ایک بڑا مکان جو ایک وسیع اور کشادہ محل تھا اور آغا ہال سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا آزادی کے ساتھ اُن کے سپرد کر دیا۔ یہ مکان آجکل مزگاؤں کے سینٹ میری کالج کا ایک حصہ ہے (ST. MARY'S COLLEGE, MAZGAON)

اس مکان میں وہ جم گئے اور وہاں پر وہ تقریباً دو سال تک رہے۔ جب تک کہ ہندوستان کی حکومت نے جو اُن کے طریقوں کی کامیابی کا یقین کر چکی تھی اس تمام ریسرچ کے منصوبے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کو مناسب مکمل اور سرکاری طریقہ پر چلانا شروع کیا۔

اس اثنا میں مجھے بہت تیزی اور سختی کے ساتھ کام کرنا تھا۔ طاعون کا اثر خاص میرے مریدوں کے درمیان بہت خوفناک ہوگیا تھا۔ یہ میرے اختیار میں تھا کہ میں ان کے سامنے ایک مثال پیش کروں۔ اس لئے میں نے خود عام پبلک کے سامنے ٹیکہ لگوایا اور میں نے اس کا خیال رکھا کہ جو کام میں نے کیا تھا اس کی خبر جتنی دور تک ممکن ہو اور جتنی جلد ممکن ہو پھیلادی جائے۔ میرے مرید خود دیکھ لیں گے کہ مجھ کو جو اُن کا امام تھا اور جس نے اس پُراسرار اور خوفناک عمل کو بہت سے گواہوں کی نگاہ کے سامنے اپنے اوپر کرایا تھا کوئی نقصان اُس کی وجہ سے نہیں ہوا تھا۔ بیماری سے محفوظ رہنا جس کا ظاہری ثبوت میری مسلسل تندرستی اور میری مصروفیتیں تھیں میرے مریدوں کے احساس پر اثر کرگیا اور اُس نے اُن کے خوف پر غلبہ حاصل کرلیا۔

میں اُس وقت بیس سال کا تھا۔ میں نے ہیفکن کے ساتھ اُس زمانہ کے ڈاکٹری خیالات اور رائے کے خلاف جو پرانے اور سخت قسم کے تھے اور جو یورپین لوگوں میں بھی ایسے ہی پائے جاتے تھے جیسے کہ ایشیائی لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ ایک محاذ قائم کیا۔ جب ڈاکٹر لوگ ہی ٹیکہ لگنے کے اصول کے خلاف تھے تو معمولی آدمیوں کے خیالات کا کیا ذکر تھا۔ جو خود میرے خاندان والوں میں۔ میرے ملازموں میں اور عام لوگوں میں تھے معمولی آدمی بے انتہا خوف زدہ تھے۔ نصف صدی سے زائد پچھلے زمانہ پر نظر ڈالتے ہوئے۔ کیا اس بات کا احساس میرے لئے حق بجانب نہ ہوگا کہ میں نے ایک نوجوان آدمی ہوتے ہوئے بھی ہمت و استقلال کا اظہار کیا۔؟

بہرحال اس طرز عمل نے کام کیا۔ میرے خاص مریدوں میں یہ خبر تیزی کے ساتھ دورہ کرگئی جیساکہ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ کرجائے کہ ان کے امام نے ٹیکہ لگوالیا تھا اور اُن کو اس مثال کی پیروی کرنی تھی۔ میں نے ارادتاً اپنی لیڈری کا امتحان لیا۔ وہ باقی رہی اور اس نے ایک نئے اور شاید ڈراما والے طریقہ پر خود کو پختگی کے ساتھ قائم کرلیا۔ میرے مریدوں نے ٹیکہ لگوانا شروع کیا اور چند جداگانہ صورتوں میں نہیں بلکہ ایک جماعت کی حیثیت سے ٹیکے لگوائے۔ کچھ عرصہ کے اندر موتوں کے نقشہ جات کا نتیجہ

صاف طور پر میرے موافق تھا۔ یعنی طاعون سے مرنے والوں کی تعداد اسماعیلیوں کے درمیان قوم کے کسی دوسرے فرقہ کی نسبت بہت کم ثابت ہوئی۔ نئے مریضوں کی تعداد جو دوسروں کا مرض لگنے سے ہوتی تھی بہت تیزی کے ساتھ گھٹ گئی اور آخر میں تندرست ہونے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔

زندگی میں انسان کی سب سے پہلی جنگ ہمیشہ سے بہت اہمیت رکھتی ہے میری اس جنگ نے مجھے بہت کچھ اپنے متعلق اور دوسرے لوگوں کے متعلق سکھایا۔ میں نے سرکاری بے رخی اور قدامت پسندی۔ خوف اور جہالت کے خلاف جنگ کی۔ میرے ماضی نے میرے مستقبل کی پیشین گوئی کی چونکہ یہ میرے دشمن تھے۔ جو میری تمام زندگی میں بار بار مجھ پر حملہ کرنے والے تھے۔

اس وقت جب کہ یہ نازک حالت گذر چکی تھی میں اپنی عمر سے زیادہ سست اور فکرمند محسوس کیا جا سکتا تھا۔ مگر میرے اندر ایک اندرونی خود اعتمادی اور قوت موجود تھی جس کو قسمت کے عارضی اور گذرنے والے موڑ توڑ آئندہ کے لئے نہیں ہلا سکتے تھے۔ اُس اثر و اختیار کا جو میں نے استعمال کیا تھا ایک ضمنی نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اسماعیلی مریدوں کے علاوہ دوسرے لوگوں نے میری طرف لیڈری کے لئے دیکھنا شروع کیا۔
سنہ ۱۸۹۷ء ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کا سال تھا (DIAMOND JUBILEE) یہ بات قدرتی تھی کہ اپنے اسماعیلی فرقہ کا موروثی امام ہونے کی حیثیت سے میں شملہ جا کر وائسرائے لارڈ ایلجن (LORD ELGIN) کی خدمت میں وفاداری اور ملکۂ معظمہ کو مبارکبادی کا ایڈریس پیش کروں۔ مگر در اصل میں وہاں پر تین حیثیتوں سے گیا اور میں نے تین ایڈریس پیش کئے۔ ایک خاص میری جماعت کی طرف سے تھا۔ دوسرا مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا لیڈر اور نمائندہ ہونے کی حیثیت سے تھا اور تیسرا بمبئی اور پونا کے شہریوں کی ایک نمائندہ جماعت کی طرف سے تھا۔

لارڈ ایلجن (LORD ELGIN) نے مہربانی اور مہمان نوازی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ مجھے فیلڈ مارشل جورج وہائٹ نے جو اُس وقت ہندوستان کے کمانڈر انچیف تھے

لنچ پر مدعو کیا۔ (FIFLDMARSHAL SIRGEORGE WHITE) ان فیلڈ مارشل کا عرفی نام سرجارج دی ڈریگن کلر تھا۔ (SIR GEORGE, THEDRAGON KILLER) اور کوئی شخص اس نام کے لئے ان سے زیادہ موزوں نظر نہ آتا تھا جو ایسے رعب دار۔ خوبصورت پُرانے فوجی آدمی تھے اور بہت زیادہ اونچے قد کے۔ مضبوط جسم کے اور پکا چہرہ رکھنے والے تھے۔ لنچ کے موقعہ پر اُن کے پاس بیٹھے ہوئے مجھے اس بوڑھے آدمی کی شکل فوراً یاد آجاتی ہے۔ جو پہاڑی فوجی لباس پہنے ہوئے تھا۔ جس کے ہاتھ میں اسکاٹ لینڈ کی تلوار تھی (CLAYMORE) جو سب آنے والوں کو خواہ وہ انسان ہوں یا جانور خوفناکی کے ساتھ ڈانٹتا تھا۔ ان میں ایک یا دو اژدہے ہوں۔ فوجی سواروں کا کوئی دستہ ہو۔ یا بارہ سنگوں کا کوئی جھنڈ ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اُس نوجوان آدمی میں اُسوقت بھی افسانہ والی دلیری کا ایک رنگ پایا جاتا تھا۔ جس نے بہت سنجیدگی اور مناسبت کے ساتھ اپنے تین سرکاری ایڈریس وائسرائے کے سامنے پیش کئے تھے۔

میں بمبئی کو واپس ہوا تاکہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ اہم سفر کے لئے جو میں اس وقت تک کرچکا تھا تیاری کروں۔

میں اُس یورپ کا حال معلوم کرنے کے لئے روانہ ہوا جس کے متعلق میں نے بہت زیادہ پڑھا تھا اور سنا تھا اور جو مجھ کو بہت اصرار اور زبردست کشش کے ساتھ بلا رہا تھا۔

ہمارے اس پریشان اور لڑائی کے مارے ہوئے زمانہ میں اس شان وشوکت اور اس امن وسکون کو یاد کرنا جو اُنیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں مغربی یورپ کی تہذیب کو حاصل ہوا تھا ایسی گہری غمگینی کی بات ہے جو وطن سے دور ہونے کی بیماری میں پائی جاتی ہے۔ جوان ہونے کی حیثیت سے میں نے اس پُرانی دنیا کو اُس کے انتہائی عروج پر دیکھا اور اس کے عجیب اور تیز تنزل کی سب تبدیلیوں کو غور سے دیکھنے کے لئے میں اب تک زندہ رہا ہوں۔ جب میں نے یورپ کی سرزمین پر پہلی مرتبہ قدم رکھا تو اس وقت ۱۸۴۸ء کے انقلابات کو ختم ہوئے ٹھیک نصف صدی

گذر چکی تھی۔ امن وسکون۔ خوش حالی اور ترقی کا دور عالمگیر اور ہمہ گیر معلوم ہوتا تھا یہ بات سچ تھی کہ ۱۸۷۰ء کی فرانس و جرمن کی جنگ نے ان لوگوں کو کافی خوفناک تنبیہ دیدی تھی جس کا ان کو پہلے سے علم تھا۔ مگر اکثر آدمیوں کے لئے وہ لڑائی ایک عارضی اور قابلِ افسوس انحراف معلوم ہوتا تھا۔ جو انسانی بہبودی کے ایک عام اور مستقل میلان کے خلاف کیا جا رہا تھا۔ برطانیہ جس کی عالمگیر سرداری جو اُس کی مطلق بحری قوت پر منحصر تھی ناقابلِ مخالفت معلوم ہوتی تھی۔ اپنی شاندار ملکہ کے زیر حکومت ایسا طاقتور اور خوش حال تھا جیسا کہ وہ پہلے کبھی نہ تھا۔ ۱۸۱۵ء کے بعد سے وہ کسی بڑی یورپ کی جنگ میں دخل دینے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا اور اس کے سیاست دان اور بین الاقوامی سفیروں کی نسلوں کو اس ضروری فن اور فرض کے لئے تربیت دی جاتی تھی کہ یورپ میں قوت کا توازن قائم رکھیں۔ فوجی۔ تمدنی اور اقتصادی خطرات اور بے چینی کی بعض خطرناک علامات کے باوجود ۱۸۹۸ء کے یورپ میں امن وسکون اور مالداری کا رنگ غالب تھا۔

میں فروری کے شروع میں بمبئی سے یورپ کے لئے روانہ ہوا۔ اُس وقت میری عمر بیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ میرے گھر کے دو آدمی میرے ذاتی متعلقین کی حیثیت سے میرے ساتھ چلے تھے۔ ہم مارسیلز (MARSEILLES) سے ایک بالکل نئے جہاز میں روانہ ہوئے جو میسجریز (MESSAGERIES) کے بحری جہازوں میں سے تھا۔ برسبیل تذکرہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بہر حال جہاں تک ہندوستان۔ افریقہ اور مشرق بعید کے سفروں کا تعلق ہے ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی آخری زمانہ کے پُرانے جہاز سفر کرنے کے لئے ان جہازوں سے بہت زیادہ بہتر تھے جو اُن کے بعد بیسویں صدی کے "آرام کے جہاز" کہلاتے تھے۔ اُن کے کمرے زیادہ کشادہ اور آرام دہ تھے اور اُن میں رہنے کی تمام سہولتیں بہتر مہذب پیمانہ پر تھیں۔ ظاہری نمائش کی زیادتی اور کرومیم (CHROMIUM) دھات کی چادریں میرے خیال میں مستقل آرام کی کمی کا بدل نہیں ہوسکتیں۔

مارسیلز (MARSEILLES) سے میں براہ راست نیس کو (NICE) روانہ ہوگیا۔ اس وقت ریورا (RIVIERA) کا موسم سرما اپنے انتہائی زور پر تھا اُس زمانہ میں جنوبی فرانس میں گرمی کا کوئی موسم نہ ہوتا تھا۔ کوٹ ڈی آزر (COTE D'AZUR) کے کنارے ہر مقام پر ہر ہوٹل بالکل بھرا ہوا تھا اور مجھ کو قیام کی جگہ ملنے میں انتہائی مشکل پیش آئی۔ بہرحال شاہی خاندان کے افراد اور یورپ کے رئیسوں اور شریفوں کی کافی تعداد اس سمندری کنارہ والے قطعہ پر جمع ہو گئی تھی۔ ملکۂ وکٹوریہ سیمز کے مقام پر تھیں (CIMIEZ) اور آخر کار مجھے اُس ہوٹل میں ایک کمرہ مل گیا جس میں ملکہ مقیم تھیں اور ایک چھوٹی حیثیت کا آدمی ہوتے ہوئے میں اُس وسیع۔ شاندار حکمران اور مال دار جماعت کے درمیان موجود تھا جو ریورا کا موسم (RIVIERA) منانے کے لئے وہاں جمع ہوئی تھی۔ شہنشاہ فرانز جوزف (FRANZ JOSEPH) کیپ مارٹن (CAPMARTIN) کے مقام پر تھے۔ روس کے بڑے شہزادے (GRAND DUKES) اور آسٹریا کے شہزادے جو بیس[20] کے قریب تھے اپنے بنگلوں اور محلوں میں تھے۔ انگریزوں کے رئیس طبقہ کی نصف تعداد اور صنعت وحرفت اور مالیات کے لکھ پتیوں کی تعداد جو آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھی۔ جرمنی کے۔ آسٹریا ہنگری کی سلطنت کے۔ اُن بلقانی ملکوں کے جو حال میں عثمانیہ حکومت سے آزاد ہو چکے تھے۔ اور زار والے روس کے (TSARIST RUSSIA) مال دار اور حکمران طبقہ کے آدمی وہاں موجود تھے۔ وہ نوجوان آدمی جو بمبئی سے گیا تھا اُن کو دیکھ کر حیران اور رعب زدہ ہوگیا۔

میں کسی شخص کو نہ جانتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے ذاتی متعلقین کے علاوہ وہ لوگ جن سے میں کچھ بات کر لیتا تھا ہوٹل کے اسٹاف والے تھے اور وہ عہدہ دار تھے۔ جو کیسینو (CASINO) کے مقام پر مونٹے کارلو (MONTECARLO) میں تھے۔ مگر میں نے وہاں چیزوں کو دیکھنے اور لوگوں کی باتیں سننے میں بہت زیادہ تفریح حاصل کی۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر بہت دور دور نکل جاتا تھا۔ سیمز (CIMIEZ) سے لیکر

سمندر کے کنارے کنارے مونٹے کارلو (MONTE CARLO) اور مینٹن (MENTON) تک۔ میں دوکانوں کی کھڑکیوں میں جھانک کر دیکھتا تھا۔ اور کونسی دوکانوں میں؟ خاص طور پر جوہریوں کی دوکانوں میں! پچاس سال سے زائد گذر جانے کے بعد میرے اندر اُس ٹھوس دولت کی یاد بہت وضاحت کے ساتھ باقی ہے۔ جو یورپ کے سب سے زیادہ مالدار آدمیوں کو دکھانے کے لئے نمائش کے طور پر باہر رکھی جاتی تھی۔ خواہ وہ آدمی انگلستان کے دولت مند یا زمیندار تھے یا ماسکو (MOSCOW) کے کارخانوں کے مالک تھے۔ وہاں پر آجکل کے زمانہ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں نہ تھیں۔ سونے اور چاندی کے ٹکڑے اور بیکار قسم کے پتھر جن سے نمائشی آرائش کی چیزیں بنائی گئی ہوں وہاں پر نہ تھے۔ بلکہ وہاں پر اصلی قسم کے جواہرات تھے۔ بڑے چمک دار ہیرے۔ موتی۔ یاقوت۔ زمرد اور نیلم جو موسم سرما کے سورج کی تیز روشنی میں جگ مگ کر رہے تھے۔

کینس (CANNES) نیس (NICE) اور مونٹے کارلو (MONTE CARLO) کے مقام پر سیر کے وقت تمام سڑکیں بڑے اور مالدار آدمیوں کی گاڑیوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ خوبصورت لینڈو اور وکٹوریا گاڑیوں سے جن میں اعلیٰ قسم کے تیز رفتار گھوڑے لگے ہوئے تھے اور جن پر کوچوان اور ملازم چمک دار وردیاں پہنے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مونٹے کارلو (MONTE CARLO) کے مقام پر ہوٹل ڈی پیرس (HOTEL DEPARIS) کے سامنے ایک یا دو خود رو گاڑیاں عجائبات کی طرح دکھانے کے لئے کھڑی رہتی تھیں۔ وہ نفرت کیسی پرلطف تھی جس کے ساتھ وہاں کا فیشن والا مجمع ان شور دار اور بودار کھلونوں کو دیکھتا تھا۔ اُسوقت کوئی شخص پیش بینی کر کے یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ وہ خود رو گاڑیاں یا کھلونے آئندہ زمانہ میں ترقی کر کے نہ صرف آجکل کے (CONCOURS D'ELEGANCE) ٹھاٹ کا سامان بن جائینگی۔ بلکہ ایسے بڑے۔ چاندی کے بازو والے اور گیس سے چلنے والے ہوائی جہاز بن جائینگی جو آسمان کی بلندی پر اِدھر اُدھر شور مچاتے پھرتے ہیں۔

باوجودیکہ تمام قصبوں اور دیہات میں جو کوٹ ڈی آزر کے کنارے پر واقع تھے (COTE D'AZUR) کسی حد تک خوش حالی پھیلی ہوئی تھی اور باوجودیکہ کوئی شخص بھوکا اور پھٹے ہوئے کپڑوں میں نہ تھا۔ اور غریب سے غریب آدمی بھی کم از کم ایک مرتبہ دن میں گوشت کے ساتھ پورا کھانا پیٹ بھر کر کھالیتا تھا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ میں ریورا کے مقام پر (RIVIERA) رہنے سہنے کا خرچ سستا پڑتا تھا۔ میں بہترین ہوٹل میں ٹھیرا ہوا تھا اور میرے ساتھ میرے دو ملازم تھے۔ اس طرح پر میرا روزانہ ہوٹل کے خرچ کا بل جس میں سب چیزیں شامل ہوتی تھیں مگر اس میں کوئی فضول خرچی اور کسی قسم کا دعوت وغیرہ کا خرچہ نہ ہوتا تھا۔ تقریباً دو سو سونے کے فرنیک (FRANK) کا ہوتا تھا۔ آجکل کے حساب کے بموجب وہ بل تقریباً چالیس ہزار فرنیک روزانہ کا ہوگا۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ میں آجکل اسی شرح اور اسی پیمانہ پر رہ سکوں جس پر میں اپنے پہلے سفر میں رہا تھا تو موجودہ زمانہ کے حساب سے میرا بل تقریباً چھ اور سات ہزار فرنیک کے درمیان ہوگا۔ اس طرح پر ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ کے معیار زر کی نسبت سے زندگی کا خرچہ۔ گویا اس زمانہ میں اس قسم کی زندگی کا خرچہ جیسی کہ میری تھی آجکل کی نسبت سے پانچ یا چھ گنا زیادہ تھا۔

چونکہ میں اسی ہوٹل میں ٹھیرا ہوا تھا جس میں ملکہ وکٹوریہ تھیں اس لئے مجھے اس کے اکثر موقعے ملتے تھے کہ میں ان کو دیکھوں کہ وہ اپنی لینڈو میں روزانہ تفریح کے لئے باہر جا رہی ہیں اور وہاں سے واپس آرہی ہیں۔ اُن کو اپنی گاڑی کے اندر بٹھانے اور باہر آنے کے لئے ان کے ذاتی خانگی معاملات کے محکمہ کے ہندوستانی ملازم مدد دیتے تھے۔ میں اور میرے ملازم اسی نتیجہ پر پہنچے جو ایک قسم کا عجیب سا نتیجہ تھا۔ اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس نتیجہ کی مزید تائید آئندہ چل کر اُس وقت ہوگئی جب میں نے اُن کے ملازموں کو ونڈسر (WINDSOR) کے مقام پر بہت قریب سے دیکھا۔ وہ نتیجہ یہ تھا کہ ملکہ کے خدمتگار صاف طور پر دوسرے درجہ کے ملازم تھے۔ اس قسم کے ملازم جو آپ کو ہوٹلوں اور ریسٹورانٹوں میں ملتے ہیں اور اس قسم کے ملازم جو کسی نووارد یا عارضی قیام کرنے والے یورپین آدمی کو اُس پہلے

ہوٹل میں مل جاتے ہیں جہاں وہ قیام کرتا ہے۔ یہ ملازم اُن قابل تعریف۔ قابل اعتماد اور بہت اونچی تنخواہ والے آدمیوں سے بہت مختلف اور بہت کمتر درجہ کے ہوتے ہیں جن کو آپ نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے تمام زمانہ میں وائسرائے کی کوٹھی پر یا کسی صوبہ کے گورنمنٹ ہاؤس میں دیکھا ہے۔ یہ بہت عجیب بات معلوم ہوتی ہے اور صفائی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اب بھی ایسی ہی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس کا یہ سبب ممکن تھا کہ جو تنخواہ اُن کو دی جاتی تھی وہ اتنی اچھی نہ تھی کہ اول درجہ کے آدمیوں کو سمندر پار جانے کے لئے آمادہ کرے؟۔ ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے بعد قدرتی طور پر اس میں تبدیلی واقع ہوئی۔ اُسکے بعد متعدد بادشاہوں کے پاس کوئی ہندوستانی کام کرنے والے ملازم نہ تھے مگر شاہی خاندان کے اندر ہندوستانیوں کو اے۔ڈی۔سی (A.D.C) اور اردلی افسر بنانے کے لئے چند اعزازی ملازمتیں تھیں۔

میں نے ریورا (RIVIERA) کے مقام پر دس قابل یاد دنوں تک قیام کیا۔ اور پھر میں پیرس کے لئے روانہ ہوگیا۔ میں نے اس زمانہ کے جہازوں کے آرام کی تعریف کی ہے۔ مگر نہیں۔ سونے کی گاڑیاں ایسی نہ تھیں۔ جس شخص کو موجودہ زمانہ کی ویگن لٹ (WAGONLIT) یا پلمین کاروں (PULLMANCARS) کا تجربہ ہے اور شاید بلیو ٹرین (BLUETRAIN) کی شان وشوکت کا تجربہ ہے۔ اس شخص کو سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ اور سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک کے ابتدائی سالوں میں اُن تنگ پُرانے زمانہ کی گاڑی کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا جس کو سونے کی گاڑی کہا جاتا تھا۔ بہر حال اُس نے مجھے پیرس (PARIS) پہنچا دیا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں اُس وقت بیس سال کا تھا۔ میں نے اُنیسویں صدی اور اُس سے پہلے کی فرانسیسی تاریخ اور فرانسیسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ میں پیرس کی سڑکوں کو جانتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پیرس والے کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ کس طرح کام کرتے تھے اور کس طرح سوچتے تھے۔ میرے خوابوں میں اور میرے مطالعہ میں دو نیپولین والا پیرس تھا۔ (PARIS OF THE TWO NAPOLEONS) بالزیک (BALZAC) اور بیرس (BARRES) والا پیرس تھا۔ چوڑی روشوں والا اور سڑکوں پر گاڑیوں کی قطاریں رکھنے والا

پیرس تھا۔ میں سوائے اُس مشہور برسٹل ہوٹل کے (BRISTOL HOTEL) اور کہاں ٹھیر اتھا؟ میں نے اپنی آمد کی پہلی صبح کو سوائے اس کے اور کیا کام کیا تھا کہ میں برطانوی سفارتخانہ میں ملنے کے لئے گیا تھا؟۔

میں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں ایک سنجیدہ نوجوان آدمی تھا اور مجھے اپنی کلچر اور اپنے علمی مذاق کا بہت گہرا خیال تھا۔ برطانوی سفیر کی عدم موجودگی میں اُن کے وزیر نے مجھے وہ تعارفی خطوط دیئے جن کی مجھے ضرورت تھی اور اُن خصوط کی تائید کی جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں کارنوال (CARNAVALET) عجائب خانہ میں گیا۔ لوور گیا۔ (LOUVRE) وہاں کی قومی لائبریری ببلیوتھیک نیشنل (BIBLIOTHEQUE NATIONALE) میں گیا۔ وہاں ایم سولومن ریناک (M. SOLOMON REINACH) کے ساتھ جو ایک مشہور ماہر آثار قدیمہ تھے۔ مشرقی کتابوں کے مہتمم نے مجھے چاروں طرف سیر کرائی۔ انہوں نے کہا کہ اُن کو اس پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک نوجوان آدمی جو انگریزی اور فرانسیسی ایسی روانی کے ساتھ بولتا تھا۔ وہ فارسی اور عربی کے قدیم قلمی نسخوں کو آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا تھا۔ مجھے اپنی طرف سے اس پر تعجب ہوا مگو میں نے اس کا اظہار نہیں کیا، کہ ایسا فاضل آدمی اس بات کو بھول جاتا ہے کہ فارسی اور عربی بالآخر میرے وطن کی زبانیں تھیں جو میرے مورثوں نے سینکڑوں سال تک بولی تھیں۔

میرے دوست پروفیسر ہیفکن (HAFFKINE) نے بمبئی میں مجھے ایک تعارفی خط پاسٹور انسٹیٹوٹ کے ڈاکٹر روکس کے (DR. ROUX OF THE PASTEUR INSTITUTE) نام دیدیا تھا۔ شام کے وقت میں تھیٹر اور اوپرا میں چلا جاتا تھا۔ پیرس میں اُس وقت تھیٹر کا موسم نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ کھیل اور وہ نفاست جو میں نے ریویرا (RIVIERA) کے مقام پر دیکھی وہاں موجود نہ تھی۔ پھر بھی میں نے وہاں پر کومیڈی فرانکیش میں (COMEDIE FRANCAISE) میڈم بارٹٹ (MADAME BARTET) کو دیکھا اور خیال کیا کہ وہ اُن سب ایکٹریسوں سے زیادہ دلفریب اور کامل ایکٹرس تھی جو میں اپنی عمر میں دیکھ چکا تھا اور اب بھی ایک پوری زندگی کا زمانہ گذرنے کے بعد یہ میرا وہ فیصلہ ہے جس کو بدلنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں

ہوتی ہے۔ میں نے سارا برنہارڈٹ (SARA BERNHARDT) کو دیکھا مگر میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اُس سے میں بہت مایوس ہوا۔ میرا کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ وہ بارٹٹ (BARTET) کی برابر ہو سکتی تھی۔ میں چند مرتبہ اوپرا (OPERA) میں گیا اور سوائے فاؤسٹ (FAUST) کے ہر اوپرا جو میں نے دیکھا میر بیر کا (MEYERBEER) تیار کیا ہوا تھا۔ آجکل میر بیر کے اوپرا کو کون سنتا ہے؟ اُس کی شہرت ایک دم ڈول کی طرح نیچے گر گئی۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ اُس کے ساتھ ناانصافی کی گئی اور ایسی خوفناک توہین کی گئی جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ "ویگنر" (WAGNER) نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ وہ موزارٹ (MOZART) یا وردی (VERDI) کے بہترین کاموں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مگر میں بڑے شوق کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہوں کہ میر بیر (MEYERBEER) کو دوبارہ ترقی دینا کافی کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔

پیرس میں میرا تمام وقت صرف 'کلچر' کا مطالعہ کرنے میں ہی نہیں گذرا۔ میرے پاس جاکی کلب کے ممبروں کے نام تعارفی خطوط موجود تھے۔ میں گھوڑ دوڑ دیکھنے کے لئے بھی گیا اور پندرہ روز بعد میں لندن کے لئے روانہ ہو گیا۔

میری پرائیویٹ نامعلوم حیثیت جس میں اُس وقت تک میں نے سفر کیا تھا اب ممکن نہ رہی تھی۔ میں سلطنت کے مرکز اور دارالخلافت میں پہنچ گیا تھا۔ اسٹیشن پر میرا استقبال کرنے کے لئے جب میں وہاں پہنچا بکنگھم پیلیس (BUCKINGHM PALACE) کا ایک سرکاری افسر جو ملکہ معظمہ کی نمائندگی کر رہا تھا موجود تھا۔ انڈیا آفس (INDIA OFFICE) کی سکریٹری آف اسٹیٹ (SECRETARY OF STATE) کی نمائندگی کرنے والا اُن کا پولیٹیکل اے۔ ڈی۔ سی (POLITICAL A.D.C.) تھا۔ یعنی سر جورج فٹز جرالڈ (SIRGEORGE FITZGERALD) میں پکاڈلی کے (PICCADILLY) البی مارل ہوٹل میں گیا (ALBEMARLE) جو اُس موسم بہار اور گرمیوں کے زمانہ میں میرا ہیڈ کوارٹر اور مرکز رہا۔

میرے ہوٹل پہنچنے پر کچھ دیر بعد ڈیوک آف کیناٹ (DUKE OF CONNAUGHT) جو

مجھ سے میرے بچپن اور لڑکپن میں میرے وطن پر واقف ہو چکے تھے مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ برطانوی شاہی خاندان کو جو گہری اور دوستانہ دلچسپی میرے ساتھ تھی اُس میں کچھ کمی نہ ہوئی تھی۔

سن ۱۸۹۰ء اور سن ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ کا لندن ایسا تھا جس کے متعلق بہت کچھ اور اتنا حد سے زیادہ لکھا جا چکا تھا کہ طبیعت اُکتا جائے۔ پھر بھی وکٹوریہ کے دورِ حکومت میں اُس کے روشن اور بہترین زمانہ کا لندن ایسا مقناطیسی اثر اور شان و شوکت رکھتا تھا جس کے متعلق مبالغہ کرنا مشکل ہے یعنی اُس آرام۔ اطمینان و سکون۔ مالداری اور خود اعتمادی کے متعلق جو وہاں پائی جاتی تھی۔ وہ شہر مہذب دنیا کا مالیاتی مرکز تھا جو بے انتہا مالدار اور بے انتہا طاقتور تھا۔ ویسٹ منسٹر (WESTMINISTER) سے ایک بڑی سلطنت کا انتظام فیاضانہ یقین کے ساتھ ہوتا تھا۔ اگرچہ دفتر خارجہ کا کام گندا تھا اور آسانی کے ساتھ نہ چلتا تھا۔ اگرچہ انڈیا آفس نے جو طریقے ایک برِّصغیر کا انتظام کرنے کے لئے استعمال کر رکھے تھے وہ تکلیف دہ اور پُرانے زمانہ کے تھے۔ پھر بھی اِس سے کون انکار کر سکتا تھا کہ اُس چند ایکڑ والے چھوٹے حصہ میں طاقت اور حکومت کا ناقابلِ مخالفت احساس سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گیا تھا؟ اُس طاقت اور اُس حکومت کی ظاہری نمائش بہت شان کے ساتھ اثر ڈالنے والی تھی۔ پاؤنڈ اسٹرلنگ (POUND STERLING) ایک سونے کی ساورین (SOVEREIGN) کی برابر تھا جس کی قیمت آجکل اُس کے برابر کاغذی سکہ سے آٹھ گنی زیادہ تھی۔ امیر اور غریب کے درمیان جو فرق اور درجے تھے وہ بہت گہرے تھے اور ایک حد سے دوسری حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ پھر بھی سوسائٹی کے اندر زیادہ تر خوش حالی کا عام احساس پھیلا ہوا تھا۔ وہاں پر کوئی من مانی حکومت نہ تھی (WELFARE STATE) مگر یہ زبردست اور دل پسند جذبہ موجود تھا کہ برطانیہ چوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اور عوام کی کثیر تعداد کے لئے زندگی میں خوشی۔ قوت اور مہم پسندی پائی جاتی تھی۔ اصلی اختیار۔ سیاسی اور اقتصادی۔ چند آدمیوں کے ہاتھ میں تھا۔ انگلستان اور کل سلطنت کے حکمران رئیس طبقہ کے ایک مختصر اور محدود

دائرہ میں شامل تھے اور اُس میں ترقی کرنے والے عوام کے وہ افراد بھی شامل تھے جو رئیس طبقہ کے ساتھ مل گئے تھے۔ اور جن کو اُس رئیس طبقہ نے منظور کر لیا تھا۔ میرے رتبہ اور اُن شاندار تعلقات کی وجہ سے جو میں رکھتا تھا۔ اُس رئیس طبقہ تک میری رسائی فوراً اور براہِ راست ہو گئی۔ میں نے جس کی عمر اتنی ہو چکی ہے کہ اُس یورپ کے بڑے حصہ میں جو کسی زمانہ میں مہذب تھا۔ عوامی لیڈر اور ڈکٹیٹر (DICTATOR) دونوں کو حکومت کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ اپنی نئی جوانی میں بہت قریب سے اُن چند آدمیوں کی حکومت کو بھی دیکھا ہے جو وکٹوریہ کے انگلستان اور اُس کی سلطنت کا انتظام کرتی تھی۔

جب میں وہاں پہنچا تو لندن کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ میں فوراً اُس موسم کے درمیان وہاں کی مصروفیتوں میں گھسیٹ لیا گیا۔ سوسائٹی کے سب دروازے میرے لئے کھلے ہوئے تھے۔ شاندار اور اعلیٰ طریقہ پر ترتیب دئے ہوئے جلسے اور رسومات میں مجھے اپنی جگہ مل جاتی تھی۔ ایپسم میں (APSOM) ایسکوٹ میں (ASCOT) نیومارکیٹ میں (NEWMARKET) لینس ڈون ہاؤس کے (LANSDOWN HOUSE) کسی ڈنر میں۔ لارڈ رپن کے مکان پر (LORD RIPON) یا لارڈ رے (LORD REAY) کے مکان پر۔ کسی بڑے شہزادے کے محل پر۔ اوپرا یا ناچ کی محفل میں۔ گارڈن پارٹیوں میں۔ اور دیہات کی ہفتہ والی تفریحات میں میری شرکت ہوتی تھی۔ رسمی لباس کا رواج لندن میں بڑی پابندی اور سختی کے ساتھ تھا۔ فراک کوٹ (FROCK COAT) یا مورننگ کوٹ (MORNING COAT) پہنا جاتا تھا۔ سخت کالر اور سلک کی ہیٹ (SILK HAT) اور دستانے پہنے جاتے تھے۔ خواہ موسم کیسا ہی گرم ہو۔ اتوار کی صبح کو ہائیڈ پارک میں (HYDE PARK) گرجا گھر کی پریڈ (PARADE) ایک بڑی شاندار چیز تھی جس کے ساتھ اُس کی خاص مفصل رسم ادا کی جاتی تھی۔ اذان کی رسم۔ یعنی عبادت کے لئے لوگوں کو بلانا۔ بڑی تفصیل کے ساتھ ہوتی تھی۔ شاہی خاندان سے نیچے طبقہ تک تمام سوسائٹی کی تنظیم ایسی احتیاط اور سختی کے ساتھ کی جاتی تھی جو آجکل خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ ان سب باتوں کو اب

یاد کرنا ایسا ہے جیسا کہ ایک غائب اور گذری ہوئی دنیا کو پھر زندہ کرنا ہے۔

مناسب موقعہ پر ملکہ معظمہ سے ونڈسر محل (WINDSORCASTLE) میں ملاقات کرنے کے لئے میری طلبی ہوئی۔ وہ مجھ سے انتہائی اخلاق اور محبت کے ساتھ ملیں۔ اس ملاقات کے دوران میں اُس کمرہ کے اندر صرف ایک اور صاحب تھے اور وہ میرے قدیم مربی ڈیوک آف کیناٹ تھے۔ (DUKE OF CONNAUGHT) جن کی موجودگی میں مجھے کوئی شرم یا رعب محسوس نہ ہوا۔ ملکہ معظمہ موٹی موٹی سیاہ چادروں اور شالوں میں لپٹی ہوئی ایک بڑے سوفہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں یہ معلوم نہ کرسکا کہ اُن کا قد بلند تھا یا چھوٹا۔ وہ جسم کی مضبوط تھیں یا نہیں اُن کے بیٹھنے کا طریقہ اور اُن کی چادریں ایسی تھیں کہ اس قسم کا اندازہ لگانا بالکل ناممکن تھا۔ میں نے اُن کے ہاتھ کو بوسہ دیا جو انہوں نے میری طرف بڑھایا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ڈیوک آف کیناٹ میرے اور میرے خاندان کے گہرے دوست تھے۔ اُن کا ایک عجیب لہجہ تھا۔ جو اسکاٹ لینڈ اور جرمنی کے مخلوط لہجہ کی طرح تھا۔ اُس میں جرمن لہجہ کا انداز پوری طرح اس واقعہ سے ثابت ہوتا تھا کہ اُن کی تربیت اپنی ماں کی صحبت میں جو جرمنی کی شہزادی تھیں اور ایک جرمنی کی گورنریس (GOVERNESS) کی صحبت میں جس کا نام بیرنس لہزن (BARONESSLEHZEN) تھا۔ ہوئی تھی۔ اُن کے اندر جرمنی والوں کی طرح گفتگو کا یہ انداز بھی پایا جاتا تھا کہ وہ 'سو' (SO) کو 'ٹزو' (TZO) کی طرح اکثر اپنی باتوں کے اندر نکالتی تھیں۔ اس ملاقات میں ملکہ معظمہ نے مجھے نائٹ (KNIGHT) کا خطاب عطا فرمایا۔ اور انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چونکہ میں خود بھی ایک شہزادہ تھا اور بہت سے بادشاہوں کی اولاد میں سے تھا اس لئے وہ مجھ سے یہ نہ کہیں گی کہ میں گھٹنوں کے بل جھکوں یا خطاب لینے کے وقت کا طرز عمل (ACCOLADE) اختیار کروں اور تلوار کو اپنے کندھے سے لگاؤں۔ بلکہ وہ صرف خطاب کا تمغہ میرے ہاتھ میں دیدیں گی۔ مجھ پر اُن کی اس توجہ اور اخلاق کا بڑا اثر ہوا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے حکم دیا گیا کہ میں رات کو محل میں قیام کروں اور ملکہ معظمہ کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ یہ بھی ایک قابل یاد تجربہ تھا۔ کھانے کے وقت میں ملکہ معظمہ اور ان کی بیٹی شہزادی بیٹریس (BEATRICE) کے درمیان بیٹھا۔ وہ پرنسس ہنری آف بیٹن برگ

(PRINCESS HENRY OF BATTENBERG) کہلاتی تھیں۔ اور اسپین (SPAIN) کی ملکہ اینا (QUEEN ENA) کی ماں تھیں۔ ملکہ معظمہ اپنا رسمی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھیں۔ یہ وہ ماتمی لباس تھا جس کو انہوں نے اپنے شوہر کی موت کے دن سے اُتار کر نہیں رکھا تھا۔ اپنی کلائی پر وہ ایک بڑا ہیرے کا کنگن پہنے ہوئے تھیں جس کے اندر بیچ میں اُن کے شوہر کی خوبصورت چھوٹی سی تصویر تھی جو تقریباً تین انچ لمبی اور دو انچ چوڑی تھی۔ اُس وقت ملکہ معظمہ کی عمر اُناسی سال کی تھی۔ اُن کے جسم کی قوت اور اُن کی گفتگو کی روانی اور صفائی بہت تعجب خیز تھیں۔

اس موقعہ پر چند بڑے سرکاری عہدہ دار موجود تھے۔ جن میں لارڈ چانسلر (LORD CHANCELLOR) ارل آف ہیلسبرے (EARL OF HALSBURY) بھی شامل تھے۔ وہ ایک چھوٹے قد کے۔ پست طبیعت آدمی تھے جو دیکھنے میں بالکل نہ جچتے تھے۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا اور کچھ خوشی بھی۔ جب ملکہ نے چپکے سے مجھ سے یہ کہا کہ لارڈ ہیلسبرے (LORD HALSBURY) گو دیکھنے میں کچھ اچھے نہ تھے مگر وہ بڑے زبردست قانون دان اور سیاسی آدمی تھے۔ ملکہ معظمہ نے مجھ سے خاص طور پر ہندوستان کے متعلق گفتگو کی۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا برطانیہ کے سنیئر (CENIOR) عہدہ دار اور نمائندے ہندوستانی شہزادوں اور شرفاء کے ساتھ با اخلاق تھے یا اُن کے آداب میں کوئی کمی تھی۔ میں نے سچائی کے ساتھ جواب دیا کہ جہاں تک میرا اور میرے خاندان کا تعلق تھا۔ ہمارے ساتھ اُن برطانوی عہدہ داروں نے جن سے ہمارا واسطہ پڑا بے عیب مہربانی اور اخلاق کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ کھانے کے دوران میں ملکہ معظمہ اور اُن کے دو مہمان جو اُن کے داہنے اور بائیں طرف تھے۔ یعنی میں اور لارڈ چانسلر (LORD-CHANCELLOR) اُن کے سامنے ہندوستانی ملازم کھانا رکھ رہے تھے۔ یہ لوگ اسی قسم کے دوسرے درجہ کے ملازم تھے جن کو میں نے اُن کے ملازموں میں نیس (NICE) کے مقام پر دیکھا تھا۔

کھانا بہت دیر تک رہا اور مختلف قسموں کا تھا۔ پلیٹ پر پلیٹ آتی گئی۔ تین یا چار قسم کے گوشت تھے۔ گرم پڈنگ (PUDDING) اور برف کی پڈنگ تھی۔ ترکاری تھی اور سیب

قسم کے بے موسمی پھل تھے۔ جو آہستہ آہستہ اور نہایت شان کے ساتھ کھلائے گئے۔ ہم سوا نو بجے رات کو کھانے پر بیٹھے تھے اور اُس وقت لازمی طور پر پونے گیارہ بجے ہوں گے جسوقت سب کھانا ختم ہوا۔ ملکہ معظمہ نے باوجود اپنی کافی عمر کے بہت اچھی طرح کھایا اور پیا۔ ہر قسم کی شراب جو پیش کی گئی پی اور ہر قسم کا کھانا جس میں گرم اور سرد پڈنگ دونوں تھیں کھایا۔ کھانے کے بعد سرکاری ڈرائنگ روم (DRAWING ROOM) میں ہر مہمان ملکہ معظمہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور اُس نے چند منٹ کے لئے اُن سے گفتگو کی۔ انہوں نے مجھ کو اپنی ایک ہیرے لگے ہوئی تصویر دی جس میں انگلستان کا گلاب۔ اسکاٹ لینڈ کا کانٹا اور آئرلینڈ کا ستار نشان کے طور پر آراستہ تھے۔ ستار کا نشان زمرد کا بنا ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح کو اُن کے منشی جو اُن کے ہندوستانی سکرٹری تھے میرے پاس آئے اور مجھے کچھ لکھی ہوئی چیز دی جو ملکہ معظمہ نے خود اردو اور عربی خط میں لکھی تھی۔

ملکہ اور شہنشاہ ہونا ملکہ وکٹوریہ کے لئے ایسا نہ تھا کہ محض رسمی اور دور و دراز کے خطابات حاصل کرلیں۔ وہ اپنی ہندوستانی رعایا کے خیالات اور ضروریات سے بہت اچھی طرح خبردار تھیں اور اُن کا گہرا احساس رکھتی تھیں۔ ہندوستانیوں کے لئے اُن کی رغبت اور ہمدردی بہت گرم اور حقیقی قسم کی تھی۔ مجھے خاص طور پر یاد ہے کہ انہوں نے کھانے کے وقت بڑے شوق کے ساتھ مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں یہ امید کرتی ہوں کہ جب برطانیہ کے آدمی ہندوستان کی مسجدوں اور مندروں میں جائیں تو وہ وہاں پر ایسے ادب اور احترام کا برتاؤ کریں جیسے کہ وہ اپنے ملک میں گرجاؤں کے اندر کرتے ہیں۔

انگلستان کے اس سفر میں میری ملاقات برطانوی شاہی خاندان کے دوسرے مختلف افراد سے ہوئی۔ اُن میں سب سے پہلے پرنس آف ویلز تھے (PRINCE OF WALES) جو بعد میں شاہ ایڈورڈ ہفتم ہونے والے تھے (KING EDWARD VII) شروع ہی سے پرنس آف ویلز مجھ پر بے انتہا مہربان تھے۔ انہوں نے مجھے فوراً اپنے خاص کلب مارلبورو (MARLBOROUGH) کا اعزازی ممبر بنالیا اور چند مہینے بعد ۱۸۹۹ء کے شروع میں انہوں نے خود مجھ کو اُس کلب کی مکمل ممبری کے لئے نامزد کیا۔ اُس زمانہ میں مارلبورو کلب کی ممبری

جو اس طرح عطا کی جاتی تھی ایک خاص سوشل اور ذاتی خصوصیت رکھتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص جو ممبر ہو جاتا تھا پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) کا ذاتی دوست شمار کیا جاتا تھا۔ برسبیل تذکرہ میں یہ بتا دوں کہ میں اب بھی پچاس سال سے زائد گذرنے کے بعد اس "ماربولو-سونڈھم" کلب کا ممبر ہوں (MARLBOROUGH-WINDHAH) اور جب کبھی میں لندن جاتا ہوں میں وہاں پر اخبار پڑھنے کے لئے پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں کے دربانوں کا جمعدار اور میں اب وہاں کے آدمیوں میں سب سے زیادہ عمر کے آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سنہ ۱۸۹۶ء یا سنہ ۱۸۹۷ء میں اس کلب کی ملازمت میں داخل ہوا۔ وہ اور میں دونوں پرانے زمانہ کی باتیں یاد کرتے ہیں اور ہماری گفتگو بہت سی ایسی روحوں کو سامنے لاتی ہے جن کی زندہ موجودگی ہم کو بالکل ایسی ہی اصلی معلوم ہوتی ہے جیسی کہ ہم اپنی جوانی کے زمانہ میں جانتے تھے۔

شاہ ایڈورڈ ہفتم نے (KING EDWARD VII) اپنی زندگی کے آخری دس سال میں مجھے اپنی ذاتی اور گہری دوستی کی عزت بخشی۔ اُن سے میرے تعلقات بہت بے تکلف تھے جو ضابطہ اور پابندی کی حدود سے بہت دور تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے اور کافی عمر کے تھے میں بالکل نوجوان تھا اور شروع شروع میں اُن کے لئے اجنبی تھا۔ مگر وہ ہمیشہ میرے ساتھ بڑی مہربانی اور فیاضی سے برتاؤ کرتے تھے۔ اگر میں درحقیقت کسی ایسے ایک لفظ کی تلاش کروں جس میں شاہ ایڈورڈ کی ساری سیرت اور کیرکٹر جمع ہو جائے تو اُس کا جواب بینولینٹ (BENEVOLENT) کے لفظ میں مل جائے گا۔ یعنی فیاض۔ سخی۔ اور کھلے دل والے آدمی۔ وہ ہمیشہ ہر آدمی کا بھلا چاہتے تھے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ وہ زندگی کی سب اچھی چیزوں کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے۔ اور وہ اپنی زندگی بہت اچھی طرح گذارتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ اور سچے دل سے یہ چاہتے تھے کہ ہر شخص۔ یعنی ان کی رعایا کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا آدمی بھی۔ اسی طرح اپنی زندگی اچھی طرح گذارے اور اس کا وقت چین کے ساتھ کٹے۔

اُن کو اس کی بڑی فکر تھی کہ دنیا میں تکلیف اور بیماری کم کر دی جائے شفاخانوں سے اُن کی دلچسپی اور سرپرستی ایسی چیز نہ تھی جس کو وہ صرف ایک قسم کا شاہانہ فرض سمجھ کر ادا کرتے

ہوں۔ نہ وہ ایسی تھی جس کو برائے نام ایک فیشن یا رسم کی چیز سمجھ کر کرتے ہوں۔ یا ایک قسم کا ذاتی شوق اور وہم ہو۔ بلکہ وہ سرپرستی انسانی زندگی کے متعلق اُن کے گہرے احساس اور رنگ مزاج کا اظہار کرتی تھی جس میں انسانی تکلیف کی سب قسموں سے ایک فیاضانہ اور خود بہ خود پیدا ہونے والی ہمدردی پائی جاتی تھی۔

اس سلسلہ میں اُن کے دو جملے اکثر سنائے جاتے ہیں۔ میں چونکہ اُن کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لئے سمجھتا ہوں کہ یہ جملے دراصل اُن کے دل کی تہ سے نکلے تھے۔ اُن میں کا ایک جملہ یہ ہے "جو شخص سرطان کا علاج معلوم کر لیتا ہے اس بات کا مستحق ہے کہ اُس کا مجسمہ یورپ کے ہر دارالسلطنت میں بطور یادگار کے قائم کیا جائے۔" مجھے اب بھی یاد ہے کہ یہ جملہ کہتے وقت اُن کی آواز میں کیسی تبدیلی پیدا ہو جاتی تھی۔ اُن کا دوسرا جملہ اُن بیماریوں کے متعلق ہے جن کو ڈاکٹر قابل علاج سمجھتے ہیں۔ وہ یہ ہے "اگر کوئی بیماری قابل علاج ہے اور دور کی جاسکتی ہے تو اُس کا علاج کیوں نہ کیا جائے اور کیوں اُس کو دور نہ کیا جائے"۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں جب پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) جو بعد میں شاہ جارج پنجم کہلائے۔ ہندوستان کا دورہ کرنے والے تھے اور اُس کے متعلق مشورے ہو رہے تھے تو میں اُس وقت انگلستان ہی میں تھا۔ بادشاہ سلامت نے مجھے بکنگھم پیلیس (BUCKINGHAM PALACE) میں پرائیویٹ ملاقات کے لئے مدعو کیا اور مجھ سے ہندوستان کے شفاخانوں کے متعلق بہت گہرے اور تفصیل کے ساتھ سوالات کئے۔ جس سے اُن کے کافی علم اور گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ اُن کو خاص طور پر اس کی بڑی فکر اور بے چینی تھی کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں اور خاصکر کلکتہ میں شفاخانوں کی حالت بہت خراب ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس موقعہ پر اپنے بیٹے کو اس معاملہ میں پوری ہدایات دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور وہ اس بات پر زور دیں گے کہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں وہاں کے شفاخانوں کے متعلق بہت مفصل اور صحیح رپورٹیں حاصل کی جائیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ پہاڑوں پر اور ملک کے صحت بخش مقامات پر بیماروں کے رہنے کے لئے مکانات قائم کئے جائیں۔ جن میں ٹیوبرکلوسس یعنی مرض دق کو روکنے اور شروع میں اُس کا

مناسب علاج کرنے کا انتظام کیا جائے۔

اس واقعہ کے تقریباً دو سال بعد ۱۹۰۶ء کی گرمیوں میں بادشاہ سلامت نے بڑی تفصیل کے ساتھ اسی مضمون کا پھر ذکر کیا اور ایک دوسری طویل اور پرائیویٹ ملاقات میں اس پر مجھ سے گفتگو کی۔ انہوں نے پرنس آف ویلز (PRINGE OF WALES) کے اس کام کی تعریف کی جو اُن کی ہدایات کی بموجب انجام دیا گیا تھا اور یہ فی الواقع ایسا قابل تعریف کام تھا جس کی تائید میں اپنے ذاتی علم سے کرسکتا ہوں۔ بادشاہ سلامت کو اس سلسلہ میں بہت سی آزاد اور مفصل رپورٹیں بھی موصول ہوئیں اور اُن کو اس کا علم ہوگیا کہ میں نے اپنے دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ پہاڑی مقام پر ایک صحت افزا مرکز یعنی سنی ٹوریم (SA NITORIUM). قائم کیا تھا جہاں دق کے مرض کا علاج اُس کی ابتدائی حالت میں کیا جاسکے۔

شاہ ایڈورڈ کی طبیعت میں انسانیت بھی تھی اور سخاوت بھی۔ ان کی یہ گہری دلچسپی جو اُن کو انسانی تکلیف اور بیماری اور اُن کے کم کرنے کی طرف تھی (کیا شاید اسی کی وجہ سے اُن پر خود ٹائی فائڈ (TYPHOID) کا ایسا سخت حملہ ہوا جو قریب قریب مہلک ثابت ہوا) محض اس وجہ سے نہ تھی کہ اُن کو اپنے شاہانہ فرض کا احساس تھا۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ یہ دلچسپی اُن کے سچے انسانیت کے جذبہ سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ اس دلچسپی میں اُس وقت سے اضافہ ہوگیا تھا اور وہ بہت گہری ہو گئی تھی۔ جب اپنی تاجپوشی سے کچھ دن پہلے وہ بہت سخت بیمار پڑ چکے تھے۔ وہ خود جسمانی تکلیف کے موقعہ پر بہت ہمت والے اور بہادر ثابت ہوتے تھے۔ مگر وہ بیماری کو بے انتہا ناپسند کرتے تھے اور اس کے حملوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنی نسبت دوسروں کی طرف زیادہ خیال کرتے تھے اور دوسروں پر بیماری کے حملوں کو دور کرنے کی زیادہ کوشش کرتے تھے۔

یہ بات بہت مشہور تھی کہ شاہ ایڈورڈ جرمنی کے مخالف تھے۔ اور یہ کہ اُن کے دل میں جرمنی کے خلاف بہ حیثیت ایک قوم کے ایک قسم کی دشمنی اور نفرت کا جذبہ تھا۔ چونکہ اُن کے تعلقات اُن کے بھتیجے قیصر ولیم ثانی سے اچھے نہ تھے۔ مگر اس کی تردید میں جو ثبوت موجود ہے وہ بہت پختہ ہے۔ یہ ثبوت خود بادشاہ کے الفاظ سے اور ایسے معتبر گواہوں کے

بیان سے ملتا ہے جیسے بیرن وان ایکارڈسٹن (BARONVONECKARDSTEIN)
اور کاؤنٹ ولف میٹرنک (COUNTWOLF NETTERNICH) یہ دونوں افسر اپنے اپنے زمانہ میں انگلستان کے سفارت خانہ میں بہت با اثر اور با اختیار عہدوں پر متقررکھے۔ اُن دونوں نے اپنے راستہ سے ہٹ کر مجھے یہ بات بتلادی کہ بادشاہ سلامت پورے طور پر سچے دل سے برطانیہ اور جرمنی کے درمیان دوستی قائم رکھنے کے خواہش مند تھے۔ اور یہ کہ انہوں نے اپنی انتہائی کوشش کی کہ وہ اپنے بھتیجے سے اچھے تعلقات باقی رکھیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں کے درمیان بہت گہرے اور پکے ذاتی اختلافات اور مشکلات موجود تھے۔ اس وجہ سے ضروری تھا کہ ایک دوسرے سے ان کا تعلق کشیدہ رہے قیصر جب تخت نشین ہوئے تو بہت کم عمر کے نوجوان تھے اور دس سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک وہ اپنے ملک کے تمام سیاسی معاملات پر پورا اختیار رکھتے تھے۔ مگر اُن کے چچا جو ادھیڑ عمر کے آدمی تھے اسی غم و غصہ میں تڑپتے رہتے تھے کہ اُن کو کسی قسم کی ذمہ داری نہیں دی جاتی۔ بلکہ یہاں تک تھا کہ اُن کو دراصل اس بات کی بھی اجازت نہ تھی کہ وہ دفتر خارجہ کے کاغذات پڑھ سکیں۔ قیصر کبھی بھی نہایت عقلمند اور خود کو مٹانے والے آدمی نہ تھے۔ وہ کبھی موقعہ شناس (TACTPUL) اور منکسر مزاج (SELF-EFFRCIMG) ثابت نہ ہوئے۔ بیسویں صدی کی اصطلاح میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ احساس کمتری کے مریض تھے۔ وہ اس بات سے کبھی نہ چوکتے تھے کہ اپنی برتری کو ظاہر کریں۔ اُن کے چچا نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنے قدرتی غصہ اور طیش کو دبانے کی کوشش کی اور ایسا دراصل بہت کم اتفاق ہوتا تھا کہ وہ غصہ میں بھڑک اُٹھے ہوں یا اپنے بھتیجے کے ساتھ اخلاق اور لحاظ کے علاوہ کسی دوسری طرح کا برتاؤ کیا ہو۔ حالانکہ اس طرز عمل میں ایسا چھچھور پن پایا جاتا تھا جس کو ایک عقلمند اور دنیا کا تجربہ رکھنے والا آدمی اچھی طرح روک سکتا تھا۔

شاہ ایڈورڈ کو وضعداری کا بہت سخت خیال تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بادشاہ کے لئے کیا کیا مناسب ہے اور بادشاہ سے برتاؤ کرنے کے لئے کیا کیا چیزیں مناسب ہیں۔

وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص آزادی برتے یا اُن کی شرافت اور مہربانی سے ناجائز فائدہ اُٹھائے۔ مگر مجھ کو ایسی بھول چوک کی مثالیں یاد ہیں جو اُن کی سخت ناپسندیدگی کا باعث ہوئیں اور پھر بھی جب اُس قصور وار آدمی نے بادشاہ سلامت کے پاس کوئی تحریر براہ راست بھیجدی اور اُس میں معافی مانگ لی یا شاہی محل کے کسی افسر کے ذریعہ سے معافی کی درخواست پیش کی اور اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ سچے دل سے اپنے قصور پر افسوس کرتا تھا تو بادشاہ سلامت نے اس کو نہ صرف معاف ہی کردیا بلکہ اُس کی غلطی کو بالکل بھول گئے اور آئندہ اس خطا وار آدمی کے ساتھ کسی قسم کی مخالفت کا یا سرد مہری کا اظہار نہیں کیا۔ شاہ ایڈورڈ دراصل بہت فراخ دل اور اُونچے ظرف کے آدمی تھے۔

سب چھوٹے بڑے معاملوں میں وہ سوچ سمجھ کر ٹھیک کام کرنے کی اہمیت بھی رکھتے تھے۔ اُن کے اندر عاقبت اندیش مصلحت بینی کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں امریکہ کی ایک مشہور اور مالدار لیڈی جو پیرس میں رہتی تھی اور جس کا نام مسز مور (MRS. MOORE) تھا۔ لندن وارد ہوئی۔ یہ بادشاہ سلامت کی دوست تھی اور میری بھی اور بادشاہ سلامت اکثر بیارز (BIARRITZ) کے مقام پر اُن کے مہمان ہوا کرتے تھے اور اُن کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک روز دوپہر بعد جب کافی سردی پڑ رہی تھی بادشاہ سلامت مسز مور (MRS. MOORE) کے مکان پر گئے۔ اُس روز سارے دن سخت کہر پڑ رہا تھا۔ مسز مور بادشاہ سلامت کو اپنے گرم ڈرائنگ روم میں جو اوپر کے زینہ پر تھا لے گئیں اور وہیں پر آگ کے قریب وہ چاء پینے کے لئے بیٹھ گئے۔ وہاں سے رخصت ہونے کے چند منٹ بعد ہی ڈرائنگ روم کے دروازہ پر کسی نے کھٹکا دیا اور ایک شاہی پیادہ کمرہ کے اندر داخل ہوا اور اُس نے مسز مور کو ایک پرچہ دیا۔ بادشاہ سلامت کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ کاغذ، پنسل اور چھوٹے لفافے رکھا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے خیالات کو جو اُن کے دماغ میں پیدا ہوں نوٹ کرلیا کریں۔ بادشاہ سلامت نے اپنے اس پرچہ میں مسز مور کو اس روز یہ بتایا تھا کہ جب کبھی وہ کمرہ سے باہر جائیں اُن کو بڑی احتیاط کے ساتھ

چلنا چاہیئے۔ اس لئے کہ کمرہ کے فرش پر بہت پھسلن ہو رہی تھی اور یہ ممکن تھا کہ وہ چلنے میں نیچے گر پڑیں اور اُن کے چوٹ لگ جائے۔ بادشاہ سلامت اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے انتظار کرتے رہے جب تک کہ اُن کا پیادہ وہ پیام پہنچا کر واپس آیا۔

مجھے ایک اور واقعہ یاد ہے جب بادشاہ سلامت نے اسی قسم کی عقلمندی اور مصلحت بینی کا اظہار میرے ساتھ کیا۔ چالیس سال گذرنے کے بعد اس واقعہ کا ٹھیک وقت اور موقعہ میں اس وقت بھی بتا سکتا ہوں۔ یہ ۱۹۰۹ء میں جمعہ کے دن ایسکٹ کے مقام پر سفتہ منانے کا ذکر ہے۔ اس روز بادشاہ سلامت نے مجھے دوپہر کے کھانے پر شاہی محل میں مدعو کیا۔ میں بادشاہ سلامت کے قریب اُن کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب خاص ڈش (DISH) میز پر لائی گئی تو کھانا کھلانے والے ملازموں نے مجھے نظرانداز کر دیا اور مجھے چھوڑ کر دوسری طرف بڑھ گئے۔ مجھے اس پر کچھ تعجب بھی ہوا۔ مگر فوراً ہی دو کباب میرے سامنے رکھدیئے گئے (CUTLETS)۔ اس پر بادشاہ سلامت نے مجھ سے میز ہی پر اپنی اونچی اور گہری آواز کے ساتھ کہا کہ "مجھے خیال تھا کہ آپ اس چیز کو جو ہمارے کھانے کی فہرست میں شامل تھی پسند نہ کریں گے اس لئے میں نے ہدایت کر دی کہ وہ کباب آپ کو پیش کر دیئے جائیں"۔ اس کے بعد میں نے اپنے قریب والے مہمان کی پلیٹ پر نظر ڈالی اور میں نے دیکھا کہ خنزیر کی ران کا ایک ٹکڑا اُس میں رکھا ہوا ہے۔ بادشاہ سلامت کو یہ معلوم تھا کہ میں بہ حیثیت ایک مسلمان کے خنزیر کا وہ ٹکڑا کھانا پسند نہ کروں گا اور اس کے ساتھ ہی میں اس بات کو بھی پسند نہ کروں گا کہ جو چیز اُن کی میز پر میرے سامنے رکھی جائے اس کے کھانے سے انکار کر دوں۔ اس لئے انہوں نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اپنی یہ ترکیب نکالی اور اُس کا انتظام کر دیا۔

اس موقعہ پر بات کاٹ کر میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ اس قسم کی ترکیب اور مصلحت اُن آدمیوں کے لئے بہت ضروری ہے جو اونچے درجے رکھتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آیا۔ وہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں لارڈ کرزن (LORD CURZON) ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ امیر افغانستان کے سب سے بڑے بیٹے شاہی مہمان کی حیثیت سے

کلکتہ تشریف لائے۔ اسی روز رات کے وقت اُن کے اعزاز میں ایک خاص قسم کی شاہی دعوت دی گئی۔ میں بھی مدعو کیا گیا۔ میری جگہ افغان شہزادہ کے بالکل سامنے تھی اور وہاں پر مجھے اپنے سامنے ہی ایک افسوسناک واقعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ شہزادہ کے سامنے جو شوربا آیا اس میں شیری (SHERRY) شراب کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے (LACEDWITH SHERRY) قبل اس کے کہ شہزادہ اس میں سے ایک چمچہ بھر کر اپنے منہ تک لے جائیں۔ اُس سرکاری عہدہ دار نے (POLITICALAGENT) جو اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا بڑی اہمیت سے ایک قسم کی تنبیہ کے ساتھ کہا کہ "جناب والا! اس شوربے میں شراب پڑی ہوئی ہے۔"

اسلامی قانون کی مفروضہ اور سخت پابندی کرتے ہوئے شہزادے نے شوربے کی پلیٹ کو الگ رکھ دیا اور اُس کو چھوا تک نہیں۔ مچھلی کی جو پلیٹ ان کے سامنے آئی اس میں کوئی چیز قابل نفرت نہ تھی اور شہزادے نے اُس کو بڑی خوشی کے ساتھ خوب کھایا۔ کھانے کے اس پہلے دور میں خنزیر کی ران کے کچھ ٹکڑے بھی (SLICES OF HAM) آئے اور شہزادے نے کچھ رنجیدہ ہو کر اُن کی طرف دیکھا اور اُن کو اپنے سامنے سے گذرنے دیا۔ پھر ترکاری کی ایک پلیٹ آئی اور اُس میں صاف طور پر خنزیر کی چربی کے ٹکڑے دکھا دے کے لئے اوپر لگے ہوئے تھے۔ اس طرح کھانے کا سارا خاص حصہ غریب شہزادے کے لئے بالکل صفر کی برابر تھا جس سے اُن کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے آخر میں آئس کریم آئی۔ اس کو کھانے کے لئے شہزادہ بڑے شوق کے ساتھ تیار ہو گئے۔ مگر اُس تنبیہ کرنے والے سرکاری عہدہ دار نے فوراً کہا کہ "جناب والا" اس میں شارٹریوس (CHARTREUSE) شراب پڑی ہوئی ہے۔ یہ سنکر شہزادے نے تھک کر پھر اپنا چمچہ نیچے رکھ دیا اور آخرکار کچھ پنیر کی ترکاری (CHEESESAUORY) اور پڈنگ اور پھل وغیرہ کھا کر اپنی بھوک کی تلافی کر لی۔ مگر اس بات کا تعجب ہوا کہ لارڈ کرزن کو اس کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ان کے خاص مہمان اُس دن بھوکے میز پر سے اُٹھ گئے۔ اس بات پر اور زیادہ تعجب اس وجہ سے ہے کہ لارڈ کرزن جن کا مہمان میں کئی مرتبہ ہاکوڈ کے (HAWKWOOD) مقام پر رہ چکا تھا۔ اپنے مکان پر اس قسم کے میزبان ثابت ہوتے تھے

جو اپنے مہمانوں کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے اور جو اُن کی طرف اتنی توجہ دیتے تھے جس کا امکانی طور پر تصور کیا جا سکتا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ انہوں نے وائسرائے کی حیثیت سے اپنے محل کے روزمرہ کا انتظام اپنے عملہ کے اوپر چھوڑ دیا اور اس سلسلہ میں کسی سے اس طرح کی سخت غلطی ہو گئی جس کی اجازت لارڈ کرزن اپنے مکان پر ہرگز نہ دیتے۔

میں مانتا ہوں کہ میں خود بھی اسی قسم کی مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ بمبئی کے اندر اور ولنگڈن کلب (WILLINGTON CLUB) جیسے مقام پر جہاں کا بڑا باورچی پارسی تھا۔ اُس موقعہ پر میں نے ایک بڑا ڈنر دیا تھا جس میں بہت سے ہندو مہاراجہ میرے مہمان تھے۔ میں ڈنر سے پہلے خود کلب گیا اور باورچی کو بتایا کہ میرے مہمانوں میں کس قسم کے آدمی ہوں گے اور یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ کھانے کے معاملہ میں بہت سخت اور احتیاط کرنے والے آدمی ہوں گے۔ اس وجہ سے گائے کا گوشت کسی صورت میں میز پر نہ لایا جائے۔ باورچی نے جواب دیا۔ "حضور والا۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ میں بہت احتیاط رکھوں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی قسم کی غلطی نہ ہونے پائے گی۔"

کھانے کے وقت ہم سب ایک جگہ بیٹھے جس میں ہندو مہاراجاؤں کا کافی مجمع تھا اور اُن میں سے بعض بہت سخت مذہبی نقطۂ نظر رکھنے والے راجپوت تھے۔ جب تک کھانے کا پہلا خاص دور چلتا رہا سب چیزیں ٹھیک ٹھیک آتی رہیں۔ اس کے بعد میں نے بڑے خوف کے ساتھ دیکھا کہ بیل کی زبان ٹری ٹری پلیٹوں میں رکھی ہوئی برابر آنی شروع ہوئی۔ میرے مہمانوں نے سمجھا کہ یہ افسوسناک حرکت جان بوجھ کر اُن کی براہ راست اور سخت توہین کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ مگر میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ معافی مانگی۔ جب کھانا ختم ہو گیا تو میں نے باورچی کو بلایا اور اُس کو اچھی طرح ڈانٹا۔ میں نے کہا:۔

"تم پر کیا مصیبت آ گئی تھی؟ میں نے تم کو سخت ہدایت کر دی تھی کہ گائے کا گوشت بالکل نہ رکھا جائے۔" اُس نے فوراً اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر، حضور والا! وہ تو بیل کی زبان تھی، گائے کا گوشت کب تھا؟"

یہ باورچی پارسی تھا اور اُس نے ہندوستان میں اپنی تمام عمر گذاری تھی۔ مگر اس کا کس کو یقین آئے گا کہ وہ اب بھی یہی سمجھتا تھا کہ بیل کی زبان گائے کا گوشت شمار نہیں کی جاسکتی۔

غذا کے معاملہ میں اس قسم کی ممانعت یا ہدایت کا اثر بہت گہرا اور دیر تک رہنے والا ہوتا ہے جو بچپن ہی سے انسان کے دل میں بٹھا دی جائے اور جس کی تائید کے لئے مذہبی حکم موجود ہو اور جس کا رواج صدیوں سے چلا آتا ہو۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں کسی ہندوستانی دوست کے ساتھ جو ہندو تھے یورپ میں کھانا کھا رہا تھا۔ یہ صاحب بڑے بھاری عالم اور بڑی وسیع کلچر کے تھے۔ مگر جب اُن کے سامنے میز پر گائے کا سر رکھا گیا تو اُن پر بظاہر ایک قسم کا صدمہ اور سخت تکلیف کا اثر محسوس ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تقریباً بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ کچھ دن بعد میں نے اُن سے پوچھا کہ مذہبی اعتبار سے آپ کے لئے اُس چیز کا ناپسندیدہ ہونا ضرور سمجھ میں آتا ہے مگر پھر بھی آپ اُس دن اتنے زیادہ بے قابو کیوں ہو گئے؟۔ انہوں نے کہا کہ بھئی۔ میرے لئے تو میز پر اس طرح گائے کا سر دیکھنا بالکل اسی طرح سے بھیانک اور فوری دہشت پیدا کرنے والی چیز ہے۔ جس طرح کسی انسان کے بچہ کا کٹا ہوا سر کوئی شخص میرے سامنے لاکر رکھ دے۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ اگر وہ باورچی کسی انسان کے بچہ کا سر پکا لیتا اور اُس کو خوب مزے دار اور بارونق بنا کر گوشت کی پلیٹ میں آپ کے سامنے لاکر رکھ دیتا تو بتائیے کہ آپ پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ میرے پاس ایسی باتوں کا کوئی فوری جواب نہ تھا۔

میں نے ایک مرتبہ ایک دوسرے دوست سے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ برہمن اور کیمبرج کے اسکالر تھے دریافت کیا کہ کیا اُن کے اندر جنہوں نے اپنی عمر میں سوائے دودھ وغیرہ کے کبھی گوشت نہیں کھایا تھا اور جن کے بزرگوں نے دو ہزار سال سے انڈا۔ مچھلی اور گوشت کو نہیں چھوا تھا اس قسم کا کھانا دیکھ کر کس طرح کی نفرت کا فطری جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ میرے اُس دوست نے میرے اس سوال پر بہت دیر تک تأمل کیا اور پھر آخر کار جواب دیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اگر آپ کی پرورش اسی طرح ہوتی جس طرح میری پرورش ہوئی ہے تو مجھے شبہ ہے کہ آپ عمر بھر گوشت۔ مچھلی یا انڈے کی بو سے جو فطری خوف اور نفرت

پیدا ہوتی ہے اُس پر کبھی بھی قابو پا سکتے۔

۱۸۹۸ء کی اُس لمبی گرمیوں کے موسم میں لندن سے کچھ دور مقامات پر میں گھومتا پھرا جب کہ لندن کی سوسائٹی میں پہلی مرتبہ میرا تعارف ہو چکا تھا۔ میں نے لندن کی تفریحوں کا ذکر کر دیا ہے۔ وہاں کی شان و شوکت۔ وہاں کے گھوڑ دوڑوں کی بیٹنگ۔ وہاں کی گارڈن پارٹیاں۔ وہاں کے ڈنر۔ وہاں کے اوپرا (OPERA) کی راتیں۔ اُس اوپرا کے بعد مارلبورو کے (MRALBOROUGH) مقام پر آخر میں بہت رات گئے تک آنا جانا اور وہاں پر پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) سے باتیں کرنا (اُن کا یہ دستور تھا کہ اپنے گھر واپس جاتے وقت اس کلب میں کچھ دیر کے لئے ٹھیر جائیں) مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ ہرگز خیال نہ ہونا چاہیئے کہ میں نے اپنا تمام وقت صرف بیکار تفریحوں میں ہی خرچ کیا۔

میرے دوست پروفیسر ہیفکن (HAFF KINE) نے مجھے انگلستان کے ایک سے زیادہ سائنس دانوں کے نام تعارفی خطوط دیئے تھے۔ اُن میں لارڈ لسٹر (LORDLISTER) کا نام بھی شامل تھا جو وہاں کے بہت بڑے سرجن مشہور تھے۔ لارڈ لسٹر بڑے مہمان نواز آدمی تھے۔ میں لارڈ کیلون (LORDKELVIN) سے بھی ملا جو اُس زمانہ میں انگلستان کے سائنس دانوں میں سب سے سینئر (DOYEN = SENIOR) شمار ہوتے تھے۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کے متعلق میں نے کسی دوسری جگہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسی مشینوں کے ذریعہ سے اڑنا جو ہوا سے زیادہ وزن دار ہوں انسان کے لئے قطعی ناممکن ہے۔ اُس زمانہ میں بیرونس برڈٹ کوٹس کا (BARUNESS BURDETT-COUTTS) میں اکثر مہمان رہتا تھا اور اُن کے مکان پر مجھے اُس وقت کے بعض مشہور روحانی آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

میں مس فلورینس نائیٹنگل (MISS FLORENCE NIGHTINGALE) سے ملنے کے لئے بھی گیا۔ وہ اور بیرونس (BARONESS) اُس زمانہ میں ملکہ وکٹوریہ کے بعد سب سے زیادہ مشہور عورتیں شمار کی جاتی تھیں۔ مس نائیٹنگل اُس وقت کافی عمر کی

ہو چکی تھیں اور بالکل بیکار سی ہو گئی تھیں۔ وہ پارک لین کے (PARKLANE) مقام پر اپنے مکان کے ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ پر جمی رہتی تھیں مگر دنیا کے معاملات سے اُن کی گہری دلچسپی ابھی تک باقی تھی۔ جس چیز سے اُن کو سب سے زیادہ لگاؤ تھا اور جس کے متعلق وہ بہت گہرائی اور تفصیل کے ساتھ معلوم کرنا چاہتی تھیں وہ ہندوستان کے اندر برطانوی انتظام کے متعلق ہوا کرتا تھا۔ خاص طور سے وہاں کے وہ انتظامات جو لوگوں کی صحت اور ہائی جین (HYGIENE) کے متعلق ہوتے تھے۔ وہ اس عمر میں برطانوی راج کے لئے ایک قسم کی شاندار غیر سرکاری مشیر بن گئی تھیں۔ حالانکہ اُن کو کبھی ہندوستان جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ انڈیا آفس اور وار آفس (WAR OFFICE) دونوں میں مس نائیٹنگل کے تحریری (MEMORANDA) مشورہ کی اہمیت اور ضرورت کو خوب سمجھا جاتا تھا۔ جب کبھی کوئی نیا وائسرائے ہندوستان کے لئے مقرر کیا جاتا تھا تو کبھی اُس کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ قبل اس کے کہ اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے لئے انگلستان سے روانہ ہو مس نائیٹنگل کی خدمت میں حاضر ہونا موقوف کر دے۔ ان سب کے لئے یہ ملاقات بہت مفید اور کار آمد ثابت ہوتی تھی۔ مس نائیٹنگل نے تمام ہندوستان میں برطانوی فوجوں کے لئے فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کا پورا خاکہ تیار کیا۔ ڈاکٹروں اور شفاخانوں کے انتظام کی پوری اسکیم بنائی اور ملازموں کو تنخواہیں اور بھتّے وغیرہ دینے کے قاعدے اور طریقے بنائے جو ہندوستان میں برطانوی حکومت ختم ہونے کے آخر تک قائم رہے اور جن کے اصول میں یقیناً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ گو اُن کی تفصیلات میں کبھی کبھی معمولی تبدیلی ہو گئی ہو۔

یہ بالکل قدرتی اور ضروری بات تھی کہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوں لٹن اسٹریچی (LYTTON STRACHEY) نے جو دلچسپ مگر بہت کم قابل اعتبار مورخ ہیں اپنی کتاب ایمی ننٹ وکٹورینس (EMINENT VICTORIANS) میں جو مضمون مس نائیٹنگل پر (MISS NIGHTINGALE) لکھا ہے اُس میں میری اس پہلی ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے مگر اُن کا یہ ذکر ایک قسم کا قابل تمسخر خاکہ ہے۔ جس خاص بات کا انہوں نے بالکل ذکر نہیں کیا

وہ یہ ہے کہ میں اور مس نائیٹنگل دونوں بڑے گہرے دوست ہو گئے تھے اور یہ کہ میں اُن کے پاس بار بار ملنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ قدرتی طور پر مجھ سے بہت دیر تک اس موضوع پر بڑی فصاحت اور سرگرمی کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھیں کہ ہندوستان میں صحت کو بہتر بنانے کے لئے کیا کیا ہو سکتا ہے اور کیا کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر عورتوں اور بچوں کی صحت کے لئے۔

میں اور دوسرے عام مضمونوں پر اُن سے گفتگو کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ میں اُس زمانہ میں ایک نہایت سنجیدہ نوجوان تھا۔ میں نے مس نائیٹنگل (MISS NIGHTIKGALE) سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ کیا اُن کے خیال میں اُن کی جوانی کے زمانہ کی نسبت دنیا کے اندر انسانی معاملات کے متعلق دراصل کسی قسم کی ترقی اب اور زیادہ ہو گئی ہے۔ اور کیا خدا کے متعلق عقیدہ زیادہ وسیع اور گہرا ہو گیا ہے؟ لٹن اسٹریچی (LYTTON STRACHEY) میرے اس سوال پر مجھ کو اعتراض اور ہنسی کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ مگر میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ میرا سوال بالکل ٹھیک اور برمحل تھا۔ اور مس نائیٹنگل نے (MISS NIGHTINGALE) اس کو اسی طرح محسوس کیا اور مجھ سے اس سوال پر اسی متانت اور گہرائی کے ساتھ گفتگو کی جس طرح میں نے اُس کو اُن کے سامنے رکھا تھا بہرحال ایسا اتفاق ہوا کہ مس نائیٹنگل (MISS NIGHTINGALE) کی زندگی میں ہی اور میری زندگی میں اُس سے دوگنا۔ قدرتی ذرائع کو اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرنے میں انسان کی قوت بہت تیزی اور وسعت کے ساتھ ترقی کر گئی۔ پہلے بھاپ کے ذریعہ سے انجن چلانا۔ پھر اندرونی رگڑ سے انجن چلانا اور پھر ایٹم کو پھاڑ کر اس کی قوت سے کام لینا۔ ان تمام ترقیوں کا تعلق خدا کے عقیدہ پر ہے۔ یا اس عقیدہ کے خلاف ہے اور اس سارے عقیدہ کا انسان کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں ایک خاص اہم مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔ مس نائیٹنگل نے (MISS NIGHTINGALE) مسٹر لٹن اسٹریچی (LYTTONSTRACHEY) کی طرح ان باتوں کو محض ہنس کر ٹال دینا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ انہوں نے اس مسئلہ پر مجھ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اُس دن سے وہ ہمیشہ مجھ کو

اپنی دوستی کی عزت بخشنے لگیں۔

اُس گرمی کے موسم میں مجھے ایک اور بڑے آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو برطانوی فوج کی تاریخ میں خاص آدمی تھے۔ یعنی فیلڈ مارشل لارڈ ولزلے (FIELD MARSHAL LORD WOLSELEY) سر الفریڈ لائل (SIR ALFRED LYALL) نے ایک ناشتہ کی دعوت میں میرے علاوہ ان مہمانوں کو بھی بلایا یعنی لیونارڈ کورٹنی (LEONARD COURTNEY) جو لبرل پارٹی (LIBERAL) کے ادیب اور سیاسی آدمی تھے اور جو بعد میں لارڈ کورٹنے (LORD COURTNEY) کے نام سے مشہور ہوئے۔ مسٹر پال (MR. PAUL) جو مورخ اور ایڈیٹر تھے۔ اور لارڈ ولزلی (LORD WOLSELEY) اُس وقت کسی نے مسٹر گلیڈ اسٹون (MR. GLADSTONE) کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس پر فیلڈ مارشل نے فوراً گلیڈ اسٹون کو اور اُن کے سارے کاموں کو نہایت غصہ کے ساتھ بُرا کہنا شروع کیا۔ کوئی ایسا بُرا لفظ نہ تھا جو اُن کے لئے استعمال نہ کیا ہو۔ ہم میں سے کسی کی سمجھ میں اُن کا ایک جملہ بھی نہ آیا مگر ہم سب اُن کی اس بے روک ٹوک اور سخت لعنت ملامت والی تقریر کو بیٹھے ہوئے غور سے سنتے رہے۔ گلیڈ اسٹون (GLADSTONE) اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ برے اور تباہ کرنے والے بااثر آدمیوں میں سے تھے۔ وہ یورپ میں اور ساری دنیا میں برطانوی اثر اور اختیار کی ہولناک تنزل کے ذمہ دار تھے۔ وہ سوڈان کی مصیبت کے ذمہ دار تھے۔ جنرل گارڈن (GENERAL GORDON) کی موت کا الزام اُن کی واحد ذات پر ہے۔ مختصر یہ کہ اس بات کے ہوتے ہوئے کہ انگلستان کی کم از کم آدھی آبادی اُن کو بُت بنا کر پوجتی تھی (خواہ دوسری آدھی آبادی اُن کے متعلق کچھ ہی خیال رکھتی ہو) وہ ایسے مجرم تھے جن کو مہذب سوسائٹی میں کبھی آزادی کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔

سر الفریڈ لائل کے گھر پر اُس دن ناشتہ کی دعوت میں فیلڈ مارشل لارڈ ولزلی (FIELD MARHAL LORD WOLSELY) کے جذبات کی ایسی سختی اور اُن کی صاف گوئی کی اس انتہا پر کو مجھے بہت تعجب ہوا۔ مگر وہ کسی طرح پر غیر معمولی نہ تھیں مجھے یاد ہے

کہ جب گلیڈاسٹون (GLADSTONE) کا انتقال ہو چکا تھا تو باوجودیکہ عام آدمیوں کی رائے کا اندازہ با ادب تھا مگر پھر بھی سوسائٹی کے اندر پرائیویٹ گفتگو میں اُن پر بہت سخت اعتراض کئے جاتے تھے اور اُن کو ناقابلِ معافی شمار کیا جاتا تھا۔ میں نے اس قسم کی باتیں خود ڈنر پارٹیوں کے موقعہ پر سنی ہیں۔ یا جب کبھی مجھے مفصلات کے بڑے مکانوں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا وہاں پر بھی اس قسم کی باتیں سنیں۔ اس سوسائٹی کے سب سے زیادہ با اثر طبقے کنزرویٹو (CONSERATIVE) اور یونینسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد چند سالوں میں بھی مجھے یاد ہے کہ اس قسم کے آدمی کس طرح لائڈ جارج (LLOYD GEORGE) کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے (جن کے متعلق میں تفصیل سے بیان کروں گا) اس زمانہ میں بھی مجھے یقین ہے کہ لیبر پارٹی (LABOUR PARTY) کا ایک خاص ممبر جو لائڈ جارج (LLOYD GEORGE) کی طرح ویلس (WALES) کا رہنے والا ہے (OF WALSH ORIGIN) اپنے اُن مخالفوں کے لئے (TORY OPPONENTS) جو ٹوری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں نہایت خوفناک بھوت بنا ہوا ہے۔

لبرل پارٹی (LIBERAL PARTY) کے خاص خاص حلقوں میں آپ کو اس سے بالکل مختلف باتیں سننے میں آئیں گی۔ اسی گرمی کے موسم میں مجھے لارڈ اسپنسر (LORD SPENCER) کا مہمان ہونے کا اتفاق ہوا۔ جو گلیڈاسٹون (GLADSTONE) کے قریبی شریک کار اور اُن کی کیبنٹ کے (CABINET) ممبر رہ چکے تھے۔ انہوں نے برمنگھم (BRIMINGHAM) کے قریب ایک چھوٹا سا مکان زراعتی نمائش کے لئے لے رکھا تھا۔ اُن کے پاس میرے قیام کی آخری رات کو جب سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ لارڈ اسپنسر (LORD SPENCER) نے مجھ سے نہایت آزادی مگر سنجیدگی کے ساتھ برطانوی سیاست کے اُس نازک مسئلہ پر گفتگو کی جو ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں دائمی اور سال بہ سال چلنے والا معاملہ بن گیا تھا۔ اور وہ آئرلینڈ کا مسئلہ تھا۔ یہ ۱۸۹۶ء کا ذکر ہے۔ آئرلینڈ کے متعلق گلیڈاسٹون کی ہوم رول (HOME RULE BILL) کی تجویز بالکل ناکامیاب ہو چکی تھی۔ لارڈ سیلسبری (LORD SOLISBURY) کی حکومت جو یونینسٹ (UNIONIST) پارٹی کی تھی نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنا کام کر رہی تھی۔ اس

حکومت کی پالیسی آئرلینڈ کے متعلق یہ تھی کہ وہاں سختی کے ساتھ حکومت کرنی چاہیئے۔ یہ پالیسی آرتھر بالفور (ARTHUR BALFOUR) کے نام سے منسوب کی جاتی ہے) اور یہ کہ وہاں کے زمینداری و کاشتکاری کے مشکل مسئلوں کو طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لارڈ اسپنسر (LORD SPENCER) اس بات پر زور دیتے تھے کہ آئرلینڈ کے مسئلہ کو طے کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آئرلینڈ کو مکمل سیاسی آزادی دیدی جائے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ بیس سال تک یا دو سو سال تک پولیس کے زور سے حکومت کرنا آئرلینڈ کو کبھی وفادار یا مطیع نہ بنا سکے گا۔ ۱۸۸۶ء میں ایک بہت بڑا موقعہ ہاتھ سے نکل گیا اور یہ موقعہ پھر کبھی نہ آئے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ جلدی یا دیر میں یہی ہوگا کہ ملک میں ایک مسلح بغاوت شروع ہوجائے گی جس کے ساتھ ساتھ قتل اور خونریزی برابر ہوتی رہے گی اور آخر کار آئرلینڈ (IRELAND) برطانوی سلطنت کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ چوتھائی صدی کے اندر اندر اس پیشین گوئی کی ہر تفصیل جس کو میں نے ۱۸۹۵ء میں اس گرمیوں کی رات کو غور سے سنا تھا پورے طور پر بالکل حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں وہ لوگ موجود تھے جو اس کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے کہ آئرلینڈ کی تقدیر کا فیصلہ کس طرح ہوتا ہے جو سبق اس سے حاصل ہوتے تھے اور جس پیام کی طرف ساری دنیا کے لئے اس میں اشارہ پایا جاتا تھا ان سب باتوں کو وہ لوگ اچھی طرح سمجھتے تھے۔

لندن واپس آکر میں نے وہاں کے موسم کو آخر تک خوب دیکھا۔ اور پھر اگست میں جب انگلش سوسائٹی نے اپنا سالانہ دورہ کوس (COWES) اور اسکاٹ لینڈ کی طرف شروع کیا میں دوبارہ اپنے یورپ کے سفر کے لئے روانہ ہوگیا۔ میں ایک مرتبہ پھر پیرس گیا اور وہاں سے جنیوا (GENEVA) اور لازین (LAUSSANE) گیا اور وائنا (VIENNA) گیا۔ وائنا (VIENNA) اس وقت بھی ایک بڑی تاریخی سلطنت کا خاص شہر شمار کیا جاتا تھا۔

اس خوشگوار گرمی کے موسم میں مجھے اس کے علاوہ اور کوئی تکلیف نہ ہوتی کہ میں نے اس زمانہ میں ہندوستان سے آنے والی ایک سخت تکلیف دہ خبر سنی جس سے مجھ کو بڑا رنج اور سخت صدمہ پہنچا۔ وہ خبر یہ تھی کہ میرے پونا کے مکان میں ایک ملازم باورچی نے میرے ایک قریبی عزیز

ہاشم شاہ کو جن کے والد میرے بڑے سوتیلے بھائی تھے ۔قتل کر ڈالا - یہ غنیمت تھا کہ یہ قتل ایسا نہ تھا جیسا کہ جدہ کے مقام پر ۱۸۹۶ء میں ہوا تھا اور جو مذہبی جنون اور تعصب کی وجہ سے کیا گیا تھا - بلکہ یہ قتل ذاتی ناراضگی اور ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا - بہر حال جو نصیحت اِس قتل سے حاصل ہوئی اُس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - اس سے معلوم ہوا کہ خود میرے قریبی ماحول میں بے قاعدگی اور زیادتی و ظلم کا ایک عنصر موجود تھا جس کے ساتھ جلد یا دیر میں سختی کا برتاؤ کرنا ضروری تھا - ورنہ آگے چل کر یہ میری بمبئی اور پونا کی زندگی کے لئے ایک قسم کا بہتا ہوا زخم ثابت ہو جائے گا -

---

باب نمبر ۵

بادشاہ سفیر اور سیاستدان

لندن میں میرے تجربات اور یورپ کے سفر نے میری نظر بہت وسیع کر دی تھی اور اس سے میری اس خواہش اور روزافزوں دلچسپی میں اضافہ ہوگیا تھا کہ میں سیاست کی دنیا میں حصہ لوں اور سیاسی مصلحت بینی یعنی ڈپلومیسی (DIPLOMACY) کے مطابق کام کروں۔ مجھے انگلستان میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا جب کہ میری ملاقات سر ولیم لی وارنر سے ہوئی (SIR WILLIAM LEE WARNER) اور میں نے بہت جلد ان کا اعتماد حاصل کرلیا۔ وہ انڈیا آفس کے سیاسی محکمہ کے صدر تھے۔ یہ وہ محکمہ تھا جہاں امور خارجہ کے تمام خفیہ اور رازداری کے معاملات طے ہوتے تھے۔ گھوڑ دوڑ کے ایک مشہور مالک سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ اُن کا نام سر جے پی میپل (SIR J.P. MAPLE) تھا وہ ایک بڑے فرنیچر اسٹور کے بانی اور صدر تھے جو اُن ہی کے نام سے مشہور تھا اُن کے ذریعے میری ملاقات اُن کے داماد سے ہوئی۔ جن کا نام بیرن وان ایکارڈسٹن تھا۔ (BARON VON ECKARDSTEIN) اور جو اس وقت جرمنی سفارت خانہ کے واقعی انچارج تھے چونکہ اُس کے سفیر اکثر بیمار رہتے تھے۔

اپنے ان دوستوں کی قریبی اور مسلسل صحبت میں مجھے اس بات کا موقعہ ملا کہ میں اُس وقت کی بہت سی سیاسی چالوں کو جو بڑی اہمیت رکھتی تھیں خود براہ راست دیکھ سکوں کہ وہ کس طرح اپنا کام کر رہی تھیں۔ برطانیہ کے بعض حلقوں میں یہ احساس بڑھتا جارہا تھا کہ وہ شاندار یک سوئی اور کنارہ کشی جو کچھ دن پہلے بالکل قدرتی اور قابلِ عمل شمار کی جاتی تھی

نہایت خطرناک نقصانات بھی رکھتی تھی۔ جنوبی افریقہ کے اہم واقعہ نے بہت جلد اس بات کو صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ برطانیہ کس طرح سچ مچ الگ تھلگ رہنے والا ہے۔ برطانیہ کے خلاف سارے یورپ میں جیسے گہرے اور تلخ جذبات پائے جاتے تھے وہ اب اتنے ظاہر ہو گئے تھے کہ اُن کی طرف سے غفلت نہیں برتی جا سکتی تھی۔ لارڈ سیلسبری کی (LORD SALISBURY) کیبنٹ کے سربرآوردہ روحِ رواں اُس زمانہ میں مسٹر جوزف چیمبرلین تھے۔ (MR. JOSFH CHAMBERLAIN) جو نوآبادیات کے سکرٹری تھے یہ حقیقت پرست تو ضرور تھے مگر کبھی کبھی اُن کے شہنشاہیت کے منصوبے محض خواب و خیال کی سی کیفیت رکھتے تھے۔ برطانیہ کی موجودہ حالت کو جو خطرات لاحق تھے اُن سے وہ بہت اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اُس زمانہ کی عالمی قوت کس طرف کو جا رہی تھی اس کا اندازہ کرتے ہوئے مسٹر چیمبرلین کو اس کا یقین تھا کہ برطانیہ اور جرمنی کے درمیان سمجھوتہ ہونے کا امکان ہے اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر یہ سمجھوتہ نہ ہو سکا تو کس قسم کے خطرات سامنے نظر آ رہے تھے۔ اُن کی سرکاری سوانح عمری نے جو حال میں شائع ہوئی ہے صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ مسٹر چیمبرلین کس حد تک اور کس استقلال کے ساتھ انگلستان اور جرمنی کی مفاہمت کرانے کی کوششیں کرتے رہے۔

جہاں تک مجھے واقعات یاد ہیں میں اس بات کی پوری طرح تائید کرتا ہوں۔ یہ برطانیہ کی سچے دل سے اور سخت قسم کی کوشش تھی کہ وہ جرمنی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو جائے مگر اس میں صرف جرمنی کے رویہ اور طرزِ عمل کی وجہ سے ناکامیابی ہوئی۔ اس کی ذمہ داری جرمنی کے اُن خاص آدمیوں پر جو صلح کی بات چیت کے لئے مقرر کئے گئے تھے یعنی پرنس ون بلو (PRINCE VON BULLOW) اور ہیر ون ہولسٹن (HERR VON HOLSTEIN) اور یہ سب ناکامیابی اُن ہی لوگوں کے تعصبات اور نقطہ نظر کا نتیجہ تھا۔ اس سلسلہ میں برطانیہ نے جو قدم بڑھائے میں نے اُن کو اچھی طرح دیکھا اور اس کے ساتھ ہی جرمنی کا جو ردِ عمل اُن پر ہوا اُن کا مجھ کو اس وجہ سے پوری طرح علم ہو جاتا تھا کہ میری دوستی ون ایکارڈسٹین (VONECKARDSTEIN) سے تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ ایکارڈسٹین کو اُس وقت کیسا

رنج ہوتا تھا جب برطانیہ کا سچی دوستی کا پیام برابر رد کر دیا جاتا تھا۔ اور اس رد کرنے کی بنیاد ہمیشہ نئے نئے اور بناوٹی بہانوں اور ٹال بازیوں پر ہوا کرتی تھی۔ ان صلح کی باتوں کے ناکامیاب ہونے پر جو عرصہ تک رہنے والے نتیجے پیدا ہوئے اُن پر اس وقت غور کرنے سے دراصل بہت رنج ہوتا ہے۔ کیا اس بیسویں صدی میں تاریخ کا دور بالکل مختلف نہ ہوتا۔ اگر چیمبرلین اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے کہ انگلستان اور جرمنی کی مخالفت میں جو مسلسل اور ناقابل تلافی اضافہ ہو رہا تھا اُس کو پلٹ دیں؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم دنیا کی دو بڑی لڑائیاں روک سکیں۔ اگر جرمنی اپنا کھیل ٹھیک طرح کھیلتا تو یہ بات ضرور ہو جاتی۔ مگر یورپ میں امن و امان قائم رکھنے کا بڑا مسئلہ ہمیشہ سے جرمنی کے رویّہ پر منحصر رہا ہے۔

اِس سلسلہ میں اُن دو جرمنی آدمیوں کا جو صلح کی بات چیت میں شامل تھے ایسا مزاج رہا جس سے وہ اس موقعہ سے فائدہ نہ اُٹھا سکے جو اُن کو دیا گیا تھا۔ یہ لوگ بسمارک اعظم کے (GREAT BISMARK) سائے میں پلے تھے مگر ان میں اُس جیسی سیاست دانی کی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ دراصل چھوٹے ظرف کے سرکاری عہدہ دار تھے مگر اُن میں بسمارک (BISMARK) کا سارا غرور اور آپا دھاپی موجود تھی۔ یہ لوگ اُس بات کی طرف سے ایسے مشتبہ رہتے تھے کہ کبھی مطمئن نہ ہوں جس کو وہ برطانیہ کی مکاری اور بدعہدی خیال کرتے تھے۔

اس واقعہ کے بہت عرصہ بعد لارڈ رینل نے (LORD RENNELL) (جو پہلے سر رینل روڈ (SIR RENNELL ROOD) کہلاتے تھے اور جو برسوں تک روم (ROME) میں برطانیہ کے سفیر رہ چکے تھے) مجھ سے کہا کہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جب پرنس وون بلو (PRINCE VON BULOW) ریٹائر ہو کر روم میں رہ رہے تھے۔ اس کام قصہ پر ان دونوں نے آپس میں گفتگو کی۔ اس وقت بلو (BULOW) نے بڑے تامل اور رنج کے ساتھ اس بات کو مان لیا کہ دراصل اُن سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے برطانیہ کی دوستی کو رد کر دیا اور برطانیہ کا وہ ہاتھ جو سچے دل سے اور مقصد کی پختگی کے ساتھ

بڑھایا گیا تھا۔ اُس کو جرمنی نے منظور نہیں کیا۔

جب میرا یورپ کا پہلا دورہ ختم ہوگیا تو میں شمالی افریقیہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ بہر حال محض تفریح کا سفر نہ تھا۔ ایک یا دو نازک اور اہم معاملے طے کرنے کے لئے وہاں پر میرا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اور اُن کو طے کرنے کے لئے مجھے ایک حد تک اپنی سیاسی ہوشیاری اور عملی ہنر کو استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ سمندر کے کنارہ پر وہاں چند مقامات تھے جہاں اسمٰعیلی لوگ آباد تھے۔ ان لوگوں کی آبادی اور دولت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور اُن میں سے بعض جماعتوں کے ساتھ وہاں کے مقامی افسروں کے جھگڑے چل رہے تھے۔ جو صرف معمولی قسم کے نہ تھے۔

مشرقی افریقیہ میں تیزی کے ساتھ کام شروع ہوگیا تھا اور ترقی ہو رہی تھی جس سے ملک بھر میں سنسنی پیدا ہوگئی تھی مگر اُس صدی کے ختم ہوتے ہی وہاں کی صورتِ حال آجکل کی حالت سے بالکل مختلف ہوگئی۔ وہاں پر بعض یورپین حکومتیں جن کے اندر اپنی نو آبادیات بڑھانے کا جذبہ موجود تھا۔ آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ بحرِ قلزم سے (RED SEA) سے کر کیپ تک (PAPE) ہزاروں میل کے رقبہ میں وہی ہو رہا تھا جو بعد میں "افریقہ کا جھگڑا" ایک ڈرامائی صورت میں ثابت ہوا (SCRABLE FOR AFRICA) حبشہ (ABYSSINIA) جو افریقہ کی واحد دیسی ریاست تھی اور جس میں اپنے حدود بڑھانے کا شوق موجود تھا کچھ دن بعد اٹلی والوں سے بڑی خونریزی مگر کامیابی کے ساتھ لڑ پڑی۔ ۱۸۹۶ء میں اڈووا کے مقام پر جو جنگ (BATTLE OF ADOWA) ہوئی اُس میں ریس میکونن (RAS MAKONNEN) جو شہنشاہ مینیلک (EMPEROR MENELIK) کا بڑا قابل لفٹننٹ تھا اور جو آخر میں اُن کا جانشین ہوگیا۔ اٹلی کی فوج کو بُری طرح شکست دے چکا تھا۔ اور اس نے تیس سال سے زائد عرصہ تک اٹلی کی اُن تمام کوششوں کو ختم کر دیا جو اٹلی نے سمندر کے کنارہ اپنا پیر جمانے کے لئے بڑی احتیاط کے ساتھ جاری رکھی تھیں۔ برطانیہ نے سلطان زنجبار سے صلح کرنے کے بعد وہ ریاست قائم کر لی تھی جس کو اس زمانہ میں مشرقی افریقہ کی ریاست کہتے تھے اور جو آجکل کینیا (KENYA) کی شاداب نو آبادی کہلاتی ہے۔ اور جہاں پر

بہت سی قوموں والی مرکب جماعت موجود ہے۔ اُس کا مرکز ممباسا میں تھا۔ (M MBASA) جو دفتر خارجہ کے زیر نگرانی تھا۔ کچھ دن بعد وہاں پر لارڈ ڈیلامیر (LORD DELAMERE) وغیرہ نے لوگوں کو آباد کرنے کی تجویزیں پیش کیں۔ اُن مقامات کو "گورے پہاڑی علاقے" (THE WHITE HIGHLANDS) کہنے لگے۔ جو سمندر کے کنارہ پر ریاست کے پیچھے واقع تھے۔

جنوب کی طرف جرمنی لوگوں نے ملک کے اندر اپنے منصوبوں کی بازی لگا رکھی تھی۔ جو دارالسلام سے لے کر اُن حصوں میں واقع تھے۔ جن کو اب ٹنگانیکا (TANGANYIKA) کہتے ہیں۔ اُس کے اور جنوب کی طرف پرتگال والوں کے پاس جو یورپ کے سب سے پہلے وہ لوگ تھے جنہوں نے گذشتہ تلاش وسفر کے مشہور زمانہ میں اِن ملکوں کے اندر آنے کی ہمّت کی تھی۔ ایک پُرانی قائم کی ہوئی کالونی (COLONY) موجود تھی۔ اس کے آگے بڑھ کر ملک کے اندرونی حصہ میں جمیسن (JAMESON) اور اُس کے سربرآوردہ ساتھیوں نے وہاں کے خالی اور بے درخت والے گھاس کے میدانوں میں وہ حصہ بنانا شروع کر دیا تھا جو بعد میں شمالی اور جنوبی روڈیشیا (RHODESIA) بن گیا۔ اُس کے آگے اور جنوب کی طرف برطانیہ اور بور لوگ (BOERS) اُس لمبی اور سخت لڑائی میں مصروف تھے جو جنوبی افریقہ کی جنگ (SOUTH AFRICAN WAR) کہلاتی ہے۔

گو افریقہ میں اُس وقت آئندہ مالی ترقی اور لڑائی کی ابتدا ہونے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ جہاں میں ۱۸۹۹ء میں پہلی مرتبہ گیا۔ مگر پھر بھی آئندہ کے سیاسی اور تمدنی مسائل اور مشکلات بھی اسی طرح نمایاں ہو رہے تھے۔

(ZANZIBAR) زنجبار جس کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ عرب تمدن کا پُرانا مرکز تھا۔ وہاں کے سلطان اُس وقت بالکل خود مختار بادشاہ نہیں رہے تھے بلکہ برطانوی ریزیڈنٹ اور عہدہ داروں کے مشورہ پر کام کرنے والے ایک قسم کے دستوری بادشاہ تھے۔

اُن عہدہ داروں اور میرے اسمٰعیلی مریدوں کے درمیان ایک پیچیدہ جھگڑا شروع ہو گیا تھا جو سمندر کے کنارہ پر ایک حصہ زمین کی ملکیت اور حقوق کے متعلق تھا۔

اُس زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی مگر یہ اسمٰعیلی قبرستان کی طرح استعمال کیا جاتا تھا یہ جھگڑا بہت سخت تھا اور بہت زمانہ سے چل رہا تھا۔ اس کو طے کرانے میں بہرحال میں کامیاب ہوا اور جس میں فریقین کے لئے ایک قسم کا صلح نامہ اور راضی نامہ ہو گیا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے اپنی تمام عمر اس اصول پر کام کیا ہے کہ راضی نامہ ایسے اختلافات سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے جس پر فریقین سختی کے ساتھ اڑے رہیں اور کبھی ایک دوسرے کی طرف نہ جھکیں۔ وہ راضی نامہ جو ہم نے زنجبار میں کیا اس حد تک قابلِ عمل رہا کہ اُس وقت سے اب تک وہاں پر اسمٰعیلیوں اور برطانوی بااختیار افسروں کے درمیان کسی قسم کا دوسرا بڑا جھگڑا نہ ہو سکا۔

دارالسلام میں بھی مجھے اسی قسم کے جھگڑے سے سابقہ پڑا۔ یہ معاملہ میرے مریدوں اور جرمنی کے بااختیار افسروں کے درمیان تھا جو ملک میں تجارت کرنے کے حقوق سے متعلق تھا۔ یہ جھگڑا ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۸۹۹ء تک برابر آگ کی طرح سلگتا رہا اور کبھی کبھی چمک اُٹھتا تھا۔ جرمنی کے لوگ میرے اسمٰعیلی مریدوں کے متعلق شبہات رکھتے تھے اور وہ یہ الزام لگاتے تھے کہ اسمٰعیلی ہتھیاروں کو چوری سے لاتے اور لے جاتے ہیں۔ اور عرب میں جو بغاوت دس سال پہلے ہو چکی تھی اُس میں اسمٰعیلیوں کا ہاتھ تھا۔ جب میں پہلی مرتبہ وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جرمن گورنر اور اُس کے عہدہ داروں کا رویہ کچھ سخت تھا۔ مگر میں بہرحال اپنی کوشش میں لگا رہا اور قبل اس کے کہ میں وہاں سے روانہ ہوں میں اس میں کامیاب ہو گیا کہ اس جھگڑے کو طے کرا دوں اور اُن شبہات کو بالکل دور کر دوں جو غالباً اُس جھگڑے کی شدت کا ایک سبب تھے۔ جب میں چلنے لگا تو معلوم ہوا کہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ جہاں تک میرے مریدوں اور جرمنی حکومت کے درمیان اختلافات کا تعلق تھا۔

مشرقی افریقہ سے میں کچھ عرصہ کے لئے یورپ واپس چلا گیا۔ جب سردی کا موسم آیا تو میں جنوب اور مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ اپنے وطن ہندوستان کو واپس ہوتے ہوئے میں نے پہلی دفعہ مصر کو دیکھا۔ جن لوگوں نے مصر کو نہیں دیکھا ہے اور جو لوگ

ایسے خوش قسمت نہیں ہیں کہ مصر کے جادو سے متأثر ہوئے ہوں اُن لوگوں کے لئے میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بہت مشکل ہوگا کہ اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ مصر کو پہلی مرتبہ دیکھنے سے کس قسم کا خاص جادو ہوجاتا ہے۔ اب اس میں یہ اضافہ اور کر دیجئے کہ میری پہلی نگاہ جب مصر پر پڑی تب خوب سردی کے موسم میں صبح کا وقت تھا اور اس بات کے کہنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے کہ اس وقت سے اپنی تمام عمر میرے دل میں مصر کے لئے ایک خاص جگہ پیدا ہوگئی اور یہ کہ میں وہاں جہاں تک ممکن ہوسکا برابر جاتا رہا۔

مصر کی خوبصورتی میں ایک نرالی خصوصیت ہے۔ اُس کے کشادہ اور خاموش آسمان۔ اُس کی روشنی اور فضا میں غیر معمولی صفائی۔ اُس کے غروب آفتاب کے وقت کی شان اور اُس کی تاروں بھری راتیں۔ اُس کے شاندار ماضی کی بے پناہ یادگاریں مگر مصر میں صرف سیر۔ تفریح کرنے کے علاوہ میرے اور بھی مقصد تھے۔ وہ یہ کہ میں وہاں شام کی بڑی اسمٰعیلی جماعت اور مصر کے اُن باقی اسمٰعیلیوں سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا تھا۔ جو اب تک مجھ سے ملنے کے لئے ہندوستان نہیں آئے تھے۔ میں نے مسلم تعلیم کے اُس بڑے مرکز کو بھی دیکھا۔ یعنی۔ الازہر یونیورسٹی کو۔

یہ بڑا اہم اور ہیجان پیدا کرنے والے واقعات کا زمانہ تھا۔ سوڈان میں امڈرمن (OMDURMAN) کے مقام پر لارڈ کچنر (LORD KITCHENER) کی بڑی فتح ابھی تک ہر شخص کے خیال میں تازہ تھی۔ جنرل ونگیٹ (GENERALWINGATE) اُس وقت جنوب کی طرف سے واپس آچکے تھے۔ خلیفہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اور اُن کے درویش مریدوں کی آخری تحریک بالکل جڑ سے اُکھاڑ دی گئی تھی۔

میں لارڈ کرومر (LORD CROMER) سے ملا جو مصر میں برطانوی ریزیڈنٹ تھے۔ (BRITISHRESIDENT) اور جن کا اثر اور اختیار اُس وقت مصر میں سب سے زیادہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ مصر کو سرسید احمد جیسے آدمی کی سخت ضرورت تھی۔ جو وہاں کی مسلم آبادی کے لئے اُسی قسم کا تعلیمی اور نئی زندگی دینے والا کام کرے جو سرسید احمد نے علیگڈھ میں کیا تھا۔ اُس وقت مصر میں بڑا گہرا اختلاف پایا جاتا تھا۔ جس میں ایک طرف تو وہاں کے

پرانے طرز کے قدامت پسند اور پرہیز گار مسلمان تھے جو جدید سائنس اور جدید طریقوں سے نفرت کرتے تھے اور عربی بولتے تھے اور پڑھتے تھے۔ اور دوسری طرف فرانس کا مارا ہوا (FRENCHIFIED) ان اونچے لوگوں کا طبقہ تھا جو خاص طور پر فرانس کے بازاری اور سستے ناول پڑھا کرتے تھے۔ جن کے ملنے کی جگہ کلب میں تھی۔ جن کی تفریح تاش کھیلنا اور راتوں کو جوا کھیلنا تھی۔ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو باہر نکال دینے کی سخت تمنا رکھتے تھے اور جو خدیو اسمٰعیل کا دورِ حکومت لوٹ آنے کی خواہش کرتے تھے۔ اس وقت مصر میں کوئی چیز علیگڈھ جیسی نہ تھی جو وہاں کی وسیع مسلم آبادی کو مصالحت کا وہ راستہ دکھا سکے جس سے جدید مغربی سائنس کو سمجھنے اور اس کے ساتھ ساز کرنے کی صورت پیدا ہو جائے اور جو وہاں کے بہترین لوگوں کو اس قابل بنا سکے کہ وہ برطانوی افسروں اور برطانوی دستکاروں کے ساتھ مل کر قوم کی مالی اور معاشرتی ترقی کے لئے وہ کام کریں جس کی ملک کو اس وقت سخت ضرورت تھی۔

بدقسمتی سے خدیو عباس حلمی اس وقت بیمار تھے۔ یہ گمان تھا کہ ان کو کسی قسم کا ٹائی فائڈ (PARATYPHOID) تھا۔ میں اس وجہ سے ان سے ملاقات نہ کر سکا۔ آئندہ سالوں میں ہم دونوں بڑے گہرے دوست ہو گئے۔ میں ان کی دماغی تیزی اور ان کے علم سیاست و تاریخ کی جو بہت وسیع اور گہرا تھا بہت تعریف کرتا تھا۔ آگے چل کر میں ان کے متعلق پھر ذکر کروں گا۔ مصر کے جن وزیروں سے میری ملاقات ہوئی وہ صرف برطانیہ کے نامزد کئے ہوئے تھے۔ یعنی دراصل لارڈ کرومر (LORD CROMER) کے نامزد کئے ہوئے۔

جن لوگوں نے قاہرہ (CAIRO) کو آجکل کے زمانہ میں دیکھا ہے ان کو ۱۹۰۰ء کے بعد ابتدائی چند سالوں میں جو وہاں کے سوشل حالات تھے ان کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا اس زمانہ میں وہاں کے ہوٹل مال دار پردیسیوں سے بھرے رہتے تھے جو مصر میں سردی کا موسم گذارنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ اس زمانہ کا بڑا فیشن ایبل (FASHIONABLE) تفریح کا طریقہ تھا۔ یہ لوگ کرایہ کی کشتیوں میں بیٹھ کر دریائے نیل تک تفریح کے لئے جایا کرتے تھے۔ یا مسرز ٹامس کک (MESSERS.THOMAS COOK) کے کسی اسٹیمر میں

بیٹھ کر جاتے تھے۔ وہ خوب آزادی کے ساتھ روپیہ خرچ کرتے تھے اور بڑے چین سے اپنا وقت گزارتے تھے۔ اُن کے چاروں طرف اچھی شان و صورت والے مصری گائڈ اور وہ لوگ جو ترجمہ کرنے والے بنتے تھے موجود رہتے تھے۔ یہ ترجمہ کرنے والے یورپ کی ہر زبان کو عجیب گڈ مڈ کے ساتھ بولنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

قاہرہ کے عجائب خانہ میں جو چیزیں تھیں وہ ایسی ہی دلفریب تھیں جیسی کہ وہ ہمیشہ سے رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ گو اُس وقت تک لارڈ کارنارون (LORD CARNARUUN) نے جو شاندار توتن خامن (TUTANKHAMEN) کی تحقیقاتیں کی ہیں اور جو نئی چیزیں وہاں معلوم کی ہیں وہ سب وہاں موجود نہ تھیں مگر پھر بھی دیکھنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان موجود تھا۔ مگر اُن سب کا انتظام ایسا تھا جس میں اس سے بھی کم سہولت پائی جاتی تھی جتنی کہ آجکل پائی جاتی ہے۔ ایک نہایت ناخوشگوار اور تعظیم کے خلاف یہ رواج پھیلا ہوا تھا کہ سب بڑے بڑے فرعونوں کے (PHARAOHS) اصلی مجسمے پوری طرح کھول کر ہر اُس شخص کو دکھا دیے جاتے تھے جو اُن کو دیکھنا چاہے۔ یہ نہیں تھا کہ صرف وہ صندوق ہی اوپر سے دکھا دیے جائیں جن کے اندر اُن کے جسم کفن اوڑھے ہوئے رکھے رہتے تھے آپ وہاں رامیسس دوم (RAMESES II) کو دیکھ سکتے تھے جو اپنی شریف بانما شکل و صورت کے ساتھ اپنے صندوق میں لیٹا ہوا تھا اور جو دیکھنے میں قریب قریب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان تمام گذشتہ صدیوں میں اسی طرح کی زندہ صورت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اور پہلے زمانہ کے بڑے بڑے بادشاہ اور ملک فتح کرنے والے اسی طرح ہر کس و ناکس کے قدموں پر پڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے جو اتفاق سے وہاں جا پہنچے۔

میں چونکہ ماضی کی نسبت حال کے زمانہ سے زیادہ تعلق رکھنے والا تھا۔ اس وجہ سے میرے لئے بہرحال اُس زمانہ میں قاہرہ کے اندر سب سے زیادہ اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ عملی اعتبار سے بالکل دوسرا پونا یا شملہ تھا۔ وہ برطانوی فوقیت کا مرکز اور قلعہ اس سے زیادہ تھا جیسا کہ ہندوستان تھا۔ برطانیہ کے لوگ وہاں پر صرف سیاسی اقتدار ہی نہ رکھتے تھے بلکہ انہوں نے ایسی سوشیل برتری حاصل کر لی تھی جس کو مصریوں نے عاجزی کے

ساتھ مان لیا تھا۔ جو کچھ سیاسی گڑبڑ وہاں پائی جاتی تھی اُس کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ سبب مصر کے شاہی محل کی چالبازیوں کی وجہ سے تھی۔

مصر کے سب طبقوں کا عام رویہ برطانوی ملک گیر طاقت کے ساتھ اُس کے کارکن اور افسروں کے ساتھ۔ برطانوی فوجی عہدہ داروں کے ساتھ اور برطانوی کارخانوں میں ملازموں کی روزافزوں تعداد کے ساتھ ایسا تھا جس میں بظاہر اطاعت اور فرمانبرداری پائی جاتی تھی۔ یہ ناخوشگوار واقعہ ہے کہ جس طرح ہندوستان میں ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۸۹۹ء تک اور پھر ۱۹۰۰ء کے بعد چند ابتدائی سالوں میں تھا۔ اسی طرح مصر میں برطانوی جماعت کے درمیان خواہ وہ سیاسی تھی یا فوجی یا تجارتی اور مصری حکمران طبقہ کے درمیان یا قاہرہ اور اسکندریہ کے مالدار اوسط طبقہ کے درمیان مشکل سے کسی قسم کا لگاؤ پایا جاتا تھا۔ جب مصر کے مالدار لوگ یورپ آتے تھے تو وہ پیرس چلے جاتے تھے یا سوئٹزرلینڈ یا جرمنی۔ یا آسٹریا۔ یا اٹلی۔ مگر وہ انگلستان سے جان بوجھ کر الگ رہتے تھے۔ سردی کے موسم میں جو سفر کرنے والے باہر سے آتے تھے۔ اُن میں سے اُن چند آدمیوں کے علاوہ جو یورپ سے آئے تھے اور کوئی آدمی مشکل سے یہ زحمت اُٹھانا گوارا کرتا تھا کہ مصر کے اُونچے اور درمیانی طبقہ کے متعلق کوئی معلومات حاصل کرے۔ جزیرہ تفریحی کلب (GEZIRA SPORTING CLUB) جو دارالسلطنت قاہرہ کے وسط میں واقع تھا اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ سوائے خاص اور مستثنیٰ صورتوں کے مصری باشندے اُس کلب کے ممبر بن سکیں

دفتروں کے ماتحت اہل کار اور دوسرے ملازموں کے علاوہ صرف وہ غیر برطانوی لوگ انگریزوں سے ملتے تھے جو چند مالدار لیونٹائن (LEVANTINE) خاندانوں کے افراد تھے اور جنہوں نے پورے طور پر اس بات کی کوشش کی تھی کہ حکمران طبقہ کے ساتھ مل جل کر ایک بن جائیں اور حکمران طبقہ نے اس بات کو منظور کر لیا تھا۔ اِس سوشل تفریق کی گہرائی اور زہریلاپن کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ میں خود جب تک کہ قاہرہ میں رہا مشکل سے کسی انگریز سے مل سکا۔ سوائے اِس کے کہ میں اُن کے مکان پر جاؤں۔ حالانکہ میں نے اپنے یورپ کے سفر میں اکثر مصریوں سے ملاقات کی جو زیادہ تر حکمران

طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور جو وہاں کے شاہی خاندان کے افراد تھے۔ مگر مصر میں درحقیقت انگریزوں کے ساتھ سوشل تعلقات پیدا کرنے کے لئے کوئی مشترک چیز نہ تھی۔ اسی وجہ سے مجبوراً وہاں کے لوگوں کے دلوں میں ایک قسم کی غمگین اور مایوس کن ناراضگی پیدا ہو گئی۔ جو تقریباً ذاتی قسم کی تھی اور جس نے آگے چل کر بلاوجہ اُس اختلافی جنگ کو نہایت تلخی کے ساتھ زہر آلود کردیا۔ جو مصری قوم پرستی اور برطانیہ کے نفع نقصان کے درمیان ہوئی اور یہ وہ نفع و نقصان جو برطانیہ کیلئے بہ حیثیت ایک قابض حکومت کے ضروری تھے۔

قاہرہ میں تقریباً تین ہفتہ رہنے کے بعد میں اپنے وطن ہندوستان کو چلا گیا۔ وہاں پر میرا وہ کام جو میں نے وہاں کیا تھا اُن لوگوں سے پوشیدہ نہ رہا تھا جن کو اُس سے کچھ تعلق تھا۔ سلطان زنجبار نے مجھے اپنے عطیات کا سب سے بڑا خطاب عطا کیا یعنی برلینٹ اسٹار آف زنجبار (BRILLIANT STAR OF ZANZIBAR) اور کچھ دن بعد شہنشاہ جرمنی نے اول درجہ کا خطاب عطا فرمایا یعنی رائیل پرشین آرڈر آف دی کروَن (ROYAL PRUSSIAN ORDER OF THE CROWN)

ہندوستان سے روانہ ہو کر میں نے برما کا مختصر سفر کیا اور وہاں پہ پہلی مرتبہ اپنے معتقدوں سے ملا۔ مجھے اس وقت وہاں کا ایک بڑا دل توڑنے والا واقعہ یاد آتا ہے اور یہ تھا کہ میرے ملاقاتیوں میں ایک مسلمان جو میرے مریدوں میں سے نہ تھے۔ مجھ پر بڑی مہربانی کرتے تھے اور انہوں نے مختلف طریقوں سے میری مدد کی تھی۔ ایک دن میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کے مکان پر گیا۔ دونوں طرف سے سلام وغیرہ ہونے کے بعد انہوں نے میرے لئے شربت کا ایک گلاس منگوایا جو فوراً آ گیا اور ایک ملازم نے وہ بڑا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے دیکھا کہ جن ہاتھوں میں وہ گلاس تھا وہ ایک کوڑھی کے ہاتھ تھے۔ میں خوف زدہ ہو کر اس کی طرف تکنے لگا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے وقت کا کوئی احساس نہیں رہا۔ میں نے جو عذر بھی کر سکتا تھا کیا اور میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے مطلق پیاس نہیں ہے میں نے برابر کوشش کی کہ وہ گلاس جو میری طرف بڑھایا جا رہا تھا اس کے لینے سے بچوں۔ مگر میرے میزبان نے بڑے زور سے اصرار کیا اور وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ آخرکار میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گلاس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شربت کو گٹا گٹ کر کے

جلدی پی گیا۔ مگر میرے دل میں اُن ہاتھوں کا خوف باقی رہا۔

میں سنہ ۱۹۰۰ء میں پھر یورپ واپس ہوا۔ اُسی سال پیرس میں جہاں بڑی نمائش ہوئی تھی (GREAT EXHIBITION) میری ملاقات ایران کے شاہ مظفرالدین سے ہوئی میرے خیال میں کسی اور بادشاہ نے ایران کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ اس بادشاہ نے پہنچایا۔ وہ ہمیشہ بیمار رہتے تھے۔ بہت کمزور تھے اور جاہل مطلق تھے۔ وہ وہم پرست اور فضول خرچ تھے اور اپنے پِٹھوؤں پر اپنی دولت برباد کرتے تھے۔ وہ بہ حیثیت بادشاہ کے اپنے فرائض اور پابندیوں سے کوئی واقفیت رکھنے کے قابل نہ تھے۔ وہ سب خزانہ اور دولت جو اُن کے باپ نصیرالدین شاہ نے پچاس سال کے اندر بڑی دور اندیشی اور قابلیت کے ساتھ اپنی حکومت کے زمانہ میں جمع کی تھی وہ سب مظفرالدین نے اپنی حماقت اور بیکار باتوں میں برباد کر دی۔ اُن کے اندر ایک نہایت افسوسناک اور بچوں والا جذبہ فضول کی بیش قیمت چیزوں کو جمع کرنے کا تھا۔ مثلاً۔ گانے بجانے کے سامان جن میں ہیرے جواہرات لگے ہوں اور سونے چاندی کے بنے ہوئے ہوں۔ اُن چیزوں پر اور دوسری اسی قسم کی بھڑک دار اور دکھاوے کی چیزوں پر وہ ساری دولت خرچ کر دیتے تھے۔ اِسی وجہ سے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایران کے تعلیم یافتہ آدمیوں نے اُن کا عرفی نام "موو ے اَے فیر" (MAUVAISE AFFAIRE) رکھا تھا جس میں اُن کے اصلی نام 'مظفرالدین' کا ذو معنی مذاق اُڑایا گیا تھا اور یہ مذاق کا لفظ باہر والے آدمی تہران میں بھی استعمال کرنے لگے۔

("موو ے اے فیر" ایک فرانسیسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ چھچورا۔ لفنگا۔ بیکار آدمی۔)

وہ درحقیقت اپنے ملک کے لئے "موو ے اے فیر" ثابت ہوئے۔ میں چونکہ ان کا رشتہ دار تھا اور میرا یہ رشتہ اُن سے میرے والد کے خاندان کی طرف سے اور میری والدہ کے خاندان کی طرف سے تھا۔ اس لئے وہ مجھ سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آئے۔ انہوں نے مجھے اپنے سب سے بڑے خطابوں میں سے ایک خطاب دیا اور ہیرے کے زیورات بطور تحفہ کے میرے سامنے پیش کئے۔ مگر وہ بڑے احمق اور "کورے بدھو" تھے (SAD NINCOMPOOP) اُن سے باتیں کرنا بالکل بچہ سے باتیں کرنے کی برابر تھا اور وہ کسی

ذہین بچہ سے نہیں۔ اُن کا یہ بچوں والا نقطۂ نظر اور طرزِ عمل قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا تھا اور یہ کام اُن کے وزیرِ اعظم عطا بیگ کرتے تھے۔ جن کے ہاتھ میں سارے اختیارات تھے اور جن کا یہ طریقہ تھا کہ روزانہ صبح کے وقت جب وہ اپنے بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لئے جائیں تو اُن کو کسی قسم کی معقول اور اہم رپورٹیں نہ دیں بلکہ ان سے اس قسم کے خیالی اور جن بھوت کے قصے بیان کریں جو ایک بڑا آدمی کسی چھوٹے بچہ کے سامنے صرف اُس کا دل خوش کرنے اور اُس کو بہلانے کے لئے بیان کرتا ہے۔

جب میں نے اس قابلِ رحم آدمی سے ملاقات کی تو میں اتفاقاً یہ ذکر کر بیٹھا کہ میں برما گیا تھا۔ اس پر وہ فوراً دریافت کرنے لگے :۔

"اوہو! کیا برما کے آدمیوں کے سر اور دوسرے آدمیوں سے بڑے نہیں ہوتے ہیں؟"

جب وہ پیرس میں تھے تو انہوں نے سنا کہ موسیٔ اور میڈم کیوری نے (MONSIEUR & MADAMECURIE) ریڈیم دھات (RADIUM) معلوم کی ہے۔ اِس پر انہوں نے فرمائش کی کہ مجھے یہ دکھاؤ کہ ریڈیم کس طرح کام کرتا ہے۔ اُن دونوں ممتاز سائنس دانوں نے جواب میں کہا کہ ہم آپ کے ہوٹل میں آکر ریڈیم کی خصوصیات کے تجربات آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ مگر اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اس کمرہ میں بالکل اندھیرا رکھا جائے۔ چنانچہ ہوٹل کا ایک تہ خانہ والا کمرہ 'ڈارک روم' بنا دیا گیا۔ اُس میں کالے پردے لٹکائے گئے اور روشنی بالکل بند کر دی گئی۔ موسیٔ کیوری اور میڈم کیوری (MONSEIURE & MD M ECURIE) دونوں وہاں آپہنچے اور انہوں نے ریڈیم کا ایک ٹکڑا نکالا جس کی تیز چمک سے سارا کمرہ روشن ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی بادشاہ نے وہاں سے بھاگنا شروع کیا۔ وہ کمرہ کے چاروں طرف چیخنے چلانے لگے اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ وہ باولوں کی طرح بکواس کر رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے اور اُن دونوں کیوری سائنس دانوں پر یہ الزام لگا رہے تھے کہ ان دونوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ دونوں کیوری سائنس دان اِس قسم کے برتاوے کے عادی نہ تھے انہوں نے

بہت توہین محسوس کی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ بادشاہ کو آخر کار سمجھایا گیا کہ اُن کے طرزِ عمل سے اُن دونوں کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کی تلافی کرنے کے لئے بادشاہ نے اُن میں سے ہر ایک کو اپنے سب سے بڑے تمغوں میں سے ایک ایک تمغہ عطا فرمایا اور اس کو بہتر بنانے کے لئے حکم دیا کہ ہر ایک ستارہ پر ہیرے جڑ دئیے جائیں۔ یہ نمائشی چیزیں اُن دونوں کیوری سائنس دانوں کے پاس پہنچ گئیں۔ مگر انہوں نے صرف رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد ان چیزوں کو سختی کے ساتھ واپس کر دیا اور یہ بتایا کہ اُن کی اتنی زبردست توہین کی گئی تھی کہ وہ اس قسم کی کوئی چیز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

بادشاہ ایفل مینار (EIFEEL TOWER) پر چڑھنے کا شوق رکھتے تھے مگر آدھے راستہ ہی سے وہ خوف زدہ ہو جاتے تھے اور اس لئے لفٹ (LIFT) کو بند کرنا پڑتا تھا۔ اور اُن کو پھر نیچے اُتارنا پڑتا تھا۔

اُن کا طرزِ عمل خواہ پبلک میں ہو یا پرائیویٹ ہو قابلِ افسوس تھا۔ میں چونکہ خود ایرانی نسل کا ہوں اور ایران کے شاہی خاندانِ قاچار کا ایک فرد ہوں۔ اِس لئے مجھے اُنکے طرزِ عمل سے بڑی شرم اور ذلت محسوس ہوتی تھی۔ اور اسی طرح ایران کے سب سیاسی لیڈروں اور سیاسی مدبروں کو ہوتی تھی جو اس بات سے بہت رنجیدہ ہوتے تھے۔ اور توہین محسوس کرتے تھے۔ کہ اُن کا بادشاہ اپنی اور اپنے ملک کی شہرت کو بدنام کرنے کے لئے کیسی کیسی حرکتیں کر رہا ہے۔ ہم سب جہاں تک ہم سے ہو سکتا تھا ان حرکتوں کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور بادشاہ کی خرابئ صحت کے عذر پیش کرتے تھے جو ایک حد تک سچ بھی ہوتے تھے۔ چونکہ یہ واقعہ تھا کہ بادشاہ کو گردوں کے مرض کی بہت پرانی شکایت تھی۔

اُن کی حماقتوں کی جڑ دراصل بالکل مختلف اور بہت گہری تھی۔ یہ بادشاہ اپنے اندر پرانے طرز کی خود مختار مشرقی بادشاہیت کے سارے خطرات ایک خاص قسم کے خوفناک رنگ میں ظاہر کرتے تھے۔ اس قسم کا مطلق العنان خود مختار بادشاہ خواہ کتنا ہی نالائق۔ بیوقوف اور مجرم کیوں نہ ہو۔ مگر پھر بھی دنیا کے قابل اور ہوشیار سیاست دان

آدمیوں میں سے جو اُن کے آس پاس رہتے تھے ایک بھی ایسا نہ ہوتا تھا جس میں یہ ہمت ہو کہ کھڑے ہو کر اُن کے سامنے اُن باتوں کو بتلا دے جو دراصل اُن کے متعلق سچی تھیں۔ بادشاہیت کے متعلق اور بادشاہوں کی نسل اور خون کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ایسا پُراسرار وقار قائم ہوگیا تھا جس سے اچھے خاصے بھلے اور صاف دل آدمیوں میں بھی ایک قسم کا دماغی فالج پیدا ہو جاتا تھا اور اسی وجہ سے وہ بالکل اس قابل نہ رہتے تھے کہ وہ اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کے فائدہ کے لئے بلکہ خاص اپنے فائدہ کے لئے بادشاہ کو صحیح مشورہ دے سکیں یا صحیح بات بتا سکیں۔ میرے ممتاز روسی دوستوں نے جو کچھ مجھ سے ذکر کیا ہے اُس سے مجھے اندازہ ہے کہ زار روس (CZARIST RUSSIA) کے زمانہ میں بھی اسی قسم کی فضا روس میں پھیلی ہوئی تھی۔ کیا یہ فضا اسٹالن کے زمانہ میں روس کے اندر باقی نہیں رہی؟ ضرور رہی ورنہ مجھے تعجب ہوگا۔ جن آدمیوں کو اس قسم کا دماغی فالج ہوگیا تھا اُن کو آپ بزدل نہیں کہہ سکتے۔ وہ زمانہ کے ساتھ چلنے والے ابن الوقت بھی نہ تھے۔ یہ بھی نہ تھا کہ اُن میں جرأت نہ ہو یا اُن کے کوئی اصول نہ ہوں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے نزدیک اپنے بادشاہ کے اندر اس قسم کی الوہیت اور خدا کی خصوصیات پائی جاتی تھیں کہ بادشاہ کی کمزوریوں اور حماقتوں کے معاف کر دینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اُن کے نزدیک بادشاہ کے اندر وہ سب حماقتیں اور کمزوریاں بالکل موجود ہی نہیں تھیں۔ تاریخ ہم کو بار بار یہی سبق سکھاتی ہے۔ ایک طاقتور اور خود ترقی کرنے والا آدمی ایک سلطنت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اس کے بعد اس کی کمزور اولاد اس نیم خدائی کی فضا کا سہارا پکڑ لیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ سلطنت ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہی عمل از سر نو شروع ہو جاتا ہے۔ یا ایسا ہوتا ہے جیسا کہ جاپان میں صدیوں تک رہا کہ وہ نیم خدا بادشاہ تو اپنے محل میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں نہ اس کے پاس کوئی جائے اور نہ وہ کسی کو دیکھے اور اس کے سب اختیارات اس کی طرف سے محل کے قائم مقام عہدہ دار استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کی مطلق العنان اور خود مختار بادشاہت میں جو سب سے زیادہ افسوسناک عیوب اور خرابیاں ہو سکتی ہیں اُس کی

جیتی جاگتی مثال بیچارے مظفر الدین میں پائی جاتی تھی۔

پیرس سے میں برلن (BERLIN) چلا گیا اور وہاں پہنچ کر کھانے پر مسٹر ہولسٹن سے (HOLSTEIN) میری ملاقات ہوئی۔ یہ اُن دو آدمیوں میں سے ایک تھے۔ جن کی وجہ سے اُن کوششوں میں ناکامیابی ہوئی جو انگریزوں اور جرمنیوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے لئے کی گئی تھیں۔ مسٹر ہولسٹن کافی عمر کے۔ ذرا الگ تھلگ رہنے والے خاموش قسم کے آدمی تھے وہ خوب کھانا کھاتے تھے اور بات کم کرتے تھے۔ پوٹسڈم (POTSDAM) کے مقام پر مجھے قیصر جرمنی کی ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ولیم ثانی قیصر جرمنی میرا خیال ہے کہ اُسوقت اپنی عجیب اور بدبخت زندگی کے انتہائی عروج پر تھے۔ میرے ساتھ وہ بہت مہربانی اور صاف دلی سے پیش آئے۔ مجھے لوگوں نے آگاہ کر دیا تھا کہ قیصر کو اپنی جسمانی عیب کا بہت زیادہ احساس ہے اور وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص اُن کے بائیں بازو پر نظر ڈالے جو مارا ہوا تھا۔ مگر اُن کے دربار کے آدمیوں اور دوسرے لوگوں نے جو ان کو جانتے تھے یہ ذکر کیا کہ نئی بات دیکھنے اور معلوم کرنے کے لئے انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو شخص بھی قیصر سے پہلی مرتبہ ملاقات کرتا ہے اُس کی نگاہ خود بخود بلا اختیار اور بغیر روکے ہوئے اُن کے لباس کی بائیں جانب کی طرف پھر جاتی ہے۔ جب میں اُن سے ملاقات کرنے کے لئے گیا تو میں نے بار بار اپنے دل میں یہ کہا کہ "اُن کے بازو کی طرف ہرگز نہ دیکھنا اُن کے بازو کی طرف ہرگز نہ دیکھنا۔"

قیصر جرمنی کمرہ کے اندر داخل ہوئے۔ میری نگاہ بڑی احتیاط اور بڑے قاعدہ کے ساتھ کام کر رہی تھی مگر میں اُن کے بازو کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ قیصر کو اس قسم کا تجربہ کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ انہوں نے میرے استقبال کی سرگرمی اور خوش اخلاقی میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔

انہوں نے اپنا سیدھا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ یہ میرے لئے بڑا تکلیف دہ تجربہ تھا۔ اپنی کمزوری کی تلافی کرنے کے لئے قیصر نے بچپن ہی سے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ ان کا سیدھا ہاتھ اور سیدھا بازو اتنے مضبوط اور قوی ہو جائیں کہ وہ اُن سے

دونوں ہاتھ اور دونوں بازو کا کام لے سکیں۔ اس لئے وہ برابر سخت قسم کی ورزش کرتے رہے۔ روزانہ وہ بیس منٹ تک تلوار بازی (FENCING) کیا کرتے تھے۔ وہ اکثر دو گھنٹہ تک برابر ٹینس کھیلتے رہتے تھے اور اس کے علاوہ سب قسم کی ایسی ورزشیں کرتے تھے جن سے کمزوری کا علاج ہو سکے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے سیدھے ہاتھ اور سیدھے بازو میں بے انتہا طاقت پیدا ہوگئی۔ اسی طاقت کا ایک اثر یہ تھا کہ انہیں نے مجھ سے ایسا خطرناک اور سخت قوی مصافحہ کیا۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ مصافحہ کا جو تجربہ مجھے ہوا وہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ڈچیز آف ٹیک (DUCHESS OF TEEK) نے جو بعد میں مارشیونز آف کیمبرج (MARCHIONESS OF CAMBRIDGE) ہوگئی تھیں۔ مجھ سے ذکر کیا کہ جب ملک معظم قیصر جرمنی اپنے ہاتھ میں اُن کا ہاتھ لیتے تھے تو اکثر عورتوں کی طرح جن سے ملک معظم مصافحہ کرتے تھے اُن کو بھی تکلیف کی وجہ سے اپنی چیخ روکنے میں بڑی دقت محسوس ہوتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ قیصر جو کچھ کرتے تھے اُس سے وہ بے خبر تھے۔ چونکہ وہ اتنے بڑے شریف آدمی واقع ہوئے تھے کہ قصداً ایسی حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جس طرح ہماری آنکھیں خود بخود اُن کے مُردہ بازو پر پڑجاتی تھیں اسی طرح وہ بے خبری میں اپنی سخت جسمانی طاقت کا استعمال کر بیٹھتے تھے۔

جب میں اُس پچھلے زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسا وقت تھا جب میری بہت سی ملاقاتیں بادشاہوں کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ اسی سال کچھ عرصہ بعد میں قسطنطنیہ گیا۔ سلطان عبدالحمید نے مجھ کو پیرا پیلیس ہوٹل میں (PERA PALACE HOTEL) اپنا مہمان بنایا اور یلدز محل (YILDIZ PALACE) میں میری طویل ملاقات اُن سے ہوئی۔ اس ملاقات میں بہت سی بے تکی سیاسی خیال بازی کی گئی جو کوری قیاس آرائی تھی۔ اُس وقت بھی اور اُس کے بعد بھی سلطان خلیفہ بھی تھے اور اس وجہ سے ساری اسلامی دنیا کے سنت جماعت فرقہ کے مسلمہ سردار تھے میں شیعہ جماعت کی اسمٰعیلی شاخ کا سردار تھا۔ اِس طرح ہم دونوں کے درمیان جو قیاس آرائی کی گئی اور جو خیالی پلاؤ

پکارے گئے اُن کی بنیاد صاف ظاہر ہے۔

مجھے یہ ضرور کہنا ہے کہ ہم دونوں میں جو ملاقات ہوئی اُس میں مجھ کو ایک عجیب قسم کے ڈرامہ کا مزہ آیا۔ عبدالحمید کو اُس زمانہ میں اپنے قتل کئے جانے کا مریضانہ خوف لاحق ہوگیا تھا۔ وہ بہت بڑے حبشی تھے اور مجھے اپنی تمام عمر جیسا کہ سب لوگ کہتے ہیں سگریٹ کی بو کا بڑا احساس ہے۔ جب میں اُن کے کمرہ میں داخل ہوگیا تو اُس کے دروازے فوراً بند کر دئے گئے۔ سلطان اور میں تنہا کمرہ میں رہ گئے۔ ایک ترجمہ کرنے والے کے علاوہ۔ میں ترکی زبان نہیں بولتا ہوں اور عبدالحمید نے باوجودیکہ مجھے یقین ہے کہ وہ عربی اور فارسی پڑھ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ان دونوں میں سے کسی زبان میں بولنا پسند نہ کیا۔ کمرہ گرم ہو رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں ہوا میں خوب پھیل رہا تھا اور اس کی بو آرہی تھی۔ سلطان اپنے بڑے اور کوٹ میں دبے ہوئے بیٹھے تھے اور فیلڈ مارشل کے فوجی نشانات اُن کے کندھوں پر خوب نمایاں تھے۔ مجھے رفتہ رفتہ معلوم ہوگیا کہ اس وزنی اور تکلیف دہ لباس کے نیچے زرہ موجود تھی جس کے اندر گولی پار نہیں ہوسکتی تھی اور یہ لباس اس حد تک گولی پروف (BULLETPROOF) یعنی گولی روکنے والا بنایا گیا تھا جس حد تک اُس زمانہ میں ممکن تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ کیا سلطان عبدالحمید کو یہ خیال ہوگیا تھا کہ میں اُن کے قتل کرنے کے لئے آیا تھا؟[۵]

اس اور کوٹ کے کالر کے اوپر ایک عجیب اور منحوس جیسی شکل میرے سامنے پڑی چونکہ عبدالحمید بہت وزنی لباس پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی ڈاڑھی خضاب سے کالی ہورہی تھی۔ اُن کے ہونٹوں پر سرخی جمی ہوئی تھی۔ اُن کے رخساروں پر پاوڈر لگا ہوا تھا۔ اور اُن کی بھویں ایسی بنائی گئی تھیں جن کو دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی

---

۵ یہ بات بہت دلچسپ ہے اور مذاق سے خالی نہیں ہے کہ "ایسے سن" (ASSA SSIN) کا لفظ جس کے اس زمانہ میں خاص معنی ہیں۔ بہت سی صدیاں گذریں تب سب سے پہلے میرے بزرگوں اور اُن کے مریدوں کے واسطے استعمال کیا جاتا تھا بہت پرانے زمانہ سے یہ رواج تھا کہ چھوٹی چھوٹی اور مصیبت زدہ جماعتوں اور فرقوں کو کسی نہ کسی برے نام سے پکارا کرتے تھے جیسا کہ انگریزی کی مثل ہے کہ آپ کتے کو اُس وقت تک جان سے نہیں مار سکتے جب تک کہ اُس کو کوئی برا کام نہ دیدو۔ قرونِ وسطیٰ میں

سرکس کے مسخرہ کا پارٹ ادا کرنے والے ہیں (CLOWN) مگر اس غیر معمولی انداز میں اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور اس سارے ڈھانچے (MAQUILLAGE) میں زنانہ پن یا خلاف فطرت ہونے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ دیکھنے میں کافی مرد معلوم ہوتے تھے۔ وہ بہت سے بچوں کے باپ تھے۔ اور ایک بڑے حرم کے نگہبان اور اپنی بیویوں سے محبت کرنے والے شوہر تھے۔

ہم دونوں کی گفتگو دوستانہ اور با اخلاق تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ان کو اس بات سے بہت دلچسپی ہوئی اور وہ اس سے بہت متأثر ہوئے کہ میں اپنے کاشغر اور سنکیانگ کے سفر کی وجہ سے مغربی چین کے مسلمانوں کے متعلق تازہ اور قابلِ اعتبار معلومات رکھتا تھا۔

یہ کہا جاتا تھا کہ عبدالحمید کو اپنے قتل کئے جانے کا ایسا اعصابی مرض ہو گیا تھا جس کی بناء پر اُن کی غذا کا ہر حصہ جو اُن کے پاس بھیجا جاتا تھا اُس کو پہلے مختلف آدمی چکھ لیتے تھے جن میں اُن کا باورچی بھی شامل ہوتا تھا۔ میں نے چونکہ اُن کے ساتھ کوئی کھانا نہیں کھایا اس لئے میں اس واقعہ کی پوری تصدیق نہیں کر سکتا۔ مگر مجھے یاد ہے کہ ان کو یہ خیال ضرور تھا کہ میرا ہوٹل کا کھانا کچھ خاص طور پر اچھا نہیں تھا۔ اس لئے روزانہ دن میں دو مرتبہ ایک لینڈو اُن کے محل سے میرے لئے کھانا لے کر چلا کرتی تھی جس میں بہت سے چینی برتنوں میں بہترین قسم کے کھانے ہوتے تھے ترکی اور ایرانی دونوں قسم کے کھانے۔ جو شاہی محل میں میرے واسطے تیار کئے جاتے تھے اور جو عبدالحمید کے واضح حکم کے مطابق میرے پاس بھیجے جاتے تھے۔

اسمٰعیلی لوگ اسی قسم کے فرقہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی جان اور اپنے حقوق کے لئے برابر لڑتے رہتے تھے۔ ان کو تکلیف پہنچانے والے آدمی اُن کو کوئی بُرا نام دینا چاہتے تھے اور اس وجہ سے انہوں نے اسمٰعیلیوں کے متعلق یہ کہنا شروع کیا کہ یہ لوگ حشیش یا پوست کے ڈوڈے تیار کرتے ہیں اور اُن کو استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ یہ لوگ "پوستی" ہیں اور پوست کا نشہ پینے کے عادی ہیں۔ یہ بُرا نام جو ایجاد کیا گیا تھا قائم ہو گیا اور برابر جاری رہا۔

قسطنطنیہ سے میں اپنے وطن ہندوستان کی طرف روانہ ہوا جہاں مجھ کو اپنے گھر میں اور اپنے متعلقین کے درمیان ایک خاص کام میں الجھنا تھا اور یہ کام ایسی خوفناک پیچیدگی رکھتا تھا جس کے طے کرنے میں بہت سے مہینوں تک میرے لئے کافی قوت صبر اور برداشت کی ضرورت تھی۔

باب نمبر ۶

ایڈورڈ ہفتم کا دورِ سلطنت شروع ہوتا ہے

میرے رشتہ دار کا پونا کے مقام پر ۱۸۹۶ء کی گرمیوں میں جو قتل ہوا تھا اُس سے بہت سنسنی پھیل گئی تھی اور اُس نے بہت بُری طرح یہ ثابت کر دیا تھا کہ میرے گھر والوں اور میرے متعلقین میں کیسی ٹوٹ پھوٹ موجود تھی اور اُن کی یہ اختلاف پیدا کرنے والی خصوصیات میرے اس بڑے لمبے چوڑے گھرانے میں پوشیدہ طور پر کام کر رہی تھیں جو رئیسانہ انداز سے فضول خرچی کی زندگی بسر کرتا تھا اور جو ورا ثتاً مجھ کو ملا تھا اس کا ذکر میں پچھلے بابوں میں ذرا تفصیل کے ساتھ کر چکا ہوں۔

اُس زمانہ میں مجھ کو بمبئی اور پونا کے مقام پر اپنے اس گھرانے کے تقریباً دو ہزار آدمیوں کی ذمہ داری برداشت کرنی پڑتی تھی جن کی زندگی کا دار و مدار مجھ پر تھا۔ میں اُن سب کی پرورش کرتا تھا اور ان میں سے بہت سے آدمی بالکل بیکار تھے۔ مگر اُن سب کے رہنے اور کھانے کا انتظام میرے خرچہ سے ہوتا تھا۔ یہ مالی بوجھ گو کافی زیادہ تھا مگر اتنا تکلیف دہ نہ تھا جتنا کہ اُن کی طرزِ زندگی کے بعض سخت ناپسندیدہ پہلو تھے۔

جب میرے دادا ایران سے چلے تھے تو جیسا کہ اُن کے لئے قدرتی اور مناسب تھا وہ اپنے ساتھ قرونِ وسطیٰ کے شہزادہ کی طرح ایک پورا گروہ لے کر چلے تھے۔ مگر انیسویں صدی کے آخری سالوں میں، ہم بمبئی میں اس طرح نہیں رہ سکتے تھے جیسا کہ قرونِ وسطیٰ میں رہتے تھے۔

میرے دادا کے ساتھ صرف اُن کا خاندان ہی نہ تھا جو کافی بڑا تھا۔ بلکہ اپنی جلاوطنی کے ابتدائی زمانہ میں جب وہ اِدھر اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔ اُن کے ساتھ سواروں کی ایک فوج بھی تھی جو اُن کے کمانڈ میں ایران اور افغانستان کے اندر جنگ کر چکی تھی اور آخر میں اُس فوج نے سر چارلس نیپئر کو (SIR CHARLESNAPIER) سندھ فتح کرنے میں بڑی زبردست امداد دی تھی۔ شروع شروع میں یہ فوج غالباً دو سو آدمیوں پر مشتمل تھی جن میں سے بعض شاہی خاندان کے تھے۔ بعض فوجی افسر تھے اور بعض کاشتکار تھے۔ مگر یہ سب کے سب میرے دادا کے مطیع اور اُن سے عقیدت رکھنے والے تھے۔ جب میرے دادا بمبئی میں مقیم ہو گئے تو یہ لوگ بھی وہیں اُن کے آس پاس رہنے لگے۔ چونکہ یہ سب اُن کے وفادار آدمیوں میں تھے جو اُن کے ساتھ مصیبتیں اٹھا چکے تھے اور لڑائیاں لڑ چکے تھے۔ میری پیدائش سے بہت پہلے اور میرے بچپن کے زمانہ میں یہ سب لوگ موجود تھے۔ پرانے لڑنے والے فوجی جن کی لڑائیاں ختم ہو چکی تھیں جو اُن مکانوں اور کمروں میں رہتے تھے جو ایک وسیع جائداد کے چاروں طرف اِدھر اُدھر بنے ہوئے تھے۔ جن کی اولاد روز بروز بڑھ رہی تھی اور جن کا یہ بڑھتا ہوا خاندان بھی اُن ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ اُن میں سے کچھ لوگوں نے جو بمبئی میں جم چکے تھے اپنی بیویوں کو ایران سے بلا لیا۔ مگر اُن میں سے اکثر آدمیوں نے ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔

صرف یہ پرانے سپاہی اور اُن کے خاندان والے ہی وہاں رہنے والوں میں نہ تھے بلکہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیانی زمانہ میں مریدوں کی کافی تعداد وسط ایشیا سے ترکستان اور سنکیانگ (SINKIANG) سے بخارا اور افغانستان سے برابر آتی رہی۔ یہ لوگ میرے دادا سے نیاز حاصل کرنے اور اُن کو نذرانہ پیش کرنے کے لئے آتے تھے۔ اُن میں سے بعض تو اپنے وطنوں کو جو بہت دور تھے واپس ہو جاتے تھے اور بعض ٹھہر جاتے تھے۔ جو لوگ ٹھہر جاتے تھے وہ ہندوستانی بیویاں رکھ لیتے تھے یا اُن آدمیوں کی لڑکیوں سے شادیاں کر لیتے تھے جو اُن سے پہلے مقیم

ہو چکے تھے۔ کچھ اسمٰعیلی افریقہ سے آئے تھے اور وہ اپنے ساتھ حبشی غلام لے کر آئے تھے۔ جب یہ لوگ واپس افریقہ جانے لگے تو اُن کے بعض حبشی غلاموں نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور بمبئی میں مقیم ہو گئے۔ اُن سب مختلف لوگوں میں آپس میں شادیاں ہوتی رہیں اور اُن کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۸۹۸ء میں یا اس کے قریب دو ہزار آدمیوں کی وسیع جماعت تک پہنچ گئی۔ جن میں مرد۔ عورتیں اور بچے شامل تھے جن کے کرنے کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ جن کی کوئی مصروفیت نہ تھی۔ جن کا کوئی سہارا نہ تھا۔ نہ اُن کا کوئی ٹھکانا تھا۔ میرے دادا کے زمانہ میں اور اُن کے بعد میرے والد کے زمانہ میں گو اُن لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی۔ مگر یہ بات مسلمہ تھی کہ اُن سب کی حیثیت گھر والوں کی سی تھی۔ اور میرے طویل نابالغی کے زمانہ میں میری والدہ کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اُن سب لوگوں کو مکانات دیں اور اُن کے کھانے پینے کا انتظام کریں۔ جوں جوں اُن کی ایک نسل بوڑھی ہوتی گئی دوسری نسل جوان ہوتی گئی (بہر حال اُس وقت نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا جب میرے دادا ایران سے جلا وطن کر کے آئے تھے) اس لئے اُن لوگوں کی نگاہ میں جو ہم سے فیض حاصل کرتے تھے۔ یہ سارا معاملہ ایک ایسے رواج کی شکل اختیار کر گیا جو بطور جائز حق کے قائم ہو جاتا ہے۔

پرانے سپاہی میرے دادا سے قدرتی طور پر پنشن لیا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ مر جاتے تھے تو پنشن پھر بھی برابر دی جاتی تھی۔ میرے والد اور اُن کے بعد میری والدہ نے میرے نابالغی کے زمانہ میں اس قسم کی پنشن برابر جاری رکھی مگر اس کی اصلی رقم سب سے پہلے پنشن دار کی اولاد میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ یہ اولاد اکثر کافی تعداد کی ہوتی تھی۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی آخری زمانہ میں جو کچھ آمدنی اس قسم کی پنشن سے اُن پنشن لینے والوں کو ہوتی تھی وہ بہت کم ہو گئی تھی۔ اس لئے اُن میں سے اکثر آدمی کسی نہ کسی دوسرے طریقہ سے اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیتے تھے۔ مثلاً گھوڑ دوڑ کے میدان میں خبریں دینے کا کام کرنا۔ یا کسی اصطبل میں گھوڑوں کی نگرانی کرنا وغیرہ۔

بمبئی کے تیزی سے ترقی کرنے والے شہر اور بندرگاہ میں یا اس کے آس پاس ان لوگوں نے اپنی غیر ذمہ دار اور فضول زندگی کے بہت سے سال گذارے تھے مگر پھر بھی ایسا نہ ہو سکا کہ یہ لوگ خاص طور سے کسی قابل ہو جائیں یا بمبئی کے مفید شہری شمار کئے جا سکیں۔ مگر اُن لوگوں کا تعلق اونچی اسپرٹ والے اور مغرور خاندان سے تھا اور اُن کی قدرتی خاقیتیں اور قابلیتیں آپس کے جھگڑوں اور سازشوں میں برباد کی جارہی تھیں۔ یہ لوگ بہت جلد ناراض ہو جاتے تھے اور پھر اس کے ساتھ ہی چاقو نکالنے میں بہت جلدی کرنے کے عادی تھے۔

یہ خصوصیات بہت خطرناک تھیں۔ مگر میرے رشتہ دار کا جب پونا میں قتل ہوا اُس وقت تک حالات اتنے زیادہ خراب نہیں ہوئے تھے۔ اس قتل سے ایسا معلوم ہوا جیسے کہ کسی بھڑکنے والے مادہ میں آگ لگا دی جائے۔ اُس وقت سے آگے چل کر ایسا ہوا کہ اگر میرے گھر کے اندر کسی نے یا گھر کے باہر پولیس نے اس بات کی کوشش کی کہ اس بھڑوں کے چھتے پر کسی قسم کا قابو حاصل کریں تو اُن لوگوں کی طرف سے بڑی خوفناک دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ جب میں اپنے سفر میں مصروف تھا تو مجھ سے تنبیہ کے طور پر کہا گیا کہ اگر میں نے ان بیکار آدمیوں کی گڑبڑ کو صاف کرنے کی کوشش کی جو میرے لئے بدنامی اور خطرہ کا باعث بن گئے تھے تو ایسا کرنے سے خود میری زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

میں نے بہر حال یہ تہیہ کر لیا کہ اس گڑبڑ کا خاتمہ کر دوں گا۔ بمبئی کی پولیس کو اس کی بڑی فکر تھی کہ میں کوئی کام فوراً اور جلد بازی کے ساتھ نہ کر بیٹھوں مثلاً یہ کہ اُن سب لوگوں کی پنشن بند کر دوں اور اُن سب کو نکال کر سڑک پر ڈال دوں۔ اس طرح پر یہ دو ہزار آدمیوں کی بیکار۔ تندرست اور بے ضابطہ جماعت جو افریقہ۔ وسط ایشیا۔ ایران اور افغانستان کی نصف درجن قوموں سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر بمبئی کی آبادی کے درمیان ایک دم آوارہ گردوں کی طرح چھوڑ دی جاتی تو یہ عوام کے لئے اصلی خطرہ کا سبب بن جاتی۔ اور یہ ایسا خطرہ تھا جس کے متعلق مجھے اچھی طرح سمجھایا گیا کہ بمبئی کی گورنمنٹ اس کی اجازت ہرگز نہ دے گی۔ اسی وجہ سے میرے لئے ضروری تھا کہ اگر مجھے اپنا کام کرنا ہے تو مجھ کو ہر وقت گورنمنٹ کی پوری امداد کے ساتھ اور پولیس سے اچھی طرح مل کر

کام کرنا چاہیئے۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ انڈیا آفس کے سر ولیم لی وارنر (SIR WILLIAM LEE WARNER) میرے بڑے گہرے دوست تھے اور میرے تعلقات اُن سے بڑے خوش فہمی کے تھے۔ وہ درپردہ بہت زوردار اور بااثر آدمی تھے۔ خاص بمبئی میں لارڈ نارتھ کوٹ (LORD NORTHCOTE) کی جگہ لارڈ سنڈرسٹ (LORD SANDHURST) گورنر ہو کر آ گئے۔ وہ بھی میرے ساتھ برابر دوستانہ تعلقات رکھتے رہے اور انہوں نے مجھ کو ایک نہایت مشکل کام میں بڑی مدد پہنچائی۔ اگر میرے مددگار دوست اس درجہ اور قوت کے نہ ہوتے تو میرا یہ کام بہت زیادہ مشکل ہو جاتا۔

میں نے یہ کام آہستہ آہستہ اور استقلال کے ساتھ شروع کیا۔ اُن آدمیوں میں سے بعض آدمی جو سب سے زیادہ سرکش اور بے ڈھنگے تھے وہ قاعدہ کے مطابق برطانیہ کی رعایا نہ تھے۔ اس لئے ان لوگوں کو خلیج فارس کی طرف روانہ کر دیا گیا اور وہ اُن ملکوں میں آزاد کر دیئے گئے۔ جہاں اُن کی طبیعت کے میلانات اتنے خطرناک ثابت نہ ہو سکتے تھے جیسا کہ بمبئی میں جہاں شہریت اور کثیر آبادی پائی جاتی تھی۔ اُن میں سے اکثر آدمیوں کو میں نے عطیہ کی ایک رقم یکمشت دے دی۔ اس شرط پر کہ وہ کبھی کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ ایک جماعت کو میں نے پولیس کی مدد سے اُن پہاڑی علاقوں میں بھجوا دیا جو بہت دور تھے۔ اور جہاں سے اُن کو بمبئی واپس آنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ پرانے نکمے آدمیوں میں سے جو سب سے زیادہ خراب تھے اُن کو دور کرنے کے بعد اب ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ جو بچے باقی رہ گئے تھے اُن کی نگرانی اور تعلیم کا خوشگوار کام شروع کریں۔ چنانچہ ہم نے اُن بچوں کے لئے مدرسے قائم کئے اور اُن میں سے بعض بچے اُن عیسائی اسکولوں (JESUIT SCHOOLS) میں داخل ہو گئے جو اُن کے قریب تھے۔ اُن میں سے جو بچے خاص طور پر ذہین تھے وہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیج دیئے گئے۔ یہ سب بچے خوب کام کرتے تھے اور میں خوشی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُن میں سے بہت سے بچے اب اور ہمیشہ سے ملک کے لائق اور قانون پر چلنے والے شہری ثابت ہوئے ہیں۔ اُن میں بیرسٹر۔ انجنیئر۔ آئی۔ ایم۔ ایس کے سینیئر افسر اور دوسرے پیشوں کے کامیاب ممبر پائے جاتے ہیں۔

مگر اس گڑبڑ کو صاف کرنا کوئی آسان کام نہ تھا اور یہ ایک دن میں نہیں ہوگیا۔ یہ میرے لئے ایک طویل کشمکش تھی جس میں مجھے بہت سے مہینوں تک لگنا پڑا۔

جس زمانہ میں مجھے اس مشکل اور ناخوشگوار کام میں مصروف رہنا پڑا۔ اُس کے درمیان میں بیرونی دنیا سے غافل نہیں رہا تھا۔ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کی موت سے ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک خاص زمانہ کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ملکۂ وکٹوریہ کے عہدِ سلطنت میں پیدا ہوئے تھے اور جنہوں نے اس طویل عہد کے قابلِ اطمینان اور شاندار سایہ میں اپنی زندگی بسر کی تھی۔ ہم لوگوں کو اس بات کا احساس تھا کہ ملکہ کی موت سے ایک زبردست باب کے آخر میں 'ختم شد' لکھدیا گیا ہے۔

میرے دوست اور مربی پرنس آف ویلس (PRINCE OF WALES) ایڈورڈ ہفتم (EDWARD VII) کا خطاب دے کر تخت پر بٹھلائے گئے۔ انہوں نے مہربانی فرماکر مجھے یہ عزت بخشی کہ سنہ ۱۹۰۲ء کی تاج پوشی میں شرکت کرنے کے لئے میرے پاس ایک ذاتی دعوت نامہ اپنی طرف سے بھیجا۔ اس لئے میں اسی گرمی کے موسم میں پھر لندن واپس چلا گیا۔ اس لندن کو جس سے مجھے خوب واقفیت تھی۔ اُس سوسائٹی میں جہاں میرے بہت سے دوست تھے اور جہاں بڑی خوشی اور سرگرمی سے میرا استقبال کیا گیا۔ اُس وقت یہ محسوس کرنے کا امکان تھا کہ شاہ ایڈورڈ کا زمانہ (EDWRDIAN AGE) شروع ہورہا تھا۔ سوسائٹی میں ایک نئے رنگ کے آثار پائے جاتے تھے۔ زندگی کے معیاروں میں تبدیلی ہورہی تھی اور نئی صدی کے انقلابی دَور اور اُس کے مقاصد کا اندازہ ہورہا تھا۔ شروع شروع میں وہ گرمی کا موسم بڑا خوشگوار اور مصروفیتوں سے بھرا ہوا تھا۔ نمائشوں اور تفریحوں کا پورا دَور چل رہا تھا۔ میرے ساتھ اور دوسرے ہندوستانی شہزادوں اور مہاراجاؤں کے ساتھ جو مدعو کئے گئے تھے بڑی مہمان نوازی کا اظہار کیا گیا۔ مگر ایسا اتفاق ہوا کہ تاج پوشی کے جشن سے ایک دن پہلے بادشاہ سلامت جو بہر حال جوان عمر کے نہ تھے ایک دم بیمار پڑ گئے۔ اُس وقت بہت کم آدمیوں کو اس کا اندازہ تھا کہ بادشاہ کی بیماری کیسی خطرناک تھی اور اُن کے بچنے کی امید کتنی کم تھی۔ اپینڈیسائٹس (APPENDICITIS) کا مرض (یعنی بڑی آنت کا ورم) اُس زمانہ میں ایسا معمولی

اور روزمرہ کا معاملہ نہ تھا جیساکہ وہ آجکل خیال کیا جاتا ہے اور اپینڈیکیٹو می (APPENDECTOMY) یعنی اس مرض میں اپریشن کرنا نہایت مشکل اور خطرناک کام تھا اس وجہ سے تاجپوشی کی رسم کو ملتوی کرنا پڑا۔ ساری رسوم اور خوشیاں جوں کی توں چھوڑ دی گئیں۔ باہر سے آئے ہوئے ممتاز شاہی مہمان جو اتنے زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھیر سکتے تھے جو اُس وقت بظاہر ضروری تھا اپنے اپنے گھروں کو اجازت لے کر واپس چلے گئے۔ بادشاہ اپریشن کے بعد بہت جلد اور تعجب خیز طریقہ پر صحت یاب ہوتے گئے اور اگست کے مہینہ تک وہ اس بات پر رضامند ہوگئے بلکہ شوق کے ساتھ اس کا اصرار کرنے لگے کہ تاجپوشی کی طویل اور شاندار رسم منانے میں جو وقت اور تکلیف اُن کو اُٹھانی پڑے گی وہ اس کے لئے تیار ہیں اُس وقت عام طور پر اس کا اندازہ کسی کو نہ ہوا کہ اس رسم کے منانے میں بادشاہ کو کافی تکلیف ہوئی۔ مگر وہ برابر بڑی شان کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔

میرے لئے اس تاج پوشی کے سلسلہ میں ایک خوشگوار واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ ملک معظم نے اپنی تاج پوشی کے خطابات میں میرا رتبہ کے۔سی۔آئی۔ای (K.C.I.E.) سے بڑھا کر جی۔سی۔آئی۔ای (G.C.I.E.) کر دیا۔

رواج کے مطابق اسپٹ ہیڈ (SPITHEAD) کے مقام پر تاج پوشی کی بحری رسم ادا کی گئی۔ مجھ کو بہ حیثیت بادشاہ کے مہمان کے خود اُن کی خاص ...ی میں بیٹھ کر اس رسم میں شرکت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ اس موقع پر دوسرے مہمانوں میں حبش کے جاگیردار رئیس یعنی ریس میکونن (RAS MACKONNEN) بھی تھے جو دبلے پتلے مگر خوفناک شکل کے آدمی تھے۔ جو شہنشاہ مینلیک (EMPEROR MENELIK) کے فاتح جنرل اُن کے دست راست اور وائسرائے تھے اور جو شہنشاہ کے بعد آخر کار اُن کے جانشین بن گئے تھے۔ اُن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کوئی شخص اُن کا بھید معلوم نہیں کر سکتا تھا اور اُن کی تہ کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایڈیس ابابا (ADDI ABABA) کے برطانوی وزیر نے مجھ سے کہا کہ وہ شہنشاہ مینلیک (EMPEROR MENELIK) کے دل کی بات تو ہمیشہ معلوم کر لیتے تھے

اور اُن کے ارادوں کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ مگر ریس میکونن (RAS MACKONNEN) کے متعلق وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انسانی معاملات میں کیسی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس کی مناسب مثال اُن انقلابات میں مل جائے گی جو ریس میکونن کے بیٹے "ریس تفاری" (RASTAFARI) کو برداشت کرنے پڑے۔ جو شہنشاہ ہیلی سیلاسی (EMPEROR HAILE SELASSIE) بن گیا۔ جو ۱۹۳۵ء میں اپنے ملک پر اٹلی کے حملہ کے خلاف لڑا۔ مگر اُس کو شکست ہوئی۔ اور وہ جلاوطن کر دیا۔ پھر اُس نے اپنا معاملہ لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کے سامنے جنیوا (GENEVA) کے مقام پر پیش کیا۔ پھر جلاوطنی میں اپنے موقع کا منتظر رہا اور آخرکار ۱۹۴۱ء میں بڑی شان کے ساتھ اپنے تخت پر واپس آ گیا جب کہ اٹلی والوں کو مشرقی افریقہ میں ایک چھوٹی سی بہادر فوج نے جس کی ہندوستان نے بہت کافی مدد کی تھی بُری طرح شکست دے دی تھی۔ یہ واقعہ یقیناً ہمارے زمانہ کے نہایت غیر معمولی اور عجیب قصوں میں سے ہے جس کے بھول جانے کا خطرہ ہے۔ چونکہ اس کے علاوہ اور بہت سے عجیب اور افسانہ کی حیثیت رکھنے والے قصے اور واقعات برابر ہوتے رہے ہیں۔

میں اسی سال ۱۹۰۲ء کے نومبر میں ہندوستان واپس آ گیا۔ مجھے تعجب ہوا کہ واپسی پر مجھے لارڈ کرزن (LORD CURZON) وائسرائے کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اُن کی لیجسلیٹو کاؤنسل کا (LEGISLATIVE COUNCIL) یعنی مجلس آئین ساز کا ممبر بن جاؤں۔ یہ ایسے نوجوان آدمی کے لئے جو ابھی بیس اور اُنتیس سال کے درمیان عمر رکھتا تھا ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ چونکہ میں سب سے کم عمر والا ممبر تھا اور وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل اُس زمانہ میں ایک چھوٹی سی منتخب شدہ جماعت تھی جس میں بہت با اثر آدمی شامل تھے اور جس کے ہاتھ میں ساری اصلی طاقت اور اختیارات تھے۔ جب میں نے اس ممبری کو منظور کر لیا تو مجھے مجبوراً ایک مقررہ زمانہ کے لئے کلکتہ منتقل ہونا پڑا۔ جو اُس وقت ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا مرکز تھا۔ وہ دو سال جن میں مجھے لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کرنی پڑی میری زندگی اور کیریکٹر پر بہت گہرا اور مستقل اثر ڈالنے والے تھے۔ میری پرائیویٹ اور ذاتی زندگی پر بھی اور میری پبلک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی

اُن کا اثر کافی ہوا (مجھ سے دوبارہ نامزدگی قبول کرنے کے لئے کہا گیا تھا مگر میں نے انکار کر دیا) اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنا اصلی اور باقاعدہ گھر حاصل ہوا جس میں میرے پاس ملازموں کی ضروری تعداد موجود تھی۔ وہ معمولی سوشل اور گھریلو زندگی کی موجودگی جو مجھ جیسا مرتبہ رکھنے والے آدمی کے لئے ضروری تھی۔ اور میں اُن لٹنے والے اور بے کار آدمیوں کے اُس غیر معمولی وبال سے آزاد ہو گیا تھا جن کی جھگڑا اُٹھانے والی اور دھمکیاں دینے والی حرکتوں کا ذکر میں نے اس باب کے شروع میں کر دیا ہے (اُن لوگوں کا کچھ حصہ کبھی بمبئی اور پونا سے غائب نہیں ہوا)

میری پبلک اور سیاسی زندگی پر جو اثر ہوا وہ کچھ کم نمایاں نہ تھا۔ میں ایسی قابلیت اور ایسی خصوصیت رکھنے والے آدمیوں کے ساتھ کام کر رہا تھا جیسے لارڈ کرزن (LORD CURZON) اور جیسے اُس وقت کے کمانڈر انچیف یعنی وہ زبردست فیلڈ مارشل جن کا نام لارڈ کچنر آف خارتوم تھا (LORD KITCHENER OF KHARTOOM) میرے ہندوستانی ساتھیوں میں وہ بہت روشن خیال آدمی یعنی مسٹر جی۔ کے۔ گوکھلے (MR. G. K. GOKHLE) بھی تھے جو مہاتما گاندھی اور دونوں نہرو یعنی باپ اور بیٹے کی شہرت سے پہلے ہندوستان کے سب سے بڑے قومی سیاسی لیڈر تھے۔ میرے اور گوکھلے کے درمیان ایسی دوستی ہو گئی جو صرف اُن کی موت پر ختم ہوئی۔ وہ اونچی ذات کے ہندو تھے اور میں مسلمان تھا مگر ہماری دوستی مذہب اور قومیت کی حدوں کو پار کر گئی تھی۔ وہ بڑے خیالات کے آدمی تھے۔ بہادر اور کھلے دل والے۔ میرے خیالات اور نقطۂ نظر پر اُن کا اثر غالباً بہت کافی ہوا۔ یہ ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ گوکھلے ہی وہ سب سے پہلے سیاسی مفکر تھے جن کی بنیادِ خیال میری بنیادِ خیال سے مختلف تھی اور جن سے مجھ کو واسطہ پڑا تھا یا جن کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنا میرے لئے باعثِ حرکت تھا۔ اس سے کچھ سال پہلے بمبئی میں مجھے مسٹر نا روجی ڈوملسیا (MR. NAUROJI DUMASIA) کو جاننے کا اتفاق ہوا جن کو میں بہت پسند کرنے لگا۔ وہ نہایت قابل پارسی تھے اور اخبار ٹائمس آف انڈیا (TIMES OF INDIA) میں ملازم تھے۔ ان کے علاوہ مسٹر فرنیک. بردن بھی تھے

وہ (MR. FRANK BROWN) جو بعد میں سر فرینک براؤن ہوگئے۔ (SIR FRANK BROWN) برطانوی اخبار نویس تھے اور پبلک کے کاموں میں بہت حصہ لیتے تھے۔ اخبار بمبئی گزٹ کے (BOMBAY GAZETTE) دفتر میں کام کرتے تھے اور بعد میں اخبار دی ٹائمس کے (THE TIMES) دفتر میں چلے گئے۔ جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ سیاسی کام کرنے کی میں نے کوشش کی اُس کے لئے میں ان دونوں دوستوں کا بہت ممنون ہوں

گوکھلے میں مجھ کو ایک زبردست اور محبت کرنے کے لائق شخصیت ملی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی وہ قوتیں کتنی گہری اور مضبوط تھیں جن کی گوکھلے نمائندگی کرتے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ گورنمنٹ ہندوستان کے آدمیوں سے کتنی دور ہوگئی تھی صرف عام آدمیوں سے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے روز افزوں، نمایاں اور کارکن تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی دور ہورہی تھی۔ میں نے اچھی طرح دیکھا کہ گورنمنٹ اپنی ذہنیت اور اپنی فضا کے اعتبار سے کتنی اجنبی اور بیرونی قسم کی ہوگئی تھی۔ دوسری طرف میں نے یہ دیکھا کہ ہندوستان کے سیاسی لیڈر جو اس بات سے غیر مطمئن تھے کہ اُن کو اپنے معمولی مطالبات کے حاصل کرنے میں ناکامیابی ہوئی۔ اب اس بات کی کوشش شروع کر رہے تھے کہ اُن کو صرف انتظامی اصلاحات ہی حاصل نہ ہو جائیں بلکہ اُن کو اپنی سیاسی قسمت کا پورا فیصلہ کرنے کا حق مل جائے اور وہ اپنی سیاست پر پورا قابو پالیں۔

میں ذاتی طور پر اپنا عقیدہ تعلیمی ترقی کی طرف جمائے ہوئے تھا۔ جہالت میرے نزدیک گورنمنٹ اور عوام دونوں کے لئے ایک قسم کا خطرہ تھی۔ غریبی اور بیماری یہ دونوں جہالت کے منحوس نتیجے اور اس کے ساتھ ساتھ رہنے والی چیزیں تھیں۔ لیجسلیٹو کونسل میں میری تقریریں اکثر تعلیم کے منصفانہ اور فیاضانہ خرچہ پر زور دیا کرتی تھیں میں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ملک میں عام ابتدائی تعلیم کا رواج جاری کیا جائے جیسا کہ دنیا کے ہر مہذب ملک میں پایا جاتا ہے اور جتنی بار میں کہہ سکتا تھا میں نے یہ بھی بتایا کہ میرے خیال میں ہندوستان کی انتہائی غریبی کا بنیادی سبب ہندوستان کی انتہائی جہالت اور لاعلمی ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے ان دو سخت اور فیصلہ کن سالوں میں یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ کانگریس پارٹی جو اُس وقت ملک کی واحد کارکن اور ذمہ دار سیاسی جماعت تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ ثابت ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی (اور وہ دراصل اُس وقت ایسی ہی نااہل ثابت ہو رہی تھی) اور نیز یہ کہ وہ جماعت مسلمان طبقہ کی ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق انصاف کے ساتھ برتاؤ کرنے کی اہل نہ تھی۔ ہندوؤں کی حد پسند جماعت کا دباؤ بہت زیادہ تھا وہ مصنوعی اتفاق جو برطانوی راج کے اوپر سے زبردستی پیدا کر رکھا تھا وہ اب ٹوٹتا جا رہا تھا۔ بہت گہرے اور ناقابل تلافی اختلافات فوراً اُسی وقت سے ظاہر ہونے لگے جب سے ہندوستان کی سیاسی کوششیں اور سیاسی اُمنگیں اپنے ابتدائی درجوں سے آگے بڑھ چکی تھیں، اختلاف پیدا ہو چکا تھا جس کی وجہ ہندوؤں کی زیادتی تھی اور مسلمانوں کے بنیادی مقاصد اور امیدوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا۔ میں نے جہاں تک ہو سکا کوشش کی کہ یہ اختلاف زیادہ وسیع نہ ہو جائے۔ میں نے سر فیروز شاہ مہتا کے ساتھ اس فصل کے خلاف ایک جوابی حملہ تیار کیا مسٹر مہتا کانگریس پارٹی کے مشورہ دینے میں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ وہ میرے خاندان کے دوست تھے اور مجھ کو بچپن سے جانتے تھے۔ اِس لئے میں نے اُن سے التجا کی کہ وہ کانگریس پارٹی میں اپنا اثر استعمال کریں اور اس بات کا اندازہ کرا دیں کہ مسلمانوں کا اعتبار حاصل کرنا اور مسلمانوں کو اپنی طرف کر لینا کانگریس کے لئے کتنا اہم اور ضروری ہے مگر یہ سب باتیں بیکار رہیں۔

کانگریسی لیڈروں کے رویہ کی وجہ کچھ بھی ہو مگر وہ برابر اسی پر جمے رہے کہ وہ دانستہ حالات کی اصلیت سے غفلت کرتے رہیں۔ ہندوستان میں ایسے صوبے موجود تھے جن میں مسلمانوں کی صاف اکثریت تھی۔ مثلاً بنگال میں اور پنجاب میں جس سے اُس وقت تک این۔ ڈبلو فرنٹیر۔ صوبہ علیحدہ نہیں کیا گیا تھا۔ دہلی۔ آگرہ اور علیگڈھ میں مسلمانوں کا ایسا روحانی گھر بن گیا تھا جس کو بہت سی قیمتی مسلم روایات نے پاکیزہ بنا دیا تھا اور جو اسلامی فن اور اسلامی تہذیب و تمدن کے ناقابل فنا خزانوں سے آراستہ تھا۔ ہمارا صرف یہ مطالبہ تھا کہ اس کو سمجھ لیا جائے کہ ان سب باتوں کا مسلمانوں کے دلوں پر کیا اثر ہے۔ وہ وقت

اس قسم کے سمجھوتہ کے لئے بہت موزوں تھا اور وہ وقت پھر کبھی نہ آسکا۔ چونکہ کانگریس کے ساتھ جو سخت اختلافات رائے شروع میں تھے وہ اُس وقت تقریباً غائب ہو چکے تھے اور اُن میں سے جو کچھ باقی رہ گئے تھے اُن کی یاد بھی بالکل محو کی جا سکتی تھی (جس پر میں نے جہاں تک مجھ سے ہو سکا بہت زور کے ساتھ بحث کی تھی) اگر اُس وقت وہ چند تجویزیں جو ہم نے پیش کی تھیں منظور کر لی جاتیں اور اُن پر عمل کر لیا جاتا۔ اور وہ تجویزیں مسلمانوں کی صحیح نمائندگی اور سرکاری ملازمتوں میں اُن کا صحیح تناسب قائم کرنے کے لئے پیش کی گئی تھیں۔

اس سلسلہ میں جو پہلا قدم اٹھانا تھا وہ یہ تھا کہ کانگریس وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں اپنا ایک مسلمان نمائندہ بنگال یا پنجاب سے منتخب کرے۔ ہم وہاں پر کورے رہ جاتے تھے۔ اور ان دونوں صوبوں سے کوئی مسلمان نمائندہ نہیں لیا جاتا تھا۔ چونکہ کانگریس ضد کے ساتھ اسی پر اڑی رہتی تھی کہ مدراس اور بمبئی جیسے صوبوں سے جہاں پر ہندوؤں کی اکثریت تھی تھرڈ کلاس مسلمان برابر منتخب کرتی رہے۔ گوکھلے کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ سچے دل سے اس بات کی فکر میں رہتے تھے کہ اپنی پارٹی کا رویہ بدلنے کے لئے جو کچھ وہ کر سکتے تھے کریں۔ وہ علانیہ اس بات کا اقرار نہیں کرتے تھے مگر پرائیویٹ طریقہ پر وہ یہ دیکھ کر بہت تکلیف محسوس کرتے تھے کہ اُن کے سیاسی دوست اور ساتھی لوگ جان بوجھ کر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مستقل نا اتفاقی کے بیج بو رہے تھے۔ میں نے عملی طور پر مناسب قدم اٹھانے کے لئے اکثر اور ضروری تجویزیں پیش کیں جن سے ہم مسلمانوں کے سیاسی جذبات کو کانگریس پارٹی کے اندر ایک کرکے برطانوی گورنمنٹ کے خلاف ایک متحدہ محاذ پیش کر سکیں مگر گوکھلے کی پرائیویٹ مدد بھی جو انہوں نے میری تجویزوں کے متعلق دی۔ کانگریس پارٹی کے دل و دماغ میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔

میں اپنے علیگڑھ کے دوستوں کی طرف متوجہ ہوا اور خاص طور پر نواب محسن الملک کی طرف جو بہ حیثیت مسلم لیڈر کے سر سید احمد کے بعد ان کے جانشین تھے۔ محسن الملک کٹر قسم کے قدامت پسند نہ تھے۔ وہ میانہ رَو اور حقیقت پسند تھے اور وہ کانگریس یا عام

ہندوؤں سے بالکل مخالفت نہ رکھتے تھے۔ اگر اُس زمانہ کے چھوٹے موٹے معاملات میں لین دین کا برتاؤ کیا جاتا تو وہ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنے کو تیار تھے۔ اس قسم کی فضا بھی جس کو اس واقعہ سے بھی بہت مدد ملتی تھی کہ اُس زمانہ میں مشترکہ ایلیکشن اور مشترکہ نمائندگی موجود تھی۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک سیاسی اشتراک کا بہت امکان تھا۔ مگر ہماری امیدیں بار بار ٹوٹتی رہیں۔ حالات آئندہ ہونے والے ایلیکشن تک اور زیادہ خراب ہوگئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۶ء میں محسن الملک۔ میں اور دوسرے مسلمان لیڈر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے لئے صرف یہی ایک چارہ باقی تھا کہ ہم اپنی جداگانہ جماعت بنالیں اور جداگانہ کام کریں۔ اور برطانوی گورنمنٹ سے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کو بہ حیثیت ایک قوم کے جو دوسری قوم کے اندر ہے تسلیم کرالیں۔

میں جب کلکتہ میں رہتا تھا مجھے رائٹ آنریبل سید امیر علی سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ اُس وقت کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے اور بعد میں پریوی کونسل کے ممبر ہوگئے تھے۔ میں نے اسلام پر اُن کی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اُن کی علمیت اور ہمارے مسلم مذہب کی تفصیل و تشریح کرنے میں اُن کی قابلیت کی جو قدر میں کرتا تھا وہ غیر محدود تھی۔ گو قدرتی طور پر وہ سیاسیات میں حصہ لینے سے علیحدہ کردیئے گئے تھے۔ مگر مجھے اس میں کوئی تامل نہ تھا کہ میں اپنی سیاسی کوششوں کے متعلق ان سے مشورہ اور مدد لینے کے لئے اُن کے پاس جاؤں۔ خاص طور پر اس کام کے لئے کہ مسلمانوں کو مناسب نمائندگی مل جائے اور اُس وقت کے کانگریس ہائی کمانڈ کی آنکھیں اُن خطرات کی طرف کھل جائیں جو اس راستہ میں ضروری تھے جس پر وہ جمے ہوئے تھے۔ مگر جب ہماری امیدیں ختم ہوگئیں تو ہم کو اس سے بڑی ہمت افزائی ہوئی کہ سید امیر علی نے اپنے ذاتی وقار کے ساتھ اور اس وسیع معلومات کے ساتھ جو اُن کو ہندو مسلم سیاسی تعلقات کی بابت خاص طور پر بنگال میں حاصل تھی۔ ہماری ان کوششوں میں ہم کو آگے بڑھایا کہ ہم ایک جداگانہ مسلم تنظیم قائم کریں اور انہوں نے خاموشی کے ساتھ ہم کو مسلسل مدد دی جب محسن الملک نے اور میں نے یہ بحث کی کہ برطانیہ سے منصفانہ برتاؤ حاصل کرنے کے لئے صرف اس بات پر امید کی جاسکتی ہے

کہ ہم برطانیہ کو یہ سمجھا دیں کہ ہمارے اور ہمارے پڑوسیوں کے درمیان جو تاریخی۔ تمدنی اور مذہبی خلیج حائل ہے وہ بہت چوڑی ہے۔

کانگریس پارٹی مسلمانوں کے جائز مطالبات اور خواہشات کی طرف سے اندھی ہو رہی تھی اور وہ اپنی اس قابل تمسخر عادت پر اڑی ہوئی تھی کہ وہ وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں اپنے نمائندے مدراس اور بمبئی کے مسلمان پٹھوؤں میں سے منتخب کرتی رہے۔ ان واقعات کی وجہ سے کانگریس پارٹی نے ایک ایسا موقعہ ہاتھ سے کھو دیا جو پھر کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہ بہت سخت اور فیصلہ کن سال تھے۔ نہ صرف میری سیاسی ترقی کے لئے بلکہ اس وسیع اور پیچیدہ طریق عمل کے لئے جس نے کچھ اوپر چالیس سال کے اندر اندر ہندوستانی برصغیر کو دو جداگانہ سلطنتوں میں یعنی بھارت اور پاکستان میں تقسیم کر دیا۔

جس زمانہ میں مجھے وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں کام کرنا پڑا اس زمانہ کا ایک قابل یاد واقعہ دہلی کا تاج پوشی کا دربار تھا۔ اس واقعہ کی سب سے بڑی اہمیت ایک شاندار پریڈ تھی جو تقریباً چالیس ہزار فوج کے ساتھ کی گئی تھی۔ یہ فوج کمانڈر انچیف لارڈ کچنر (COMANDER-IN-CHIEF, LORD KITCHNER) کی سربراہی میں ملک معظم کے نمائندہ کی طرف ہو کر نکلی اور مارچ کیا۔ وہ نمائندہ خود بادشاہ کے بھائی تھے۔ جو میرے بچپن سے میرے نگران اور مہربان دوست تھے یعنی ڈیوک آف کیناٹ (DUKE OF CONNAUGHT) دربار کے بعد فوراً ہم نے ایک مسلم تعلیمی کانفرنس دہلی میں منعقد کی جس میں میں نے اُن بعض تعلیمی منصوبوں پر مفصل تقریر کی جن کے پورا کرنے کے لئے میں کوشش کر رہا تھا۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم علیگڈھ کا معاملہ تھا۔ میں نے اپنے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں سے براہِ راست ان الفاظ میں اپیل کرنے کی جرأت کی:۔

"میں آپ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ آجکل کے شور و غوغا میں جو روزانہ ہمارے بازاروں میں اُٹھتا رہتا ہے ایک مرکزی یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت کو کبھی نہ بھولنا چاہئے۔ یہ ایسی یونیورسٹی ہوگی جو آئندہ چل کر اگر خدا کو منظور ہوا تو ایک دن اکسفورڈ (OXFORD) اور لیپزگ (LEIPZIG) اور پیرس (PARIS) کی برابر ہوگی۔ جو بڑے خیالات اور شریف

مقاصد کا گھر ہوگی۔ یہ ایسی یونیورسٹی ہوگی جہاں پر ہمارے نوجوان مغربی علوم کی بہترین تعلیم حاصل کر سکیں۔ یہ ایسی یونیورسٹی ہوگی جہاں مشرق کی تاریخ اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم اس طرح جلدبازی کے ساتھ نہیں دی جائے گی جس طرح مغربی خیالات کا علم محض طوطے کی طرح رٹایا جاتا ہے۔ یہ ایسی یونیورسٹی ہوگی جہاں ہمارے نوجوان ان سب فائدوں کے باوجود ایک مسلم فضا میں زندگی بسر کرنے کا لطف بھی حاصل کر سکیں۔"

میرے یہ الفاظ جواب سے پچاس سال پہلے کہے گئے تھے اُن تمناؤں کا خلاصہ ہیں جو شروع ہی سے میں علیگڈھ کے متعلق اپنے دل میں رکھتا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ یہ تمنائیں میری زندگی میں پوری ہو گئیں۔

والسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں جو میرے دو سال گذرے وہ بڑی محنت کے اور بڑے بنانے والے سال تھے۔ ۱۹۰۴ء کی گرمیوں میں میری واپسی یورپ کو ہوئی اور میں نے وہاں اپنی ذاتی اور سوشل زندگی کے پرانے تعلقات تازہ کئے۔ سیاسی فضا میں اُس وقت بڑی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ آرتھر بالفور (ARTHUR BALFOUR) اپنے چچا لارڈ سیلسبری (LORD SALISBURY) کی جگہ وزیراعظم اور کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر مقرر ہو گئے تھے (LEADER OF CONSERATIVE PARTY) مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ برطانوی سیاست میں کنزرویٹو پارٹی کی فوقیت کا طویل زمانہ اب ختم ہو رہا ہے۔ زوردار جوزف چیمبرلین (JOSEPHCHAMBERLAIN) مسئلہ تحفظ کو زیرِ بحث لے آئے تھے۔ اور ایسا کرنے سے انہوں نے کنزرویٹو پارٹی میں سخت پھوٹ پیدا کر دی تھی۔ (LIBRUL) لبرل پارٹی کے آدمی برابر ہولے ہولے اپنی قوت بڑھا رہے تھے۔ آئرلینڈ کا مسئلہ جو کچھ سال تک صرف دھوکا دینے کے لئے خاموش کر دیا گیا تھا پھر جوش میں آرہا تھا اور لبرل پارٹی جو اس وقت تک بہت کم تعداد رکھتی تھی اب ابھر رہی تھی اور یہ ایسی علامت تھی جو اچھی طرح نوٹ کرنے کے قابل تھی۔

میں نے اُس وقت تک کوئی ارادہ نہیں کیا تھا کہ میں یورپ میں گھوڑے پالوں یا اُن کو دوڑاؤں اور بہت سال گذر جانے تک میں نے ایسا نہیں کیا۔ مگر ان معاملات میں

میری دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی۔ جب تک میں انگلستان میں رہتا تھا میں برابر پابندی کے ساتھ گھوڑ دوڑ کی میٹنگ میں شریک ہوتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اسی سال گرمیوں میں میری پہلی ملاقات کرنل ہال واکر (COLONEL HALL WALKER) سے ہوئی جو بعد میں لارڈ ویورٹری (LORD WAVERTEE) ہوگئے۔ وہ برطانوی گھوڑ دوڑ کے اُن آدمیوں میں سے تھے جن کی شخصیت سب سے اونچی تھی۔ اُن کی معلومات گھوڑوں کی ہر چیز کے متعلق بے انتہا وسیع تھی۔ وہ اپنے فیصلہ میں آزاد تھے۔ صاف اور کھری بات کہنے والے آدمی تھے اور دوسروں کو نصیحت کرنے کے عادی تھے۔ بعض آدمی اُن کے خیالات اور اُن کے طریقوں کو ایسا عجیب اور غیر معمولی شمار کرتے تھے کہ ان کا عرفی نام "وہمی واکر" (WHIMSICAL WALKER) ڈال دیا گیا تھا۔ مگر میں اُن کی عقلمندی۔ دوراندیشی اور تجربہ پر کبھی اعتراض نہ کروں گا۔ وہ اُس وقت آئرلینڈ کے مشہور تلی اصطبل (TULLY STUD) کے مالک تھے جو بعد میں آئرلینڈ کا قومی اصطبل بن گیا۔ اور جہاں پر آئندہ سالوں میں مجھے بہت کچھ کرنا پڑا اور اس سے میرا بڑا واسطہ رہا۔

اُسی سال جاڑوں کے موسم میں میری واپسی بمبئی کو ہوئی اور اگلے سال ۱۹۰۵ء میں میری روانگی مشرقی افریقہ کو ہوئی۔ یہ میرا مشرقی افریقہ کا دوسرا سفر تھا۔ وہاں پر میں نے اپنے اسمٰعیلی مریدوں پر دماغی تعلیم اور جسمانی تربیت کے متعلق اپنے اُن خیالات کا زور کے ساتھ اظہار کیا جن کی تبلیغ اور جن کا تجربہ میں ہندوستان میں کر رہا تھا۔ مجھ کو خاص طور پر اِس سے سخت تکلیف پہنچی کہ زنجبار میں جسمانی صحت کا معیار بہت نیچا تھا۔ ٹی۔ بی سے جو موتیں ہوتی تھیں اُن کی تعداد خاص طور پر بہت زیادہ تھی۔ اگر اس کے متعلق یہ بحث کی جاتی کہ مشرقی افریقہ کی خوفناک گرم آب و ہوا اُن لوگوں کو کمزور کر دیتی تھی جو وہاں پر رہتے تھے اور اُن میں بے پروائی اور بے حسی پیدا کر دیتی تھی تو میں یہ بتا سکتا تھا کہ یہی بات ہندوستان کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے مگر ہندوستان میں اس قسم کی آب و ہوا کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے بہت زور کے ساتھ قدم اُٹھانے شروع کر دیئے تھے زنجبار میں مُکھیوں سے جو وہاں کی مقامی جماعتوں کے لیڈر تھے میں نے مشورے کئے۔ میں نے

وہاں کے ایک محل کو وہاں کا کھیل کلب (SPORTSCLUB) اور جسمانی تربیت کا مرکز بنا دیا جس میں ایک دوڑ کرنے کا میدان بھی رکھا تھا اور فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے کے لئے کچھ زمین چھوڑ دی گئی تھی۔ میں نے سب قسم کے مقابلوں میں انعامات تقسیم کئے۔ بلیرڈ سے لے کر سائیکل بازی کے مقابلوں تک۔ میں خوشی کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ ساری نئی نئی باتیں نہایت کامیاب ثابت ہوئیں۔

جب میں افریقہ میں تھا تو بمبئی ہائی کورٹ میں میرے خلاف ایک مقدمہ دائر کردیا گیا جو میرے خاندان کے اُن افراد کی طرف سے تھا جو مجھ سے مطمئن نہیں تھے اور جو میرے دادا کے ہم جد اور خاندانی رشتہ دار تھے۔ اس مقدمہ میں میرے خلاف بہت سے مالی اور دیگر قسم کے دعوے کئے گئے تھے۔ یہ مقدمہ جو مہینوں تک چلتا رہا۔ اس پہلے مقدمہ کا لازمی نتیجہ نہ تھا جو سنہ ۱۸۶۰ء اور سنہ ۱۸۶۹ء کے درمیان میرے دادا کے خلاف اُن چند خوجوں نے دائر کیا تھا جو اُن سے پلٹ گئے تھے (جس کا ذکر میں نے ایک پہلے باب میں کیا ہے) بلکہ یہ مقدمہ اُس رئیسانہ اور فیاضانہ طرزِ زندگی کا نتیجہ تھا جو میرے دادا نے بمبئی میں شروع کی تھی اور اس کو وہاں قائم رکھا تھا۔ اس مقدمہ کی طویل سماعت میں میرے خاندان اور اسمٰعیلی فرقہ کی تاریخ اور پس منظر کی دوبارہ تحقیقات کی گئی تھی۔ تحقیقات کے کمیشن ایشیا اور افریقہ کے دور و دراز ملکوں میں اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ وہ وہاں سے میرے بزرگوں کی جائداد اور اُن کے حالات کے متعلق ثبوت اور شہادت جمع کریں میری والدہ نے میری طرف سے گواہی دی جس کی تعریف جج نے ان الفاظ کے ساتھ کی کہ "انہوں نے غیر معمولی قوتِ حافظہ کا اظہار کیا" میں وکیل کے معاملہ میں بہت خوش قسمت رہا۔ میرے وکیل مسٹر انوریرٹی تھے جو (MR.INVERARITY) نہایت ذہین اور قابل قانون دان تھے۔ آخرکار جب مقدمہ کی سماعت ختم ہوگئی اور فاضل جج مسٹر جسٹس رسل نے (MR.JUSTICERUSSELL) اپنا فیصلہ دیا تو یہ فیصلہ اپنی نوعیت کا ایک بہترین تاریخی فیصلہ ثابت ہوا جس میں اسلامی تاریخ۔ مذہب۔ رواج اور قانون پر ایک نہایت وسیع۔ روشن اور صاف اور فاضلانہ نظر ڈالی گئی تھی۔ اس سارے

جھگڑے کا جس میں کافی وقت اور روپیہ خرچ ہوا۔ یہ اطمینان بخش نتیجہ ہوا کہ میرے حقوق اور میرا رتبہ پوری اور قطعی طور پر تسلیم کر دیئے گئے اور میں اپنی جگہ پر مستقل کر دیا گیا اس کے بعد سے پھر کبھی کسی نے میرے خلاف اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

میں سنہ ۶-۱۹۰۵ء کی سردیوں میں ہندوستان واپس آیا تاکہ ٹھیک وقت پر پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) سے کلکتہ میں نیاز حاصل کر سکوں (جو بعد میں شاہ جارج پنجم ہوئے) وہ اُس وقت ہندوستان کے اس سرکاری دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ جس کے متعلق سنہ ۱۹۰۴ء میں جب میں انگلستان میں تھا گفتگو ہو رہی تھی وہ اُس وقت ہز رائل ہائی نس (HIS ROYAL HIGHNESS) کہلاتے تھے اور میری یہ ملاقات اُن سے صرف پہلی ملاقات نہ تھی چونکہ اُن سے اور اُن کی محبوبہ بیوی ملکہ میری (QVEEN MARY) سے میری دوستی بہت پرانی تھی۔ میں سب سے پہلے سنہ ۱۸۹۸ء میں ملکہ میری سے ملا تھا جب وہ ڈچز آف یارک (DVCHESS OF YORK) تھیں۔ وہ انگلستان میں اپنے مکان پر رہتی تھیں معہ اپنے تین چھوٹے بچوں کے یعنی شاہ ایڈورڈ ہشتم جو بعد میں ڈیوک آف ونڈسر ہوئے۔ شاہ جارج ششم مرحوم اور اُن کی بہن شہزادی۔ اُن کے شوہر اپنے وطن سے باہر اپنے پہلے سرکاری سفر پر بہ حیثیت ایک بحری افسر کے گئے ہوئے تھے۔

ان دونوں نیک اور مہربان شوہر اور بیوی کی یاد میرے دل میں بہت زیادہ محبت سے بھری ہوئی ہے۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر فخر رہا ہے کہ میں نے شاہ جارج پنجم کی دوستی حاصل کی اور اُس کو اُن کی زندگی کے آخر تک قائم رکھا۔ وہ مجھ پر اتنا زیادہ بھروسہ کرتے تھے جتنا کہ اُن کے والد کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ سب قسم کے مضامین پر باتیں کیا کرتے تھے۔ ذاتی معاملات پر۔ سیاسی اور سوشل معاملات پر اور کھیل و تفریح کے معاملات پر۔ مجھے اکثر لنچ پر اُن کا مہمان ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔ یہ لنچ پہلے تو مارلبورو ہاؤس (MARLBOROUGH HOUSE) میں ہوا کرتے تھے۔ جب تک وہ پرنس آف ویلز رہے پھر اُن کی تخت نشینی کے بعد

بکنگھم پیلیس (BUCKINGHAMPALACE) میں ہونے لگے۔ یہ لنچ بالکل بے تکلفی کے ساتھ گھریلو طریقہ پر اور خاموشی سے ہوا کرتے تھے۔ جن میں ملکہ میری اور (QUEEN MARY) اُن کے ایک یا دو بچے ہوتے تھے اور مہمان کی حیثیت سے صرف میں موجود ہوتا تھا۔ عام طور پر ان لنچوں کا ذکر سرکاری سرکلر (COURTCIRLULAR) میں ہوتا تھا۔ مگر خاص وجوہ کی بنا پر عوام کے لئے ان کا علانیہ حوالہ کبھی نہیں دیا جاتا تھا

شاہ جارج پر عمر بھر اُن کی ابتدائی تربیت کا اثر باقی رہا جو انہوں نے ایک پیشہ ور بحری افسر ہونے کی حیثیت سے حاصل کی تھی۔ اُن کا صاف ستھرا خوب صورت جسم۔ اُن کا تیز کھلتا ہوا رنگ۔ اُن کی سمندر والوں کی سی ڈاڑھی۔ اُن کی قابلِ تعریف صاف آواز کا لہجہ اور زور جس سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ انہوں نے برسوں تک سمندر پر کمانڈر کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی موت پر تخت کے جانشین بن سکیں وہ بہت نازک مزاج تھے اور وہ اس کا اظہار بھی کر بیٹھتے تھے۔ جب کبھی کوئی معمولی سی بات بھی غلط ہو جائے مگر وہ جلد اس پر قابو پا لیتے تھے۔ وہ بہت نرم دل واقع ہوئے تھے اور دوسروں کی مصیبت دیکھ کر اُن کے دل میں بہت جلد ہمدردی پیدا ہو جاتی تھی۔

مجھے اُن کی ہمدردی کی ایک مثال یاد ہے کہ وہ کس طرح خود بخود اور فیاضی کے ساتھ پیدا ہوتی تھی۔ ملک معظم کے دربار تاج پوشی کے موقعہ پر دہلی میں مہاراجہ بڑودہ نے اس بات پر بہت بُرا مانا کہ اُن کو جا کر بادشاہ سلامت کے آگے سب کے سامنے جھکنا پڑا۔ انہوں نے اپنی اس ناراضگی کا ثبوت اس طرح پر دیا کہ رسم احترام کو نہایت بے پروائی اور بے قاعدگی کے ساتھ ادا کیا۔ اس طرز عمل سے ہر شخص کو جس نے اس رسم کو دیکھا بہت صدمہ ہوا خواہ وہ ہندوستانی تھا یا انگریز۔ چونکہ ملک معظم کے سامنے کھلم کھلا بداخلاقی کا اظہار کرنا کسی صورت میں حق بجانب اور مناسب نہ تھا۔ اس پر مہاراجہ نے وائسرائے سے تحریری معافی مانگی اور باوجودیکہ وہ معافی منظور کر لی گئی مگر پھر بھی بادشاہ سلامت اس واقعہ پر فطرتاً رنجیدہ ہوئے اور اُن کو برسوں تک اس کا افسوس رہا کچھ دن بعد مہاراجہ بڑودہ پر ایک مصیبت آ پڑی۔ اُن کے بیٹوں میں سے دو بیٹے جوانی سے

پہلے مر گئے۔ اور تیسرا بیٹا سخت بیمار پڑ گیا جب بادشاہ سلامت کو ان غم کی باتوں کا پتہ چلا تو انہوں نے مہاراجہ کو پوری طرح معاف کر دیا اور اس بے ادبی کی یاد کو بالکل بھلا دیا۔ اسکے بعد مہاراجہ بڑودہ کے متعلق میں نے ان کو کئی مرتبہ یہ کہتے ہوئے سنا۔" وہ غریب بدقسمت آدمی" اور ان الفاظ کے استعمال کرنے پر اُن کے لہجہ میں مہاراجہ کے لئے سچی ہمدردی پائی جاتی تھی۔

شاہ جارج پنجم اپنے والد کی طرح اُس طریقہ کی بڑی سختی کے ساتھ احتیاط کرنے والے تھے جس پر تمغے۔ بلّے اور اعزازی نشانات لباس پر لگائے جاتے تھے اور نیز اپنے والد کی طرح اُن کی نگاہ اس معاملہ میں غیر معمولی طور پر تیز تھی جس سے وہ کسی آدمی کے سینہ پر ان تمغوں وغیرہ کے استعمال کرنے میں کم سے کم غلطی کو بھی معلوم کر لیتے تھے۔

انہوں نے ایک مرتبہ اس کے متعلق مجھ سے کہا کہ" بعض آدمیوں کو تعجب ہوتا ہے کہ میں اور میرے والد ان چیزوں کے متعلق اتنے سخت ہیں۔ مگر یہ سوچئے کہ کیا یہ بات عجیب معلوم نہیں ہوگی کہ عام سوسائٹی میں لوگ باگ اس طرح آجایا کریں کہ انکی قمیصیں ان کے پاجاموں سے باہر نکلی ہوئی ہوں۔ اُن کے کالر اُن کی نکٹائیوں کے اوپر ہوں جو پیچھے کی طرف لٹکی ہوں اور اُن کے کوٹ اور واسکٹ کے بٹن سب غلط اور اُلٹے سیدھے لگے ہوں؟ جس طرح عام سوسائٹی میں ٹھیک طرح لباس پہننے کے کچھ قاعدے ضرور ہوتے ہیں اسی طرح بادشاہ اور اس کے دربار میں بھی کچھ قاعدے ضرور ہونے چاہئیں۔ جن کے مطابق یونیفورم (UNIFORM) اعزازی نشانات اور بلّے وغیرہ لباس کی صورت میں استعمال کئے جائیں۔"

ایک مرتبہ کسی بڑے دربار کے موقعہ پر سابق مہاراجہ راجپیپلا (MAHARAJAH OF RAJPIPLA) بادشاہ کے حضور میں اس طرح پیش ہوئے کہ وہ اپنے اعزازات کا وہ کالر نہیں لگائے ہوئے تھے جو اُن کو ضرور لگانا چاہئے تھا۔ چونکہ اس کالر کے لگانے سے ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ اس کو دیکھ کر بادشاہ سلامت ناراض ہوئے اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ وہ ناراض ہیں مگر ملکہ میری (QUEEN MARY) نے بہت جلد اُس بدقسمت نوجوان آدمی کی طرف ایک اطمینان بخش اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے

"کچھ پروانہ کیجئے۔ یہ سب ختم ہو جائے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ سلامت نے مہاراجہ کو فوراً معاف کر دیا۔

ان ہی مہاراجہ راج پٹیالا کے متعلق میں شاہ جارج پنجم کا ایک اور واقعہ پیش کرسکتا ہوں جو اس بات کی مثال ہے کہ وہ سب قسم کے معاملات میں نہایت سخت اور گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ مہاراجہ نے ۱۹۳۴ء میں ڈربی گھوڑ دوڑ (DERBEY) کا انعام حاصل کیا۔ وہ گھوڑا جس نے انعام لیا ونڈسر لیڈ (WINDSORLAD) کہلاتا تھا۔ مہاراجہ نے اس موقعہ پر اپنے گھوڑا اسدھانے والے کو وہ تحفہ نہیں دیا جس کا عام رواج ہے۔ اور جو گھوڑوں کے مالک ہمیشہ اپنے گھوڑا اسدھانے والے کو ڈربی جیتنے کے بعد دیا کرتے ہیں۔ اُن کا گھوڑا اسدھانے والا مسٹر مارکس مارشن تھا۔ جو شاہ جارج کے سابق گھوڑا اسدھانے والے کا بیٹا تھا۔ اس واقعہ کے بعد کئی ہفتے گذر گئے مگر مہاراجہ نے پھر بھی کوئی انعام نہیں دیا۔ ایک دن دوپہر بعد میں کسی بڑی اور شاندار سرکاری رسم منانے کے موقعہ پر موجود تھا جہاں پر سفیر۔ کابینہ کے وزیر اور اعلیٰ سرکاری عہدہ دار کثرت سے شریک ہوئے تھے۔ اس شاندار ہجوم میں بادشاہ سلامت کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چپکے سے مجھ کو ایک گوشہ کی طرف لے گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ "دیکھو مارشن کو اب تک اس کا انعام نہیں ملا ہے۔ آپ اس کے باپ کے بڑے دوست تھے۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے؟ اور آپ خود بھی اس نوجوان آدمی سے واقف ہیں۔ اس لئے مہربانی کرکے مہاراجہ کو پکڑئیے اور اُن کو سمجھائیے کہ اس قسم کا انعام دینا بالکل قاعدہ کی بات ہے اور وہ اُن کو ضرور دینا پڑے گا۔"

میں نے قدرتی طور پر ایسا ہی کیا جیسا کہ بادشاہ سلامت نے مجھ سے فرمایا تھا۔ اور مہاراجہ نے اتنی دیر کے بعد مارشن (MARSH) کے پاس اس کا واجبی انعام بھیج دیا۔ اس واقعہ کے بیس سال بعد میں نے مارشن کو بتایا کہ اس قصہ میں میری طرف سے کیا ہوا۔ باوجودیکہ مارشن بادشاہ کے گھوڑا اسدھانے والے کا بیٹا تھا اور باوجودیکہ وہ اکثر بادشاہ سلامت سے ملتا رہتا تھا۔ مگر اُس نے کبھی اس بات کا ذکر اُن سے نہیں کیا۔ مارشن نے

اپنے ایک دوست سے مہاراجہ کی اس عجیب غفلت کا ذکر کر دیا تھا۔ یہ دوست ایک جنرل کا عہدہ رکھتا تھا جو بادشاہ سلامت کے اسٹاف میں شامل تھا۔ اس جنرل نے بادشاہ کو یہ واقعہ بتا دیا اور بادشاہ نے یہ طے کر لیا کہ اس معاملہ میں مجھے بچولیا بنا کر کام لیں۔

اُس چونتیس سال کے زمانہ میں جب سے میری ملاقات شاہ جارج پنجم سے ہوئی میں نے اُن کو بہت اچھی طرح سے دیکھا اور برتا۔ اُن کے مکان پر گھوڑ دوڑ کی میٹنگ کے موقعہ پر اسکاٹ (ASCOT) ایپسم (EPSOM) اور دوسرے مقامات پر ہندوستان میں دو مرتبہ اُن کے دورہ پر جو انہوں نے بطور شاہزادہ ویلز (PRINCE OF WALES) اور بہ حیثیت بادشاہ کے کئے۔

جب وہ ۱۹۰۵ء میں ہندوستان آئے تو اُس وقت وائسرائے کے مکان پر کلکتہ میں ایک سرکاری ناچ کی محفل منعقد ہوئی (STATE BALL) اس واقعہ سے مجھے گذشتہ باتوں کا یہ سلسلہ یاد آ گیا۔ اُس وقت پرنس آف ویلز مجھ کو اپنے کمرہ میں لے گئے اور مجھے بتایا کہ وہ پوری طور پر اس کے حامی تھے کہ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل (مجلس عاملہ) میں ہندوستانیوں کا تقرر ہونا چاہیئے اور یہ کہ اُن کو بہت افسوس تھا کہ بدقسمتی سے کوئی ہندوستانی اس وقت وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں نہیں تھا۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ "میں نے لارڈ مورلے (LORD MORLEY) اور لارڈ منٹو (LORD MINTO) دونوں پر بہت زور ڈالا ہے کہ کوئی ہندوستانی ضرور مقرر کیا جانا چاہیئے"۔

وہ مجھ سے دیر تک کلکتہ کے شفاخانوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ جس کا ذکر اُن کے والد نے ایک سال پیشتر کیا تھا۔ وہ ان شفاخانوں سے بالکل مطمئن نہیں تھے۔

مورلے منٹو اصلاحات (جن کی بابت میں آگے چل کر بہت کچھ کہوں گا) اس کے اگلے سال میں شائع کر دی گئی تھیں۔ پرائیویٹ طور پر پرنس آف ویلز نے اس واقعہ کو راز میں نہیں رکھا کہ وہ بذاتِ خود ان اصلاحات کو ضروری اور صحیح شمار کرتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی طرح وہ اپنی ہندوستانی رعایا سے بڑی تیز اور سچی ہمدردی رکھتے تھے۔ اور وہ ہندوستان کی اصلی ضرورتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے اس ضرورت کو کہ ہندوستان

میں جہالت اور غریبی کے خلاف اور وہاں کے معیار زندگی کی خوفناک پستی کے خلاف ایک طاقتور اور متحدہ کوشش کیجائے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (ROUND THABAL CONFERANCE) کے موقعہ پر انہوں نے ایک مرتبہ سے زیادہ میرے پاس یہ پیام بھیجا کہ میں ہندو مسلمانوں کے اختلافات کو طے کر دوں اور اس سلسلہ میں وہ میری کوششوں کی ہمت افزائی فرمائیں گے تاکہ ان اختلافات پر سمجھوتہ ہو جانے کے بعد ہم اس قابل ہو سکیں کہ اُن عملی۔ مالی اور سوشل اصلاحات کو کامیاب بنا سکیں جو اتنے عرصہ سے نامکمل پڑی ہوئی ہیں اور جو اس سے بہت پہلے پوری ہو جانی چاہیئے تھیں۔ ایک دن ایسکٹ کے مقام پر (ASCOT) جب مجھ کو ان کے ساتھ لنچ کھانے کا اعزاز حاصل ہوا تو کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے بڑی سرگرمی کے ساتھ ان ہی موضوعات پر گفتگو کی۔

مجھے یاد ہے کہ جب پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں برلن سے یہ خبر اُڑی کہ اُن ہندوستانیوں جو گورنمنٹ کے خلاف تھے جرمنی میں ٹریننگ دی جارہی ہے۔ تو بادشاہ سلامت کو اس خیال سے بہت صدمہ پہنچا اور بڑا رنج ہوا کہ قیصر نے خود کو اس حد تک ذلیل کر لیا تھا کہ وہ اس قسم کے خفیہ اور وحشیانہ طریقوں کی تائید کریں۔ اسی طرح جب ۱۹۱۸ء میں ایکاٹرنبرگ (EKATERINBURG) کے مقام پر روس کے تمام شاہی خاندان کا خوفناک قتل ہوا۔ جن میں شاہ جارج پنجم کے رشتہ کے بھائی اور بہن یعنی زار روس اور زرینہ روس اور اُن کے سارے بچے شامل تھے تو اُن کے رنج کی یہ حالت تھی کہ وہ بہت گھبرا اٹھا۔ مگر وہ اس کا علانیہ اظہار نہ کرتے تھے اور اس کا ذکر صرف پرائیویٹ طور پر کر دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی عوام کے سامنے اس کا حوالہ نہیں دیا مگر ایک مرتبہ سے زیادہ جب اُن کی پرائیویٹ گفتگو مجھ سے ہوئی تو ان کو اس میں کچھ تامل نہ ہوا کہ میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیں اور مجھ سے اپنے رنج کا اظہار کر دیں۔

سر ہارولڈ نکلسن (SIR HAROLD NICOLSON) نے شاہ جارج پنجم کی جو سوانح عمری حال میں شائع کی ہے اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ بادشاہ سلامت کو ہمیشہ سیاسی نفاستوں کا پورا پورا احساس تھا اور اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ سیاسیات میں

دخل دینے کے قابل نہیں تھے۔ خواہ اُن کے ذاتی اور پرائیویٹ خیالات۔ خواہشات اور جذبات کتنے ہی زیادہ تیز اور سخت کیوں نہ ہوں۔ سرہارولڈ نے اس طریقہ کو بہت روشن بیان کے ساتھ ظاہر کیا ہے جس طریقہ پر بادشاہ سلامت اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد جو وہ بلاشبہ بہت زور کے ساتھ کیا کرتے تھے اور بہت عجیب کٹتے ہوئے جملوں میں کیا کرتے تھے۔ اپنا سیدھا ہاتھ اپنے بدن پر پھیر کر ایک ہلکا سا اشارہ کرتے تھے اور ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس سے اطمینان بخش مجبوری ظاہر ہوتی تھی یوں فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں رائے زنی کروں یا مداخلت کروں۔" مجھے وہ اشارہ اور وہ مسکراہٹ خوب یاد ہے۔ ان دونوں باتوں کو میں نے لنچ کے بعد والی گفتگو کے بہت سے موقعوں پر اکثر مرتبہ دیکھا ہے۔

شاہ جارج پنجم نہایت محنتی۔ جفاکش اور بہت زیادہ کام کرنے والے آدمیوں میں سے تھے۔ مگر اس کے باوجود اُن میں یہ دل خوش کُن خصوصیت تھی کہ وہ اپنے دوستوں کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی ذاتی قسم کی باتیں تفصیل کے ساتھ معلوم کرتے تھے اور اُن کو یاد رکھتے تھے۔ پہلی عالمگیر جنگ سے کچھ سال پیشتر مہاراجہ گوالیار کی منگنی مہاراجہ بڑودہ کی بیٹی سے ہوگئی تھی (جواب مہارانی کوچ بہار ہیں) ۱۹۱۲ء کے دہلی دربار کے زمانہ میں مہاراجہ بڑودہ کی بیٹی نے اس تعلق کو توڑ دیا۔ ظاہری طور پر تو مہاراجہ گوالیار نے بڑی بہادری سے اس ناامیدی کو برداشت کیا مگر اندر سے اُن کو سخت صدمہ پہنچا۔ بادشاہ سلامت نے اس کے متعلق سنا۔ اُن کو معلوم تھا کہ میں اور مہاراجہ گوالیار آپس میں گہرے دوست تھے۔ ایک سرکاری جلسہ کے موقعہ پر بادشاہ سلامت نے مجھے بلا کر بتایا کہ اُن کو مہاراجہ گوالیار کے واقعہ سے کتنا رنج ہوا اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس معاملہ کو سلجھانے کی جہاں تک مجھ سے ہوسکے کوشش کروں۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ میں ملکہ میری (QUEEN MARY) کو بہت پہلے سے جانتا تھا قبل اس کے کہ میری ملاقات اُن کے شوہر سے ہوئی۔ مجھے اس بات کا فخر ہے اور میں اس سے بہت خوش ہوں کہ میں پچاس سال سے زائد عرصہ تک ملکہ میری کے دوستوں

میں شمار کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں۔ یعنی اُن کی موت سے کچھ کم ایک سال پہلے ملکہ میری نے میرے پاس دو محبت بھرے ذاتی پیام بھیجے۔ پہلا پیام ایک مبارکبادی کا تار تھا جو اُس وقت میرے پاس بھیجا گیا جب میرا گھوڑا تلیار (TULYAR) ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں اول نمبر آیا۔ اس تار کے اندر ملکہ میری نے میری تندرستی کے متعلق بھی بڑی بے چینی سے ساتھ دریافت کیا تھا۔ چونکہ اُن کو معلوم تھا کہ میں سخت بیمار رہ چکا تھا اور پھر اُن کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی تھی کہ میں ٹھیک ہوتا جا رہا تھا۔ اُن کا دوسرا پیام جو دراصل میرے لئے اُن کا آخری پیام تھا مجھے اُس وقت موصول ہوا جب میرے اسی گھوڑے تلیار (TULYAR) نے اسکٹ (ASCOT) کے مقام پر شاہ جارج اور ملکہ ایلزبتھ کا کپ (PUP) جیتا تھا۔ اُس وقت ملکہ میری نے اپنے ایک افسر کے ذریعے سے مجھے مبارکباد بھیجی اور سلام کہلا کر بھیجا۔

ملکہ میری شاہ جارج کے لئے ایک نہایت مضبوط اور بیش قیمت سہارا ثابت ہوئیں۔ وہ بہت بڑی انگریز خاتون تھیں۔ میرے نزدیک اُن کے اندر بادشاہیت کے سب بہترین اوصاف "قانونی طریقہ پر دستوری انداز میں جمع ہوگئے تھے یہ اوصاف بہ حیثیت ایک بیوی کے۔ بہ حیثیت ایک ماں کے اور بہ حیثیت خانہ داری کے نہایت اعلیٰ قسم کے تھے اور اُن میں اوسط طبقہ والے آدمیوں کی پختہ حقیقت پرستی بھی پائی جاتی تھی۔

میرے زندگی کے نہایت نازک بلکہ ایک اعتبار سے نہایت تکلیف دہ تجربوں میں سے وہ گفتگو بھی ہے جو میں نے ملکہ میری سے شاہ ایڈورڈ ہشتم کے تخت چھوڑنے سے کچھ عرصہ پہلے کی تھی۔ جنیوا سے لندن واپس آنے پر جب لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کی لاتعداد کانفرنسوں میں سے ایک کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ شاہ ایڈورڈ ہشتم سے میری ایک طویل ملاقات ہوئی اور اس ملاقات میں لیگ کی کارروائیوں کے متعلق میں نے اپنی مفصل رپورٹ بادشاہ سلامت کو دی۔ اس کے بعد میں نے ملکہ میری سے نہایت سرگرمی اور خلوص کے ساتھ

شاہ ایڈورڈ کا ذکر کیا اور اس بات کی بہت تعریف کی کہ اُن کے خیالات نہایت صاف تھے۔ وہ حقیقت پر نگاہ رکھتے تھے۔ اور خاص طور پر اُن کی یہ بات بہت قابلِ قدر تھی کہ وہ آئندہ ہونے والی جنگ کے خطرات کا پورا اندازہ رکھتے تھے۔ میں نے اُس وقت دیکھا کہ ملکہ میری کو اپنے بیٹے پر بے انتہا فخر تھا مگر اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور وہ اُن کو روکے ہوئے تھیں۔ یہ آنسو اس بات کا ثبوت دے رہے تھے کہ ملکہ میری کو اُس رنج اور مصیبت کا احساس ہے جو عنقریب شاہی خاندان پر آنے والی تھی۔ انہوں نے اس کی طرف کوئی کھُلا ہوا اشارہ نہیں کیا اور میں بھی اس کے متعلق نہ کوئی ذکر کر سکتا تھا نہ میں اس بات کو پسند کرتا تھا کہ اس کا کوئی حوالہ دوں۔ میں چونکہ عرصہ تک باہر رہنے کے بعد واپس آیا تھا اس لئے مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ شاہ ایڈورڈ کی مصیبت کتنی بڑی اور کتنی قریب تھی۔ اُس مغموم خاموشی کی فضا میں اس مصیبت کا اندازہ کر لینا اور بھی زیادہ صدمہ پہنچانے والا تھا۔

جو معاملات میری اور ملکہ میری (QUEENMARY) کی گفتگو میں نہیں آئے اُن کی بناء پر اور اُن کے ڈرائنگ روم کی اس خاموش فضا کی وجہ سے جو وہاں پھیلی ہوئی تھی ایک نہایت گہرے اور افسوسناک خطرہ کا پتہ چلتا تھا۔ وہاں پر اس کا احساس ہو رہا تھا کہ ملکہ میری اور اُن سب لوگوں کے چاروں طرف جن سے وہ بہت زیادہ محبت کرتی تھیں ایسے بادل منڈلا رہے ہیں جو سخت طوفان کی صورت میں اُن کے اوپر ٹوٹ پڑیں گے۔

سنہ ۱۹۰۶ء کی گرمیوں میں میرا قیام پھر انگلستان میں ہوا۔ میرے گذشتہ قیام کے بعد انگلستان میں عام الیکشن ہوئے جن میں کنزرویٹو پارٹی CONSERVATIVEPARTY کے ممبروں کو سخت شکست ہوئی اور لبرل پارٹی (LIBERALPARTY) کے ممبر برسرِ اقتدار ہو گئے اور یہ اس اکثریت کے ساتھ تھے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ سر ہنری کیمبل بینرمین (SIR HENRY CAMPBELL-BANNERMAN) وزیرِ اعظم نے جو

گورنمنٹ بنائی وہ کابینہ کے کمرہ میں (CIABINET ROOM) جمع ہوئی اور اگلی صف پر (FRONT BENCH) ایسے تیز اور قابل آدمیوں کی جماعت موجود تھی جو موجودہ برطانوی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی۔ اس قابل یادگار حکومت کے چند نام یہ تھے۔ ایسکواتھ (ASQUITH) گرے (GREY) ہیلڈین (HALDANE) لائڈ جارج (LLOYDGEORGE) جان مارلے (JOHNMORLEY) ہربرٹ سیموئل (HERBERTSAMUEL) اور ونسٹن چرچل (WINSTON CHURCHILL) مارلے (MORLEY) جو گلیڈاسٹون (GLADSTONE) کے گہرے دوست۔ کابینہ کے ساتھی اور اُن کی سوانح عمری لکھنے والے اور اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ زبردست اور تعمیری کام کرنے والا دماغ رکھنے والے آدمیوں میں سے تھے۔ اُس وقت وزیر ہند کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ عہدہ میرے نزدیک اور میرے سیاسی دوستوں کے نزدیک نہایت اہم قسم کا عہدہ تھا۔ کچھ دن بعد مارلے (MORLEY) کا نام وائسرائے کے نام کے ساتھ مارلے منٹو اصلاحات (MORLEYMINTO REFORMS) کی صورت میں مشہور ہو گیا۔ یہ وائسرائے ارل آف منٹو (EARL OF MINTO) تھے۔ جو اسکاٹ لینڈ کے معزز شہری اور لبرل پارٹی (LIBERAL PARTY) کے نقطۂ نظر ذہانت اور اعتدال پسندی رکھنے والے آدمیوں میں سے تھے۔ مارلے منٹو اصلاحات سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ہندوستان نے اپنی سیاسی آزادی کے راستہ میں ایک خاص اہم ترقی کر لی ہے۔ ایسکواتھ (ASQUITH) اُس وقت وزیر خزانہ تھے۔ لائڈ جارج (LLOYD GEORGE) تجارتی بورڈ کے صدر تھے۔ اور ونسٹن چرچل جو اس وقت صرف تیس سال کی عمر کے تھے اور پارلیمنٹ کی دوسری پارٹی کی طرف سے حال ہی میں مقرر کئے گئے تھے پہلے دفتر میں ایک چھوٹی سی جگہ پر ملازم تھے۔ مگر بہت جلد کافی شہرت رکھنے والے آدمیوں میں ہونے والے تھے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا۔ بلکہ اب تو ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو جائینگے کہ مسٹر ونسٹن چرچل کی عنایت بہ حیثیت ایک دوست کے مجھے حاصل رہی ہے اور میں اس سے بہت خوش ہوں۔ سنہ ۱۸۹۶ء کی گرمیوں کے آخر میں پونا کے مقام پر میں اور وہ

سب سے پہلی مرتبہ ملے برطانوی سوار فوج (CAVALRY REGIMENT) یعنی فورتھ حصار (FOURTH HUSSARS) کے افسروں کی ایک جماعت جو اُس وقت بنگلور میں مقیم تھی میرے پاس آئی اور میں نے اُن کو اپنے دوڑ کے گھوڑے دکھائے۔ اُن فوجی افسروں میں ایک نوجوان رسالدار بھی تھا جس کا نام وِنسٹن اسپنسر چرچل (WINSTON SPENCER CHURCHILL) تھا۔ کسی دوسرے افسر کی نگاہ اتنی تیز اور اتنی پہچاننے والی نہ تھی جتنا کہ اس نوجوان افسر کی تھی۔ نہ کوئی اور آدمی گھوڑے کو اتنا اچھا سمجھنے والا اور پرکھنے والا تھا جتنا کہ یہ نوجوان تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس وقت اُن کی عمر کچھ اوپر تیس سال ہو گی۔ بالکل لڑکوں کی سی شکل رکھتے تھے۔ بہت بے چین اور چلبلے تھے۔ اور پہلے سے نہایت جوشیلے۔ بہادر اور ہوشیار پولو کے کھلاڑی تھے۔

نوجوان ونسٹن چرچل کا خیال کرتے وقت یہ ناممکن ہے کہ اُن کی والدہ کی یاد نہ آجائے یعنی لیڈی رینڈولف چرچل (LADY RANDOLPH CHURCHILL) جو بہت مشہور اور ہر دلعزیز تھیں۔ اُن کی خوبصورتی۔ اُن کا اخلاق اور اُن کی خوش طبعی اب افسانہ کی سی خصوصیت رکھتی ہیں (اُن کا حسن۔ اُن کا کرم۔ اور اُن کی ظرافت اب قصۂ ماضی ہو کر رہ گئی ہیں) ایک مشہور آدمی کی بیوی کی حیثیت سے اور دوسرے مشہور آدمی کی ماں کی حیثیت سے وہ بذاتِ خود ایک انتہائی امتیاز رکھنے والی خاتون تھیں۔

لیڈی رینڈولف (LADY RANDOLFH) کے متعلق بہت سے موقعوں اور بہت سے مقامات پر جتنی باتیں یاد ہیں اُن میں سے میں صرف اُن کی ایک بات کا انتخاب کرتا ہوں جو میرے نزدیک خصوصیت کے ساتھ یہ ثابت کرے گی کہ ان کی ظریفانہ طبیعت کتنی موزوں اور چبھنے والی بات پیدا کرتی تھی۔ ایک دن ایکس لے بنیس (AIX-LES-BAINS) کے مقام پر سر رفس اساکس (SIR RUFUS ISAACS) نے جو بعد میں مارکوس آف ریڈنگ ہوئے (MARQUESS OF READING) کسی حرکت کے متعلق جس کو انہوں نے ناپسند کیا تھا یہ جملہ استعمال کیا۔ "جو عورت ایسا کرے گی اس کی کوئی مرد عزت نہیں کرے گا۔" اس پر لیڈی رینڈولف نے ہولے سے جواب دیا کہ "دنیا میں کوئی

عورت یہ نہیں چاہتی کہ اُس کی عزت کی جائے۔" (یعنی کوئی عورت یہ ضرورت محسوس نہیں کرتی ہے کہ دوسرے آدمی اُس کی عزت کریں۔ گویا وہ خود کو اس سے بالاتر سمجھتی ہے کہ دوسروں کی توجہ کی محتاج رہے۔)

آئندہ زندگی میں ہم دونوں کو ایسے راستوں پر چلنا پڑا جو بار بار ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ۱۹۰۲ء کی گرمیوں میں جس سال شاہ اڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی ہوئی ہم دونوں کی دوسری ملاقات وارِوک محل (WARWICK CASTLE) میں ہوئی جب ایک بڑی ہفتہ والی دعوت میں ہم لارڈ اور لیڈی وارِوک (WARWICK) کے مہمانوں کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ چھ سال کے اندر وہ جوشیلا فوجی رسالدار دور دور سفر کر چکا تھا اور بہت کچھ حاصل کر چکا تھا۔ جہاں کہیں جنگ ہوتی تھی وہیں پر وہ ترکیب لگا کر پہنچ جاتا۔ خواہ اسکے سینئر افسر کی رائے کچھ ہی ہو۔ ملاکنڈ (MALAKAND) کے متعلق چرچل نے اپنی بہت سی کتابوں میں سے سب سے پہلی کتاب لکھی ہے۔ دریائے نیل کے بالائی حصہ پر کچنر کی دریائی جنگ (RIVER WAR) اور اومڈرمین (OMDURMAN) کے مقام پر سواروں کے دستہ کا حملہ (ان سب مقامات پر چرچل موجود تھے) جنوبی افریقہ میں جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے وہ گرفتار کر کے قیدی بنا دیئے گئے۔ مگر وہ وہاں سے بچ کر نکل بھاگے۔ اور کروگر (KAUGER) نے اُن کا سر اُتارنے پر انعام مقرر کر دیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں وہ کنزرویٹو پارٹی کی طرف سے اولڈ میں (OLDMAN) حلقہ کے لئے پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ وارِوک کے مقام پر اس ہفتہ کے آخر میں وہ تعطیل کے موڈ میں تھے (HOLIDAY MOOD) میں اور وہ دونوں بالکل تفریح کے طور پر اس بات پر بہت زور کی بحث میں مصروف ہو گئے کہ مقابلتاً پولو اچھی چیز ہے یا شکار کھیلنا اچھی چیز ہے۔ وہ بہت زور کے ساتھ پولو کے طرف دار تھے اور میں چونکہ بچپن ہی سے شکاری کتوں کا شوقین رہا اس لئے ایسی ہٹ دھرمی کے ساتھ شکار کھیلنے کا طرف دار تھا۔ جیسی کہ چرچل پولو کے لئے ظاہر کر رہے تھے۔ مگر اس کے علاوہ مجھے ایک اور گفتگو کا موقعہ بھی یاد آتا ہے جو اُسی گرمی کے موسم میں ہفتہ کے آخری دنوں میں پیش آیا۔ اُس گفتگو میں ذرا کم تفریح بازی تھی۔ چرچل شاہانہ روایات کے حامی تھے اور اُن کا نقطۂ نظر بھی

شہنشاہیت پرستی کا تضاد (IMPERIALIST OUTLOOK) اس لئے جس طرح پر کہ اس زمانہ کے اکثر سیاسی میلانات رکھنے والے انگریز کیا کرتے تھے۔ اسی طرح چرچل نے بھی آئرلینڈ کے مسئلہ پر گفتگو شروع کی۔ انہوں نے وہی بات کہی جو چند سال پیشتر لارڈ اسپنسر نے (LORD SPENCER) مجھ سے کہی تھی۔ وہ یہ کہ "بیس سال تک آئرلینڈ میں سختی سے حکومت کر لینا آئرلینڈ کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہو سکتا۔"

اُس نوجوان ٹوری پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ نے جو آرتھر بالفور کا برائے نام حامی تھا پھر یہ بھی کہا کہ "جب تک آئرلینڈ کے آدمی غیر مطمئن رہتے ہیں۔ وہاں کے معاملات کا کوئی حل نہیں ہو سکتا۔ جب آئرلینڈ کے آدمی سیاسی اعتبار سے مطمئن ہو جائیں گے ہم صرف اُسی وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ آئرلینڈ کے مسئلہ کو حل کر لیں۔"

جیسا کہ نوجوان آدمیوں کی عادت ہوتی ہے ہم دونوں بہت سے معاملات پر بہت زیادہ باتیں کیا کرتے تھے۔ چرچل کی مشہور خصوصیات میں سے اُن کی وہ قوت حافظہ بھی ہے جو الفاظ یاد رکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے وہ آزادی کے ساتھ فٹز جرالڈ (FITZGERALD) کے ترجمۂ عمر خیام میں سے زبانی پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ کو یقین دلایا کہ اُن کو دراصل وہ ساری کتاب حفظ یاد تھی مجھے یاد ہے کہ مجھے دراصل اُن کے اُس جوش اور دلچسپی پر تعجب ہوتا تھا جو وہ عمر خیام کے متعلق ظاہر کرتے تھے بات یہ ہے کہ ہم میں سے اُن لوگوں کے نزدیک جن کی مادری زبان فارسی ہے عمر خیام ایک ایسا معمولی شاعر معلوم ہوتا ہے جس کی نگاہ بہت محدود تھی۔ میں نے چرچل کو یہی باتیں کہہ کر ٹٹولا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر میری تردید کی کہ وہ عمر خیام کی جس بات کی تعریف کرتے تھے وہ اس کا فلسفہ نہ تھا بلکہ اُس کی شاعرانہ قابلیت تھی۔ پھر ایک دم انہوں نے اِس بحث کا رخ بدلتے ہوئے کہا کہ "آپ کو معلوم ہے کہ عمر خیام کے فلسفہ میں بہت کچھ موجود ہے۔ بہر حال جو کچھ ہم آجکل کرتے ہیں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے چونکہ سو سال بعد بھی یہ رنگ ڈھنگ اسی طرح پر رہیں گے۔"

چرچل کے اس سرسری جملہ پر میں نے سخت اعتراض کیا اور میں نے کہا کہ "جو کچھ

تم آجکل کرتے ہو وہ اب سے ہزار سال بعد بیکار ہی کیوں نہ ہو مگر یہ ضروری ہے کہ جو واقعات اب سے سو سال بعد ظاہر ہوں گے وہ بڑی حد تک ہمارے موجودہ اچھے اور بُرے کاموں کے براہِ راست نتیجے ہوں گے۔"

مجھے یاد ہے کہ چرچل نے آخر میں آکر اس بحث میں مجھ سے اتفاق کر لیا۔ اب چونکہ میں اُس زمانہ کی نسبت زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں اور اب مجھے زیادہ تجربہ بھی ہو گیا ہے اس لیے اس بات کو میں اب اِس طرح کہوں گا کہ جو واقعات اب سے ہزار سال بعد ظاہر ہوں گے اُن پر اُن باتوں کا بہت اثر پڑے گا جو ہم آجکل کرتے ہیں یا جو کچھ ہم آجکل کرنے سے چھوڑ دیتے ہیں۔

میرے بزرگ پیش رو حضرت محمدؐ پیغمبر اسلام کی زندگی پر ذرا غور کیجئے۔ اگر محمدؐ اپنے دشمنوں کے ہاتھ اپنی پہلی لڑائی میں ہی قتل کر دیئے جاتے تو دنیا میں اسلام ظاہر ہی نہ ہوتا۔ عرب میں بہت سے چھوٹے چھوٹے عیسائی فرقے اپنا گھر کر لیتے۔ مشرقِ وسطیٰ ایک عیسائی ملک ہوتا۔ بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والا ملک ہو ہندوستان کا وہ حصہ جو مسلمان ہو گیا۔ عیسائیت کے کسی فرقہ میں اپنا مذہب بدل لیتا۔ میں اس سے بھی زیادہ کہنے کو تیار ہوں۔ وہ یہ کہ اگر ہمارے پیغمبر کی وفات کے بعد (واصل باللہ ہونے کے بعد) مکہ کے قریش کی جگہ مدینہ کے انصار اُن کے جانشین ہو جاتے تو اسلام کی حالت اب سے بالکل مختلف ہوتی۔ مدینہ کے انصار بہت نرم قسم کے ایک سی زندگی بسر کرنے والے کاشتکار پیشہ لوگ تھے جو اپنی زمین پر رہتے اور اسی پر کام کرنے سے مطمئن تھے اور اس سے زیادہ اور کچھ کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ مگر اسکے خلاف پیغمبر کا خاص قبیلہ یعنی مکہ کے قریش ایک قسم کی عالمگیر طبیعت رکھنے والے آدمی تھے نہایت جوانمرد تھے جو کسی بات کی پروا نہ کرتے تھے۔ اور جن کو سفر کرنے اور مشکل کاموں میں پڑنے کا بے انتہا شوق تھا۔ جنہوں نے قسطنطنیہ اور اسکندریہ تک سفر کیا اور روم (ROME) تک پہنچ گئے اور ایران کو بھی نہ چھوڑا۔ سمندر کے راستہ سے تجارت کی تلاش میں ہندوستان بھی آ پہنچے۔ اگر مدینہ کے انصار مسلمانوں کے لیڈر رہتے تو اسلام اگر

مشکل سے آج تک باقی بھی رہتا تو وہ آجکل مشرق کے اُن بہت سے چھوٹے چھوٹے فرقوں میں سے ایک فرقہ شمار کیا جاتا جن کو بہت کم آدمی جانتے ہیں۔

اسلام کو ایک عالمگیر مذہب بنانے کے لئے جس کی آواز ساری دنیا میں بنی نوع انسان کے لئے پھیل گئی اس کی ضرورت تھی کہ اس کو تجارتی احساس رکھنے والے قریشی لوگوں کا جو مکہ کے شہری تھے عالمگیر تجربہ اور تخیل کی قوت حاصل ہو۔

ہمارے زمانہ میں بھی بہت سی سیاسی اور دوسری قسم کے فیصلوں کی مثالیں پائی جاتی ہیں جن کا اثر موجودہ زمانہ سے لے کر بہت دور تک آئندہ زمانہ میں پڑتا رہے گا۔ اگر ۱۸۷۱ء میں بسمارک (BISMARCK) السیک (ALSACE) اور لورین (LORRAINE) کو صلح کی اُن شرائط میں سے خارج کر دیتے جو اس نے اپنی فتح مندی کے وقت فرانس پر عائد کی تھیں۔ تو کیا یہ ممکن تھا کہ ملک میں "ریونیچی" (REVANCHE) کی وہ آواز جو بعد میں برسوں تک نہایت خوفناک طریقہ پر گونجتی رہی کبھی اُٹھائی جا سکتی تھی؟ جرمنی اور فرانس کی جنگ کو لوگ بالکل بھول جاتے (FRANCO-PROSSIAN WAR) جس طرح کہ وہ اس "نئی سلطنت" کی بعض اور حماقتوں کو بھول گئے تھے جو محض اترانے کے لئے کی گئی تھیں۔ اس صورت میں وہ متحدہ یورپ پیدا ہو جاتا جس کی ہم سب آجکل امید اور خواہش کرتے ہیں۔ اور ہم کو دو عالمگیر جنگوں کے تلخ تجربے اُٹھانے نہ پڑتے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد بھی اگر مغربی حکومتیں ویمر ریپبلک (WEIMAR REPUBLIC) کے ابتدائی آزمائشی سالوں میں ایسے آدمیوں کی نصیحت مان لیتے جیسے لارڈ ڈی ابیرنن (LORD D'ABERNON) تو ہم اڈولف ہٹلر کا (ADOLF HITLER) نام کبھی نہ سنتے۔ پرانی لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) جسکے اندر بہت سی اچھی باتیں تھیں۔ جن میں کم از کم یہ بات بھی تھی کہ اسٹرسیمین کی جرمنی کو (STRESEMANN'S GERMANY) بہت جلد لیگ آف نیشنز کا پورا ممبر بنا لیا گیا۔ بہت بڑی حد تک پہلی عالمگیر جنگ کے نقصانات کی تلافی کرنے میں کامیاب ہوتی۔ مگر بعض ایسے مشورے دینے والے بھی تھے جو اتنے زیادہ بیدار مغز نہ تھے مگر اُن کی بات کو مغربی یورپ نے غور سے سنا اور آئندہ سالوں میں جرمنی کے آدمیوں پر یہ بات ہم کلام

کے ذریعہ سے واضح کی گئی کہ جو کچھ وہ چاہتے تھے اُس کے حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا اور وہ طریقہ سیاسی قوت کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا تھا۔

او ہو! وہ بھی کیا زمانہ تھا! بہت عرصہ ہوا وارِوک محل (WARWICK CASTLE) میں جو دو نوجوان بیٹھے ہوئے ایسی گہری دلچسپی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے اُن کو آگے چل کر بہت کچھ سیکھنا تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سر ونسٹن چرچل کی سب سے بڑی خصوصیات میں سے جو شاید ان کی زندگی میں بہ حیثیت ایک سیاسی آدمی کے اُن کے لئے سب سے زیادہ قابلِ قدر ثابت ہوئی ہے یہ خصوصیت ہے کہ وہ تجربہ سے سبق سیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور پھر اس سبق کو سیکھنے کے بعد اس کو بالکل بھول جاتے ہیں جیسے کوئی شخص سلیٹ کو دھو کر صاف کر ڈالے۔

۱۹۰۶ء میں جب ہماری وارِوک محل (WARWICK CASTLE) والی قابلِ یادگار ملاقات کو چار سال گذر چکے تھے کیمبل بینربین (CAMPBELL BANNERMAN) کی لبرل گورنمنٹ میں چرچل جونیئر وزیر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جان مارلے (JOHN MORLEY) نے جو اُن سے سینئر کابینہ والوں میں سے تھے چرچل کے متعلق مجھ سے یہ بات کہی کہ "نوجوان چرچل نوجوان جوزف چیمبرلین (JOSEPH CHAMBERLAIN) کی طرح بہت بڑا قدرتی سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ نئے نئے معاملات جس وقت پیدا ہوں اُن کو لینے اور اُن کو حل کرنے کے لئے چرچل میں ایسی اندرونی اور قدرتی آمادگی پائی جاتی ہے جیسی کہ جوزف (JOE) میں تھی۔"

سر ونسٹن چرچل کی زبردست شخصیت کے اندر دو متضاد اور عام طور پر ایک دوسرے سے مختلف رگیں مل کر ایک ہو گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک تو اُن کی قدیم افسانہ والی خصوصیت سے تعلق رکھتی ہے جس کی وجہ سے وہ بہت گہرے جذباتی اور شاعرانہ طریقہ پر تاریخی باتوں کو بیان کرتے ہیں اور دوسری خصوصیت جو اس میں شامل ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ چرچل عام آدمیوں کی طرح عملی طور سے زمین پر رہنے والے اور حقیقت کو حقیقت کی طرح دیکھنے والے آدمیوں میں سے ہیں۔ وہ نہایت سخت قسم کے اور ٹھنڈے دل سے حساب لگانے والے منصوبہ بند آدمی ہیں۔ ان دونوں خصوصیات کا ایک جگہ جمع ہونا اُن کے اندر ناقابلِ مخالفت ہے اور

بعض موقعوں پر بہت شان دار ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً چرچل نے اس بات کو منظور کر لیا کہ ہندوستان برٹش کامن ویلتھ میں (BRITISHCOMMONWEALTH) اپنی خوشی سے اور اپنی شرائط کے ساتھ شامل رہے گا اور اس کی حیثیت ریپلک (REPUBLIC) کی شمار ہوگی۔ انہوں نے خود مجھ سے اس سلسلہ میں یہ کہا کہ "آدھی روٹی مل جانا اس سے بہتر ہے کہ بالکل روٹی نہ ملے"۔ چرچل کا ہندوستان کے معاملہ سے جو تعلق رہا ہے اُس سے یہ بات پوری طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اُن کے کیریکٹر میں یہ دونوں ملے جُلے پہلو سب سے اونچی سیاسی سطح پر پائے جاتے ہیں۔ اُن کے وجود کا ایک حصہ فوری خیال بازی کے ساتھ (ROMANTICISM) سلطنت کی ایک نہایت رنگین تصویر پیش کرتا ہے جس میں یونین جیک (UNION JACK) کسی دور و دراز سرحد پر خوب ہوا میں لہلہا رہا ہو۔ خیبر کے ویران حصہ میں فوجی سپاہی نہایت ہوشیاری سے پہرہ دے کر کرکٹ لگا رہے ہوں۔ برطانوی شہنشاہیت کی تاریخ میں نصف صدی سے زائد عرصہ تک جو خوشی کی بانسری بجتی رہی ہے۔ ان سب کا تصور چرچل کے دماغ میں کام کرتا ہے۔ مگر اپنے وجود کے دوسرے حصہ میں وہ مستقل عملیت اور عام شعور کے اہل اور بہت ٹھوس قسم کے حقیقت بین مگر فراخ دل ثابت ہوئے ہیں۔ اُن کی زندگی کا یہ دوسرا پہلو اُن کے اندر ۱۹۴۷ء سے بہت زیادہ واضح ہوگیا ہے۔ انہوں نے خوشی کے ساتھ ایک سیاسی واقعہ کو بہ حیثیت ایک واقعہ کے تسلیم کر لیا ہے۔ اور نہایت کامیابی کے ساتھ اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایک بالکل نئی صورتِ حال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیں۔

اُس زمانہ کے بعد سے جب کہ چرچل کی مختصر سپاہیانہ زندگی ہندوستان میں ختم ہو چکی تھی میری یہ تمنا رہی کہ چرچل کا تعلق ہندوستان سے اور زیادہ قریب ہو جاتا۔ اور ہندوستان کے معاملات پر فیصلہ دینے کی ذمہ داری اُن کے اندر اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصہ میں اور زیادہ پیدا ہو جاتی۔

میں نے چرچل کو پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں بہت اچھی طرح سے دیکھا اور برتا

اور ہم دونوں اکثر سیاسی معاملات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اُس جنگ کے ختم ہونے پر کچھ عرصہ بعد جب کہ لارڈ چیمسفورڈ کی مدتِ ملازمت بہ حیثیت وائسرائے کے ختم ہونے والی تھی اور لارڈ ریڈنگ کا اس وقت تک تقرر نہیں ہوا تھا۔ لائڈ جارج نے (LLOYD GEORGE) ہم دو آدمیوں کو بلایا۔ یعنی خود مجھے اور میرے ایک گہرے دوست مسٹر باسو (MR. BASSOU) کو جو انڈیا کونسل کے ممبر تھے۔ تاکہ وہ ہم سے وائسرائے کا جانشین مقرر کرنے کے متعلق مشورہ کریں۔ ہم دونوں کی طرف سے میں نے مسٹر لائڈ جارج کے سامنے اس بڑے عہدہ کے لئے دو امیدواروں کے نام پیش کئے۔ یعنی لارڈ ڈربی اور ونسٹن چرچل۔ انہوں نے ان دونوں میں سے کسی کو بھی براہ راست نامزد نہیں کیا۔ پھر انہوں نے مسٹر باسو سے الگ دریافت کیا کہ مسٹر باسو کی تجویز دراصل مجھ سے متفق تھی۔ مگر مجھ سے لائڈ جارج نے ان میں سے کسی نام کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ مسٹر باسو کے آگے اور میرے آگے لائڈ جارج۔ لارڈ ڈربی کا نام سنکر خاموشی کے ساتھ درگذر کر گئے۔ پھر وہ جلدی سے مسٹر باسو کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا "کیا آپ مسٹر چرچل سے واقف ہیں؟" اس پر مسٹر باسو نے اعتراف کیا کہ اُن کو مسٹر چرچل سے کوئی ذاتی واقفیت نہیں تھی۔ پھر لائڈ جارج نے قطعی طور پر زور کے ساتھ کہا کہ "میں چرچل کو خوب جانتا ہوں۔"

پچھلی زندگی پر نظر کرتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ ونسٹن چرچل نے کتنے بڑے عہدوں کو کیسی شان کے ساتھ سنبھالا ہے میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ لائڈ جارج نے ہماری متفقہ تجویز کو منظور نہیں کیا۔ اگر چرچل کو ہندوستان کا براہ راست اور موجودہ حالات کا تجربہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ گول میز کانفرنس کے موقعہ پر سنہ ۱۹۳۰ء سے لے کر آگے تک اُن کا تمام نقطۂ نظر اور پارلیمنٹ کی بحثوں میں ان کی تقریریں جن کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سنہ ۱۹۳۵ء پاس کیا گیا۔ بالکل مختلف نوعیت کی ہوتیں۔ اس بدلی ہوئی ذہنیت کا اثر انگریز اور ہندوستان کے تعلقات کی ساری آئندہ تاریخ پر بہت محسوس کیا جاتا۔ میں اس سے بھی زیادہ کہنے کو تیار ہوں۔ وہ یہ کہ اگر چرچل کو وائسرائے ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کے متعلق براہ راست معلومات حاصل کرنے کا

موقعہ مل جاتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ہٹلر کو نیچا دکھانے اور جرمنی کو بچانے کے لئے مغربی تہذیب کے مطابق دوسری قسم کے ذرائع معلوم کر لیتے جو اُن ذرائع سے بہت کم خطرناک ہوتے جو اب تک اس سلسلہ میں استعمال کئے گئے۔

میں نے جب کبھی ونسٹن چرچل سے سیاسی معاملات پر گفتگو کی ہے۔ مجھ پر اُن کے نقطۂ نظر کی غیر معمولی عملی حقیقت بینی کا نیا اثر پیدا ہوا ہے۔ وہ کبھی اپنے پرانے خیالوں خواہشوں اور خوابوں کا غلام بن کر نہیں رہتے بلکہ وہ ہمیشہ اُن کے آقا بن کر رہتے ہیں۔

پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں جب بہت سے برطانوی سیاست دان اس فکر میں تھے کہ ٹرکی کو اس مصیبت سے بچایا جائے جو فوری طور پر اُس کو گھیرنے والی تھی تو مجھے یاد ہے کہ چرچل نے مجھ سے صاف طور پر یہ کہا کہ ٹرکی پر اس حکومت کا قبضہ ہوگا جس کو فتح ہوگی۔ اور یہ بھی کہا کہ ترکی یورپ کا بیمار آدمی ہے جو مرنے کے قریب ہے اور دن بدن گرتا جا رہا ہے اور جس کو بچانے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ میں اور اُس کے بعد سے ونسٹن چرچل سے زیادہ موجودہ ٹرکی کا جوش کے ساتھ تعریف کرنے والا اور سختی سے حمایت کرنے والا دوست اور کون ثابت ہوا ہے؟ وہ رفتہ رفتہ اس پختہ یقین پر پہنچ گئے ہیں کہ موجودہ ترکوں کے کیرکٹر میں جنہوں نے اناطولیہ کے پہاڑی علاقوں میں پرورش پائی تھی کتنی جان اور کتنی سخت قوت پائی جاتی ہے چرچل اس بات کی بھی سچی تعریف کرنے پر اُتر آئے ہیں کہ ترکی نے کس قوت کے ساتھ کمال اتاترک کی قیادت میں اپنی نئی زندگی حاصل کی یہ نئی زندگی ایسی تھی جیسے ققنس کی زندگی (PHOENIX) جو سلطنت عثمانیہ کے خاکستر سے پیدا ہوئی اور جس کی مصیبتیں ٹرکی کے لیڈروں کی اندھی اور احمقانہ پالیسی کا نتیجہ تھیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ چرچل کے نقطۂ نظر میں جو تبدیلی ہوئی وہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ مجھے اُن کا رویہ گول میز کانفرنس کے موقعہ پر یاد ہے۔ ان کا وہ تمام لہجہ جس میں انہوں نے ہم سے خطاب کیا اور اُن کی طے شدہ مخالفت جو ہندوستان کو مرتبہ نوآبادی (DOMNION STATUS) دینے کے متعلق تھی۔ مگر یہی چرچل تھے

جنہوں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس (SIR STAFFORD CRIPPS) کو ایسی ہدایت دے کر بھیجا جس کا نتیجہ آخر میں ہندوستان کی مکمل آزادی ثابت ہوا اور جس سے ہندوستانی جمہوریت وجود میں آ گئی۔ جب ہندوستان کی علیحدگی بالکل مکمل ہو گئی جب برطانوی تاج کا سب سے زیادہ چمکدار ہیرا باقی نہ رہا۔ جب برطانیہ کے آخری سپاہی اور برطانیہ کے آخری حکمران نے ہندوستان کی سرزمین کو چھوڑ دیا تو اُس وقت چرچل نے ہندوستان کی آزادی کے واقعہ کو سچے دل سے اور بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا۔

چرچل نے بہ حیثیت کنزرویٹو پارٹی (CONSERVATIVE PARTY) کے لیڈر کے واقعات کے اُس اہم نتیجہ کو بڑی فراخ دلی سے منظور کر لیا جس سے ہندوستان کی آزادی وجود میں آئی۔ جس سے اُس برِ صغیر کی تقسیم دو نئی خود مختار حکومتوں میں ہو گئی یعنی بھارت اور پاکستان اور جس سے ہندوستانی فوج کے دو حصے ہو گئے۔

جب میں اُن سب سالوں کے طویل زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں جب سے کہ میں سر ونسٹن (S.R WINSTON CHURCHILL) سے واقف ہوں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خدا نے وہ سب سے بڑی نعمت جو چرچل کو عطا فرمائی ہے وہ اُن کی صحت ہے وہ لوہے کا جسم رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنی عمر بھر اس جسم سے انتہائی درجہ پُر سخت کام لیا ہے۔ ڈاکٹر لوگوں کی ہدایات کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو چرچل نے کبھی نہیں مانی۔ وہ برابر کام کرتے رہے ہیں وہ خوب کھیلے ہیں۔ پولو سے لے کر مصوری تک بے شمار تفریحوں میں انہوں نے کمال حاصل کیا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے کھانے کی کوئی اچھی پلیٹ جو اُن کے سامنے رکھی گئی ہو واپس کر دی ہو۔ یا برانڈی کا کوئی گلاس یا سگار واپس کیا ہو۔ زندگی کا یہ لطف اور یہ زور اُن کے شاندار جسمانی قویٰ کی وجہ سے برابر قائم رہا ہے۔ وہ نوجوان رسالدار جو کبھی میرے گھوڑوں کو دیکھنے کے لئے میرے پاس آیا تھا اُس وقت ایسی ہی صحت رکھتا تھا جیسی کہ اب بھی وہ پرانا سیاست دان رکھتا ہے جس کی عزت اور جس کا احترام ساری مہذب دنیا کرتی ہے۔

سنہ ۱۹۰۶ء کے آزمائشی سال میں انگلستان کے اندر جو الیکشن کے متعلق تبدیلی

ہوئی اُس کا اثر ہندوستان پر پڑا۔ اُس گرمی کے موسم میں جب میرا قیام انگلستان میں تھا تو میرے ہندوستانی دوستوں نے مجھے لکھا اور بتایا کہ آخر کار گورنمنٹ کو اس کا احساس شروع ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلم مسئلہ بھی کوئی چیز ضرور ہے اور اس مسئلہ کو گورنمنٹ یہ کہکر نظر انداز نہیں کرسکتی کہ یہ بیکار من گھڑت ہے۔

۱۸۵۷ء سے جب ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے برطانوی تاج کو منتقل کر دی گئی مسلمانوں کے ساتھ سیاسی اعتبار سے انگریزوں نے کم و بیش غفلت کا برتاؤ کیا۔ شاید یہ بات غیر قدرتی نہ تھی کہ ہندوستان کے نئے حکمران اُن لوگوں کی طرف سے بیزار ہو گئے جو اپنی زبان اور مذہب کے اعتبار سے اُن حکمرانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کو ہندوستان سے نکال دیا گیا تھا مسلمانوں کو حکومت یا سیاست میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی تھی۔ بہت کم مسلمان انگریزی زبان کا مطالعہ کرتے تھے یا اس کو پڑھتے تھے۔ اگر مغل بادشاہوں کا انجام افسوسناک رہا تو اس کے نتائج بھی ضرور دو نسلوں تک اس اعتبار سے باقی رہے کہ مسلمان اپنے ہی ملک میں الگ تھلگ اور بے بسی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ہندوؤں کی اکثریت کو اپنے نئے حکمرانوں کی ماتحتی میں زیادہ فائدہ حاصل کرنے کا موقعہ مل گیا اور انہوں نے اس موقعہ کو اچھی طرح استعمال کیا مسلمان عرصہ تک ایسی حالت میں رہے جس کو فرانس کے لوگ (GUANTITENEGLIGEABLE) "کس مپرسی کا عالم" کہتے ہیں۔ مگر آخر کار ہماری سنائی ہونی شروع ہو گئی۔ لارڈ منٹو وائسرائے نے یہ منظور کر لیا کہ وہ ہمارے ایک وفد سے ملاقات کریں اور میں اس وفد کا لیڈر منتخب کیا گیا۔

ہم کو اس بات کا سخت احساس تھا کہ ہمارے ساتھ عرصہ سے غفلت برتی جارہی ہے اور یہ کہ ہندوؤں کی اکثریت جس کی نمائندگی کانگریس پارٹی میں اُس کے لیڈر کر رہے تھے ہم مسلمانوں کو ایسا سمجھتی تھی جیسے کہ ہندوستان کے سیاسی جسم میں ایک تکلیف دہ پھانس لگی ہوئی ہے۔ باوجودیکہ اُس زمانہ میں قومیت کے خوب باتیں ہوا کرتی تھیں مگر پھر بھی اُن خواہشوں کے سلسلہ میں جو لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی تھیں اور اُن اسکیموں کے متعلق جو اُس وقت بنائی جاتی تھیں ہم مسلمانوں کا کبھی کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ہندو لوگ

وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں گھٹیا قسم کے ایسے مسلمانوں کو بھیجتے تھے جو اُن کی ہاں میں ہاں ملائیں بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کے صحیح نمائندے وہاں بھیجیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ حیثیت ایک جماعت کے ہماری جداگانہ شخصیت کو اور اس درجہ کو جو ہم کو اس شخصیت کی بدولت حاصل ہوتا برطانوی حکمرانوں نے بالکل فراموش کر دیا۔۱۔

اُس وقت ہم نے طے کیا کہ اب وہ وقت آ گیا تھا جب کہ ہم اس بات کے لئے کھڑے ہو جائیں کہ اس رویہ میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ اگر سیاسی حقوق پر کوئی بحث کی جائے تو ہم کو بھی اُن کے ملنے نہ ملنے کے متعلق اپنی بات کہنے کا موقعہ ضرور ملنا چاہیئے۔ اُس وقت اصلاحات ملنے کی خبریں اُڑ رہی تھیں۔ مگر اس کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن اصلاحات کی سیاسی فضا اُس سے بالکل مختلف تھی جو اس زمانہ سے چالیس سال بعد پیدا ہوئی اُن اصلاحات کا دائرہ بے انتہا محدود تھا اور وہ بہت تھوڑے معاملات سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہندوستان میں انتظامی اور قانون سازی کے اعتبار سے برطانیہ کی فوقیت بدستور باقی رکھی گئی تھی۔ اس میں کسی قسم کا دخل اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مورلے منٹو اصلاحات (MORLEY MINTO REFORMS) میں جو ان کا نام رکھا گیا تھا اور ۱۹۰۷ئہ کے انڈین کونسلز ایکٹ (INDIAN COUNCILS ACT OF 1907) میں جس کے اندر یہ اصلاحات موجود تھیں اس بات کا کوئی اشارہ تک نہ تھا کہ آخر میں ہندوستان کو خود مختار حکومت کے درجہ تک ترقی کرنے کا کوئی راستہ دیا جائے گا۔ نہ اس بات کا کوئی اشارہ تھا کہ حکومت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے لے کر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں منتقل کر دی جائے گی۔ جان مورلے نے خود یہ جملہ کہا کہ "اونی کوٹ کناڈا کے ملک میں بہت اچھا کام دے سکتا ہے مگر ہندوستان میں یہ کوٹ بالکل بیکار ہے"۔ اس طرح پر وہ سیاسی ترقی اور حکومت کا ردوبدل جس کا تجربہ کناڈا میں کیا گیا اس کو کنایتہً ہندوستان کے لئے بالکل نامنظور کر دیا گیا۔ حالانکہ اس کو ہندوستان نے خود کبھی نامنظور نہیں کیا۔ مورلے منٹو تجاویز میں جو کچھ دینے کا ارادہ کیا تھا اور جو دراصل اُن کے ذریعہ سے ہندوستان کو ملا وہ صرف اتنا تھا کہ فرقہ وارانہ اور مقامی معاملات میں معمولی سا اختیار حاصل

ہو جائے اور یہ کہ ہندوستانیوں کو ایک نہایت محدود پیمانہ پر انگریزوں کے ساتھ مشورہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ مگر ہندوستانیوں کو اپنے معاملات پر خود فیصلہ کرنے کی اجازت بالکل نہیں دی گئی تھی۔

ان حدود کے اندر یہ تجاویز ضرور ترقی کی طرف شمار کی جا سکتی تھیں اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ خاص طور پر قابل قدر تھیں۔ ۱۹۰۲ء کی کراس لینسڈون (CROSS-LANSDOWNE) اصلاحات کے زمانہ سے لے کر آئندہ تک جو ہم کو تجربہ ہو چکا تھا اُس نے ہم کو راستہ بتا دیا تھا۔ ہم یہ سمجھ گئے تھے کہ ہمارے لئے کانگریس پارٹی کے اندر رہ کر یا اُس کے ساتھ کام کر کے کسی منصفانہ برتاؤ کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اب ۱۹۰۶ء میں ہم نے دلیری کے ساتھ وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وہ واقعات کو اُن کے اصلی روپ میں دیکھیں۔ ہم نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک اقلیت رکھنے والی جماعت شمار نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اُن کو ایک قوم شمار کرنا چاہیئے جو دوسری قوم کے اندر موجود ہے اور جس کے حقوق و فرائض قانون کے ذریعہ سے محفوظ کر دینے چاہئیں۔ تاریخ نے ہمیشہ سے یہ خوب ثابت کر دیا ہے اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد سے بار بار آگے چل کر یہی ثابت ہوا ہے کہ اقلیت رکھنے والی جماعتوں کا وجود ہمارے زمانہ کے اہم مسائل میں سے ہے۔ یہ ایسی جماعت ہوتی ہے جس کو اپنی قومیت کا احساس دوسری قوم کے اندر ہوتے ہوئے موجود ہوتا ہے۔ جو دوسری قوم سے کمزور ضرور ہوتی ہے مگر شاید وہ اُس دوسری قوم کی نسبت اس بات کا احساس کچھ کم پختگی کے ساتھ نہیں رکھتی کہ وہ بھی اکثریت رکھنے والی قوم کی طرح خود بھی ایک جداگانہ قوم کا درجہ رکھتی ہے۔ مثلاً آئرلینڈ (IRELAND) پولینڈ (POLAND) زیکوسلوویکیا (CZECHOSLOVAKIA) جوگوسلیویا (JUGOSLAVIA) دنیا کے نقشوں پر ان اقلیت رکھنے والی جماعتوں کے نشانات بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اُن کے معاملات نہایت پیچیدہ اور مشکل ثابت ہوتے ہیں۔

ہم نے اپنے لئے ۱۹۰۶ء میں یہ مطالبہ کیا کہ ایک ایسا اصول قائم کیا جائے جو ان اصلاحات کی تجاویز کا نتیجہ شمار کر کے قانون کی شکل میں پاس کر دیا جائے۔ ہم نے کہا کہ

مسلمانوں کو مقامی اداروں اور قانون ساز مجلسوں میں مناسب اور جداگانہ نمائندگی دی جائے۔ اور یہ نمائندگی ایک علیحدہ فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی دے کر اور الگ فہرست رائے دہندگان تیار کرا کے مستقل اور محفوظ کر دینی چاہیئے۔ ہم نے اس بات کی رعایت دے دی کہ اُن رقبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو مثلاً پنجاب میں اور اُس رقبہ میں جو اُس وقت مشرقی بنگال کا صوبہ تھا۔ ہم ہندوؤں کو کچھ زیادہ سیٹیں (SEATS) دے دیں گے تاکہ اُن کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور اُس کے بدلے میں ہم نے یہ مطالبہ کیا کہ اُن رقبوں میں جہاں ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی ہم کو بھی اسی طرح کچھ زیادہ سیٹیں (SEATS) مل جانی چاہئیں۔

لارڈ منٹو نے ہمدردی کے ساتھ ہمارے مطالبات کے بیان کو غور سے سنا۔ انہوں نے ہم کو یقین دلایا کہ ملک کی حکومت میں جو بھی تبدیلی آئندہ واقع ہو گی اُس میں مسلمان فرقہ کے سیاسی حقوق اور مفاد کا ضرور تحفظ کیا جائے گا۔ ہمارا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ ہمارے مطالبات کا اکثر حصہ بالتفصیل منظور کر لیا گیا۔ گو ہمارے سب مطالبات منظور نہیں کئے گئے میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا اگر اُس وقت یہ شرط رکھ دی جاتی کہ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے دو ہندوستانی ممبر ہوں گے جن میں سے ایک ہندو اور ایک مسلمان ہو گا۔ بجائے اس کے کہ صرف ایک ممبر ہو جیسا کہ آخر کار طے کیا گیا۔ مگر جان مورلے (JOHN MORLEY) نے اس سلسلہ میں جب میں نے اُن کے سامنے یہ سوال اٹھایا تو خود مجھ سے یہ کہا کہ "دیکھو تم کو معلوم ہے کہ تم لوگوں کو بہت زیادہ طاقت ہرگز نہیں ملنی چاہیئے۔"

اس وقت یہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ جان مورلے کے اس جملہ پر تاریخ بہت تیور کے ساتھ ہنسی اڑا کر اپنا فیصلہ دے رہی تھی مگر اُس زمانہ کے لحاظ سے مورلے منٹو اصلاحات کی صورت میں ہم نے دراصل ایک قدم ضرور آگے بڑھا لیا۔ ہم نے ایک بڑا سیاسی اصول مقرر کرا لیا۔ اُس کا عملی استعمال آگے چل کر ہندوستان کی تمام سیاسی ترقیوں کا ایک مستقل پہلو بن گیا۔ یہ اصول بغیر مخالفت کے تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ پچھلی باتوں پر نگاہ ڈال کر ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح جان مورلے کے اُس جملہ میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ایک ہنسی اور

تمسخر کا پہلو موجود ہے۔ اسی طرح اس سے بھی زیادہ ہنسی کے قابل اور جلد بدلنے والا رنگ اُس خاص مسلمان کے نام اور شخصیت میں پایا جاتا ہے جو اُس اصول اور اُس جگہ کا مخالف تھا جو ہم نے اپنے لئے اس وقت حاصل کی تھی۔ لارڈ منٹو کا ہمارے مطالبات کو منظور کر لینا اُن تمام آئندہ سیاسی تجاویز کی بنیاد تھی جو مختلف برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان کے لئے پیش کیں اور اُس کا آخری اور لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم ہوگئی اور پاکستان وجود میں آگیا۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں اُس وقت کون ہمارا سب سے زیادہ سخت مخالف تھا؟ وہ بمبئی کا ایک بیرسٹر تھا جس کی پریکٹس بہت بڑی اور کامیاب تھی۔ یعنی مسٹر محمد علی جناح۔ اُن کی اور میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد بمبئی میں مقیم ہوئے اور جب انہوں نے بلا ذاتی دولت اور رسوخ کے بہت جلد اپنی کامیاب پریکٹس حاصل کر لی۔ ہم دونوں ہمیشہ دوستوں کی طرح رہے مگر اس نازک مسئلہ پر وہ سخت دشمنی کے ساتھ اُن تمام باتوں کے خلاف کھڑے ہوگئے جو میں اور میرے دوست کر رہے تھے یا جن کے کرنے کی ہم کوشش کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں صرف وہی ایک مسلمان ایسے تھے جنہوں نے ہمارے خلاف یہ رویہ اختیار کیا۔ مگر اُن کی مخالفت معمولی اور کھُسر پھُسر قسم کی نہ تھی بلکہ اُن کا یہ کہنا تھا کہ ہمارا جداگانہ نمائندگی کا اصول یہ مطلب رکھتا تھا کہ ایک قوم کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اور یہ قوم کی تقسیم خود اُس قوم کے خلاف ہو جائے گی۔ تقریباً ایک چوتھائی صدی تک یہ شخص ہمارا سب سے زیادہ نہ بدلنے والا مخالف اور نکتہ چین رہا۔

آئندہ آنے والے باب میں اُن حالات کا میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا اور سب سے زیادہ میں کانگریس کی ہندو اکثریت کی اُس سخت حماقت اور زیادتی کا حال بتاؤں گا جس نے اس شخص کو جو ہندوستان کے اتفاق و اتحاد کا سب سے زبردست حامی تھا بدل کر اپنا سب سے بڑا مخالف بنا لیا۔ اور میں تفصیل کے ساتھ مقدر کے اُن راستوں کا پتہ دوں گا جن کی وجہ سے اس شخص کو جسے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا مسلمہ لیڈر ہونے کی حیثیت سے وہ فتح حاصل ہوئی۔ یعنی جداگانہ اور خود مختار حکومت پاکستان کا پیدا ہونا۔ جس کے لئے ہم

شروع میں در پردہ اور بلا وضاحت کے ساتھ کوشش کر رہے تھے اور جس کے لئے اُس شخص نے آخر میں براہ راست اور کھلم کھلا اور اپنی دل و دماغ کی پوری قوت کے ساتھ کوشش کی۔ فی الحال میں صرف قدرت کے اس عجیب اور پُر مذاق کرشمہ پر روشنی ڈالتا ہوں جو اس تمام کارروائی میں پوشیدہ نظر آتا ہے۔

جو کامیابی ہم کو ۱۹۰۶ء میں ہوئی وہ کافی اہم معلوم ہوتی تھی۔ اور یہ بات ہم میں سے ان لوگوں کو بالکل صاف نظر آتی تھی جو اس کامیابی حاصل کرنے میں برابر لگے رہے کہ چونکہ ہم نے اپنا جداگانہ ایلیکشن کا حق حاصل کر لیا ہے اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ہی ادارہ ہو جس کے ذریعے سے ہم اُس جداگانہ نمائندگی کو کامیاب بنا سکیں۔ اسی وجہ سے آئندہ سال ڈھاکہ میں ایک میٹنگ کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اتفاقاً میں اُس میٹنگ میں شریک نہ ہو سکا مگر بہر حال میں اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور میں ۱۹۱۲ء تک برابر اس کا صدر رہا۔

یہ تمام واقعات یعنی وائسرائے کے سامنے اپنا وفد لے جانا۔ وائسرائے کا ہمارے مطالبات کو منظور کر لینا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی آخر میں بنیاد ڈالنا میرے لئے ایک مسلسل سیاسی کوشش کے زمانہ کا اختتام ثابت ہوئے۔ جو بار میں نے اس سلسلہ میں اٹھایا اس کا اثر مجھ پر جسمانی اعتبار سے ظاہر ہوا اور جب ہم وائسرائے سے ملنے کے لئے شملہ گئے تو مجھ پر غشی کا دورہ پڑ گیا۔ مجھ کو جسمانی آرام کی ضرورت تھی اور میں نے ارادہ کیا کہ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے تجربہ اور علم میں بھی اضافہ کروں۔ اس لئے میں اپنے ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ جن کا نام رینے ٹالومن (MONSIEUR RENE TALOMON) تھا۔ دنیا کا سفر کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ بعد میں امریکہ کے اندر فرانسیسی زبان کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ اور اُن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ ہم مشرق کی طرف روانہ ہوئے پہلے ہم ملایا اور سنگاپور گئے اور پھر وہاں سے چین پہنچ گئے۔

چین کی حالت اُس زمانہ میں افسوسناک تھی۔ پیکنگ (PEKING) میں بیوہ ملکہ موسم گرما کے محل کی وسیع چہار دیواری میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہی تھی اور اُس محل کے

باہر اُس کی وسیع سلطنت میں تباہی اور گڑبڑ پھیلی ہوئی تھی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ سمندر کے کنارے پر جو شہر واقع تھے ان میں اور جو اُن بڑے دریاؤں کے آس پاس واقع تھے جو چین کے لئے ایسے تھے جیسے زندہ خون کی رگیں۔ اُن شہروں میں باہر والی یورپ کی تجارتی جماعتوں نے بندرگاہوں کا ایسا سلسلہ وار اور طویل نظام قائم رکھا تھا جس میں اُن کو حکومت کی طرف سے مالکانہ اور قابضانہ رعایتیں حاصل تھیں جو دو سلطنتوں میں صلح ہونے پر باہر کے آدمیوں کو دی جاتی ہیں۔ یہاں پر ملک کے اس حصہ میں جو کسی طرح اُن یورپین قوموں کی کالونی شمار نہیں کیا جاسکتا تھا جو وہاں موجود تھیں۔ یہ بات بڑی عجیب اور تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی کہ وہاں پر نہایت مغرور رگہری قسم کی ملک پرستی پھیلی ہوئی تھی شنگھائی (SHANGHAI) ہنکو (HANKOW) اور اسی قسم کے شہروں میں جو زمینیں باہر والوں کو رعایتاً دی گئی تھیں وہ سیاسی اور مالی اعتبار سے بڑی طاقت کا مرکز بن گئی تھیں۔ اُن مختلف مقامات پر اور اُن مختلف آبادیوں میں دراصل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باہر والوں کی حکومت اپنے ملک کے باہر قائم کی گئی ہے۔ اُن باہر والوں کا اختیار اور اثر زیادہ تھا اور چین کی منچو (MANCHU) گورنمنٹ کا زور اتنا کم ہوگیا کہ اُس زمانہ میں چین کے اصلی حکمران یورپین حکومتوں کے سفیر تھے (CONSUL) جن میں سب کا سردار برطانیہ کا کونسل جنرل تھا (CONSULGENERAL) جو شنگھائی میں رہتا تھا۔ اُس بدنظمی کی وجہ سے جو اُس وقت چین کی حکومت میں پھیلی ہوئی تھی۔ چین کے مالدار آدمی اپنا روپیہ اور اپنا مال و متاع حفاظت سے رکھنے کے لئے ان آبادیوں میں لے جاتے تھے جو باہر والوں کے قبضہ میں تھیں۔ جس طرح آجکل بہت سے یورپین اپنے کیپٹل (CAPITAL) کو امریکہ اور کنیڈا بھیج دیتے ہیں ملک پرستی کی فضا بہت تکلیف دہ تھی اور ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ اُس پی اینڈ او جہاز (P.&O.SHIP) میں جس میں میں نے ہانگ کانگ سے شنگھائی تک سفر کیا۔ میرے ساتھی مسافروں میں صوبہ یونان (YUNNAN) کا وائسرائے بھی تھا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اس قسم کا عہدہ دار اپنے ملک میں کچھ نہ کچھ اثر ضرور رکھتا ہوگا۔ مگر جب ہم شنگھائی پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر دراصل تعجب ہوا اور بہت زیادہ صدمہ پہنچا کہ

حکومت چین کے بحری کسٹم کے اہلکاروں نے اُس بڑے عہدہ دار کے ساتھ کس طرح برتاؤ کیا۔ یہ سب اہلکار بہرحال حکومت چین کے ملازم تھے اور اپنے ملک کے وائسرائے کے ساتھ اُن کا برتاؤ اس رویہ کے مقابلہ میں جو وہ برطانوی مسافروں کے ساتھ۔ میرے ساتھ اور میرے ملازموں کے ساتھ ظاہر کرتے تھے کیسا عجیب اور تکلیف دہ تھا۔ ہمارے لیے ہر قسم کا لحاظ اور اخلاق ظاہر کیا جاتا تھا۔ مگر اس چینی وائسرائے کے ساتھ چینی اہلکاروں نے بہت بیہودگی اور بدتمیزی کا برتاؤ کیا۔ اُس کا سارا سامان کھول ڈالا کسٹم کے اہلکاروں نے جلدی جلدی اُس کے چغے اور اُس کے سرکاری تمغوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ برتاؤ کا یہ فرق دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں اور مجھ کو اس واقعہ سے ایسی نفرت ہوئی کہ میں اُس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

باہر والی حکومتوں کی جو آبادیاں چین میں موجود تھیں اُن کے اندر چینی لوگوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جاتا تھا وہ وحشیانہ ظلم کی حد سے کچھ ہی کم ہوگا۔ وہاں کے تمام بہتر ہوٹلوں میں چینی لوگوں کو جانے کی اجازت نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ وہاں جا کر ان خاص بازو کے گوشوں میں بیٹھ جائیں جو اُن کے واسطے علیحدہ کر دئے گئے تھے۔ یہی حال وہاں کے ریسٹارنٹوں کا تھا۔ یورپین کلبوں سے چینی لوگ بالکل خارج کر دئے گئے تھے۔ دوکانوں پر بھی یہ حال تھا کہ چینی گاہک کو کھڑا رہنا پڑتا تھا اور اُس وقت تک انتظار کرنا پڑتا تھا جب تک دوکان دار اس یورپین یا امریکی گاہک سے فارغ نہ ہو جائے جو اُس چینی کے بعد میں آیا تھا اور جس نے سودا طلب کیا تھا۔ آجکل ہم جنوبی افریقہ میں رنگ کے امتیاز کا (COLOUR BAR) بڑا شور سنتے ہیں۔ مگر چین میں اس صدی کے شروع سالوں میں یہ رنگ کا امتیاز بہت سختی کے ساتھ قائم کیا جاتا تھا۔ یہ فرق اُس حکومت کے عہدہ داروں کے خلاف بھی کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا۔ جس کے مہمان بین الاقوامی قانون کے مطابق وہ تمام باہر والے آدمی شمار کئے جاتے تھے جو اس حکومت کے ملک میں رہتے تھے۔ اس فرق کو دیکھ کر کیا تعجب کی بات ہے اگر چین کے تعلیم یافتہ طبقہ نے اس طرز عمل کی تلخی کو عرصہ تک یاد رکھا؟۔

چین کا پرانا سرکاری طبقہ قدرتی طور پر چین سے باہر سفر نہیں کرتا تھا اور اُس کو

چین سے باہر والی دنیا کا بہت کم علم تھا۔ مگر ۱۹۰۶ء میں بھی کچھ چینی طالب علم ایسے فرد تھے جو امریکہ کی یونیورسٹیوں کو جایا کرتے تھے اور وہاں سے تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن کو واپس آتے تھے۔ ان طالب علموں کے جذبات کو جو تکلیف پہنچتی تھی وہ غالباً اس ٹھنڈی اور خاموش نفرت سے زیادہ تیز اور زیادہ گہری ہوتی تھی جو چین کا سرکاری طبقہ ایک قدرتی ردِ عمل کی صورت میں ان باہر والوں کے خلاف ظاہر کرتا تھا۔

شنگھائی میں چند مال دار چینی سوداگروں نے جن کے نام سنگاپور کے ایک چینی دوست نے ہم کو تعارفی خطوط دے دئے تھے۔ مجھے اور ٹالومن (TALOMON) کو ایک ڈنر پر مدعو کیا جو چینی طرز کا تھا۔

اس ڈنر میں ہمارے سامنے مرغی کے چوزہ کی عام پلیٹیں بھی رکھی گئیں اور ایک ایسی چیز بھی تھی۔ جس کو وہ لوگ بھنا ہوا گوشت (TARTAR GRILLED MEAT) کہتے تھے۔ یہ دراصل کباب کے قسم کی چیز تھی جو اُس کباب کی مانند تھی جو ایران۔ ترکی۔ مصر، تمام مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اور کاکیشیا (CAUCASUS) میں بھی کھایا جاتا ہے۔ جب ہم نے کہا کہ یہ کھانا دنیا کے بہت بڑے حصہ میں ایک مشہور کھانا شمار کیا جاتا ہے اور خاص کر اُس حصہ میں جس سے میرا تعلق تھا تو ہمارے میزبان نے کہا "بے شک۔ یہ ٹھیک ہے۔ یہ کھانا ہمارے لئے چین کے ایک مسلمان باورچی نے تیار کیا ہے۔" اس کے بعد چین کی خاص مشہور کھانے آتے رہے۔ مثلاً بانس کے چھلکے (BAMBOO SHOOTS) اور دبے ہوئے انڈے (BURIED EGGS) پھر ہمارے سامنے ایک ایسا کھانا آیا جس کو ہم نے پہلی مرتبہ خیال کیا کہ وہ ایل (EEL) مچھلی ہے۔ اس پر ٹالومن (TALOMON) نے کہا۔ "او ہو۔ بڑی عمدہ بات ہے۔ ہم تو اس کھانے سے خوب واقف ہیں۔"

ہمارے میزبان یہ سنکر ہنس پڑے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے ٹالومن کی معمولی غلطی کو معلوم کر کے اس کی تردید جوش اخلاقی کے ساتھ کی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ:۔

"نہیں نہیں۔ یہ تو سانپ ہے۔"

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور ہمارے لئے یہ حد گذر چکی تھی۔ اپنے رومالوں سے منہ

ڈھک کر اور اس طرح پر بڑی احتیاط کے ساتھ کہ کوئی شخص ہم کو دیکھ نہ لے۔ ہم اس سانپ کی پلیٹ سے نجات پا گئے۔ اس واقعہ کے سالوں بعد مجھے یاد ہے کہ میں نے کسی اخبار میں یہ واقعہ پڑھا کہ چین کے کسی سرکاری ڈنر میں چند باہر والے مہمانوں پر اس قسم کے کھانے کا کیا اثر پڑا تھا۔ وہ سب لوگ بیمار پڑ گئے تھے۔ اور ان میں سے بعض آدمی مر گئے تھے۔

مدنیات (SOCIOLOGY) کے طالب علموں کو اس سے دلچسپی ہوگی کہ اُس زمانہ میں شنگھائی اور ہانگ کانگ کے مقامات پر ایسی چیزیں موجود تھیں جن کو مہمان خانے (WELCOMEHOUSES) کہتے تھے۔ اور جن کو امریکی عورتوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے قائم کر رکھا تھا۔ ان اداروں کے متعلق کسی قسم کی بداخلاقی یا بدتمیزی کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا تھا مگر ان اداروں کو ایک قسم کی تکلیف دہ نفاست کی فضا گھیرے ہوئے تھی پہلی مرتبہ کوئی نیا آدمی جو اُن میں سے کسی مہمان خانہ میں داخل ہوتا تھا یہی خیال کرتا تھا کہ وہ کسی خوشگوار مگر سخت ضابطہ رکھنے والی سوشل جماعت میں داخل ہوا ہے چونکہ وہاں صرف ایسے یورپین اور امریکی لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت تھی جو بے عیب سوشل پوزیشن رکھتے تھے اور کسی چینی آدمی کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ جو عورتیں وہاں کا انتظام کرتی تھیں اُن کی بہت کافی عزت کی جاتی تھی۔ ان میں سے اکثر عورتیں مال دار تھیں اور اُن میں سے بعض عورتیں حقیقت میں شنگھائی میں دوڑ کے گھوڑوں کی مالک تھیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عورتیں زیادہ تر یونان کی طوائف کے مشابہ تھیں (GREEKHETAERER) نہ کہ اُس فیشن ایبل لیڈی کی طرح تھیں جو اُس زمانہ میں یورپ کی بازاری عورتوں میں پائی جاتی تھیں۔ اُن میں سے اکثر عورتیں اسکینڈنیویا کی (SCANDINAVIAN ORIGIN) نسل کی تھیں اور میرا خیال ہے کہ وہ منے سوٹا (MINNESOTA) کے مقام کے آس پاس سے آئی تھیں جہاں پر اسکینڈنیویا کے بہت کافی آدمی آباد ہیں۔ اُن کے متعلق مشرق بعید میں یہ عام خیال تھا کہ یہ عورتیں وہاں پر ایک خاص مقصد کے لئے آئی تھیں اور وہ یہ تھا کہ وہاں رہ کر اپنے جہیز کا ایسا سامان جمع کریں جو اُن کے گھر والے اُن کو دینے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور چند سالوں میں وہاں سے کافی دولت جمع کرنے کے بعد وہ اپنے وطن واپس چلی جاتی تھیں تاکہ وہاں پہنچ کر

اُن کی شادی اچھی جگہ ہو جائے اور وہ ایک بے عیب اور معزز گھریلو زندگی بسر کریں۔

میں اور ٹیلومن (TALOMON) وہاں سے جاپان پہنچے۔ چونکہ دنیا کی تصویر اُس زمانہ سے لے کر اب تک ایسی بدل چکی ہے کہ پھر ویسی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ ضروری ہو گا کہ ۱۹۰۶ء میں جاپان کی جو حالت تھی اس کے متعلق دو نہایت اہم واقعات بیان کر دیئے جائیں۔ اُن میں سے ایک واقعہ ہے کہ ایک صلحنامہ کے بموجب جس پر اُس صدی کے شروع میں دستخط ہو چکے تھے جاپان اور برطانیہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے دوست تھے اور دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جاپان کو روس اور جاپان کی جنگ میں (RUSSO-JAPANESE WAR) اسی وقت فتح حاصل ہو چکی تھی۔ جدید دور میں یہ پہلا موقعہ تھا جس پر کسی ایشیائی حکومت نے ایک بڑی یورپین حکومت پر حملہ کیا ہو اور اس کو اچھی طرح ایسی لڑائی میں شکست دی ہو جو جدید طریقوں پر اور جدید ہتھیاروں اور سامان کے ساتھ لڑی گئی ہو۔ وزیر خارجہ کاؤنٹ ہیاشی (COUNTHAYASHI) نے جو لندن میں اس وقت سفیر تھے۔ جب انگریزوں اور جاپانیوں کے درمیان صلح نامہ پر دستخط ہوئے تھے میرے اعزاز میں ایک بڑی لنچ کی دعوت دی۔ کھانے کے دوران میں میری اور اُن کی گفتگو اس انگریزی جاپانی صلح نامہ پر ہوئی اور کاؤنٹ ہیاشی (COUNTHAYASHI) نے مجھے یقین دلایا کہ جاپان کے با اثر فوجی حلقوں میں اس بات کی مخالفت کی گئی تھی کہ جاپان اور برطانیہ کے درمیان دوستی ہو جائے بلکہ انہوں نے اس کے ساتھ دوستی کرنے کی حمایت کی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ دراصل برطانیہ اور روس دونوں کے ساتھ جاپان کی بات چیت ہوئی تھی مگر روس کی تجویز صرف اس وجہ سے ناکامیاب رہی کہ جاپان نے جو شرائط پیش کی تھیں اُنکی منظوری کی اطلاع روس نے اُس وقت دی جب کہ جاپان اور برطانیہ کے صلح نامہ پر دستخط ہو چکے تھے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اور کچھ خوف پیدا کرنے والی بھی ہو گی اگر ہم اس کا اندازہ لگائیں کہ ہماری اس صدی کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی اگر زار کی حکومت TSAR'S GOVERNMENT کچھ زیادہ جلدی کے ساتھ کام کرتی۔ اُس صورت میں زار کی حکومت کو کمزور کرنے کے لئے کوئی جنگ نہ ہوتی جس سے زار کی حکومت درحقیقت ایسی کمزور ہو گئی جس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اور کیا یہ ممکن نہ تھا کہ لینن (LENIN) عمر بھر مستقل جلا وطنی کی حالت میں ایک ایسے گمنام آدمی کی

زندگی بسر کرتا جو شورش پیدا کرنے والا تھا؟

جاپان کے لیڈروں میں سے جن سے میری ملاقات ہوئی فیلڈ مارشل اویاما (FIELD MARSHALOYAMA) بھی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مجھ پر اُن کی شخصیت کی اُن خصوصیات کا کتنا اثر ہوا تھا کہ وہ اپنی روش میں بالکل سادہ اور بے تکلف تھے۔ اُن میں خود پرستی بالکل نہ تھی اور وہ اپنی طاقت و اختیارات کا بالکل اظہار نہ کرتے تھے مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اُن کا طرزِ عمل اس سے کتنا مختلف تھا جو کوئی یورپین یا امریکی فوجی لیڈر اسی رتبہ پر پہنچ کر اختیار کرتا۔ حالانکہ یہ فیلڈ مارشل اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے ملک کو روس کے خلاف جنگ میں فتح اور کامیابی دلائی تھی۔ میرے دوستوں نے مجھے بتایا کہ ایڈمائرل ٹوگو (ADMIRALTOGO) کا طرزِ عمل بھی اُن فیلڈ مارشل کے طرزِ عمل کے مانند تھا اور یہ وہی ایڈمائرل تھے جو ٹسوشیما (TSUSHIMA) کی بڑی بحری جنگ میں کامیاب کمانڈر رہ چکے تھے۔

خوش قسمتی سے مجھ کو جاپان کے بوڑھے شہنشاہ یعنی جاپانی انقلاب کے مکاڈو اعظم (GREATMIKADO) سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ یہ وہ شہنشاہ تھے جن کے دورِ حکومت میں جاپان نے ایک دم ایسی ترقی کی تھی کہ وہ قرونِ وسطیٰ کی زندگی چھوڑ کر جدید زمانہ کی اتنی بڑی صنعتی اور فوجی طاقت رکھنے والا بن گیا۔ جس نے مغرب کو خود مغرب کے طریقوں پر مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ جاپانی انقلاب سے پہلے بچپن کے زمانہ میں یہ شہنشاہ مکاڈو کیوٹو (KYOTO) کے مقام پر اس زمانہ کے جاپانی کمانڈر انچیف اور خود مختار حکمران (SHOGUN) کے حکم سے بالکل افلاس اور گمنامی کی حالت میں قید کر دیے گئے تھے۔ اور وہاں پر اُن کو روزانہ صرف تھوڑے سے چاول خوراک میں دیے جاتے تھے۔ جو اُن کے سامنے وہ چند آدمی رکھ دیتے تھے جو برائے نام ان کے ملازموں میں شمار کیے جاتے تھے مگر مکاڈو نے اس غاصبانہ ظلم کو بالکل ختم کر دیا اور اس کے نتیجے بڑے اہم اور شاندار نکلے۔ مجھے جس بات پر تعجب ہوا وہ یہ تھی کہ میکاڈو بلند قد طاقتور اور مضبوط آدمی ضرور تھے اور وہ جہاں پر بھی ہوتے اُن کا شمار بڑے آدمیوں میں کیا جاتا۔ مگر ٹوکیو (TOKYO) میں اُن کے قد و قامت کو بے انتہا

زیادہ اہم شمار کیا جاتا تھا۔ اُن سے میری ملاقات کا معاملہ ایک بڑی شور والی بات ثابت ہوئی۔ وہ مجھ سے اپنی پوری طاقتور آواز کے ساتھ باتیں کرتے تھے اور بہت چلا کر مجھ سے سوالات کرتے تھے۔ پھر اسی طرح چلا کر جوابات دیتے تھے جن سے اُن کی رائے اور خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ جب وہ چلاتے نہ تھے تو وہ بڑی زور سے چیخیں مارتے تھے۔ جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی گولا پھٹ رہا ہے۔ اُس سرکاری ملازم نے جو ترجمان کا کام کر رہا تھا مجھے بعد میں بتایا کہ ان چیخوں سے یہ مطلب ہے کہ شہنشاہ سلامت نے آپ کے اُن جوابات کو پسند فرمایا جو آپ نے سوالات پر دیئے۔

ہم نے بحرالکاہل پر (PACIFIC) ایک جاپانی کشتی میں سفر کیا اور ہونو لولو (HONOLULU) کے جزیرہ میں پہنچ گئے۔ جن لوگوں نے ہونو لولو کو اس زمانہ میں دیکھا ہے اُن کو اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اُس وقت وہ کیسا تھا۔ کتنا خوب صورت تھا اور اُس کی خاموش ہوا میں کیسی خوشی اور مکمل سکون پایا جاتا تھا۔ اُس زمانہ میں وہ سمندر پار لے جانے والے چھوٹے جہاز نہ تھے جو راتوں رات چل کر امریکہ سے اُن آدمیوں کو لے آئیں جو صرف تعطیل منانے کے لئے اس جزیرہ میں آنا چاہیں۔ وہاں پر سنیما بھی شروع نہیں ہوئے تھے اور اُن کا وہاں کوئی زور نہ تھا۔ وہاں کی فضا اور وہاں کی عجیب کہانی بالکل اصلی اور اچھوتی تھی وہ مصنوعی طریقہ پر بنائی ہوئی اور تیار کی ہوئی نہ تھی۔ وہاں پر باہر سے آنے والوں کی کوئی صنعتی تجارت نہ تھی۔ نہ وہاں پر کوئی بڑا بحری اور ہوائی اڈہ موجود تھا۔

اس جزیرہ کی تمام نوجوان عورتیں اپنے گلوں میں ہار ڈال کر چلتی پھرتی تھیں اور جب کبھی ہم میں سے کسی آدمی کا اُن عورتوں سے تعارف کرایا جاتا تو وہ اپنے ہار اُتار کر ہمارے گلوں میں ڈال دیتی تھیں۔ اُن کی مسکراہٹ کیسی حسین اور کیسی خوشی سے بھری ہوئی تھی۔ اُن کے ہاتھوں کی حرکت کیسی دلفریب اور نزاکت بھری تھی اور اُن کے ہاتھوں کا چھونا کیسا نرم اور دل خوش کن معلوم ہوتا تھا۔ میں اور ٹالومن (TALOMON) دونوں اُسوقت نوجوان تھے اور بہت اثر لینے والے آدمی تھے۔ اس لئے ہم دونوں اس بااخلاق رواج سے بہت خوش ہوئے اور ہم نے اس کا خوب لطف اٹھایا۔ (GRATIFIED)

پھر ہم وہاں سے امریکہ پہنچ گئے اور روس میں بین الاقوامی تاریخی لائن کو پار کر گئے جس کے مشرق اور مغرب کے مقامات پر تاریخوں میں فرق شمار کیا جاتا ہے۔ (INTERNATIONAL DATELINE) وہاں سے ایک پوراون راستہ میں گذار کر ہم دسمبر ۱۹۰۶ء میں سان فرانسسکو (SANFRANCISCO) پہنچ گئے۔ جو زلزلہ کی مصیبت سے حال ہی میں نجات پا چکا تھا۔ وہ سارا شہر ایک وسیع تباہی اور بربادی کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ فرانس اور جرمنی کی لڑائیوں میں جو مالی بربادی ہو چکی ہے اس کا ذکر لوگوں میں بہت کیا جاتا ہے اور میں نے خود دنیا کی دو عالمگیر جنگوں کے ختم ہونے پر بہت سے شہروں اور قصبوں کو دیکھا ہے جو بالکل ویران ہو گئے۔ مگر جو حال میں نے ۱۹۰۶ء میں سان فرانسسکو کا (SANFRANCISCO) دیکھا وہ اُس سب سے بدتر اور بہت زیادہ خراب تھا جو میں اب تک دیکھ چکا ہوں۔ وہاں پر کوئی دوکان مشکل سے کھلی ہوئی نظر آتی تھی۔ مگر اتفاق سے ہم ایک دوا والے کی دوکان پر پہنچ گئے۔ وہاں ہم کو عجیب تجربہ ہوا۔ وہ یہ کہ اس تباہی کے باوجود اس نے ہم کو آئس کریم اور ٹھنڈائی کے شربت پیش کئے۔ اور یہ چیزیں ایسی جگہ پر ہم کو ملیں جو دنیا میں دوسرے مقامات پر کسی دوا فروش کی دوکان کہلائی جا سکتی تھی۔ وہاں پر ایک یا دو ہوٹل اور ریسٹورنٹ بھی کھلے ہوئے ملے مگر عام طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں پر اس خوفناک اور قابل افسوس تباہی کے بعد زندگی اور کام دوبارہ پھر شروع ہونے والا تھا۔

کیلفورنیا (CALIFORNIA) سے ہم نے امریکہ کے براعظم کو ریل گاڑی سے پار کیا ہم جگہ جگہ پر ٹھیرتے گئے اور ایک یا دو دن مختلف شہروں میں جو ہمارے راستہ میں پڑے قیام کرتے گئے۔ شکاگو (CHICAGO) میں ہم کو وہاں کے مویشی گھروں اور کمیلوں (SLAUGHTERHOUSE) کا دورہ کرایا گیا۔ اس سے کچھ دن پہلے ان کمیلوں کے متعلق اپٹن سنکلیر (UPTON SINCLAIR) نے ایک پروپیگنڈا کرنے والا ناول شائع کر دیا تھا اور اس نے ملک میں بڑی سنسنی پیدا کر دی تھی۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کمیلوں میں جو حالت مجھے دکھائی گئی وہ ان سخت خوفناک حالات سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھی جو

اُس ناول میں بیان کئے گئے تھے۔

مجھے یہ بتا دینا چاہیئے کہ امریکہ کے متعلق جو کچھ اس زمانہ میں میرا علم تھا وہ ناولوں کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں نے لارڈ برائس (LORD BRYCE) کی مشہور کتاب امریکہ کے دستورِ حکومت پر پڑھی تھی۔ میں مختلف مصنفوں کی کتابیں دیکھ چکا تھا مثلاً والٹ وہائٹ مین (WALT WHITMAN) ہاتھورن (HAWTHORNE) تھورو (THOREAN) ہنری (HENRY) ولیم جیمس (WILLIAM JAMES) اور مارک ٹواین (MARK TWAIN) (جن سے جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں میں بمبئی میں مل چکا تھا) یورپ میں میرے بہت سے امریکی دوست اور جاننے والے تھے۔ امریکہ جانے والے سب آدمیوں کی طرح میرا خیال ہے کہ میں امریکہ کے متعلق پہلے سے کچھ خیالات اپنے دل میں رکھتا تھا۔ مگر اُن خیالات کی بنیاد اس حقیقی علم پر تھی گو وہ علم کتابی معلومات کے ذریعہ سے حاصل ہوا تھا جو امریکہ کی تمدنی۔ اقتصادی اور سیاسی زندگی کی ساخت کے متعلق تھا۔

۱۹۰۷ء کے نوروز کے بعد ہی ہم فوراً نیویارک (NEW YORK) پہنچ گئے۔ وہ زمانہ اس شہر کے انتہائی سردی کے موسم کا تھا۔ میں اور ٹالومن (TALOMEN) دونوں سینٹ ریجس میں (ST. REGIS) مقیم ہوئے۔ اُس وقت سے پچاس سال بعد میرے چھوٹے بیٹے صدرالدین کی یہ عادت رہی کہ جب تک وہ نیویارک میں رہا وہیں پر بہ حیثیت ہرورڈ انڈر گریجویٹ (HARVARD UNDER GRADUATE) کے قیام کرے۔

میرے دوستوں نے جو کچھ مجھے بتایا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیویارک میں جو سوشل زندگی اس زمانہ میں تھی اُس کا کوئی مقابلہ اُس شہر کی موجودہ تیز و تند زندگی سے نہیں کیا جا سکتا۔ میرے پاس بہت سے تعارفی خطوط تھے جن میں سے اکثر میرے امریکی دوستوں نے دئے تھے جو یورپ میں تھے اس وجہ سے امریکہ میں فوراً اور بہت فیاضی کے ساتھ میری تواضع کی گئی۔ امریکہ والے دنیا میں سب سے زیادہ مہمان نواز آدمیوں میں سے ہیں۔ وہ باہر والوں سے اتنی زیادہ مہربانی کے ساتھ ملتے ہیں اور اُن کا استقبال

ایسا کھلا ہوا اور ایسے سچے دل کے ساتھ ہوتا ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ امریکہ ہو آتا ہے وہ کبھی اس وقت کو نہیں بھولتا ہے۔ جب وہ امریکہ میں تھا لنچ اور ڈنر پر روزانہ میری دعوت ہوا کرتی تھی اور ہر رات کو میں اوپرا (OPERA) دیکھنے کے لئے کسی نہ کسی کا مہمان ہوتا تھا۔ اس زمانہ کا میٹرو پولٹن اوپرا ہاؤس (METROPOLITAN.OPERAHOUSE) یعنی وہاں کا بڑا تھیٹر گھر جواہرات اور سجاوٹ کی بہترین نمائش بنا ہوا تھا۔ میں نے پیرس اور لندن کے تھیٹر گھر (OPERAS) بھی دیکھے تھے۔ مگر نفاست کے اعتبار سے اور اس لحاظ سے کہ وہاں جانے والے کتنے مال دار تھے نیویارک کے میٹرو پولٹن کی جو حالت اس صدی کے شروع سالوں میں تھی اس کا مقابلہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

نیویارک کے ان با اثر آدمیوں میں سے جن سے میرا تعارف ہوا وہاں کے سرکاری وکیل تھے (DISTRICTATTORNEY) جن کا نام مسٹر جیروم (MR. JEROME) تھا۔ اور وہ لیڈی رینڈولف چرچل (LADYRANDOLPHCHORCHILL) کے رشتہ کے بھائی تھے۔ انہوں نے مہربانی کر کے میرے لئے ایک خاص پاس کا انتظام کر دیا جس کی وجہ سے میں اُس زمانہ کے ایک نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز سرکاری مقدمہ کی سماعت میں شریک ہو سکا۔ یہ سنسنی پیدا کرنے والا مشہور مقدمہ "ہیری کے تھا" (HARRYK.THAW) ملزم کے متعلق تھا جس پر اسٹینفورڈ وہائٹ کے (STANFORD WHITE) قتل کا چارج لگایا گیا تھا۔ یہ اسٹینفورڈ وہی شخص تھا جس نے امریکہ کی نہایت بلند عمارتوں کی تعمیر کی تھی اور اُن کا خاکہ تیار کیا تھا۔

مجھے اس سنسنی پیدا کرنے والے اور پر لطف واقعہ سے خاص طور پر دلچسپی تھی چونکہ دو سال پیشتر پیرس میں میری ملاقات 'تھا' (THAW) اور اُن کی موجودہ بیوی جو پہلے (EVELYNNESBIT) ایولین نسبت کہلاتی تھی دونوں سے ہو چکی تھی۔ 'تھا' (THAW) جس نے ریل کی سڑکوں کے ذریعہ سے دولت پیدا کی تھی۔ اُس ملک کی بین الاقوامی سوسائٹی میں خاص درجہ رکھتا تھا۔ مگر اس کا مزاج بالکل بے قابو تھا اور وہ نہایت حسد رکھنے والا اور خودی میں ڈوبا ہوا آدمی تھا۔ میری ملاقات ایک مرتبہ ان دونوں سے

ڈنر پر ہو چکی تھی اور اس کے بعد اُس دن شام کے وقت میں نے اُس نوجوان عورت سے جو بے انتہا خوب صورت اور دلکش تھی بہت خوشی سے اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کیں۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھا' (THAW) کچھ خوفناکی کے ساتھ کسی خیال میں محو ہیں اور میرے ایک دوست نے جو اس وقت ہماری پارٹی میں تھا مجھے متنبہ کیا کہ تھا' (THAW) کے اندر کوئی خطرناک رنگ موجود تھا۔

مقدمہ کی سماعت کے بعد تھا' (THAW) مجرم قرار دیا گیا مگر پاگل مجرم اور اس طرح پر وہ پھانسی سے بچ گیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ میرے دوست نے جو تنبیہ مجھے دی تھی وہ کیسی صحیح بنیاد پر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب یہ دونوں امریکہ واپس آئے تو مسز تھا (MRS.THAW) نے اپنے شوہر کے سامنے اس بات کا اقبال کیا کہ اس کی شادی سے پہلے ایک دن اسٹینفورڈ وہائٹ (STANFORD WHITE) اس کو اپنے کمرہ میں لے گیا اور اس کو دوا ملی ہوئی CHAMPAGNE شیمپین شراب پلا دی اور اس کے بعد اس کی آبرو خراب کی۔ اس اقبالی بیان سے تھا' (THAW) کے اندر مجنونانہ حسد پیدا ہوگیا اور یہ حسد اس وجہ سے اور زیادہ غضبناک ہو گیا کہ تھا' (THAW) کو بلا وجہ یہ شبہ ہو گیا کہ وہائٹ (WHITE) اب بھی اس کی بیوی کے پیچھے پڑا ہوا ہے میڈیسن اسکوار آف گارڈین (MADISONSQUAREROOFGARDEN) کے ناچ گھر میں وہائٹ (WHITE) اپنی ایک نئی محبوبہ کے ساتھ رقص و سرود میں مصروف تھا اُس وقت "ہیری تھا" (HARRY THAW) فرش پر آ پہنچا اور وہاں سے چھ گولیاں وہائٹ (WHITE) کے جسم کے اندر مار دیں۔

اس مقدمہ کے متعلق بہت بہت خوفناک اور وحشت زدہ دلچسپی پھیلی ہوئی تھی۔ برطانوی عدالتوں میں جن طریقوں پر کام ہوتا تھا مجھے اپنی عمر بھر اُن ہی کا تجربہ ہوا تھا مگر امریکہ کی عدالتوں میں بیان کرنے اور جرح کرنے کا طریقہ اور وہاں کے تمام قوانین شہادت بالکل حیرت انگیزی کے ساتھ مختلف تھے۔ مجھے اس بات کے سمجھنے میں ذرا وقت لگا کہ باوجودیکہ امریکہ اور انگلستان میں قانون فوجداری کی بنیاد ایک سی ہے مگر اٹھارھویں صدی سے

امریکہ کا قانون مختلف طرح سے ترقی کرتا گیا ہے اور امریکہ کے قانونی پیشہ والوں نے اپنی نئی اصطلاحات اور روایات قائم کرلی ہیں۔

باوجودیکہ سنہ ۱۹۰۶ء میں موٹر کار اپنا رواج پاتی جارہی تھی اور اس سے دس سال پیشتر وہ ایک قابل نفرت اور بودار کھلونا شمار کی جاتی تھی۔ مگر سنہ ۱۹۰۶ء میں ایسا نہیں رہا تھا۔ پھر بھی نیویارک میں عمدہ گاڑیوں اور چمک دار صاف ستھرے گھوڑوں کا عام رواج تھا۔ خوب صورت دو پہیوں والی بگی کی جگہ ٹیکسی (TAXI) کا رواج نہیں ہوا تھا اُس زمانہ میں امریکہ کے سب طبقوں کے آدمی کیسے با اخلاق اور خوش مزاج تھے۔ دفتر کے کلرک۔ دوکانوں اور فیکٹریوں کے مددگار ملازم سب کے سب دوست اور اپنے کام میں چست اور مستعد معلوم ہوتے تھے۔ وہ کسی کے ساتھ ایسی تلخی اور ناراضی کی نگاہ سے پیش نہیں آتے تھے جیسا کہ یورپ کے دوکانوں پر کیا جاتا ہے۔ وہ کانسٹبل جو اپنے پہرہ پر ہوتے تھے اور نیویارک کے سب پولسمین با اخلاق تھے اور جب کبھی اُن سے راستہ دریافت کیا جائے تو خوب باتیں کرکے بتاتے تھے۔ وہ پیرس کے ہتھیار بند کانسٹبلوں کی طرح تندمزاج بداخلاق نہ تھے۔ نہ وہ پرانی فیشن کے لندن والے پولسمین کی طرح الگ تھلگ رہنے والے اور شان دکھلانے والے آدمی تھے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بے انتہا خوش قسمت تھا اس وقت کے اعتبار سے جب میں پہلی مرتبہ اور صرف ایک مرتبہ نیویارک پہنچا اور اس سوشل دنیا کے اعتبار سے (جو اب تقریباً بالکل ختم ہوچکی ہے) جس کے اندر میں داخل ہوا تھا۔ میں اس زمانہ کی سوسائٹی کے لیڈروں اور اُن بڑی عورتوں سے ملا جو میری میزبان رہیں مثلاً مسز کورنیلیس وینڈربلٹ (MRS. CORNELIUS VANDERBILT) مسز جون جیکب ایسٹر (JOHN JACOBASTOR) مسز وہائٹ لارئیڈ (MRS. WHITELAWREID) مسز فپس (MRS. PHIPPS) مسز اوگڈن ملز (MRS. OGDEN MILLS) وغیرہ۔ یہ سب کتنی مہربان اور مہمان نواز تھیں۔ وہ پارٹیاں اور ناچ کی محفلیں جو ایک مرتبہ سے زیادہ انہوں نے میرے اعزاز میں منعقد کیں کیسی شاندار تھیں۔

میں اپنا زیادہ وقت عجائب خانوں میں گذارتا تھا جیسا کہ میں ہمیشہ ہر اس شہر میں کرتا ہوں جہاں میں پہلی مرتبہ جاؤں۔ امریکہ میں بہت سے مالدار آدمیوں کے مکانات قدرتی طور پر اپنی خاص قسم کے عجائب خانے اور تصویروں کے گھر بنے ہوئے تھے مجھے یاد ہے کہ میں نے اس وقت اس تعجب کا اظہار کیا تھا کہ باوجودیکہ یورپ میں فرانسیسی مصوری کا بہترین زمانہ شروع ہو گیا تھا اور فن کے نقادوں نے اپنا مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی امریکہ کا ذوق پرانی روایات کے مطابق اور اعلیٰ قسم کا باقی تھا۔ بہت سے بڑے بڑے مکانوں کی دیواروں پر جہاں میں گیا مختلف زمانوں کی مصوری کے نمونے لٹکے ہوئے تھے۔ مثلاً انگریزی مصوری کے۔ اٹلی کے۔ جرمنی کے۔ فلانڈرس اور ہالینڈ کے۔

میں یونین کلب (UNION CLUB) کا اعزازی ممبر بنا دیا گیا۔ امریکہ کے خاص کھانوں میں جو لطف ہوتا ہے اس کو میں نے محسوس کیا یقینی طور پر وہاں کے دو کھانے یعنی مرغابی اور کچھوا دنیا کے بہترین کھانوں میں ہیں۔ میں تھیٹر دیکھنے کے لئے اکثر جایا کرتا تھا اور وہاں پر یقینی طور سے جدید پرستی یا نئے زمانہ کے رنگ نے نیویارک پر اپنا اثر شروع کر دیا تھا۔ ابسن (IBSEN) کا بڑا زور شور تھا۔ اور اس کے بعض ڈرامے شہر کے اندر مختلف تھیٹروں میں دکھائے جا رہے تھے۔ مگر اس زمانہ میں عام طور پر موسیقی والے ڈرامے کا بھی کافی زور تھا۔ قبل اس کے دوسری قسم کی تفریحات جن میں اس سے زیادہ شور اور ہم آہنگی تھی۔ اس ڈرامے کی جگہ مقبول ہو گئیں۔ وہ زمانہ نیویارک کی اور عام طور پر امریکہ کی بڑی وسعت اور خوش حالی کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کی ظاہری اور نمایاں نشانی یہ تھی کہ وہاں کے آسمان پر نیویارک کا ستارہ ابھرتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس زمانہ میں ہم امریکہ کی نہایت بلند عمارتوں کا ذکر کیا کرتے تھے مگر وہ معمولی چھوٹی چھوٹی چیزیں جو بیس یا تیس منزلوں تک پہنچتی تھیں پھر بھی وہ ہمارے لئے بڑی اونچی اور غیر معمولی معلوم ہوتی تھیں۔

نیویارک میں میرا سارا وقت بہت عجیب طریقہ پر گذرا۔ میں اُس کو کبھی نہیں

بھولا ہوں۔ میری یہی آرزو رہی کہ میں وہاں دوبارہ جانے کے قابل ہوجاتا۔ میری یہ بدقسمتی رہی ہے کہ اس بات کا امکان نہ ہوسکا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بات سے مجھے بڑا افسوس رہا ہے جو برابر قائم ہے۔

میرے سفر نے میری تندرستی اور زندہ دلی میں اضافہ کیا۔ ۱۹۰۷ء میں مارلے منٹو دستوری اصلاحات تجرباتی تجاویز سے بڑھ کر قانون کی شکل میں نافذ کر دی گئیں۔ اُن کی شکل اور نمونہ تیار کرنے میں ہم نے نہایت مؤثر طریقہ پر کام کیا تھا۔ جان مارلے (JOHN MORLEY) اپنی لبرل پارٹی کا پس منظر اور نقطۂ نظر رکھتے تھے جو خالص طور پر نظریاتی اور کتابی قسم کا تھا اور وہ اس بات کے بے انتہا خلاف تھے کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ الیکشن کی نمائندگی منظور کر لی جائے۔ یہ بات اُن کی ذاتی فطرت کے خلاف تھی۔ مگر لارڈ منٹو وائسرائے نے بہر حال وعدہ کر لیا تھا اور اس وجہ سے مارلے کو اس کی اجازت نہ ہوئی کہ اس وعدہ کے خلاف جا سکیں گو ان کے قانونی اعتراضات کیسے ہی سخت اور انتہائی توجہ اور احتیاط کے ساتھ کئے ہوئے تھے۔ میرے اور سید امیر علی کے لئے ۱۹۰۷ء کا سال ایسا تھا جس کا ذکر اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس میں ہم دونوں اپنی چھوٹی سی پارٹی کے ساتھ ایک معمولی قسم کی لڑائی میں مصروف رہے جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم اپنی جگہ پر قائم رہیں ہم کو نتیجہ میں کامیابی ہوئی مگر ہم وہاں تک بڑی مشکل سے پہنچے۔

میں اپنی ذاتی زندگی میں بنیادی اور مستقل تبدیلیاں پیدا کرنے کے قابل ہوگیا اپنی بیوی شہزادی بیگم سے مصالحت کی کوئی امید افسوس کے ساتھ مگر قطعی طور پر ختم ہوچکی تھی۔ اس لئے ہم دونوں اس پر رضامند ہوگئے کہ تحریر کرنے کے بعد ایک دوسرے سے علیحدہ زندگی بسر کریں اور کچھ دنوں بعد قانون اسلام کے مطابق ہم دونوں طلاق پر راضی ہوگئے۔ گو میں ان کی زندگی تک اُن کے نان نفقہ کا ذمہ دار رہا مگر اس طلاق کے بعد وہ میری زندگی سے بالکل خارج ہوگئیں اور پھر ہم دونوں کبھی نہ ملے۔

۱۹۰۷ء کے بعد سے میں برابر ہر سال یورپ جاتا رہا۔ میری زندگی ایک خوشگوار اور وسیع دور میں بسر ہو رہی تھی۔ ۱۸۹۸ء میں جب میں پہلی مرتبہ یورپ

گیا تھا تو میں ایک قسم کا شرمیلا اور ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ اور میں فرانس کے رِویرا (RIVIERA) پر اپنا دل کھو بیٹھا تھا (یعنی وہاں کے تھیٹر اور ڈرامے پر) اب پورا جوان ہونے کے بعد میری محبت اس سے اور زیادہ گہری اور پختہ ہو گئی اور میں وہاں بار بار برابر جاتا رہا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں میری اس محبت کو ایک انسانی مرکز حاصل ہو گیا یعنی میری واقفیت مُل تھریسیا میگلیانو (MLLETH ERESA MAGLIANO) سے ہو گئی۔ وہ مونٹے کارلو (MONTECARLO) کے تھیٹر گھر (BALLETOPERA) میں ایک مشہور نوجوان ناچنے والی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ ایسی رقاصہ تھی جس کے متعلق پیرس کے تھیٹر گھر اور میلان کے (MILAN) لا اسکیلا (LASCALA) ان دونوں مقامات کے استادوں کی یہ رائے تھی کہ اپنے پیشہ میں اس کا مستقبل یقینی طور پر نہایت شاندار رہے گا۔ اُس کی عمر اس وقت ٹھیک اُنیس سال کی تھی۔ ہم دونوں میں بڑی گہری محبت ہو گئی اُس سال کے موسمِ بہار میں وہ میرے ساتھ مصر گئی اور وہاں پہنچ کر قاہرہ میں (CAIRO) ہم دونوں کی شادی اسلامی قانون کے مطابق ہو گئی۔

میری نئی شادی نے میرے لئے روحانی اور دماغی اطمینان و دولت پیدا کر دی۔ اس کی وجہ سے میرے لئے ایک نئی اور دلچسپ دنیا میں ایک راستہ کھل گیا میری نوجوان بیوی کی فطرت بے انتہا حسن پرست تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک ایجادات کرنے والی فن کار تھی۔ گو شادی کے بعد اس نے مجبوراً اسٹیج پر کام کرنا چھوڑ دیا۔ مگر اُس نے اپنی توجہ پہلے تو مصوری کے گہرے مطالعہ کی طرف منعطف کی پھر وہ سنگ تراشی کی طرف متوجہ ہوئی۔ ان کاموں میں اُس کی خداداد قابلیت نے پھلنا پھولنا شروع کیا۔ اُس کی بنائی ہوئی چیزیں یورپ اور انگلستان میں بطور نمائش کے رکھی جاتی تھیں۔

قبل اس کے کہ میری بیوی ستائیس سال کی جوان عمر میں وفات کر گئی جو موت کے لئے افسوسناک زمانہ ہے۔ اس کو بہ حیثیت ایک ماہر سنگتراش کے جس میں اپنے فن کی اعلیٰ قابلیت موجود تھی کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس سے اکثر فرمائش کی گئی تھی کہ انگلستان اور فرانس میں جنگ کی یادگار چیزیں تیار کرے اور گمنام فوجی

سپاہیوں کی یاد میں ایسے بہت سے سنگ تراشی کے نمونے بنائے جن سے جنگ کے زمانہ میں جو لوگوں کے جذبات تھے اُن کا اظہار اس طرح کیا جائے کہ اُس حالت کا نقشہ دل میں چبھ جائے۔ سب سے اخیر میں جو کام باضابطہ طور پر اس کو دیا گیا تھا وہ اُس کے لئے خاص خوشی کا باعث ہوا۔ یہ کام وائنا (VIENNA) کے شہر سے ملا تھا اس طرح پر کہ اس کام کے لئے سوا سے زیادہ قابل امید واروں نے ایک عام مقابلہ کے امتحان میں شرکت کی تھی۔ وہ کام یہ تھا کہ ایک ایسا فوارہ بنایا جائے جس کی زیبائش کی اسکیم میں بت تراشی کا کام خاص اہمیت رکھتا ہو۔

میری بیوی کو 'حسنیات' سے جو دلچسپی اور ذوق تھا اُس سے مجھ کو یہ رغبت ہوئی کہ میں بھی خود فنکاری کی دنیا کا پتہ لگاؤں اور اُس کی چھان بین کروں۔

دنیا میں حسنیات کا تجربہ کرنے کے سلسلہ میں مجھے سب سے پہلے جن چیزوں سے محبت ہوئی وہ موسیقی اور ناچ تھیں۔ موسیقی اور ناچ سے جو اثر میرے دل پر ہوتا رہا ہے وہ جذباتی اور ظاہری حواس سے تعلق رکھنے والا ہے۔ مجھے وہ وقت خوب یاد ہے جب میں نے پہلی مرتبہ دو آدمیوں کا بغلگیر ناچ دیکھا تھا اور اس ناچ میں گانا بھی سنا تھا۔ میں اُس وقت تیرہ یا چودہ سال کا لڑکا تھا۔ وہ موقعہ یہ تھا کہ پونا میں گورنمنٹ ہاؤس کے اندر ایک ناچ کی محفل منعقد ہوئی تھی۔ میں صاف طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کا گانے بجانے کا سامان معمولی قسم سے بھی کم درجہ کا تھا۔ اور ناچنے والے بھی شاید اپنے فن کے خاص ماہر لوگوں میں نہ تھے میرے پاس کوئی معیار نہ تھا جس سے میں اُن کے اچھے یا بُرے ہونے کا اندازہ کر سکوں۔ میرا مذاق بالکل قائم نہ ہوا تھا اور میرے لئے اپنے مذاق کی پختگی کا وقت نہیں آیا تھا۔ مگر اس روشن ناچ گھر میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ناچنے والے میرے سامنے چکر لگا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ اونی کپڑے پر بنائی ہوئی خوب صورت تصویریں ایک دم زندہ ہو کر چلنے پھرنے لگی ہیں۔ گانے کی وہ آواز اور وہ لہر میرے دل کے اندر اس طرح اُترتی چلی گئی جس طرح خوشی کی بہت تیز اور طوفان پیدا کرنے والی لہر گھستی چلی جاتی ہے جو روشنی اس ناچ گھر میں چمک رہی تھی اُس کو بجھے ہوئے ساٹھ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں

اور وہاں کے ناچنے والے بھی سب ختم ہوگئے ہیں۔ مگر اُس گانے اور اُس چلت پھرت کی یاد میرے دل میں سے اب تک کم نہیں ہوئی ہے۔

مجھے خوشی کا ایسا ذریعہ حاصل ہوگیا تھا جس کو میں نے کبھی نہیں کھویا جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی میری دلچسپی۔ موسیقی۔ ناچ۔ اوپرا اور تھیٹر سے برابر زیادہ ہوتی گئی اور مجھے ان سے زیادہ سے زیادہ فرحت اور سکون حاصل ہوتا گیا۔ میرے نزدیک یہ چیزیں فنون میں سب سے اول نمبر کی ہیں۔ تصویروں کو میں ضرور پسند کرتا ہوں مگر نسبتاً بہت محدود دائرہ میں۔ جس طرح میری عمر کے اور بہت سے آدمیوں کا حال ہے اسی طرح میری نشو نما اُس زمانہ میں ہوئی جب اٹلی کے بڑے استادوں کی بنائی ہوئی تصویروں کا رواج تھا اور اُس سے کم درجہ پر ہالینڈ اور برطانیہ میں بنی ہوئی تصویروں کا رواج تھا مگر باوجودیکہ میں سب تصویر گھروں میں بڑی فرض شناسی کے ساتھ گھوما۔ پھر بھی اُن کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ جب ٹرنر (TURNER) کی مصوری کا کام دیکھا تو اُسی وقت میں سمجھا۔ دراصل مصوری کیا چیز ہے اور اس سے کیا بات پیدا ہوسکتی ہے۔ اُس زمانہ میں ۱۹۰۲ء کے قریب میں نے پہلی مرتبہ فرانس کے مصوروں کا کام دیکھا ان میں مجھ کو ایسی کشادگی اور فن کی ترقی معلوم ہوئی جس سے ایسی ہی خوشی ہوئی جیسا کہ ٹرنر کی تصویریں دیکھنے سے ہوئی تھی۔ ان کی شکل وصورت سے نہیں بلکہ اس ابتدائی خاکہ سے ہوئی جو اُن تصویروں کی زمین تیار کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ ٹرنر (TURNER) مونے (MONET) رینور (RENOIR) پسارو (PISSARRO) یہ ان مصوروں کے نام ہیں جن سے مجھے دلچسپی ہے۔ سنگ تراشی اور فرنیچر کے معاملہ میں میرا مذاق بالکل مصر والوں کا سا ہے۔ قدیم مصر کے بڑے بڑے بت۔ سادہ۔ صاف باقاعدہ مگر ہموار قسم کا معمولی روزمرہ کا فرنیچر جو قاہرہ کے عجائب خانہ میں دیکھا جاتا ہے۔ بس یہی چیزیں میرے لئے بہت کافی ہیں۔ انگلستان اور فرانس کا فرنیچر خواہ وہ کسی مشہور زمانہ کا ہو مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ میں جواہرات یا قیمتی دھاتوں کے کام کی طرف بہت کم توجہ کرتا ہوں سوائے چاندی کے۔ چاندی کا خوبصورت کام میرے لئے ہمیشہ سے کافی

کشش رکھتا ہے۔

حسیاتی تجربہ کے اُن میدانوں میں جن سے مجھے دلچسپی ہے میں نے بہت زیادہ سفر کیا ہے اور اُن سے میں نے بہت گہرا لطف اُٹھایا ہے۔ میں یہ بات کرکے فخر کرتا ہوں کہ اس صدی کے بہت سے بڑے فنکاروں کو میں اپنے ذاتی دوستوں میں شمار کرتا ہوں میں اسٹراونسکی (STRAVINSKY) سے خوب واقف تھا۔ اُن کے ابتدائی کام کا جو مجھے علم تھا وہ بہت قریب سے اور ایک دوست کی طرح حاصل کیا گیا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ ڈائگیلیو (DIAGHILEV) کے ساتھ کام کرکے اُس نے بعض بہترین ناچوں کے لئے وہ گانا تیار کیا جو اُس استاد کے امکان میں تھا۔ اور جس کے سپرد اُن کا سارا انتظام تھا۔ میں نے اُس گانے کا بہت سا حصہ اُس وقت ہی سن لیا تھا جب تک وہ گانے کی صورت میں تھیٹر کے اندر پیش کرنے کے قابل نہ ہوا تھا۔

میں میسینے (MASSENET) اور پکینی (PUCCINI) دونوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں پکینی (PUCCINI) کے ان دوستوں میں سے ہونگا جنہوں نے سب سے پہلے اُس کی آواز میں ایک تکلیف دہ اور بڑھنے والی تکلیف محسوس کی وہ ایسی تھی جیسے کہ کسی آدمی کا گلا پڑ جائے اور اُس کی آواز بیٹھ جائے۔ یہ تکلیف اس بیماری کی پہلی علامت تھی جو آخر کار اس کی موت کا باعث ہوئی۔

موقع اور مصلحت کو دیکھکر جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے ایک مرتبہ اُس کو مشورہ دیا کہ بجائے اس کے کہ وہ ہمیشہ کھانسی کی گولیاں نگلتا رہے اُس کو یہ چاہیئے کہ کسی ڈاکٹر کے پاس جاکر اس کو دکھائے۔ میسینے (MASSENET) میرا دوسرا دوست تھا اور ہم دونوں اکثر مونٹے کارلو (MONTECARLO) کے ہوٹل ڈی پیرس (HOTEL DE PARIS) میں ساتھ ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ نزلہ اور کھانسی کی وجہ سے بیمار پڑے ہوئے تھے۔ میں اُن کے دیکھنے کے لئے کینس (CANNES) سے گاڑی میں سوار ہو کر ہوٹل ڈی پیرس (HOTEL DE PARIS) پہنچا۔ ہوٹل کے ملازم مجھے فوراً اُس کمرہ میں لے گئے جہاں

وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ وہاں پر بالکل مادرزاد ننگے ایک سنگ مرمر کے غسل خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس جگہ دروازہ کے قریب خوب تیز آگ جل رہی تھی۔ وہ وہاں پر ایک عورت کو جو اُن کی سکرٹری تھی بہت مصروفیت کے ساتھ گانا لکھوا رہے تھے مجھے دیکھ کر نہ تو وہ عورت ہی بالکل گھبرائی اور نہ وہ گھبراتے ہوئے معلوم ہوئے مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُس وقت کچھ جھجھک گیا اور پیچھے کو ہٹنے لگا۔ میسنے (MASSANET) بہت جلدی جلدی گنگنا رہے تھے۔ اُن کے دماغ میں کچھ نئے خیالات کا ذور ہو رہا تھا اور وہ اُن کو جلد کاغذ پر لانا چاہتے تھے۔ میں چونکہ اتنی دور چل کر کینیس (CANNES) سے اُن کے ملنے کی غرض سے آیا تھا اس لئے کیا یہ بڑی بد اخلاقی نہ ہوتی کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے انکار کر دیتے؟۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ "مہربانی کر کے تشریف رکھئے میں ابھی اس تھوڑے سے کام کو ختم کئے دیتا ہوں۔" وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک برابر اس غسل خانہ میں بیٹھے رہے اور گرم پانی کی ٹونٹی کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے اوپر کھولتے رہے۔ وہ گانے کے الگ الگ ٹکڑوں کو خود گا کر دہراتے جاتے تھے اور پھر اپنے سکرٹری سے کہتے تھے کہ وہ بھی اسی طرح اُن کو گا کر سنائے۔ یہاں تک کہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ اس کو گانے کا کوئی سبق دے رہے تھے۔ آخر کار اس تعلیم کی روانی ختم ہو گئی۔ نوجوان عورت نے اپنی نوٹ بک بند کر کے رکھدی اور جلدی سے باہر چلی گئی۔ صرف اُس وقت اُس بوڑھے آدمی کو جس کی عمر بہر حال تقریباً ستر سال کی تھی یہ محسوس ہوا کہ وہ وہاں پر ننگے بیٹھے ہوئے تھے اور یہ کہ نہانے کا پانی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے غسل خانہ کے باہر نکلے۔ اپنے کمرہ کی طرف لپکے غسل کا لباس پہنا اور پھر مجھ کو دوستانہ اور با اخلاق طریقہ پر رخصت کرنے کے لئے کمرہ سے باہر واپس آئے۔

میں بہت سے ایکٹر اور گویّوں کو جانتا ہوں۔ مثلاً میڈم بارٹیٹ (MADAME BARTET) کومیڈی فرانکیس (COMDIEFRANCAISE) اِلی جین ڈی رزکے (JEANDERESZKE) جو مرد گانے والوں میں سب سے اونچی آواز رکھنے والی

اور گویّوں کی ایک نئی پارٹی کا استاد شمار کیا جاتا تھا کیروسو (GREAT TENOR) جس کی آواز ایسی زور کی تھی کہ جب کبھی وہ اپنے گانے میں پوری بلند (CARUSO) آواز تک پہنچ جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آواز نے کونیٹ گارڈن کی عمارت کی بنیادوں کو دراصل ہلا دیا ہے۔ میرا خیال (COVENT GARDEN) ہے کہ باوجودیکہ وہ شاید ایسا خالص فنکار نہ تھا جیساکہ ٹومیگنو (TOMAGNO) مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ وہ میرے زمانہ میں سب سے زیادہ اونچی آواز رکھنے والا گویّا تھا

مجھے یاد ہے کہ میں نے میلبا (MELBA) کو اس کی شاندار نوجوانی کے زمانہ میں دیکھا تھا۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ پیرس کے تھیٹر گھر میں پیش ہوئی تو وہاں کے ڈائرکٹر نے اُس کی آواز کی قوت اور قابلیتوں کا اندازہ لگانے کے بعد یہ کہا کہ اس کا اسٹریلیا والا لہجہ ایسا خطرناک اور مشکل سے قابو میں آنے والا تھا کہ وہ اس سے کوئی کام نہ لے سکے گا اور وہ اس کے کسی مطلب کی نہ تھی۔ بہت سے بڑے گویّوں کی طرح میلبا (MELBA) بھی گانے کی بہت شوقین تھی۔ وہ گانے کے بعد رات کے وقت بہت اچھا اور لذیذ کھانا چاہتی تھی اور اس کو ختم کرنے کے لئے اس کی عادت تھی کہ وہ آئس کریم تازہ ناشپاتی۔ رس بھری اور بالائی کی فرمائش ضرور کرے اور ان سب کو وہ ایک ساتھ کھا جاتی تھی۔ اینسکافر (ESCOFFIER) نے جو مشہور ریسٹورنٹ رکھنے والا تھا جب میلبا (MELBA) کی اِس عادت کا ذکر سنا تو اُس نے اس قسم کا ایک خاص کھانا جاری کر دیا اور اُس کھانے کا نام میلبا کے نام پر اس کے اعزاز میں رکھدیا۔ اس طرح پر وہ کھانا پیدا ہوا جو آجکل دنیا میں پیچے میلبا (PECHE MELBA) کے نام سے مشہور ہے۔

انگلستان میں تھیٹر کے بہت سے انتہائی مشہور آدمیوں کو میں خوب جانتا تھا۔ سر ہنری اروِنگ (SIR HENRY IRVING) سے لے کر (جن سے میری ملاقات اکثر لیسیم تھیٹر (LYCEUM THEATRE) میں اس کمرہ کے اندر ہوتی تھی جہاں وہ اپنا لباس بدلا کرتے تھے) جارج الیگزنڈرز (THE GEORGE ALEXANDERS) اور ٹریز

(THE TREES) نام رکھنے والوں تک۔ سر سیمر ہکس (SIR SEYMOUR HICK) اور اُن کی بیوی ایلاین ٹیریس (ELLALINE TERRISS) اور اُن کے علاوہ اور بہت سے آدمی۔

میرے ایک دوست کے ذریعہ سے جو مارلبرو ڈگلس اینسلے (MARLBOROUGH DOUGLAS AINSLEY) کے ممبر تھے۔ میری واقفیت "سر جانسٹن فاربس رابرٹسن" (SIR JOHNSTONE FORBES ROBERTSON) سے ہوئی۔ اینسلے (AINSLEY) خود بھی ایک خاص اور نرالا کیرکٹر رکھنے والے آدمی تھے اور قابلیت بھی رکھتے تھے اس سے پہلے وہ سفیر کی حیثیت سے ملازمت کرتے تھے انہوں نے اپنی شخصیت کی وجہ سے تھیٹر کی دنیا اور بیرونی سوسائٹی کی دنیا میں ایک قسم کا غیر سرکاری تعلق اور لگاؤ پیدا کر دیا تھا۔ فاربس رابرٹسن نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اُن کے لئے کوئی مشرقی افسانہ نظم لکھ کر تیار کروں جس کا موضوع بحث کوئی تاریخی واقعہ ہو یہ بات انہوں نے مجھ پر چھوڑ دی کہ میں اسلامی قصے اور افسانوں کے بڑے ذخیرہ میں سے جو مضمون چاہوں اپنے لکھنے کے لئے منتخب کرلوں۔ چنانچہ میں نے وہ غمگین اور دل ہلا دینے والا قصہ منتخب کیا جو کربلا کے مقام پر پیغمبر اسلام کے نواسے اور میرے مورث (حسین) کے قتل کا قصہ تھا اور میں نے اس کو لکھنا شروع کر دیا۔

ایک دن سنہ ۱۹۰۴ء کی گرمیوں میں ڈگلس اینسلے (DOUGLAS AINSLEY) کے مکان پر میں نے فاربس رابرٹسن (FORBES ROBERTSON) کو جو کچھ میں نے لکھا تھا سنایا میرا یہ خیال نہیں ہے کہ انہوں نے اس کو بہت زیادہ پسند کیا۔ اس کے بعد سے میں نے یہ خیال بالکل ترک کر دیا کہ میں کبھی نظم میں کوئی ڈرامہ لکھوں۔

اب میں اُن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں جو گانے کے استاد اور گانے کی ترتیب دینے والے لوگ تھے۔ جب میں پہلی مرتبہ یورپ پہنچا تو اس وقت بھی وگنر (WAGNER) کے متعلق جو بڑی بحث مشہور تھی اس کا پورا زور چل رہا تھا۔ مگر یہ بحث نسبتاً بہت تھوڑے آدمیوں تک محدود تھی۔ جس طرح اٹلی کے علاوہ مغربی یورپ کے ہر ملک میں

سب قسم کے موسیقی کی قدر دانی اُس زمانہ میں قدرتی طور پر ایک خاص حلقہ تک محدود تھی۔ ایک بڑی تبدیلی جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے یہ ہے کہ موسیقی کی سمجھ اُس کا ذوق اور اس کی قدر دانی سوسائٹی کے سب طبقوں میں بہت زیادہ پھیل گئی ہے۔ پرانے زمانہ کی وہ شان جو سوشل رتبہ کی وجہ سے شمار کی جاتی تھی اب ختم ہو چکی ہے مگر نہ صرف انگلستان میں بلکہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں تھی میری رائے میں اس سے ضرور فائدہ پہنچا ہے کہ ذات پات فرق اور چھوٹے بڑے درجہ کا امتیاز بہت کم ہو چلا ہے۔ یہ بات ناچ گھروں میں خاص طور پر دیکھی جاتی ہے اور اس سلسلہ میں میرا دعویٰ ہے کہ میں نے نہایت قریب سے غور کے ساتھ دیکھا ہے کہ شروع سے لے کر اب تک برابر لوگوں کے ذوق میں ایک زبردست انقلاب ہوتا چلا آیا ہے۔

اس سے پہلے میں ڈائگلیو (DIAGHILEV) کا حوالہ چلتے چلتے دے چکا ہوں یہی وہ شخص تھا جو اس انقلاب کا پیدا کرنے والا اور اس کی روح پھونکنے والا تھا۔ جس طرح برطانیہ میں قیصر (CAESAR) نے کیا اسی طرح اس روسی ڈائگلیو (DIAGHILEV) نے لڑائی سے پہلے مغربی یورپ میں کیا۔ وہ آیا۔ اُس نے دیکھا اور اس نے فتح حاصل کر لی۔ اُس نے خود کہا ہے کہ اگر وہ روس ہی رہتا تو اس کو مغربی یورپ میں اپنی نئی چیزیں ظاہر کرنے اور اپنا اثر قائم کرنے کا کوئی موقعہ نہیں ملتا۔ باوجودیکہ روس ایک اعتبار سے بارٹی ناچ کا مرکز تھا۔ مگر وہاں پر پرانا ڈھرا بہت سختی سے قائم ہو چکا تھا۔ اسلئے ڈائگلیو کو کوئی موقعہ نہ مل سکتا تھا کہ وہ نئی باتوں اور نئے ڈھنگوں کی وہ تیز آگ اپنے ملک میں لگا سکے۔ جو اُس نے گھر سے باہر نکل کر مغربی یورپ میں لگائی۔

میں شروع ہی سے ڈائگلیو (DIAGHILEV) کا بڑا پُر جوش اور بہت پکا حمایت کرنے والا تھا۔ اور میں اُس کی قبل از وقت موت تک ایسا ہی رہا۔ اس باب میں مجھے شبہ ہے کہ ڈائگلیو (DIAGHILEV) کو جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان کا صحیح اندازہ آجکل عام طور پر کیا جاتا ہے۔ آجکل کی نئی نسل ان سب باتوں کو مسلمہ طور پر مان لیتی ہے۔ کہ یہ اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔ قبل اس کے کہ ڈائگلیو (DIAGHILEV) پبلک کے

سامنے آیا۔ پارٹی ناچ کو مغربی یورپ میں جس طرح لوگ سمجھتے تھے اور جس طرح اس کا رواج تھا۔ وہ فنکاری کی ایسی چھوٹی سی قسم شمار کی جاتی تھی جو بالکل بے جان اور دراصل ایک حالت پہ جمی ہوئی تھی۔ اس میں سے اصلی زندگی اور جوش جو صرف چھوٹے چھوٹے الفاظ اور حرکات کے دہرانے سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس فن کے اندر سے غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں ڈائگلیو (DIAGHILEV) یورپ کے حسینانی احساس پر ایک بم گولے کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اس کا زوردار اثر صرف پارٹی ناچ (BALLET) تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ وہ اس سے ملتے جلتے سب فنون پر اپنا اثر ڈالتا گیا اور اس نے اُن کے متعلق بنیادی خیالات میں جو ایجاد اور تنقید سے تعلق رکھتے تھے بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ گانا اور جسمانی حرکت کو اس کے ساتھ ملانا حرکات کے ذریعہ سے نظر یاتی تصورات اور خیالی شکلوں اور منصوبوں کو اسی طرح ظاہر کرنا جیسا کہ موسیقی کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ ان سب کے اصول اور خیالات پر ڈائگلیو (DIAGHILEV) نے بڑا زبردست اور ہمیشہ رہنے والا اثر قائم کیا ہے۔ یہ بات ظاہری طور پر اس کی بے مثل کامیابی کی جڑ تھی۔ مگر ڈائگلیو (DIAGHILEV) نہ ہوتا تو اسٹیج کی ساری آن بان اور نمائشی لباسوں کے مختلف ڈیزائن (DESIGN) عورتوں کے نئے نئے فیشن ساز و سامان کی آرائش اور اندرونی سجاوٹ اس صدی کے پہلے نصف حصہ میں کس قسم کے ہوتے؟ اس کا اثر سنگ تراشی اور مصوری کے بڑے لچک دار فنون پر بھی کچھ اس سے کم انقلاب پیدا کرنے والا نہ تھا۔ مگر پھر بھی اس کی تعجب خیز اور بے مثل خصوصیت یہ تھی کہ وہ اس طرح نئی بات پیدا کرتا تھا کہ اُس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

اس بات پر بحث کرنا ممکن ہے کہ دراصل اُس نے خود کبھی کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی مگر واقعہ یہ ہے کہ ہر اس شخص کا ایجادی کام جس نے ڈائگلیو (DIAGHILEV) کے ساتھ محنت کر کے کام کیا دراصل پورے طور پر ڈائگلیو کی ایجاد کی وجہ سے تھا۔ ایسے کتنے فنکار ہیں جنہوں نے ڈائگلیو کی خاطر اور اس کے ساتھ ایسے کام کئے جن کو دنیا آجکل اُنکے بہترین کام شمار کرتی ہے؟ مثلاً نہ صرف ایسے ناچنے والے جیسے کہ کرسا دینا (KARSAVINA)

نجنسکی (NIJINSKY) لفار (LIFAR) اور ملیین (MASSINE) بلکہ بکسٹ (BAKST) جیسا مصور اور اسٹرلونسکی (STRAVINSKY) جیسا گویا (یہ سب کے سب ڈائگلیو کے مرہون منت ہیں) وہ بے انتہا ذہین ۔ منیجر موسیقی تھا اور وہ کچھ اس سے بھی زیادہ تھا وہ دوسروں پر ایسا اثر ڈالتا تھا اور ان میں ایسی روح پھونکتا تھا کہ اس کے ساتھ کام کرکے وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ اس سے زیادہ بہتر ہو، بڑے ہو گئے ہیں جو وہ اس کے بغیر کسی صورت میں ہو سکتے تھے اور جو وہ اس کے بعد نہیں رہے تھے۔ جب ان کا تعلق اُس سے ختم ہو گیا تھا۔ نجنسکی (NIJINSKY) میں اِس پُراسرار قوت کی اعلیٰ اور افسوسناک مثال پائی جاتی ہے جس کا اثر ڈائگلیو نے دوسروں پر ڈالا۔ یعنی ایک ذہانت دوسری ذہانت کو ابھارتی ہے۔ مگر اس کا اثر دوسرے بہت سے آدمیوں پر بھی جن پر اس کا اثر بظاہر ایسا بیہوش کرنے والا نہ تھا کچھ اس سے کم اہمیت نہ رکھتا تھا۔ قابل فنکاروں کی ایک جماعت پر اپنے زبردست اور نئے ذوق کا اثر ڈال کر اور ان سے ان کا بہترین اور ایجادی کام لے کر ڈائگلیو (DIAGHILEV) نے اس ذوق کو یورپ پر ایسا مسلط کر دیا جس کا اثر کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

میں اس کی کانفرنسوں میں اکثر موجود ہوتا تھا۔ جہاں اس کے سربرآوردہ ساتھی ہوتے تھے جن کو وہ "اپنے محکموں کے صدر" کہا کرتا تھا مثلاً اسٹراونسکی (STRAUINSKY) بسکٹ (BAKST) نجنسکی (NIJINSKY) کرساونیا (KARSAVINA) اس کا بیلے ماسٹر (BALLETMASTER) اس کا خاص ناچوں کا ترتیب دینے والا کبھی کبھی کوئی نوجوان شاعر اور کوئی قابل عزت اور معزز فنکار مثلاً روڈن (RODIN) یہ سب لوگ اس کی کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس کی کانفرنس ایک جنگ کی کانفرنس کی طرح ہوا کرتی تھی۔ ہر شخص اپنے خیالات ایک مشترکہ ذخیرہ میں ڈال دیتا تھا مگر اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ڈائگلیو (DIAGHILEV) ان سب کا اعلیٰ کمانڈر ہوا کرتا تھا۔ وہ جنیاتی تخیل اور اُس کی ظاہری صورت میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا تھا۔ وہ شاندار منصوبوں کے ڈھیر میں سے فن لطیف کا ایک منظم اور مسلسل نمونہ نکال لیتا تھا۔ وہ خیالات کے اختلافات کو

دور کر دیتا تھا اور ان کو ٹھوک پیٹ کر ان کی خاص شکل و صورت بنا لیتا تھا جس کا آخری نتیجہ اکثر حالتوں میں یہی ہوتا تھا کہ ایک بڑا کارنامہ وجود میں آجاتا تھا۔

اس غیر معمولی قابلیت کی عملی بنیاد پہلی نگاہ میں بے انتہا کمزور معلوم ہوتی تھی۔ ڈائگلیو ہمیشہ قرضدار رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کبھی بھی بظاہر ایک پیسہ تک نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ایجاد کرنے والا تخیل اور اس تخیل پر خود اس کا عقیدہ جیسا کہ اس کو محسوس ہوتا تھا ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بالاتر پرواز کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کوئی بڑا کارنامہ یا بڑے کارناموں کا ایک لمبا سلسلہ پیدا کرنے والا ہے اور اس کو اندر سے اس پر بھروسہ ہوتا تھا کہ اس کے سامعین اس کے کام کی قدر و قیمت پہچانیں گے۔ اس کے اندر ایسا پختہ عقیدہ موجود تھا جو پہاڑوں کو ہلا ڈالتا ہے اور فی الواقع جب وہ کوئی کام لے کر اٹھتا تھا تو مشکلات کے پہاڑ پانی کی طرح بہہ جاتے تھے۔ جب کبھی اس کی مالی حالت بہت زیادہ مایوس کن معلوم ہوتی تھی تو کوئی نہ کوئی مال دار آدمی مثلاً کوئی میکینس (MAECENAS) نکل آتا تھا اور اس وقت اس کی فوری اور تکلیف دہ مشکلات حل ہو جاتی تھیں جس کے بعد وہ پھر اپنی دوسری کامیابی کی طرف پورے بھروسہ کے ساتھ بہت جلد متوجہ ہو جاتا تھا۔ اسٹیج پر بھی فی البدیہہ اور فوری کام کرنے کی قابلیت اور اس قابلیت پر اس کا پورا بھروسہ ایسی چیزیں تھیں جو سب پر چھا گئی تھیں۔ اس کی ہر نئی تصنیف آخر وقت تک بالکل بے ڈھنگی اور بکھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس پر وہ اپنا ایسا جادو کر دیتا تھا کہ اس کے آخری ریہرسل اور اس کو دکھانے کی پہلی رات کے درمیان میں جب ڈائگلیو (DIAGHILEV) کے آس پاس والا ہر آدمی بالکل مایوس ہو جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس مایوسی کی وجہ سے بیہوش ہو کر زمین پر گرنے والا ہے تو ڈائگلیو اس بے ڈھنگی اور درہم برہم چیز میں جان اور صفائی پیدا کر دیتا تھا جس کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ اس کی کامیابیوں کی لمبی فہرست میں ایک اور قابل تعریف کامیابی کا اضافہ ہو جاتا تھا جس کا ساری دنیا میں شور مچ جاتا تھا۔ ہر رات کو تھیٹر کے سامنے وہ سارا ہجوم جس سے تھیٹر گھر بھر جاتا تھا اپنے گھروں سے نکل کر جمع ہو جاتا تھا وہ سارا تھیٹر کا موسم بڑا کامیاب رہتا تھا۔ اس کے ختم ہونے پر ڈائگلیو (DIAGHILEV) اور

اُس کی کمپنی کے سب آدمی پیرس اور لندن کو روانہ ہو جاتے تھے۔ جہاں پر اُن کی تعریف کا ایسا ہی شور مچایا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دوسرے دار السلطنت اور صوبہ کے مرکزی شہروں میں چلے جاتے تھے اور وہاں پر بھی اُن کی کامیابی کی یہی کہانی رہتی تھی یہاں تک کہ جو کچھ روپیہ اُن کے پاس ہوتا تھا وہ سب ختم ہوتا تھا۔

وہ درحقیقت بے مثل آدمی تھا مگر فنِ لطیف میں جو انقلاب اس کی ذہین طبیعت نے نہایت تیزی کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ اس کی موت کے بعد سے اپنی رفتار پر برابر جاری ہے ساری دنیا میں پارٹی ناچ کا (BALLET) وہ مقبول فن جس میں دوبارہ نئی جان ڈالی گئی پیرس میں۔ لندن میں اور امریکہ میں۔ ایسے خوبصورت اور پھل والے درخت کی مانند ہے جس کے بیج اس عجیب شورش والے اور شاندار آدمی نے ایسی فیاضی کے ساتھ بوئے تھے یہ بات اُن لوگوں کے لئے ایک بڑی گہری خوشی کا سبب ہے جنہوں نے میری طرح اس شخص کے کام کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور تقریباً اس کے شروع سے دیکھا ہے کہ اُن کو احساس ہے کہ حسنیات کی دنیا میں یہ انقلاب عظیم جو ایسا ہی بنیادی اور دور رس تھا جیسا کہ وہ انقلاب تھا جو ویگنر (WAGNER) نے موسیقی کی دنیا میں برپا کیا۔ ایک ایسے ذہین آدمی کا کام تھا جس کو ہم بہ حیثیت ایک دوست کے جانتے تھے اور جس کی دوستی کا ہم کو فخر حاصل تھا۔

ڈائگلیو (DIAGHILEV) اور پارٹی ناچ (BALLET) اُس دلچسپ دنیا کا مرکز بنے ہوئے تھے جس میں بہت مرکب اور بہت پختہ ایجادی کام اور اُن کی ناقدانہ قدرشناسی یعنی اُن کو پرکھنے والی پہچان پائی جاتی تھی اور جس دنیا میں پہلی عالمگیر جنگ سے قبل میں نے پورے طور پر ایسی پُرلطف زندگی بسر کی۔ وقت۔ موقع۔ جنگ۔ مالی اور سوشل تبدیلیوں نے اس تمدن کے نمونہ اور بیش بہا ساخت میں اور اس طرزِ زندگی میں بڑا زبردست انقلاب پیدا کیا ہے حالانکہ وہ زندگی اُس زمانہ میں ایسی معلوم ہوتی تھی کہ کبھی ختم نہ ہوگی بہر حال بہت کچھ کھونے کے بعد بھی بہت کچھ حاصل ہو گیا ہے وہ یہ کہ فنونِ لطیفہ کے تمام معاملات میں جو انقلاب ڈائگلیو (DIAGHILEV) نے پیدا کیا اُس کے شاندار اور

دور تک پھیلنے والے اثرات باقی رہ گئے ہیں۔ اونچے طبقہ والے آدمیوں کو اگر کچھ نقصان پہنچا ہے تو عوام کو ضرور فائدہ بھی پہنچا ہے۔ کلچر (CULTURE) کا پھیلانا آجکل صرف ایک کتاب میں لکھی ہوئی بات شمار نہیں کیا جاتا بلکہ وہ در اصل ایک حقیقی اور عملی واقعہ ہوگیا ہے۔

جب میں آجکل کے مغربی یورپ میں جو تھیٹر گھر اور سماع خانے ہیں جو وہاں موسیقی کے ہال اور عجائب خانے ہیں ان کا خیال کرتا ہوں اور اُن آدمیوں کا خیال کرتا ہوں جو سوسائٹی کے تمام طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں (نہ صرف چند مالدار لوگ اور وہ لوگ جن کے پاس فرصت کا وقت بہت ہے) اور جو ان تھیٹروں وغیرہ میں بھیڑ لگائے رہتے ہیں جن کی خوشی اور دماغی و روحانی ترقی ظاہری طور پر معلوم ہوتی ہے۔ جب میں خیال کرتا ہوں کہ گذشتہ چند سالوں میں فنونِ لطیفہ کی قدر دانی اور اس کی صحیح اور پر شوق سمجھ سوسائٹی کے ہر طبقہ تک پھیل گئی ہے۔ تو ان سب خیالات کے بعد مجھ کو بجائے افسوس کرنے کے ان سب باتوں پر خوشی کرنے کے زیادہ معقول وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض آدمی بہر حال ایسے ضرور ہیں جو اس معاملہ میں میری اس خوش فہمی سے اتفاق نہ کریں گے۔ رچارڈ اسٹراس سے (RICHARD STRAUSS) جو میری ملاقات زیورچ (ZURICH) کے مقام پر وہاں کے تھیٹر گھر میں ہوئی اُس میں مجھ کو ایک ایسی علامت ملی جو ان انقلابی سالوں کے ایک غمگین پہلو کو پورے طور پر ظاہر کرتی تھی۔ میں اس زمانہ سے جب کہ اسٹراس (STRAUSS) اپنی بین الاقوامی شہرت کے انتہائی عروج پر تھے ان سے خوب واقف تھا۔ ہم دونوں کے چاروں طرف ایک ایسا برِ اعظم تھا اور ایسی دنیا تھی جس میں نہایت بے رحمی کی لڑائی جاری تھی اور اُس لڑائی میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ویگنر (WAGNER) کے تمام انتہائی خطرناک خیالات اور پیشین گوئیاں ایک بھیانک خواب کی طرح اصلی اور خوفناک حقیقت بن کر ظاہر ہو رہی ہیں۔ اسٹراس (STRAUSS) اُس وقت ایک بوڑھا اور دل شکستہ آدمی تھا۔ جب اُس نے مجھے دیکھا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک غمگین اور مایوس حرکت کا اظہار کرتے ہوئے اوپر کو اٹھائے۔ اپنی آنکھیں آسمان کی طرف کیں اور ہولے سے

ایک بے سلسلہ جملہ بولا جس میں مجھ کو صرف "خدا" کا لفظ ضرور سنائی دیا۔ اس کے بعد وہ مایوسی کی حالت میں اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

سنہ ۱۹۰۷ء سے لے کر جنگ کے شروع ہونے تک میں ہر سال کچھ عرصہ کے لئے ضرور یورپ میں قیام کرتا تھا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں یا ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں جانا اس زمانہ میں آجکل کی نسبت گو زیادہ وقت لیتا تھا مگر بہت زیادہ آسان بھی تھا اور بہت زیادہ آزادی کے ساتھ کہا جا سکتا تھا۔ اس زمانہ میں مہذب دنیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ پاسپورٹ اور ویزا۔ اشیاء کے باہمی تبادلہ پر کنٹرول اور قوانین حفاظت کے تکلیف دہ تکلفات کی تعلیم حاصل کرے۔

اُن امریکی لوگوں کی تعداد جو یورپ آیا کرتے تھے ہر سال برابر بڑھتی جاتی تھی۔ اُن میں سے بہت سے آدمی مالدار تھے۔ بہت سے نہایت پختہ اور مرکب ذوق رکھنے والے آدمی تھے۔ بعض آدمی وہاں پر مستقل طور پر قیام کرتے تھے۔ بعض وہاں پر آتے جاتے رہتے تھے۔ بعض ریورا (RIVIERA) اور دوسرے مقامات پر بڑے بڑے مکانات اور ادارے قائم کر لیتے تھے۔ اُن میں سے اکثر آدمی ایسے تھے جو بذاتِ خود ایک جداگانہ شخصیت اور کیریکٹر رکھتے تھے۔ مثلاً وہ قابلِ ذکر آدمی جس کا نام جیمس گورڈن بینٹ (JAMES GORDON BENNETT) تھا جو اخبار نیویارک ہیرالڈ (NEW YORK HERALD) کے مشہور مالک تھے۔ اور جن کے پاس بیولو سرمر (BEAULIEU-SUR-MER) کے مقام پر ایک کوٹھی تھی۔ وہ اُس وقت بہت بوڑھے تھے اور اپنی عمر کے مطابق وہ بوڑھے معلوم بھی ہوتے تھے۔ وہ بہت تند اور تیز مزاج آدمی تھے۔ مگر ان کا دل بہت نرم اور مہربان تھا۔ وہ مہمان نوازی جو وہ اور اُن کی ہنس مکھ بیوی اکثر برتنا پسند کرتے تھے ایک ناشتہ کی دعوت میں ہوا کرتی تھی۔ یہ ایک بڑی اور طویل دعوت ہوا کرتی تھی جس میں ہر قسم کا خاص امریکی کھانا ہوا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں اس کو ہر قسم کی بری چیزوں سے سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اگر مغربی اتحادیوں کو WESTERN ALLIES کسی مقام سے پیچھے ہٹنا پڑتا تھا جو کسی مصلحت یا جنگی حکمت کی

وجہ سے ہوتا تھا اور اس کی طرف بینیٹ (BENNETT) کی توجہ دلائی جاتی تھی تو اس کا مزاج بگڑ جاتا تھا اور جو بدقسمت شخص ایسی خراب خبریں لاتا تھا اُس پر اتنی گالیاں پڑتی تھیں اور اُس کو ایسی لعنت ملامت کی جاتی تھی کہ اس بات کا یقین نہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ شخص دراصل اتحادیوں کی اُس شکست کا خود ذمہ دار نہ تھا جس کا ذکر اُس نے ایسی عجلت کے ساتھ اور بے سوچے سمجھے کر ڈالا۔

اور لوگ جن سے میری ملاقات اور دوستی اُس زمانہ میں ہوگئی یہ آدمی تھے ۔ یعنی مارگن بینک کے مسٹر ہارجس (MR. HARJES OF MORGAN BANK) جو اُس دن سے جب کہ عالمگیر جنگ شروع ہوئی اتحادیوں کے بڑے زبردست حامی تھے اور اُن کی بیوی جو دنیا کی سب سے زیادہ خوب صورت عورتوں میں تھی۔ وہ ایک شہزادی کی طرح شان دار اور فراخ دل عورت تھی ۔ مسٹر ریلف کرٹس (MR. RALPH CURTIS) جو بڑے زندہ دل اور دلچسپ گفتگو کرنے والے تھے اور ان کی بیوی مسٹر جیمس ایچ ہائڈ (MR. AND MRS JAMES H. HYDE) اور اُن کی بیوی مسٹر برنارڈ بیرنسن (MR AND MRS. BERNARD BERENSON) اور اُن کی بیوی والٹر بیری (WALTER BERRY) جو قاہرہ کی مشترکہ عدالت میں جج رہ چکے تھے اور جو عمر بھر ایڈتھ وارٹن (EDITH WARTON) کے دوست رہے جو قدیم نیویارک کے مشہور ناولسٹ اور تاریخ دان تھے۔

برنارڈ بیرنسن (BERNARD BERENSON) کو اس بات کا بڑا فخر تھا کہ وہ انگریزی زبان کا تلفظ بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ مگر اُن کے لفظی آہنی لباس میں ایک عجیب شگاف اور کھوٹ پایا جاتا۔ وہ یہ تھا کہ وہ ایسے سادہ لفظ کو جیسے "کورک اسکریو" (CORKSCREW) اس طرح بولتے تھے کہ اُس میں ایک تیسرا حرف ملا ہوا اور معلوم ہوتا تھا جیسے "کورکراسکریو" (CORKSCREW) اُن کے بعض دوستوں نے جن کو ان کے اس وہمی مرض کا علم تھا ایک دن اپریل فول کے موقعہ پہ اُن کو بے خبر پاکر اُن کو شرارت کے ساتھ آزمائش میں ڈالنا چاہا۔ یہ دیکھ کر سب کو

بڑی خوشی ہوئی کہ اُن کے منہ سے فوراً "کورکراسکریو" کا لفظ بڑے زور کے ساتھ پڑا۔ اس کے بعد برسوں تک یہ رہا کہ اگر کبھی برنارڈ بیرنسن (BERNARD BERENSON) کو یہ جرأت ہوتی تھی کہ وہ اپنے صحیح تلفظ کی ہوا باندھیں اور اُس پر اڑے رہیں تو اُن کو سب لوگ خوب چلا کر وہ بیکار اور زائد حرف یاد دلا دیا کرتے تھے۔ جس کو وہ بولنے کے عادی تھے۔

ریلف کرٹس (RALPH CURTIS) کو ظرافت کے ضلعے اور ذو معنی الفاظ بولنے کی عادت تھی۔ ان سے میری ملاقات ہونے سے برسوں پہلے وہ بمبئی میں رہا کرتے تھے اور اس وقت مسٹر ڈبلو۔ کے۔ وینڈربلٹ (W.K. VANDERBILT) (جو کونسو لوچر آف مارلبورو کے باپ تھے جو بعد میں میڈم بالسن MADAME BALSAN ہوگئی تھیں) اپنی کشتی میں بمبئی پہنچے۔ لارڈ ہیرس (LORD HARRIS) جو اُس وقت بمبئی کے گورنر تھے۔ یہ غلط رائے رکھتے تھے جو اکثر انگریزوں میں پائی جاتی تھی کہ امریکہ کی سوسائٹی دولت پر بنی ہوئی ہے۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ وینڈربلٹ خاندان کے لوگ بہت مالدار تھے اس لئے انہوں نے ریلف کرٹس (RALPH CURTIS) کے ساتھ بے تکلفانہ اور مساویانہ برتاؤ کرتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ کیا آپ مسٹر وینڈربلٹ (MR. VANDERBILT) کو جانتے ہیں۔ اس سوال سے وہ یہ کنایتہً ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وینڈربلٹ سے واقف ہونا ریلف کرٹس کے لئے قابل عزت بات ہوگی۔ مگر ریلف کرٹس (RALPH CURTIS) نے نہایت ظرافت اور شرم کے ساتھ یہ جواب دیا کہ میں وینڈربلٹ کے خاندان والوں میں سے کسی کو نہیں جانتا ہوں۔ چونکہ جب میں نیویارک میں رہتا تھا تو یہ لوگ "وینڈربلٹ" نہیں ہوئے تھے بلکہ وینڈربلٹ بننے والے تھے۔

جیمس ہانڈ کے مکان پر میں چند مرتبہ "موسیو ہانوٹا" (MONSEIUR HANOTAUX) سے ملا۔ یہ مشہور تاریخ دان تھے۔ جامعہ فرنیکیس (ACADEMIE FRANCAISE) کے ممبر تھے اور جو ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۸ء تک فرانس کے وزیر خارجہ رہ چکے تھے۔ اُن کو مجھ سے محبت ہوگئی اور ہم دونوں اکثر سیاسیات پر باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے

بڑی سنجیدگی سے اس بات کا اقرار کیا کہ اگر ۱۸۹۸ء کی میلن کیبنٹ (MELINE CABINET) جس کے وہ ممبر رہ چکے تھے ناکامیاب ہوجاتی اور اگر وہ ملی جلی پارٹیاں جنہوں نے میلن (MELINE) کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ برابر اس کی حمایت کرتی رہیں اور اس کی جگہ ڈیلکاس (DELCASSE) کو مدد دینے کی طرف متوجہ نہ ہوجاتیں تو یہ ممکن تھا کہ السس لورین (ALSACE-LORRAIEN) کا مسئلہ ایمانداری کے ساتھ اور دوستانہ طریقہ پر حل ہوجاتا اور یہ فرانس اور جرمنی دونوں کے لئے قابل فخر اور اطمینان دلانے والا ہوتا۔ اگر ہانوٹا (HANOTAUX) کی زوردار بات صحیح تھی تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ سیاسی حکمتوں میں یہ ایک اور دوسرا موقعہ ہاتھ سے جاتا رہا اور یہ ایک دوسرا غلط موڑ اختیار کیا گیا۔ جس کے متعلق اگر صحیح فیصلہ کرلیا جاتا تو پہلی عالمگیر جنگ کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اور یہ جنگ کبھی واقع نہ ہوتی۔

والٹر بیری (WALTERBERRY) نے میری ملاقات مسز ایڈتھ وہارٹن (MRS. EDITH WHARTON) اور مارسل پراوسٹ (MARCELPROUST) سے کرائی۔ والٹر بیری کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ بہت اچھے اور دلفریب گفتگو کرنے والے آدمی تھے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح عورتوں کے اس مختصر حلقہ میں جس کے اندر میں اور وہ دونوں اس زمانہ میں اکثر گھومتے رہتے تھے یہ شہرت حاصل کرلی تھی کہ وہ شادی کے معاملہ میں ایک قسم کی ایسی زمین دوز اور نہایت خطرناک قسم کی مشین کا کام کرتے تھے جو جہازوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتی ہے۔ عورتوں کا یہ بیان تھا کہ وہ ہر عورت سے الگ الگ یہ کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے شوہر سے بہت بالاتر ہے اور اس کا شوہر ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ ایسی عمدہ عورت کا شوہر بن سکے۔ وہ ایک ممتاز آدمی تھے اور مشہور وکیل تھے۔ اس لئے ان عورتوں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اُن کی باتیں سنکر اُن کا یقین کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہمیشہ ایک نہ ایک شادی کا خاتمہ ہوجاتا تھا یعنی وہ شادی شدہ عورت اپنے شوہر کو چھوڑ بیٹھتی تھی۔ یہ اس قسم کا مذاق تھا جو ایک چھوٹی سی مخلوط سوسائٹی میں خوب چل جاتا تھا اور جو آدمیوں کی موت کا سبب بن سکتا تھا اور کبھی ختم نہ ہوتا تھا۔

والٹر بیری (WALTER BERRY) ایک بات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ دنیا کے اُن چند آدمیوں میں سے تھے جو کسی وقت پراؤسٹ کو (PROUST) کھانے پر مدعو کر سکتے تھے اور جن کو ہمیشہ یقین تھا کہ اُن کی دعوت ضرور منظور کر لی جائے گی۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ میں پراؤسٹ سے کبھی رٹز (RITZ) کے مقام پر نہیں ملا جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے۔ بلکہ میری ملاقات اُن سے چند مرتبہ والٹر بیری کے مکان پر کھانے کی دعوت میں ہوئی۔

مجھے پراؤسٹ کے متعلق جو بات سب سے زیادہ یاد آتی ہے وہ اُن کی خاموشی ہے۔ مجھے اُن کا صرف ایک جملہ یاد ہے۔ ایک دن شام کے وقت ارجنٹینا کی ایک غیر شادی شدہ خاتون (ARGENTINE LADY) جن کا نام ایٹوشا (ATOUCHA) تھا اور جن کی نسبت فرانس کے ایک معزز آدمی سے (FRENCH MARQUIS) ہو چکی تھی۔ والٹر بیری کے ہی تیسرے مہمان کی حیثیت سے ان کے مکان پر موجود تھی۔ پراؤسٹ نے اس کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا اور پھر اُس رائے کا اظہار کیا کہ وہ کلیوپیٹرا (CLEOPETRA) کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ اس جملہ کے علاوہ پراؤسٹ نے کھانا ختم ہونے تک اور کوئی بات نہیں کی۔ اس موقعہ پر جیسا کہ ہم دوسرے موقعوں پر بھی کیا کرتے تھے میں نے اور بیری نے اپنی انتہائی کوشش کی کہ ہم باتوں کا سلسلہ جاری رکھیں۔ مگر یہ مشہور ناول نگار برابر خاموش بیٹھے رہے۔ ہم کو دیکھتے رہے اور ہماری باتیں غور سے سنتے رہے۔ ہمارے لئے یہ واقعہ تھوڑا سا تکلیف دہ تھا جس سے طبیعت گھبرا جاتی ہے۔

اُن خوشگوار اور اچھے سالوں میں میری فرصت کے اوقات اسی قسم کے بعض دوستوں میں کٹتے تھے اور یہی اُس زمانہ کی سوسائٹی تھی۔ میرا کام قدرتی طور پر برابر جاری رہا اور اس میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ میں ہر سال کا بڑا حصہ ہندوستان میں گذارتا تھا جس میں میری مصروفیت یہی نہ تھی کہ میں اُن فرائض کو پورا کروں جو اپنے پیروی کرنے والوں کے لئے مجھ پر عائد ہوتے ہیں بلکہ اُن دلچسپیوں اور ذمہ داریوں کو بھی پورا کروں جو ہندوستان کی سیاسیات میں میرے لئے پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ وہ سال تھے جن میں مارلے منٹو اصلاحات کو عملی جامہ پہنایا

جا رہا تھا۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے لئے الیکشن کے ذریعہ سے جداگانہ انتخابات کا اصول جس کے منظور کرانے کے لئے ہم نے ایسی سخت لڑائی لڑی تھی بالکل صحیح اور قابل عمل تھا اور اصولی اعتبار سے بھی بالکل منصفانہ تھا۔ ایسے لیڈروں کی رہنمائی میں جیسے نواب علی چودھری۔ بنگال میں نواب ڈھاکہ اور پنجاب میں سر محمد شفیع اور سر ذوالفقار علی خاں مسلمانوں کا سیاسی احساس پختہ ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کر رہا تھا۔

میں خود اپنا بہت سا وقت۔ اپنی قوت۔ اور اپنی دلچسپیاں علیگڈھ کے معاملات میں صرف کر رہا تھا۔ اس منصوبہ کے لئے کہ علیگڈھ میں ایک بڑی مسلم یونیورسٹی قائم کی جائے میرا خیال ہے کہ میں اُس وقت اُس ایک آدمی والی "تیز جماعت" کا فرد تھا جو پارلیمنٹ میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ کسی مفید کام کرنے کا فیصلہ بہت تیزی کے ساتھ کیا جائے ان سالوں میں رفتہ رفتہ ہم نے اپنے منصوبہ کے لئے لوگوں میں دلچسپی پیدا کر دی اور اس کے لئے مدد حاصل کی۔ اس منصوبہ کی مخالفت قدرتی طور پر اُس با اختیار برطانوی حلقہ سے ہوئی جن کا اعتراض یہ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کا قیام مناسب نہیں ہے۔ اور اس کے میلانات اور اُس کی تعلیمات تنگ نظری کے ساتھ فرقہ وارانہ اور مخصوص نوعیت کے ہوں گے۔ میں نے ان اعتراضات کی تردید کرنے کے لئے سخت کوشش کی۔ مدد کے لئے میری تمام اپیلوں۔ تمام تقریروں اور مضمونوں کا یہی ایک بنیادی اصول تھا کہ علیگڈھ یونیورسٹی میں تعلیم پاکر وہاں کے لڑکے ملک کے گوشہ گوشہ میں اس پیغام کی تبلیغ کرتے پھریں گے کہ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ تحقیقات کرنے کا حق حاصل ہے۔ سب کے ساتھ فراخ دلی سے رواداری کا برتاؤ ہونا چاہیئے اور انسان کا کیرکٹر پاک اور بے لوث اخلاقیات پر بننا چاہیئے۔

اِس معاملہ میں ایسا نہیں تھا کہ بڑے لوگوں کی طرف سے مجھے مدد نہ ملی ہو۔ لارڈ منٹو (LORD MINTO) کی جگہ بہ حیثیت وائسرائے کے لارڈ ہارڈنگ آف پین شرسٹ (LORD HARDINGE OF PENSHURST) مقرر ہوئے۔ وہ ایسے سیاست دان اور سیاسی جوڑ توڑ رکھنے والے آدمی تھے۔ جن کو ایران اور مشرق قریب کے ملکوں میں رہ کر مسلمانوں کی زندگی کا بہت عرصہ تک وسیع تجربہ ہو چکا تھا۔ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل

(EXECUTIVE COUNCIL) کے ممبر جو محکمۂ تعلیم کے ذمہ دار تھے۔ اس زمانہ میں ایک روشن خیال اور وفادار انتظامی قابلیت رکھنے والے آدمی تھے۔ یعنی سر ہارکورٹ بٹلر (SIR HARCOURT BUTLER) جو مسٹر آر۔ اے بٹلر (MR. R. A. BUTLER) کے چچا تھے اور یہ مسٹر آر۔ اے بٹلر (MR. R. A. BUTLER) سنہ ۱۹۵۱ء سے لے کر آگے تک مسٹر چرچل کی گورنمنٹ میں وزیر مالیات (CHANCELLOR OF THE EXCHEQUER) تھے اور یہی وہ وزیر تھے جنہوں نے سنہ ۱۹۴۴ء میں برطانیہ کا بڑا قانون تعلیم نافذ کیا۔ تعلیم سے دلچسپی رکھنا بٹلر خاندان میں قدیم روایات کی طرح چلا آتا ہے۔ لارڈ ہارڈنگ اور سر ہارکورٹ دونوں ہماری مسلم پوزیشن کو سمجھتے تھے اور اس بات سے واقف تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے سوشل۔ مذہبی اور روحانی پس منظر میں بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے بار بار یہی کوشش کی کہ اس بات کو صاف کر دوں کہ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کو بذاتِ خود کوئی آخری مقصد نہیں شمار کرتا تھا بلکہ اُس کو ایک آخری مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کرتا تھا۔ اگر ہم کو آزادی اور خود مختار حکومت کی طرف اپنے راستہ میں چل کر ترقی کرنا تھا۔ خواہ ہماری منزل کتنی ہی دور کیوں نہ معلوم ہوتی ہو تو ہمارے لئے یہ لازمی اور ضروری ہے کہ ہمارے پاس بہ حیثیت ایک جداگانہ جماعت کے وہ علم اور دماغی ترقی کا سامان ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ سے ہم اس قابل ہو سکیں کہ اُن سیاسی ذمہ داریوں کو اٹھا سکیں جن کے لینے کے لئے ہمارے دل میں خواہشات پیدا ہو گئی تھیں۔ میرے ذہن میں کوئی تنگ فرقہ ورانہ مقصد ہرگز نہ تھا۔ میں نے شروع ہی سے اِس بات پر زور دیا تھا کہ سنسکرت کی تعلیم چلائی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندو تہذیب اور ہندو فلسفہ کی تاریخ اور ترقی کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ ہمارے آدمی اپنے پڑوسیوں کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کے قابل ہو جائیں ہماری اپنی یونیورسٹی کا قیام نہایت ضروری تھا۔ چونکہ اسلام کے روحانی اتحاد کو ترقی دینے کا یہ بہترین اور سب سے زیادہ مستقل ذریعہ تھا۔

دوسرے آدمیوں کو اپنے اس عقیدہ سے متفق کرنا جو میں ایسی سرگرمی کے ساتھ اپنے دل میں رکھتا تھا۔ اس کے لئے لوگوں کی تائید اور مدد حاصل کرنا اور اِس کام کے لئے روپیہ

جمع کرنا۔ یہ سب بے انتہا مشکل کام تھے۔ میں نے سارے ہندوستان کا سفر کیا۔ میں مسلمانوں کے بڑے لیڈروں کے پاس گیا۔ غریبوں اور امیروں کے پاس گیا۔ شہزادوں اور کاشتکاروں کے پاس گیا۔ خود میرا ذاتی چندہ اس کام کے لئے ایک لاکھ روپیہ تھا جو اُس زمانہ میں اچھی خاصی رقم شمار کی جاتی تھی۔ سب کو ملا کر میں نے تیس لاکھ روپیہ سے زیادہ جمع کیا۔ میرے لئے یہ مسلسل محنت کے سال تھے۔ ایک ساتھ کئی کئی دن اور ہفتوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنی زندگی ریل کے ڈبوں میں بسر کر رہا ہوں۔ ہر قصبہ میں جہاں ریل گاڑی ٹھہرتی تھی میں مسلمانوں کے ہجوم کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر مخاطب کرتا تھا۔ ہر موقعہ پر میں علیگڈھ کے معاملہ کی تبلیغ کرتا تھا۔ میرے اعزازی پرائیویٹ سکریٹری اور اس مہم میں میرے دست راست مولانا شوکت علی مرحوم تھے۔ اُن کی مسلسل اور ان تھک امداد کے بغیر مجھے شبہ ہے کہ میں اس کام میں کامیابی حاصل کرنے کے قابل ہوتا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں ناگپور کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے موقعہ پر ہم اس طویل مہم کی انتہائی منزل تک پہنچ گئے۔ جس میں علیگڈھ کا منصوبہ کانفرنس کے ایجنڈے (AGENDA) پر ایک خاص تجویز کی صورت میں رکھا گیا اور درحقیقت یہ منصوبہ کانفرنس کی تمام کارروائیوں میں سب سے بالاتر تھا۔ مسٹر یوسف علی نے جو کانفرنس کے چیرمین تھے ہمارے اغراض کو مقاصد کو بہت اچھی طرح ظاہر کر دیا تھا انہوں نے اس یونیورسٹی کے مقصد کو جسکے بنانیکی ہم کو امید تھی ان الفاظ میں بیان کیا "اس یونیورسٹی میں کوئی جانچ پڑتال نہیں ہوگی۔ وہاں پر آزادی اور خیال کی جدت ہمت افزائی کے ساتھ پیدا کی جائے گی۔ وہ اس اعتبار سے مسلم یونیورسٹی ہوگی کہ وہاں پر اُن مقاصد اور اُن نظریات کو ترقی دیجائیگی جو ہندوستان کے مسلمانوں نے دو نسلوں تک تعلیمی تجربہ حاصل کرنے کے بعد خود نکال کر قائم کئے ہیں"

اب جبکہ سب کچھ کہا جا چکا اور کیا جا چکا اور جب میں اُن تمام گذشتہ باتوں کو دیکھتا ہوں جو علیگڈھ کی مسلم یونیورسٹی نے پچھلے چالیس سالوں میں پوری کی ہیں اور جن کے لئے وہ تیار رہی ہے تو یہ بلا شبہ میری زندگی کا ایسا واقعہ ہے جس کو میں سچی اور مستقل خوشی کے ساتھ تحریر کرتا ہوں اور جس کو میں اپنے دل میں سوچا کرتا ہوں۔ میں صرف اُس کے سیاسی نتایج پر ہی زور دینا نہیں چاہتا ہوں گو وہ نہایت اہم ہوئے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ اور کس مقام پر یہ ممکن ہو سکتا تھا

کہ اسلامی عقائد اور اسلامی کلچر (CULTURE) کا ایسا صحیح مرکز قائم کیا جائے اور اس کو برابر جاری رکھا جائے جہاں پر لائبریریاں اور لیبوریٹریاں (LABORATORIES) قائم کر کے اور اُن سے پورا فائدہ اٹھا کر وہ ساری سہولتیں پیدا کی جائیں جو ہمارے زمانہ کی موجودہ دنیا کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ جس مرکز میں ہمارے مذہب کے اصول اس مذہب کی عالمگیر نوعیت۔ نئے زمانہ اور نئی ایجادات سے اس کی صحیح مطابقت۔ اس کی لازمی اور ضروری معقولیت۔ روا داری۔ دوسروں کے ساتھ فیاضانہ سلوک اور دوسرے مذہبوں کی عزت کرنے کی گہری خواہش۔ ان سب کو اچھی طرح سمجھایا جا سکے اور ان پر عمل کیا جا سکے۔ یہ واقعہ کہ میں نے ایسا مرکز قائم کرنے میں اپنا کام کیا میرے ان خیالات میں سے ہے جو میرے لئے سب سے زیادہ خوش کرنے والے۔ اطمینان بخشنے والے اور دل کو مضبوط کرنے والے ہیں اور جن کو میں بڑھاپے تک اپنے دل میں قائم رکھوں گا۔

باب نمبر ۷
زار کے رُوس میں

سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک میرے سب سال بہت مصروف تھے جن میں اکثر اہم واقعات پیش آئے اور مجھے بہت کام کرنا پڑا۔ خوشی اور غم۔ کام اور سفر۔ مایوسی اور کامیابی تفریح اور لوگوں سے دوستی۔ ان سب باتوں میں ان سالوں کے اندر میرا کافی حصہ رہا۔ میری بیوی اکثر فرانس میں رہا کرتی تھی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں میرا پہلا بیٹا اُن سے پیدا ہوا جس کا نام میں نے 'مہدی' رکھا۔ اس کی چھوٹی سی مختصر زندگی فروری سنہ ۱۹۱۱ء میں ختم ہوگئی۔ اور میرا دوسرا بیٹا 'علی' اسی سال کے جون میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے میری بیوی کو اور مجھ کو بڑی خوشی اور اطمینان حاصل ہوا۔ مگر اُس بیٹے کے بچپن کے ساتھ میری بیوی کے لئے ایک گہری ذمہ داری کا احساس شامل ہوگیا۔ بہت سال گذر چکے تھے جب سے کہ ہمارے خاندان میں کوئی لڑکا پیدا ہوا تھا۔ جو رنج ہم کو اپنی پہلی اولاد کے مرنے پر ہوا اُس سے ہمارے اندر ایک خاص قسم کی تیز اور چوکنی احتیاط پیدا ہوگئی جو ہم اس کے بھائی کی پرورش کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جب وہ بچہ بہت چھوٹا سا تھا تو وہ بہت نازک شمار کیا جاتا تھا اُس زمانہ میں بچوں کے ایک مخصوص اور سربرآوردہ ڈاکٹر کی یہ پختہ رائے تھی کہ گرمی کے موسم میں نورمنڈی کے سمندری کنارہ پر (NORMANDY COAST) رہنا صحت بنانے اور صحت قائم رکھنے کے لئے بہت مفید ہے۔ خاص طور پر وہاں کے سمندر کی ہوا اور وہاں پر نہانا۔ اُس وقت سے جبکہ اُس بچہ کی عمر دو یا تین سال کی تھی۔ میری بیوی اس کو ہر گرمی کے موسم میں ڈووِل (DEAUVILLE) کے مقام پر لے جایا کرتی تھیں۔ اور جاڑوں کا موسم وہ دونوں جنوبی فرانس میں گذارتے تھے۔ چند سال میری بیوی مونٹے کارلو

(MONTECARLO) میں رہیں اور پھر سمیز (CIMIEZ) کو منتقل ہوگئیں۔

مئی ۱۹۱۰ء میں میرے بڑے اور اچھے دوست شاہ ایڈورڈ ہفتم کا لندن میں انتقال ہوگیا۔ جیسا کہ میری وفاداری اور دوستی کا تقاضا تھا۔ میں فوراً اُن کے جنازہ میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوگیا۔ اور اُن کے جانشین شاہ جارج پنجم سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔

بادشاہ مرحوم ونڈسر کے سینٹ جارج چیپل (ST.GEORGE'S CHAPEL AT WINDSOR) میں دفن کئے گئے۔ جنازہ کے جلوس اور گرجا گھر میں میری جگہ شاہی خاندان اور باہر والے شاہی مہمانوں کے قریب تھی۔ جلوس میں شہنشاہ جرمنی شاہ جارج پنجم کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اُن کی اس جگہ پر ایک معمولی مگر معنی خیز سیاسی واقعہ پیدا ہوگیا۔ جب کسی مقام پر مختلف بادشاہوں کی ایک خاص تعداد جمع ہوتی ہے تو بین الاقوامی قانون کے مطابق یہ قاعدہ ہے کہ اُن کا پہلا درجہ اُن کی تخت نشینی کی سینیرٹی (SENIORITY) کے اعتبار سے قائم کیا جاتا ہے۔ اُنکے ملکوں کی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے قائم نہیں کیا جاتا ہے۔ نہ اس طرح جیسے کہ کسی بین الاقوامی کانفرنس میں باہر کے نمائندوں کا درجہ حروف تہجی کے اعتبار سے قائم ہوتا ہے اس قاعدہ کے مطابق اگر شاہ بلگیریا (BULGARIA) (اُس زمانہ میں جب بلگیریا میں حکمران بادشاہ ہوا کرتا تھا) اپنے تخت پر سب سے پہلے بیٹھ چکا تھا تو وہ جلوس میں سب سے آگے رکھا جاتا تھا۔ اگر برطانیہ کا بادشاہ یا جاپان کا شہنشاہ حال ہی میں تخت نشین ہوا تھا تو اُس کو سب سے پیچھے رہنا پڑتا تھا۔ مگر اس موقع پر شہنشاہ جرمنی شاہ جارج پنجم کے برابر رکھے گئے جو تعزیت کرنے والوں میں خاص درجہ رکھتے تھے اور باقی تمام بادشاہ اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ یہ جھگڑا یوں ہی دیکھا دیکھی پیدا ہوگیا۔ اس وجہ سے کہ شاہ یونان جو تخت نشینی کے اعتبار سے سینئر تھے وہ شاہ اسپین کے آگے آگے چل رہے تھے۔ مگر شاہِ اسپین اپنے بچپن میں تخت پر بیٹھ چکے تھے قبل اس کے کہ شہنشاہ جرمنی کو اپنے تخت کی وراثت حاصل ہوئی اس لئے شاہ ایلفنسو (KING ALFONSO) خود کو قیصر جرمنی کے برابر ضرور خیال کرتے تھے گو وہ خود کو اُن سے بڑا نہ سمجھتے ہوں۔ جب مختلف بادشاہوں نے وہاں سے

رخصت حاصل کرلی اور اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے تو اسپین کے سفیر نے اپنے بادشاہ اور اپنی حکومت کی طرف سے اس بات کے خلاف ایک باقاعدہ اعتراض اور شکایت پیش کی کہ شہنشاہ جرمنی کو ملک معظم اسپین کے آگے جگہ دینے سے اُن کی سخت توہین ہوئی ہے اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ چونکہ شاہِ یونان تخت نشینی کی سنیرٹی کے اعتبار سے شاہ اسپین کے آگے رکھے گئے تھے۔ اِس لئے اگر قاعدہ کی مناسب طور پر پابندی کی جاتی تو شاہِ یونان اور شاہِ اسپین دونوں شہنشاہ جرمنی کے آگے رکھنے چاہئیں تھے۔ اس واقعہ سے دفتر خارجہ اور شاہی دربار والے بڑے چکر میں پڑ گئے۔ اگر اس کے متعلق معافی مانگی جاتی تو وہ اور بھی زیادہ بری اور بیکار بات ہوتی چونکہ شاہی درجہ اور سلطنت کے عہدہ داروں سے یہ امید نہیں کی جاتی ہے کہ وہ اس قسم کی غلطیاں کریں۔ آخرکار یہ معاملہ بادشاہ سلامت کے پاس پہنچا۔ اور انہوں نے اس کا فیصلہ بہت ذہانت اور حکمتِ عملی کے ساتھ کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ "قیصر جرمنی شاہ ایڈورڈ مرحوم کے بھتیجے تھے اور خود میرے چچازاد بھائی۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر ان کا درجہ اوروں سے اوپر رکھا گیا جو بہ حیثیت خاندانی تعزیت کنندہ کے تھا نہ کہ بہ حیثیت حکمران بادشاہ کے۔"

اِس افسوسناک چھوٹے سے پیچیدہ واقعہ کو چھوڑ کر ساری رسم بہت زیادہ اثر ڈالنے والی تھی۔

اِس کے بعد اس مسئلہ پر بھی کچھ دقت پیش آئی کہ امریکہ کے سابق صدر مسٹر تھیوڈور روسویلٹ (MR. THEODORE ROOSEVELT) کو جو اپنے ملک کے سرکاری نمائندے تھے اس جنازے کے جلوس میں کون سا درجہ رتبہ کے اعتبار سے دیا جائے۔ چونکہ وہ شاہانہ شخصیت نہیں رکھتے تھے اس لئے جنازہ کے جلوس میں اور دوسری اہم رسموں کے موقعہ پر اُن کی جگہ یہی شمار کی جاتی تھی۔ امریکہ اور فرانس دونوں نے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا جو حالانکہ اس زمانہ کے بین الاقوامی رواج سے پوری مطابقت رکھتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ غیر شاندار اور زمانہ کی رفتار کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت سے آئندہ کے لئے یہ مناسب طریقہ پر طے ہوگیا کہ جمہوریتوں کے نمائندے بادشاہوں کی برابر رتبہ پائیں گے اور

اُس کے لئے ایک نیا اور پہلے سے بہتر رتبہ قائم کرنے کا ضابطہ مقرر کر دیا گیا۔

اُس دن بہت سی آنکھیں تر ہو رہی تھیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں ہے کہ میری آنکھیں بھی اُس روز تر تھیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شاہ جارج پنجم نے انڈیا آفس کو یہ احکام بھیج دیئے کہ دربار میں شریک ہونے کے لئے میرے نام دعوت نامہ ایک خاص اور بادشاہ کے ذاتی معزز مہمان کی حیثیت سے ارسال کیا جائے۔ اس دعوت نامہ میں صرف درباری رسم میں شرکت کرنے کی دعوت نہ ہو بلکہ اور تمام قسم کی رسموں۔ دعوتوں اور سرکاری استقبالیہ جلسوں میں شریک ہونے کی دعوت بھی شامل ہو۔ چنانچہ شاہی تھیٹر گھر میں جو خاص خاص خوشی کے کھیل دکھائے گئے ان میں میری جگہ بادشاہ کے ساتھ بیٹھنے والے آدمیوں میں رکھی گئی۔

شاہ جارج پنجم کا درباری جشن جون ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ وہ بڑی شان و شوکت کا تھا۔ جس میں برطانیہ کی ساری عظمت دولت اور قوت کا سرکاری طور پر مظاہرہ کیا گیا۔ ۱۹۱۱ء کا سال ایسا تھا جس میں مختلف ملکوں کے درمیان کشیدگی روز بروز بڑھ رہی تھی اور برطانیہ میں اندرونی سیاسی اختلافات پیدا ہو رہے تھے۔ یہ اختلافات جو مسٹر لائڈ جارج (MR. LLOYD GEORGE) کی بجٹ والی تجویزوں پر تھے۔ آئرلینڈ کے مسئلہ پر تھے اور دارالامرا (HOUSE OF LORDS) کے قانونی رتبہ کے متعلق تھے بے انتہا تلخ ہو گئے تھے۔ اس آنے والے طوفان کے سیاہ بادل تو ایک طرف منڈلا رہے تھے۔ مگر دوسری طرف اس کے مقابلہ میں درباری جشن کا موسم اپنی خاص بہار اور خوشی کے ساتھ نمودار ہو رہا تھا۔ مجھے اس زمانہ کی دو باتیں بہت وضاحت کے ساتھ یاد ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ ناچ کی محفل ہے جو کوونیٹ گارڈن (COVENT GARDEN) کے مقام پر اس خوشی کی رسم کو منانے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ وہ پیویلین ڈی آرمڈ (PAVILION D' ARMIDE) میں ہوئی تھی۔ اور وہ یقیناً سب سے زیادہ مناسب ناچ کی محفل تھی جو ایسے موقعہ پر ممکن ہو سکتی تھی اور اس میں خاص ناچنے والوں میں نجنسکی اور کرساونا (NIJINSKY AND KARSUANIA) تھے۔ اس محفل میں ایسی خوبی اور لطف تھا جس کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ میرے حافظہ میں اُس کی یاد تازہ ہے

اور مجھ کو اب تک سب سے بہتر تھیٹر دیکھنے کے جو تجربے ہوئے ہیں اُن میں سے ایک تجربہ اس محفل کا ضرور ہے۔

دوسری بات جو مجھ کو یاد ہے اور جس کا اثر میرے دل پر مستقل طور سے ہوا۔ وہ وہاں پر جرمنی کے ولی عہد شہزادہ کی موجودگی تھی۔ اور وہ توجہ جو اُن کو دی گئی وہ حقیقی اور دلی کوشش جو ہر شخص نے بادشاہ اور ملکہ سے لے کر نیچے تک اس شہزادہ کو اس کا یقین دلانے کے لئے کی کہ برطانیہ کی نیک نیت اور صلح کے ارادے جرمنی کے ملک کے ساتھ ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ کوونیٹ گارڈن کے (COVENTGARDEN) مقام پر جرمنی کے ولیعہد شہزادہ کو ملکہ میری کے داہنی طرف بیٹھنے کی جگہ دی گئی اور میں نے دیکھا کہ ملکہ نے اُن کو بڑی میٹھی میٹھی باتوں میں لگائے رکھا۔ اور ملکہ کا اخلاق اُن کے ساتھ صرف رسمی اور سرد قسم کا نہ تھا۔

چند ماہ بعد بادشاہ اور ملکہ دونوں ہندوستان کے لئے اپنے سفر پر روانہ ہوگئے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے زمانہ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہاں کا حکمران بادشاہ اور اس کی ملکہ ہندوستان کو دیکھیں۔ ۱۹۱۲ء کے شروع میں وہ شان دار تاج پوشی کا دربار دہلی میں منعقد ہوا۔ اس موقعہ پر یہ اعلان کیا گیا کہ دارالسلطنت اور حکومت کا مرکز کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا جائے گا اور ایک ایسا شہر بنایا جائے گا جو ہندوستانی سلطنت کی شان۔ قوت اور (جیسا کہ اُس وقت معلوم ہوتا تھا) اس سلطنت کے استقلال کے مناسب ہو۔ بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی گئی اور علیگڈھ کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ وہ کام تھا جو گذشتہ سالوں میں میری کوشش کا کامیاب نتیجہ اور اس کی انتہائی منزل تھی جس میں ان لوگوں کی کوشش بھی شامل تھی جنہوں نے میرے ساتھ ایسے جوش و استقلال کے ساتھ کام کیا تھا۔ ملک معظم نے ذاتی طور پر مجھ کو وہ سب سے بڑا خطاب عطا فرمایا جو کسی ہندوستانی کو جو برطانوی راج کی رعایا ہو عطا کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ یعنی مجھ کو K.G.C.S.I. بنا دیا۔

KNIGHT GRAND COMMANDER OF THE STAR OF INDIA)

دربار کی رسمیں سب بڑی شاندار تھیں مگر اُن کو دو عجیب ناخوشگوار رکاوٹوں نے خراب کر دیا۔ اُن میں ایک یہ تھی کہ بڑی سرکاری دعوت کے موقعہ پر جب ایں ہندوستان کی بہت سی مشہور ہستیاں مدعو کی گئی تھیں۔ باورچیخانہ میں کچھ گڑبڑ واقع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کھانا وہاں سے آیا وہ صرف اتنا تھا کہ بادشاہ اور اُن کے چند ساتھی جو اُن کے پاس بیٹھے تھے پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ بہت سے مہمانوں کے لئے اپنی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُن کو بادشاہ کے ساتھ کھانا کھانے کا موقعہ ملے مگر تقریباً ان سب کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ تھا۔

دوسری رکاوٹ جو پیدا ہوئی اُس میں بہت زیادہ خطرناک امکانات موجود تھے۔ وہ ایسے ہوا کہ وہ جلسہ جس میں مجھ کو جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا گیا۔ رات کے وقت ایک وسیع خیمہ کے اندر منعقد ہوا جس میں خوب روشنی کی گئی تھی۔ یہ ایک مکمل سرکاری رسم تھی۔ ملک معظم اور اُن کی ملکہ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ والسرائے۔ صوبہ کے گورنر۔ کمانڈر انچیف اور تمام سینئر فوجی کمانڈر رحکمران شہزادوں کی ایک شاندار جماعت۔ تمام سربرآوردہ عہدہ دار جن میں ہندوستانی اور انگریز جو ہندوستان کے ہر گوشہ سے آئے تھے شامل تھے۔ اس شاندار اور قابل یاد موقعہ کے اعزاز میں اس مقام پر جمع ہوئے تھے۔ اتفاقاً ایسا ہوا کہ بجلی کا ایک بلب جو کرمچ کے شامیانہ کی چھت میں بہت اوپر کی طرف لگا ہوا تھا خراب ہونا شروع ہوا اور وہ لپ لپ کرنے لگا۔ سب آنکھیں اس کی روشنی کی طرف لگ گئیں جو کبھی کم ہو جاتی تھی اور کبھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ "فرض کیجئے کہ یہ بلب پھٹ جائے"۔ یہ خوفناک خیال خاموشی کے ساتھ اس ایک لمحہ کے اندر تقریباً ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہو گیا جو وہاں موجود تھا۔ فوراً سیٹیاں بجنے لگیں اور ہم نے سنا کہ آگ بجھانے والے انجنوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ ملک معظم اور ملکہ کے تختوں کے پیچھے فوجی افسروں نے اپنی تلواریں نکال رکھی تھیں اور وہ شامیانہ کے پردوں اور کرمچ کی چہار دیواری کو ہٹا رہے تھے تاکہ باشاہ اور ملکہ کے باہر جانے کے لئے راستہ بنا دیں۔ مگر ان کے علاوہ ہم سب لوگ وہیں پر پھنسے ہوئے تھے۔ اگر اُس خیمہ میں آگ لگ جاتی تو وہ سب اس طرح جل جاتا جیسے کوئی سیلولائڈ کی

پنگ پونگ گیند (CELLULOID PINGPONG BALL) چولھے کے پاس ڈالنے سے جل جائے اور ہم میں سے کوئی بھی جو اس خیمہ کے اندر تھا زندہ نہ رہتا۔ اس مصیبت کا وہ پہلو جو انسانی ہمدردی سے تعلق رکھتا تھا اور جس پر ہم نے غور کیا وہ کافی خوفناک تھا۔ مگر ہم میں سے بہت سے آدمیوں کے نزدیک یہ خیال اس سے بہت زیادہ خوفناک تھا کہ اس واقعہ کے بعد سارے ہندوستان میں ایک قسم کا سیاسی۔ انتظامی اور تمدنی خلا پیدا ہو جائے گا۔ چونکہ ملک میں ایک بھی سربرآوردہ اور رہنمائی کرنے والا آدمی باقی نہ رہیگا۔ اس کے بعد دوسرے دن ملک معظم اور وائسرائے نے مجھے بتایا کہ آئندہ کے لئے فوری احکام جاری کر دیے گئے تھے کہ اس قسم کی کوئی رسم کبھی اس کے بعد رات کے وقت خیمہ کے اندر نہ منائی جائے۔

درباری جشن منانے کے سلسلہ میں جو ایک بڑی فوجی پریڈ دکھائی گئی تھی وہ درحقیقت درباری رسوم کی ایک مرکزی خصوصیت تھی۔ ہم میں سے بہت سے آدمی خواہ وہ ہندوستانی تھے یا انگریز روز بروز اس بات سے بہت اچھی طرح واقف ہوتے جارہے تھے کہ برطانیہ کی عالمگیر شاہانہ جنگی مصلحت کی وجہ سے ہندوستان کی فوج بڑی اہمیت رکھتی تھی چونکہ برطانیہ کے مقبوضہ ملک دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ برطانیہ نے بہت سے ملکوں سے بہت سے معاہدے کر رکھے تھے۔ اور بین الاقوامی کشیدگی کا احساس بڑھتا چلا جارہا تھا۔ برطانیہ کی باضابطہ فوج جس کا کافی بڑا حصہ حسب معمول ہندوستان میں مقیم رہتا تھا گو بہت اچھا ٹرین کیا ہوا اور قابل تعریف دلاورانہ ذہنیت کا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ان فوجوں کے مقابلہ میں بہت کم تھا جو برطانیہ کے امکانی دشمنوں کے پاس موجود تھیں۔ ہیلڈین (HALDANE) نے بحیثیت وزیر جنگ کے فوجی مشین کے نظام کو نہایت مکمل طریقہ پر دوبارہ ترتیب دے دیا تھا اور اس نے والنٹیروں کی فوج اور خاص خاص وقت پر کام کرنے والی ملکی فوج بھی تیار کر لی تھی مگر برطانیہ نے اس زبردست فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹسن (LORD ROBERTS) کی اس ضروری تجویز پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ سارے یورپ میں عام طور پر سب کو فوجی خدمت کرنے کا قاعدہ مقرر کر دیا جائے۔

مجھے اِس سلسلہ میں یہ موقعہ ملا کہ میں یہ ظاہر کروں کہ برطانیہ کی فوجی ضروریات کا احساس جو روز بروز بڑھ رہا تھا اور ان ضروریات سے جو ہندوستان کا تعلق تھا وہ میرے اس جذبہ سے کتنا ملا ہوا ہے جو ہندوستانیوں کو تعلیم دلانے کے لئے میرے اندر موجود تھا۔

جولائی سنہ ۱۹۱۱ء میں لیو میکس (LEOMAXSES) کے رسالہ نیشنل ریویو (REVIEWNATIONAL) میں جو مضمون میں نے شائع کیا اُس میں میں نے اپنے دلائل کو اتنے زور کے ساتھ پیش کیا جتنا کہ میں کرسکتا تھا (یہ رسالہ ایسا نہ تھا جس کے شاہانہ نظریات اور پالیسی سے مجھے اتفاق تھا بلکہ وہ ایسا رسالہ تھا جس کو وہ آدمی کافی تعداد میں پڑھتے تھے۔ جن تک میں اپنے خیالات پہنچانے کی خواہش رکھتا تھا) میں نے اُس میں لکھا۔

"تعلیم دلاؤ۔ تعلیم دلاؤ۔ تعلیم دلاؤ۔ تھوڑی دیر کے لئے انسانی قوت کے مسئلہ پر غور کرو۔ ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں سے جنوبی افریقہ کو فوجیں اتنی ہی جلد بھیجی جاسکتی ہیں جتنا کہ انگلستان سے۔ ہندوستان کے سپاہی اسٹریلیا میں اس سے بہت پہلے پہنچ سکتے ہیں کہ وہاں پر انگلستان اپنے سپاہی پہنچا سکے۔ ہندوستان کی فوجیں مغربی کنیڈا میں تقریباً اتنی ہی جلد پہنچ سکتی ہیں جتنا کہ انگلستان سے۔ اگر تعلیم کے ذریعہ سے ہندوستان کے لاکھوں آدمیوں کو یہ سکھایا جاسکے کہ وہ برطانوی تاج کے اسی طرح محافظ اور مددگار نے والے ہیں جس طرح برطانوی سلطنت کے گورے رنگ والے شہری ہیں تو اُس وقت یہ احساس کہ ہندوستان اور خود مختار نوآبادیات دونوں ساتھ ساتھ قائم رہیں گے اور ساتھ ساتھ ختم ہوجائیں گے ضرور پیدا ہو جائے گا۔ چونکہ ان دونوں کی مشترکہ دلچسپیاں ایک دوسرے کو باندھے ہوئے ہیں اور ان دونوں کو ایک مشترکہ مقصد کو پورا کرنا ہے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ برطانوی سلطنت میں اپنے آئندہ کام کے لئے موزوں ہوجائیں"

دو عالمگیر جنگوں کے زمانہ میں جن میں سے ایک صرف اس وقت سے تین سال بعد ہی

شروع ہوگئی۔ جب میں نے مندرجہ بالا الفاظ لکھے تھے۔ میرے سب دلائل پورے طور پر حق بجانب ثابت ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۲ء کے موسم خزاں میں میرا سفر پھر شروع ہوگیا اور اس مرتبہ روس کی طرف کو ہوا۔ زار روس نکولس دوم (THE CZAR NICHOLAS II) جو دیکھنے میں اپنے رشتہ کے بھائی شاہ جارج پنجم سے تقریبًا دو گنے معلوم ہوتے تھے۔ اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں ہندوستان آچکے تھے۔ اس واقعہ کو بہت سال گذر چکے تھے اور میں اُس کے بعد سے ان سے کبھی نہیں ملا تھا۔ اُن کے بہت سے عزیز عادتًا جنوبی فرانس جایا کرتے تھے۔ جن میں بڑے شہزادے بورس اور نکولس (GRAND DUKES BORIS AND NICHOLAS) بھی ہوتے تھے اور زار روس کے خاص بھائی گرانڈ ڈیوک میکائیل (GRAND DUKE MICHAEL) بھی ان میں سے بعض آدمیوں کے ساتھ میرے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور انہوں نے اکثر مجھے دعوت دی تھی کہ میں ان کے وطن میں آکر اُن سے ملوں۔

انگلستان اور یورپ کے بہت سے دوسرے ملکوں میں زمینداروں اور رئیسوں کی زندگی اپنی خاص قسم کی شان وشوکت اور حاکمانہ ٹھاٹ باٹ رکھتی تھی۔ مگر جیسا کہ میں نے اُس سردی کے موسم میں دیکھا سینٹ پٹرس برگ (ST. PETERSBURG) میں وہاں کے رئیس لوگ جس طرح کی عیش وآرام اور مالداری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جو بہت ہی پرتکلف اور بناوٹی وجوہ رکھتی تھی اس کے مقابلہ میں انگلستان وغیرہ کی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

تیس سال سے زیادہ گذر چکے ہیں جب کہ روس کے انقلاب نے اُن رئیسوں کی دنیا کو برباد کیا تھا۔ اُن میں سے بہت سے قتل کر دیئے گئے۔ بہت سے جلاوطن ہو کر باہر چلے گئے۔ اور ایسے شہروں میں پہنچ گئے جیسے ہاربن (HARBIN) شنگھائی (SHANGHAI) قسطنطنیہ (CONSTANTINOPLE) برلن (BERLIN) پیرس (PARIS) اور جنوبی فرانس کے مقامات۔ ان لوگوں میں جن کو اپنی زندگی دوبارہ شروع سے آخر تک بنانی پڑی ایک معزز سپاہی بھی تھے۔ جن کا نام تھا جنرل پولوٹسوف (GENERAL POLOVTSOFF)

تھا جو پہلے لندن میں ملٹری اٹیچی (MILITARY ATTACHE) تھے اور جو برسوں تک مونٹے کارلو (MONTECARLO) میں بہت مشہور اور ہر دلعزیز انسان رہ چکے تھے۔ جلاوطنی میں اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرح انہوں نے بھی اپنی زندگی کی تبدیلیوں کو بہت بہادری، متانت اور ایک اچھی اور اونچی اسپرٹ (SPIRIT) کے ساتھ برداشت کیا تھا۔ ایسا اتفاق ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں مجھے جنرل پولووٹسوف (GENERAL POLOVTSOFF) اور اُن کے بھائی کے اس مکان یعنی بڑے محل میں مہمان رہنا پڑا جو اُن کو وراثتاً اپنے باپ سے ملا تھا جو زار روس (CZAR) کے وزیروں میں سے تھے۔

اس مکان کی شان و شوکت بیان سے باہر تھی وہ دعوت کا ہال (BANQUETTING HALL) جس میں میرے میزبانوں نے میرے اعزاز میں ایک لنچ پارٹی (LUNCHEON PARTY) دی تھی مجھے یقین ہے کہ اتنا بڑا تھا کہ وہ اٹھارھویں صدی کے اٹلی والے محل کے بڑے ہال سے پورا تین گنا زیادہ تھا۔ اس کی دیواروں پر شاندار تصویریں اور پردے لٹکے ہوئے تھے۔ وہاں پر شیشے کے گملوں میں لگے ہوئے بہت مختلف رنگوں کے اور نہایت تیز خوشبو والے پھولوں کی روش چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جو دعوت وہاں پر کی گئی وہ بذاتِ خود بہت بڑے پیمانہ پر تھی۔ یہ اُن بہت سی دعوتوں میں سے ایک دعوت تھی جو اسی قسم کے مکانات میں میری ضیافت کے لئے کی گئیں اور جو سب قریب قریب ایسی شاندار تھیں جیسے کہ پرانے زمانہ کے پریوں کے قصے۔

وہاں پہ میری زندگی ایک عجیب اور شروع شروع میں کچھ غیر معینہ ٹائم ٹیبل کے مطابق گذرنے لگی جس کے لئے میں فوراً تیار نہ ہو سکا۔ چونکہ میں لندن اور پیرس کی سوشل زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ رات کے کھانے پر میری بہت سی دعوتوں میں سے سب سے پہلی دعوت نے مجھ پر یہ ظاہر کیا کہ مجھ کو وہاں پر کیا سیکھنا تھا۔ ایک مشہور جنرل کے مکان پر مجھے ایک بڑی دعوت میں رات کے وقت مدعو کیا گیا جس میں چند گرانڈ ڈیوک (GRAND DUKES) اور تھیٹر کی سربرآوردہ خواتین آنے والی تھیں۔ لندن اور پیرس کے اندر اس قسم کی دعوتوں کے متعلق جو میرا خیال تھا اس کے مطابق میں اس مکان پر

آدھی رات کے کچھ بعد پہنچ گیا۔ مگر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہاں پر کوئی شخص موجود نہ تھا۔ ملازم بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سو کر اُٹھے ہیں چونکہ وہ روشنیاں ٹھیک کرتے ہوئے چاروں طرف جلدی جلدی پھر رہے تھے۔ ایک گھنٹہ یا اس کے قریب تک میں کچھ پریشانی کی حالت میں انتظار کرتا رہا تب میرے میزبان اور اُن کی بیوی نیچے زینہ سے اتر کر آئے۔ ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان اور دوسرے مہمان آنے شروع ہوئے اور اُس وقت وہ وسیع کمرہ کچھ کم خالی معلوم ہونے لگا۔ ٹھیک دو بج چکے تھے جب ہم نے کھانا شروع کیا۔ کھانے کے بعد کچھ گانا ہوا اور اُس وقت تقریبًا ساڑھے چار بج رہے تھے۔ جب وہ پارٹی ختم ہوئی اور ہم لوگ اپنے گھر گئے مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ یہ وہاں کا معمولی قاعدہ اور عام دستور تھا۔

سینٹ پیٹرزبرگ (ST.PETERSBURG) جاڑوں کے موسم کا دارالسلطنت تھا۔ اس کا موسم جاڑوں کے موسم میں آتا تھا۔ میں وہاں پر اس موسم کے شروع ہونے کے قریب آخر نومبر میں پہنچا۔ اُس وقت سردی بہت سخت تھی۔ دن چھوٹے اور تاریک ہوتے تھے راتیں لمبی اور تکلیف دہ ہوتی تھیں اور سارا شہر برف سے ڈھکا رہتا تھا۔ میرے نزدیک وہاں کی زندگی میں غیر معمولی حرکت اور ہم آہنگی کے یہی اسباب تھے۔ دن عام طور پر دوپہر بعد شروع ہوتا تھا۔ دوکانیں۔ بینک اور دفتر شام کو دیر تک کھلے رہتے تھے۔ دن ڈھلنے کے بعد سے وہاں کام کاج اور تجارتی کاروبار ہوتا تھا۔ رات کا سارا وقت ان مختلف اور نفیس مشغلوں اور تفریحوں میں لگایا جاتا تھا جو ایک دل خوش۔ مہذب اور ملی جلی سوسائٹی کے اندر پائی جاتی ہیں۔ تھیٹر نہایت اعلیٰ قسم کے تھے اور اسی طرح وہاں گانے اور ناچنے کے مقامات تھے۔ بے شمار پارٹیاں ہوا کرتی تھیں اور تین گھوڑوں والی گاڑی میں بیٹھ کر چاندنی راتوں میں برف سے ڈھکے ہوئے نیوا (NEVA) کے کنارہ کنارہ کسی ایسے جزیروں میں تفریح کے لئے جایا کرتے تھے جو دارالسلطنت سے زیادہ دور نہ ہوا کرتے تھے۔ دن کی روشنی میں چند گھنٹوں کے لئے اکثر شکار کی پارٹیاں آس پاس کے مواضعات میں جایا کرتی تھیں۔ جہاں پر شوقین شکاری صرف پرند جانوروں اور ہرن کا ہی شکار نہیں کرتے تھے بلکہ ریچھ کا شکار بھی کرتے تھے۔

میرے خیال کے مطابق وہاں کے تمام مکانات بہت زیادہ گرم کئے جاتے تھے۔ اور ان میں روشنی پہنچنے کا انتظام بہت کم تھا۔ میں لندن اور پیرس میں رہ کر ایسے مکانات کا عادی ہو گیا تھا جن میں سردی کے موسم میں بھی کھڑکیاں اور دروازے برابر کھلے رہتے تھے اور مجھ کو اس معاملہ میں روسیوں کی عادت پر بڑا تعجب ہوا اور کافی نفرت سی ہو گئی وہاں کے تمام مکانات میں دوہری شیشہ کی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ شروع نومبر میں کسی وقت جب سردی کا موسم شروع ہونے والا ہوتا مستری لوگ وہاں آتے تھے اور سب کھڑکیوں کو کیلیں ٹھوک کر بند کرتے تھے تاکہ وہ پھر اپریل کے آخر تک نہ کھولی جا سکیں۔ جو کچھ تازہ ہوا کسی کمرہ میں آ سکتی تھی وہ سب اسی طرح کے بند کمروں میں آ سکتی تھی۔ برطانوی سفارت خانہ میں میرے قیام کی سب سے پہلی رات کو میں نے اپنے میزبان سفیر کی بیوی لیڈی بچنن (LADY BUCHANAN) سے کہا کہ میں اس رواج کو بہت زیادہ تندرستی کے خلاف اور ناخوشگوار خیال کرتا ہوں اس نے مجھے جواب دیا کہ جب وہ اور اس کے شوہر پہلی مرتبہ سینٹ پیٹرزبرگ (ST. PETERSBURG) آئے تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ وہاں پر اسی طرح رہیں جیسے کہ وہ انگلستان میں رہتے تھے جہاں پر کھڑکیاں کبھی بھی خواہ دن میں خواہ رات کو پوری طرح بند نہیں رکھی جاتی تھیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا سارا گھر بیمار پڑ گیا اور پھر ان کو مجبوراً اس ملک کا رواج قبول کرنا پڑا۔ اس کے بعد سے کسی قسم کی بیماری نہ رہی۔ اس نے مجھ کو یہ بھی بتایا کہ وہاں کے سب بڑے مکانات میں جہاں پر پارٹیاں دی جاتی تھیں اور جہاں پر آدمیوں کی بڑی تعداد جمع ہوتی تھی۔ سب کمروں میں خوشبو کی جاتی تھی اور ان کی ہوا خاص طور پر صاف اور خوشگوار بنائی جاتی تھی۔

مکانات کو اس طرح مستقل طور پر زیادہ گرم رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سب طبقوں کے روسی کمرہ کے اندر نسبتاً ہلکے کپڑے پہنتے تھے۔ مگر جب وہ کمرے کے باہر جاتے تھے تو ہر شخص اپنے اوپر موٹے موٹے اونی کپڑے لاد لیتا تھا۔ مال دار لوگ سیبل (SABLE) کی کھال یا سیبل کی اون کے کپڑے خوب لپیٹ لیتے تھے اور غریب آدمی بھیڑ کی کھال استعمال کرتے تھے۔ ہر شخص کے پاس بھیڑ کی کھال یا اون کی ٹوپیاں۔ موٹے گرم دستانے اور

برف کے بوٹ ضرور ہوتے تھے۔ مجھ سے اکثر آدمی کہا کرتے تھے کہ کبھی کسی آدمی کو گرم کمرہ سے نکل کر فوراً باہر کی سخت ٹھنڈی ہوا میں نہیں جانا چاہیئے۔ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ روسیوں کا سارا طرزِ زندگی تندرستی کے خلاف ہے جیسا کہ کسی حد تک میرے خیال میں کنیڈا (CANADA) کے اندر سردی کے موسم میں یا امریکہ کی بہت سی شمالی ریاستوں میں پایا جاتا تھا۔ مگر سینٹ پیٹرزبرگ (ST. PETERSBURG) اور ماسکو (MOSCOW) میں چند ہفتے رہنے کے بعد میرا یہ وہم جاتا رہا۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہرمیٹیج عجائب خانہ (HERMITAGE MUSEUM) اُن سب عجائب خانوں سے بہتر تھا جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی دیکھے تھے۔ وہ لوور (LOUVRE) سے نیشنل گیلری (NATIONAL GALLERY) سے یا نیویارک کے میٹروپولٹن عجائب خانہ (NEW YORK'S METROPOLITAN MUSEUM) سے بہت زیادہ بہتر تھا۔ اس کی بہتری اس کے سخت انتخاب پر منحصر تھی۔ وہاں پر کوئی چیز معمولی قسم کی یا تھرڈ کلاس سامان کی دکھانے کے لئے نہیں رکھی جاتی تھی۔ جو چیز بھی دکھائی جاتی تھی وہ اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی۔ وہاں پر اس کی ضرورت نہ تھی کہ آپ گھٹیا قسم کی چیزیں۔ قابل اعتراض بھرتی کی چیزیں بڑے استادوں کے شاگردوں کی بنائی ہوئی مشقی چیزیں اور ان کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی چیزیں عجائب خانہ کے اندر دور دور میلوں تک دیکھتے چلے جائیے جیسا کہ ہر بڑے عجائب خانہ یا آرٹ گیلری (ART GALLERY) میں جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے پایا جاتا ہے۔ مگر اس ہرمیٹیج میں کاونٹ ٹالسٹوے (COUNT TOLSTOY) کی ہدایت کے بموجب جو اس مشہور ناولسٹ ٹالسٹوے کا رشتہ دار تھا۔ اس قسم کا تمام سامان سختی کے ساتھ تہ خانوں کے اندر دبا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ اس نے ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کے ذریعے سے ہر وہ چیز جس میں کوئی خاص ذاتی خوبی اور فضیلت نہ پائی جاتی ہو۔ دیواروں سے الگ کر دی جاتی تھی۔ خواہ وہ چیز کسی بڑے کاریگر کی بنائی ہوئی ہو۔ یا جس کے متعلق یہ خیال ہو کہ کسی بڑے کاریگر نے بنائی ہوگی۔ اس انتظام کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ وہاں پر بہترین چیزوں کا ایک مختصر اور صاف ستھرا مجموعہ رکھا جاتا تھا اور وہ غیر معمولی طور پر دل خوش کرنے والا ہوتا تھا۔

ہرمیٹج (HERMITAGE) کی قیمتی چیزوں میں قدیم انگریزی چاندی کا ایک تعجب خیز ذخیرہ بھی موجود تھا۔ جو شاہ چارلس دوم (CHARLES II) کے زمانہ کا تھا جب کہ انگلستان میں چاندی کے کام کا ہنر اپنے انتہائی کمال پر تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چاندی کا ذخیرہ پیٹر اعظم (PETER THE GREAT) نے جمع کیا تھا جو جوانی کی عمر میں انگلستان آیا تھا۔ اور جس نے ڈیٹ فورڈ (DEPTFORD) کے جہازی کارخانوں میں کام کیا تھا۔ وہ نیم وحشی اور نیم ذہین آدمی تھا۔ مگر اس کے اندر ایک زبردست اور حقیقی حسن پرستی کی لہر پائی جاتی تھی۔ اُس کا مذاق نہایت اعلیٰ تھا۔ ذرا اُن تصویروں کو دیکھیے جن کا اُس نے اُس زمانہ میں انتخاب کیا جب وہ ہالینڈ میں تھا۔ اس کا فیصلہ یقینی طور پر صاف اور پختہ ہوتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں کس طرح خوشی سے مست ہو گیا تھا جب میں نے سینٹ پیٹرزبرگ (ST. PETERSBURG) کے مقام پر سینٹ آئیزک (ST. ISAAC) کے گرجا گھر میں وہاں کا کورس گانا سنا۔ میں نے مغربی یورپ میں رومن کیتھولک (ROMAN CATHOLIC) اور اینگلیکن (ANGLICAN) گرجا گھروں میں بہترین گانے سنے ہیں۔ مگر میں نے کبھی (CHOIR) گرجا گھر میں گانے والی جماعت کا ایسا گانا نہیں سنا جو اتنا صاف اور شاندار تھا جیسا کہ سینٹ پیٹرزبرگ (ST. PETERSBURG) کے گرجا گھر میں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ سارے روس میں سے لڑکوں کی بھرتی کی جاتی تھی اور اُن کو چھوٹی عمر ہی سے تربیت دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو مناسب پیشوں کی با کس اور ہنر کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

مجھے زار روس (CZAR) سے ملنے یا اُن سے گفتگو کرنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا حالانکہ زار کے بھائی گرانڈ ڈیوک میکائیل (GRAND DUKE MICHAEL) اور اُن کے دوسرے رشتہ کے بھائیوں اور اُن کی فوج کے افسروں کے ساتھ میرا بہت زیادہ میل جول رہا زار روس ایک عجیب تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی غم انگیز تکلیف سے بھری ہوئی حکومت کے آخری سالوں میں اُن کی تنہائی اور زیادہ گہری ہوئی تھی اور ان کی ملاقاتوں کا دائرہ اور تنگ ہو گیا تھا۔ وہ اعصابی شرمیلے اور قدرتی طور پر اُداس مزاج کے آدمی تھے اُن کی ملکہ کی پاکبازی وہم کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ دلیر اور رعب دار تھیں۔ مگر اصلی

دنیا سے اُن کو بالکل لگاؤ نہ تھا۔ اُن کا بیٹا اور تخت کا مالک بہت نازک اور بیمار رہنے والا آدمی تھا۔ اُن کی زندگی کے تمام واقعات کچھ اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ اُن کو ایک تاریک علیحدگی میں رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اگر میں اُن سے ملاقات کرنا چاہوں تو اس کے لئے ایک باقاعدہ کوشش کی جائے گی اور ملاقات کی درخواست سفارت خانہ کے ذریعہ سے بھیجی جائے گی اور یہ کہ اس ملاقات کی نوعیت سرکاری ملاقات کی طرح شمار کی جائے گی۔ اس وجہ سے میں نے اس کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے بتایا گیا کہ زار (CZAR) کی بعض سوشل خصوصیات میں سے یہ بھی تھا کہ اُن کو تھیٹر دیکھنے کا شوق تھا۔ خاص طور پر پارٹی ناچ (BALLET) اور ڈرامے کا گانا۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ تھیٹر میں اس وقت آتے تھے جب کھیل شروع ہو جاتا تھا۔ اُن کے ساتھ ایک یا دو سرکاری دوستوں میں سے ہوا کرتے تھے۔ وہ چپکے سے ایک چھوٹے اسٹیج بکس (STAGE BOX) میں آ کر اس طرح بیٹھ جاتے تھے کہ اُن کو کوئی نہ دیکھے۔ اُن کی موجودگی کی صرف یہ علامت ہوتی تھی کہ اُن کے بکس کے پردے کے پیچھے سے بلند اور پرجوش نعروں۔ ہرا۔ بریو کی صدا سنائی دینے لگتی تھیں۔ شاید اسی مقام پر ایسا ہوتا ہو کہ تھیٹر کی اس مصنوعی دنیا سے چند قدم کے فاصلہ پر اسٹیج کے قریب یہ شرمیلا، غمگین اور تنہائی پسند آدمی اپنے غموں کو بھول جاتا ہو اور اپنی رکاوٹوں اور پابندیوں کو دور کر سکتا ہو۔

سینٹ پیٹرزبرگ (ST. BETERSBURG) سے میں ماسکو (MOSCOW) چلا گیا۔ اُس زمانہ میں ماسکو کی خوش حالی تجارت اور صنعت و حرفت پر منحصر تھی۔ سلطنت کے دفاتر اور حکمران طبقے نے سینٹ پیٹرزبرگ کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ مالدار صنعت و حرفت والے لوگ ماسکو کے خاص شہری ہو گئے تھے۔ ان کی دولت مختلف ذریعوں سے حاصل ہوتی تھی مثلاً شکر سے۔ بحر کاسپین (CASPIAN SEA) کے علاقہ میں تیزی سے ترقی کرنے والی تیل کی تجارت سے اور ماسکو کی روئی کے کارخانوں میں بنے ہوئے مختلف سامان سے۔ یہ لوگ امریکہ کے زبردست سرمایہ دار طبقہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ وہ بڑی شان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے مکانات دراصل محل اور عجائب خانے

معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ سینٹ پیٹرز برگ (ST. PETERSBURG) کے شرفاء کی طرح ان بڑے سوداگروں میں سے اکثر آدمی فنون لطیفہ کے شوقین اور پرکھنے والے تھے میں نے اتفاقاً محسوس کیا کہ ماسکو (MOSCOW) کا مذاق سینٹ پیٹرز برگ سے زیادہ وسیع تھا (CATHOLIC) وہاں پر میرے پسندیدہ فرانسیسی مصوروں نے کسی حد تک اچھا کام کیا تھا۔ مگر سینٹ پیٹرز برگ میں جتنی تصویریں میں نے دیکھیں وہ اول درجہ کے طریقہ پر بنی ہوئی تھیں۔

غریب اور امیر کے درمیان جو فرق تھا وہ بہت افسوسناک تھا۔ میں نے کچھ تکلیف اٹھا کر وہاں کی ملوں اور کپڑے کے کارخانوں میں مزدوروں کی حالت کا مطالعہ کیا۔ وہ بہت سی باتوں میں بمبئی کے روئی کے کارخانوں سے ملتے جلتے تھے۔ مگر وہاں کے حالات کی نسبت بے انتہا زیادہ خراب تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اس زمانہ میں بمبئی کی ملوں کے مزدور جو بہت غریب مصیبت زدہ اور بھوکے تھے۔ وہ ماسکو (MOSCOW) کے اسی قسم کے مزدوروں سے زیادہ خوش اور زیادہ زندہ دل معلوم ہوتے تھے۔ بمبئی میں آپ مزدوروں کے چہروں پر کم از کم کچھ مسکراہٹ محسوس کر سکتے تھے۔ مگر ماسکو کی مل کا مزدور بالکل اداس۔ وحشت زدہ اور مُردہ سا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا ہوتا تھا۔ اس کی شکل بھیانک ہوتی تھی اور وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ مرنے کے قریب ہو رہا ہے۔ مگر اس میں مجھے شبہ ہے کہ مزدوری یا کھانے کی مقدار کے اعتبار سے ماسکو کا مزدور بمبئی کے مزدور سے زیادہ بُری حالت میں تھا۔ اس فرق کا سبب میرے خیال میں ایک معمولی واقعہ پر منحصر تھا اور وہ آب و ہوا کا اثر تھا۔ بمبئی میں سال کے اندر کم از کم آٹھ مہینے تک جب مزدور کام سے فارغ ہوتا تھا تو وہ خواہ کتنا ہی غریب اور گرا ہوا کیوں نہ ہو پھر بھی وہ تازہ ہوا میں چل پھر سکتا تھا۔ چاند۔ سورج اور ستاروں کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس کے خلاف ماسکو کے مزدور کے لئے سال میں آٹھ مہینے تک صرف کارخانہ کے اندر زندگی بسر کرنا ممکن تھا۔ مل کی گرم اور دھواں والی فضا میں رہ کر یا کسی زیادہ گرم کئے ہوئے چھوٹے سے تنگ کمرہ میں رہ کر جو اُن بُری اور

بھیانک عمارتوں میں ہوتے تھے جو بارک کی طرح اُن مزدوروں کے رہنے کے لئے بنائی گئی تھیں اور جو اُن کے مکانات کا کام دیتی تھیں۔

اُس زمانہ میں روس کے بڑے شہروں کے عام غسل خانوں میں ایک عجیب رواج پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس قسم کا غسل خانہ ماسکو میں خود دیکھا اس لئے میں صرف سُن سُنا کر یہ ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ یہ رواج روس کے اُن غسل خانوں میں پایا جاتا تھا جو روس کے گرم غسل خانے کہلاتے تھے اور جو دراصل ہمارے ٹرکش باتھز (TURKISH BATHS) کے مانند تھے۔ جو ملازم وہاں آپ کی خدمت کرتے تھے۔ آپ کو صابون اور تولیہ دیتے تھے۔ آپ کے بدن کی مالش کرتے تھے اور آپ کی سب ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ وہ سب کے سب عورتوں میں سے ہوتے تھے۔ مگر زیادہ عمر کے اور اُن کی شکل ایسی معمولی اور مکروہ ہوتی تھی کہ یہ خیال کرنا بالکل ناممکن ہو جاتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بُری حرکت کی جا سکے۔ اور مجھے اس کا یقین بھی دلایا گیا کہ وہاں پر کبھی کوئی ایسی بُری حرکت واقع نہیں ہوئی۔ یہ صرف اس لئے کیا جاتا تھا کہ ادھیڑ عمر سے گذر جانے والی عورتوں کو مفید مشغلہ مل جائے۔ سوائے ایسے آدمی کے جو میری طرح ناتجربہ کار ہو اور وہاں پر دوسرے ملک سے آیا ہو اور کوئی شخص اس رواج کو کسی حد تک بھی عجیب اور غیر معمولی خیال نہیں کرتا تھا۔

جب میں روس ہی میں تھا اُسی وقت اُس بڑی آگ میں پہلی دیا سلائی لگائی گئی جو بہت جلد ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔ بلقان کی لڑائیاں۔ یعنی پہلے تو چھوٹے چھوٹے بلقانی ملکوں نے مل کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کیا اور پھر اُن کے آپس میں ایک دوسرے سے سخت خوفناک جھگڑے پیدا ہوئے۔ یہ سب باتیں صرف مقامی اختلافات اور مقامی جنگوں کی صورت میں ہرگز نہ تھیں جیسا کہ بہت سے آدمی ان کو ایسا ہی یقین کرنے کی کوشش کرتے تھے بلکہ وہ دراصل آئندہ ہونے والے واقعات کی صحیح علامتیں تھیں۔ ٹرکی جس کی اندرونی مشکلات اور تکالیف حال کے چند سالوں میں بہت زیادہ جمع ہو کر گہری ہو گئی تھیں اپنے دشمنوں کے مسلسل حملوں سے لڑکھڑانے

لگا تھا۔ روز بروز نئی مصیبتوں کی خبریں باہر کی دنیا میں پہنچا کرتی تھیں۔ جب تک میں پیرس واپس آیا اور قبل اس کے کہ میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوا ٹرکی کی بری حالت سب پر ظاہر ہو چکی تھی۔ اب یہ صرف وقت کا سوال رہ گیا تھا کہ کب اس کے دشمن اس کو مکمل طریقہ سے اپنے رحم وکرم پر لے آئیں۔ ہندوستانی مسلمانوں بلکہ درحقیقت ساری دنیائے اسلام کے جذبات میں بہت زیادہ حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے جہاں تک مجھ سے ہو سکا بمبئی واپس پہنچنے کی جلدی کی۔

میرے سب سے گہرے سیاسی دوست اور ملاقاتی اصحاب ترکوں کے واسطے بہت کام کر رہے تھے۔ ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی سب شاخوں کے نمائندے موجود تھے اور جس میں اکثر وہ لوگ شامل تھے جن کا تعلق علیگڈھ سے تھا۔ اس ادارہ کا مقصد یہ تھا کہ ترکی کو ہر ممکن مدد پہنچائی جائے اور برطانوی حکومت پر زیادہ سے زیادہ زور ڈالا جائے تاکہ برطانیہ یورپ کے اندر اپنا اثر اس طرح استعمال کرے جس سے ترکوں کی شکست اُن کے لئے قابل برداشت اور ناقابل توہین بنائی جاسکے۔ اس سلسلہ میں مدد کا ایک عملی پہلو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ریڈ کریسنٹ (RED CRESCENT) سوسائٹی کا ایک ڈاکٹری وفد تیار کر کے ترکی کے جنگی علاقہ کو روانہ کیا گیا۔ اس وفد کے لیڈر ڈاکٹر انصاری تھے جو ہندوستان کے سربرآوردہ اور مشہور ڈاکٹروں میں سے تھے۔ یہ اس قسم کا ضروری اور موقع والا انسانی ہمدردی کا کام تھا جس کی میں نے بڑی خوشی کے ساتھ مدد کی۔ میں نے ترکی کے جنگی قرضوں میں بھی چندہ دیا۔ مگر اس لڑائی کے متعلق ہندوستان میں میرے اکثر مسلمان بھائیوں میں جو تکلیف دہ اختلاف رائے تھا اس میں مجھ کو بھی گھرنا پڑا۔ یہ ایسا اختلاف رائے تھا جس نے میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ کچھ عرصہ تک ان قریبی اور پُرخلوص تعلقات کو ختم کر دیا جو خیالی اور عملی اعتبار سے اس وقت تک میرے اور ہندوستان کے دوسرے مسلمان لیڈروں کے درمیان قائم ہو گئے تھے۔

ہم ترکی کو جتنا ہم سے ہو سکتا تھا دے رہے تھے مگر دراصل اُس سب کی

مقدار کتنی تھی؟ اس کا جواب ایمان داری کے ساتھ یہ ہے کہ وہ مقدار بہت کم تھی۔ ہم درحقیقت اپنے مالک خود نہ تھے اور تمام ترکی و بلقان کے جھگڑے کے متعلق برطانوی پالیسی پر ہمارا اصلی اثر برائے نام تھا۔ گورنمنٹ نے ہماری عاجزانہ التجاؤں کو اخلاق کے ساتھ گر دیر میں سُنا اور ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ وہ ہماری طرف کوئی عملی توجہ نہ دیتی۔ سلطنت عثمانیہ۔ یعنی یورپ کا بیمار آدمی۔ جیسا کہ پنچ (PUNCH) اور دوسرے اخباروں کے سیاسی کارٹون بنانے والوں نے اس کو ظاہر کیا تھا۔ اُس کے متعلق برطانوی رائے عام طور پر زیادہ سے زیادہ نیم گرم کہی جاسکتی تھی۔ یورپ کی سیاسی حالت اُس وقت بہت نازک اور پُرخطرہ تھی۔ یورپ کی سلطنتوں میں برطانیہ کے دوست یعنی فرانس۔ روس اور کسی حد تک اٹلی سب کچھ تھے مگر ترکی کے موافق نہ تھے اور ان سب کو بڑی فکر اس بات کی تھی کہ جرمنی اور اسٹریا سے کھُلم کھُلا مخالفت کو دور رکھا جائے عدم مداخلت کی نازک اور ٹھنڈی پالیسی زیادہ سے زیادہ وہ حد تھی جہاں تک برطانیہ جانے کو تھا۔ مگر ہندوستان میں مسلمانوں کی عام رائے بہت زیادہ آتشناک تھی۔ اسلام کی عزت اور سالمیت خطرہ میں تھی اور ہم کو ترکوں پر زور ڈالنا چاہیئے کہ وہ برابر جمے رہیں۔ ہر خطرہ کا مقابلہ کریں۔ ہر قربانی قبول کریں اور لڑائی کو آخری حد تک جاری رکھیں یہ سب بڑے اچھے احساسات تھے۔ مگر میں ان پر اعتراض کرتا تھا۔ میں نے بتایا کہ ترکی کو مدد پہنچانا دراصل ہمارے قبضہ کی بات نہ تھی۔ گو ہمارے جذبات بلاشبہ بہت بڑے اور فیاضانہ تھے مگر ہم اُس وقت بالکل اس قابل نہ تھے کہ اپنے احساسات کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ترکوں سے یہ کہنا کہ برابر کھڑے رہو۔ لڑتے رہو۔ اسلام کی خاطر جان دے دو اور اپنا آخری پیسہ اور آخری 'ترک' ختم کردو۔ یہ سب ترکوں کے ساتھ نامناسب اور بے انصافی کا برتاؤ تھا۔ جب کہ ہم سب زندہ و سلامت باقی رہیں۔ ایسا کرنے سے ترکوں کی کوئی مدد نہیں ہوسکتی تھی بلکہ اس سے دراصل اُن کی حالت اور زیادہ خراب کرنے کا امکان تھا۔

میں نے اپنے یہ الفاظ دبے دبے طریقہ پر نہیں کہے۔ بلکہ میں نے ان ہی خیالات کے

ساتھ ٹائمس آف انڈیا کے نمائندے سے ملاقات کی جو اُس وقت اس برصغیر میں سب سے زیادہ اشاعت والا اور سب سے زیادہ ذمہ دار اخبار شمار کیا جاتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ سب کچھ بہت اچھا ہے کہ ترکوں کے پاس اس قسم کے دل بڑھانے والے تار بھیجے جائیں کہ "بڑھے چلو۔ لڑے جاؤ۔ شکست کو کبھی قبول نہ کرو۔ خواہ کوئی بھی قربانی دینی پڑے"۔ مگر اس کے بعد پھر ہم لوگ جو ایسے تار بھیجتے ہیں اپنے گھر پہنچ کر آرام کے ساتھ اپنے نرم بستروں میں جا کر سو جاتے ہیں۔ عام آدمیوں نے اس قسم کی رائے قائم نہیں کی۔ اور میری باتوں نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں میری مخالفت کا طوفان پیدا کر دیا۔ مگر جیسا کہ عام طور پر اس قسم کے طوفانوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے وہ رفتہ رفتہ ہلکا پڑ گیا اور بہت جلد اس بحث کو لوگ بھول گئے۔ چونکہ پہلی عالمگیر جنگ کے معاملات اور خطرات نے دنیا کو گھیر لیا اور سب کو اپنی بھنور میں لے لیا۔

باب نمبر ۸

پہلی عالمگیر جنگ

سنہ ۱۹۱۴ء کے ابتدائی مہینوں میں مجھے دوبارہ برما جانا پڑا۔ اس وقت میں نے اپنے اسمٰعیلی مریدوں کے لئے کچھ اہمیت والا قدم اٹھایا۔ میں نے ان کو یہ نصیحت کی کہ وہ کافی طور پر وہاں کے سوشل اور تمدنی ماحول میں گھل مل جائیں اور وہاں کی فضا سے ساز کر کے اس کو اپنا بنا لیں۔ برما باوجودیکہ برطانوی سلطنت کے قبضہ میں تھا اور اُس وقت وہاں کا انتظام انڈیا آفس (INDIA OFFICE) کے ماتحت ہوتا تھا مگر پھر بھی وہ ایسا ملک تھا جہاں قومی اور وطن پرستی کے جذبات بہت گہرے تھے اور قوم پرستی ایک خودرو۔ قدرتی اور مسلسل قسم کی نشوونما پا رہی تھی۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ میرے مریدوں کے واسطے صرف یہی عاقلانہ اور مناسب پالیسی ہو سکتی تھی کہ وہ جہاں تک ممکن ہو برما کی سوشل اور سیاسی زندگی سے اپنے آپ کو مطابق بنائیں۔ اُن کو اپنے ہندوستانی عربی نام عادتیں اور رسوم چھوڑ دینے چاہئیں اور قدرتی طور پر مستقل طریقہ سے اُن لوگوں کے نام۔ عادات اور رسوم اختیار کرنے چاہئیں جن کے ساتھ وہ زندگی بسر کرتے تھے اور جن کی قسمت میں وہ شریک تھے۔

اُس قدیم زمانہ کے آخری موسم بہار اور شروع گرمیوں میں برما سے میں نے مختصر سا دورہ یورپ کا کیا اور وہاں سے میں مشرقی افریقہ چلا گیا۔ مجھے اس پر کچھ تعجب ہوا اور میرے مریدوں کو وہاں پر اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور غصہ آیا کہ جرمنی مشرقی افریقہ کی حکومت نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کے علاقوں میں نہ جاؤں۔ جب میں اپنے افریقہ کے

سفر پر تھا اس وقت آرچ ڈیوک فرانسز فرڈیننڈ (ARCHDUKEFRACISF ERDINAND) اور اُن کی بیوی کو بوسنیا کے چھوٹے سرحدی قصبہ سراجیو و (SARAJEVO) میں قتل کر دیا گیا اور اس سے لڑائی چھڑنے کا سبب پیدا ہو گیا۔ جب تک میں زنجبار (ZANZIBAR) پہنچا۔ حالات بہت نازک ہو چکے تھے۔ جولائی کے آخری اور اگست کے شروع دنوں میں زیادہ سے زیادہ خطرناک تار برابر آتے جاتے رہے۔ روس اور جرمنی میں لڑائی شروع ہو گئی۔ جرمنی نے بلجیم پر حملہ کر دیا اور ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

میرے دل میں کوئی شبہ نہ تھا۔ نہ میرے ارادہ میں کوئی عدم استقلال تھا۔ میرے حوصلے۔ اُمنگیں۔ امیدیں اور دلچسپیاں سب ایک یا دو ذاتی اور مخصوص فیصلوں تک محدود ہو گئیں۔ میرے دل میں ایک سب سے بڑا جذبہ تھا۔ وہ یہ کہ میں انگلستان جلد سے جلد پہنچ کر اپنی خدمات جس حیثیت سے وہ کام میں لائی جا سکیں پیش کروں۔ میری تندرستی اچھی تھی۔ میں اُس وقت جوان اور قوی تھا۔ میری جگہ برطانیہ کے ساتھ تھی میں نے فوراً بلا کسی وجہ کا اظہار کئے جرمنی شاہی امتیاز کا اول درجہ کا تمغہ جو قیصر نے مجھے عطا کیا تھا واپس کر دیا۔ میں نے تار کے ذریعہ سے اپنے سب مریدوں کو جو برطانوی علاقوں میں یا اُن کے حدود پر رہتے تھے ہدایات بھیج دیں کہ اُن کو اپنے اپنے رقبوں میں جہاں تک ممکن ہو برطانوی حکام کی امداد کرنی چاہیئے۔ میں نے اپنی ذاتی خدمات زنجبار کے برطانوی ریزیڈنٹ کے سامنے پیش کیں اور میں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ہندوستانی جماعت کے آدمیوں کو تنظیم دے کر اُنکی ایک امدادی فوج بنائی جو سمندری کنارہ سے ملک کے اندرونی علاقہ میں خط و کتابت جاری رکھنے میں مدد دیا کرے۔ پھر میں نے بہت جلد انگلستان روانہ ہونا چاہا۔ اس زمانہ میں افواہیں اُڑ رہی تھیں جو بعد میں صحیح ثابت ہوئیں کہ ایک سمندر میں حملہ کرنیوالا جرمنی جہاز بحر ہند میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس وجہ سے زنجبار کے حکام نے مجھ سے کہا کہ میں مومباسا (MOMBASA) ہو کر نہ جاؤں جیسا کہ میرا ارادہ تھا کہ وہاں سے سب سے پہلے جہاز میں جو مل سکا میں انگلستان جاؤں گا۔ بلکہ مجھ سے یہ کہا گیا کہ میں جنوبی افریقہ کے راستہ سے سفر کروں۔ چنانچہ میں نے

وہیں سے انگلستان کا راستہ طے کیا اور ہیں ستمبر کے درمیان میں لندن پہنچ گیا۔

مجھے فوجی ملازمت کا کوئی عملی تجربہ نہ تھا اس وجہ سے میرا خیال تھا کہ لڑائی کے سلسلہ میں جو کچھ فوری امداد میں کر سکتا تھا وہ بہت ناچیز ہوگی۔ میں نے اپنی خدمات کسی برطانوی یا ہندوستانی فوج کے کسی دستہ میں کسی جگہ پر ملازم ہونے کے لئے پیش کیں۔ میں لارڈ کچنر (LORD KITCHENER) سے ملا جو اُس وقت وزیر جنگ تھے۔ جن کو میں ہندوستان میں خوب جانتا تھا اور جن کے ساتھ میں دس سال پیشتر وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں کام کر چکا تھا۔ میں نے اُن سے اصرار کیا کہ مجھے اس ہندوستانی دستہ میں جو اُسوقت مغربی محاذ پر جا رہا تھا بہ حیثیت پرائیویٹ (PRIVATE) کے بھرتی کر لیں۔

کچنر کے خیالات بہر حال اُن خدمات کے متعلق جو میں ادا کر سکتا تھا کچھ اور قسم کے تھے چونکہ مشرق کے متعلق اُن کا علم اور تجربہ بہت وسیع اور گہرا تھا۔ اُن کو اُن خطرات اور امکانات کا پورا احساس تھا جو اس بڑی نوعیت کی جنگ میں اُن مشرقی لوگوں کے شامل ہونے سے پیدا ہو سکتے تھے جو اکثریت کے ساتھ مسلمان تھے۔ چند سال سے جرمنی کی سازشیں اور اس کا اثر قسطنطنیہ میں بہت بڑھ گیا تھا۔ جرمنی عالمگیر حکومت کا خواب جس کی وسعت برلن سے بغداد تک پہنچ جائے۔ اس قسم کے مجنونانہ خیالات میں سے ایک خیال تھا جس پر جرمنی کے شاہی مفکر اور استاد بہت دلچسپی اور شوق کے ساتھ غور کیا کرتے تھے۔ ترکی حکومت بہت منتشر معلوم ہوتی تھی اور اس میں اس کی طاقت بالکل نہ رہی تھی کہ وہ خود اپنے متعلق آزادانہ اور مفید فیصلے کر سکے۔ برطانیہ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی سلطنت کی اُس جاندار رگ (VITAL ARTERY) پر اپنا اختیار قائم رکھے یعنی سمندر کا وہ راستہ جو بحر روم (MEDITERANEAN SEA) سوئز کنال (SUEZ CANAL) بحر قلزم (RED SEA) اور بحر ہند میں ہو کر جاتا تھا اور جو نہ صرف ہندوستان کو ہی جاتا تھا بلکہ اسٹریلیا کو۔ نیوزیلینڈ کو اور جنوب مشرقی ایشیا کے سب نوآبادیاتی علاقوں کو بھی جاتا تھا۔ ان تمام سیاسی اور جنگی ضروریات اور مجبوریوں کے پیچیدہ حالات میں برطانوی حکومت کو یہ محسوس ہوا کہ میرا کام اور میری شخصیت خاص اہمیت رکھتی تھی۔ کچنر

(KITCHNER) نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا کہ فوج میں سپاہی کی حیثیت سے کام کرنا میرے لئے موزوں نہ تھا۔

سب سے زیادہ نمایاں بات جو برطانوی حکومت کے نوٹس میں آچکی تھی یہ تھی کہ بہت سے مشہور ترک میری عزت کرتے تھے اور مجھ پر بھروسہ رکھتے تھے۔ لارڈ کچنر (KITCHENER) نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا تمام اثر ترکوں پر ڈالوں اور اُن کو اس بات کے لئے مجبور کروں کہ وہ اتحادی طاقتوں کے ساتھ شامل نہ ہوں اور اپنی غیر جانب داری کو قائم رکھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ جس قسم کا کام مجھ سے بہترین طریقہ پر لیا جاسکتا تھا اُس کے متعلق صرف لارڈ کچنر (KITCHNER) کا خیال ہی تنہا نہ تھا ان کی رائے میں وزیرِ ہند بھی شریک تھے۔ اور اُس کی تائید کرتے تھے۔ وزیرِ خارجہ سر ایڈورڈ گرے (SIR EDWARD GREY) اور وزیرِ اعظم مسٹر ایسکواتھ (MR. ASQUITH) نے بھی اتفاق کیا تھا۔ حقیقت میں بادشاہ سلامت نے بھی اس کا حوالہ دیا تھا جب کہ مجھ کو اُن کے ساتھ کھانا کھانے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔

میں نے ظاہری طور پر ہندوستانی نوجوانوں کو انگلستان میں ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے کام شروع کیا۔ (اُن نوجوانوں کی تعداد کافی تھی) تاکہ یہ انڈین فیلڈ ایمبولنس کور (INDIAN FIED AMBULANCE CORPS) میں بھرتی ہوجائیں اور اُن کے آرام کے لئے ایک آسائشی فنڈ قائم کرکے اس کے لئے روپیہ جمع کرنا شروع کیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میں نے براہ راست اور بہت ضروری طریقہ پر ترکی کے سفیر توفیق پاشا سے بات چیت شروع کی۔ میری التجا پر انہوں نے نوجوان ترکوں کے پاس ایک دعوت نامہ بھیجا یہ نوجوان ترک ترکی کے انقلاب سنہ ۱۹۰۸ء میں بڑی طاقت حاصل کرچکے تھے۔ اب اُن سے کہا گیا کہ وزیروں کا ایک وفد لندن بھیجا جائے۔ جو برطانوی حکومت سے براہ راست مصالحت کی کارروائی شروع کرے۔ برطانیہ اپنی طرف سے روس کی طرف سے اور اپنے دوسرے اتحادیوں کی طرف سے اس کے لئے تیار تھا کہ ترکی کو آئندہ کے لئے مکمل ضمانت اور یقین دلایا جائے۔

ہم کو بڑی امیدیں تھیں کہ ہم وہ سیاسی فتح حاصل کریں گے جو ہر نقطۂ نظر سے نمبر اول کی اہمیت رکھے گی۔ میں خوب محسوس کرتا تھا کہ خود میرے جذبات اس معاملہ میں بہت گہرے تھے۔ بہ حیثیت مسلمان کے مجھے اس کی بڑی فکر تھی کہ ترکی کو دوبارہ جنگ کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے نجات ملے اور یہ جنگ چھوٹی چھوٹی بلقانی ریاستوں کے ناپائدار منتشر کہ قوت کے خلاف ہی نہ ہوتی بلکہ دنیا کی چند سب سے بڑی صنعتی اور فوجی قوموں کے زبردست مجموعہ کے خلاف لڑنی پڑتی۔ ترک حال ہی میں اپنی گزشتہ مصیبت سے فارغ ہو چکے تھے۔ اُن کو اس کی بڑی ضرورت تھی کہ سانس لینے کا موقعہ مل جائے۔ اُن کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی نئی لڑائی میں شریک ہو جائیں اور غیر محدود مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ ترک بجا طور پر ان "ضمانتوں" کے متعلق شکوک رکھتے تھے جو مغربی طاقتوں نے پیش کی تھیں۔ خواہ وہ کیسی ہی پختہ اور معینہ کیوں نہ ہوں۔ ان کو حال ہی میں سخت افسوسناک تجربات اس قسم کی ضمانتوں کے متعلق ہو چکے تھے جو اُن کے نزدیک ایسے وعدے تھے جو صرف اس لئے کئے جاتے تھے کہ آئندہ چل کر اُن کو توڑ دیا جائے۔ مگر اس حالت کی حقیقت کا سب سے زیادہ بُرا اور مایوس کُن اندازہ کرتے ہوئے جیسا کہ ۱۹۱۴ء کے آخری مہینوں میں پایا جاتا تھا۔ غیر جانب داری ہی (جو سب مغربی طاقتیں ترکی سے چاہتے تھے) صرف ایسی چیز تھی جس سے ترکوں کو ایسا وقت اور اتنی مہلت مل جاتی جس میں وہ اپنے تمدنی۔ اقتصادی اور فوجی اصلاحات کے پروگرام کو پورا کر سکیں۔

'توفیق پاشا' ہماری ملاقاتوں کے سلسلہ میں ایک خاص شخصیت تھی۔ وہ بہت سالوں تک سلطان عبد الحمید کے وزیر خارجہ رہ چکے تھے۔ نوجوان ترک انقلاب نے اُن کو اس عہدہ سے ہٹا دیا تھا۔ تاہم نئی حکومت ایک تجربہ کار اور قابل سیاستدان پر اپنا بھروسہ باقی رکھتی تھی۔ لندن اور دوسرے مغربی مرکزی شہروں میں اُن کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ قابل عزت۔ عقلمند اور ذہین ہونے کی وجہ سے وہ میرے بڑے اچھے دوست ہو گئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر خلوص کے ساتھ بھروسہ کرتے تھے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ اس معاملہ میں میرے رویہ سے پورا اتفاق رکھتے تھے۔

انہوں نے بہر حال موقعہ پاکر مجھے اس بات سے آگاہ کیا کہ ہماری مصالحت کی بات چیت میں بہت زیادہ کامیابی کے امکانات ہوجاتے اگر اتحادی قوتیں ترکی سے یہ کہتیں کہ وہ بجائے غیر جانب دار رہنے کے اُن کی طرف شامل ہوجائے چونکہ غیر جانب داری کی صورت میں لڑائی کے ختم ہونے پر کوئی بھی ترکی کا شکریہ ادا نہ کریگا وہ یہ بھی کہنے لگے کہ اُن کو اس کا یقین تھا کہ روس اس بات سے کبھی اتفاق نہ کرے گا کہ ترکی اتحادیوں کے ساتھ شامل ہوجائے چونکہ اس قسم کا اقدام روس کی اُن تمام امیدوں کو ختم کردے گا جو یا تو شمال مشرق میں اُرزیرم (ERZERUM) کے آس پاس کے علاقہ میں یا جنوب کی طرف بحر اسود (BLACKSEA) سے لے کر روس نے اپنے ملک کی توسیع کے لئے ترکی کے خلاف لگا رکھی تھیں۔ میں نے ان خیالات کی اطلاع خفیہ طور پر لارڈ کچنر (LORD KITCHENER) کو دے دی۔ اس کے چند گھنٹے بعد ہی لارڈ کچنر نے مجھے بتایا کہ اتحادیوں کی یہ خواہش نہیں ہے کہ وہ ترکی کو اپنی طرف سے لڑائی میں شامل کریں۔ ان ابتدائی تبادلۂ خیالات کے بعد ہم کو مصالحت کی بات چیت بڑے مشکل حالات میں شروع کرنا پڑی۔ تاہم میں کچھ دنوں تک اچھی امیدیں لگائے رہا اور میری یہ خوش فہمی کچھ بے بنیاد بھی نہ تھی۔

ایک دم اس بات کی اطلاع ملی کہ دو جرمنی جہاز گیبنؔ (GOEBEN) اور بریسلاؔ (BRESLAU) اتحادیوں کی بحری نگہداشت سے بچ کر نکل گئے۔ اور قسطنطنیہ (CONSTANTINOPLE) کے قریب لنگر ڈالے پڑے ہوئے تھے۔ اُن کی موجودگی نے ساری حالت کو خطرہ کے ساتھ بدل دیا۔ ترکوں نے ان جہازوں کے ساتھ مہمان نوازی کی اور اُن کو اپنی حفاظت میں رکھا۔ یہ جہاز جرمنی بحری طاقت اور وسعت کا نمایاں ثبوت تھے قسطنطنیہ (CONSTANTINOPLE) میں جرمنی فوجی مشن نے اپنے نہایت قابل اور مستقل مزاج کمانڈر جنرل لیمن ودن سینڈرس (GENERAL LIMAN VON SANDERS) کی

ماتحتی میں جو زبردست اخلاقی فوقیت حاصل کر رکھی تھی اس کے ساتھ ساتھ ان جہازوں کی موجودگی ہماری امیدوں کے لئے انتہائی خطرہ ثابت ہو رہی تھی۔ وہ امیدیں جو حال میں ترکی کو غیر جانب دار رکھنے کے لئے قائم ہو چکی تھیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے آخر تک مرکزی قوتیں (CENTRAL POWERS) کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنی شرائط کے بموجب بہت جلد فتح حاصل کرلیں گے۔ پروشا (PRUSSIA) کے ایک پرانے جنرل نے جن کا نام 'وون ہنڈن برگ' (VON HINDENBURG) تھا جرمنی کی بے انتہا بہادر مگر ناقابلیت کے ساتھ کمانڈ کی ہوئی فوج کو مغرب میں مشرقی پروشیا (EAST PRUSSIA) کی ٹینن برگ (TENNENBERG) کی دلدلوں میں بڑی زبردست شکست دے دی تھی جرمنی کی فوجیں جو پیرس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھیں اس چھ سو میل والے محاذ پر قائم ہو گئی تھیں جو اگست سنہ ۱۹۱۸ء تک بہت تھوڑی ردو بدل کے ساتھ اور دونوں فریقوں کے نہایت خوفناک جانی نقصان کے باوجود قائم رکھنا پڑا۔ ایک جنگی جہاز جس کا نام ایمڈن (EMDEN) تھا اور جو بحر ہند میں پڑا ہوا تھا۔ اتحادیوں کے جہازوں کو بے انتہا نقصان پہنچا چکا تھا اور وہ مدراس کی طرف دلیری کے ساتھ اپنا رخ کر چکا تھا۔ ان تمام علامات اور حالات سے جو خوش جرمنوں نے ترکوں کی آنکھوں کے سامنے دکھلائے ترکی حکومت نہایت افسوس کے ساتھ دھوکے میں آگئی اور اس نے یہ ناقابل تلافی اقدام کیا کہ روس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس واقعہ نے سلطنت عثمانیہ (OTTOMAN EMPIRE) کو خود بخود برطانیہ اور فرانس کے خلاف جنگ میں شامل کر دیا۔

چرچل جیسے جنگی مدبر کو اس فیصلہ سے ایسا موقعہ مل گیا۔ جس سے کبھی پوری طور پر فائدہ نہ اٹھایا گیا کہ وہ مغربی محاذ کی جنگی خاموشی کو ختم کر دے اور جرمنی اور اسٹریا (AUSTRIA) پر جنوب و مشرق سے حملہ کر دے۔ میرے لئے اس وقت یہ بڑے صدمہ کی بات تھی۔ اس کی شدت اور سختی بے انتہا تکلیف دینے والی تھی۔ اور جب ترکی حکومت نے ایک ایسے واقعہ کو جو دراصل بلا وجہ پیدا کیا گیا اور جو ناقابل معافی

ظلم تھا ایک باعزت اور عام پسند ظاہری رنگ دینے کی کوشش کرکے اس کا اعلان جہاد کی صورت میں کر دیا۔ یعنی عیسائیت کے خلاف ایک مقدس جنگ۔ تب میری تکلیف اور مایوسی ترکی حکمرانوں کی غیر مذہبی حماقت کے خلاف سخت ناراضگی کی صورت میں بدل گئی۔ میری ناراضگی میرے اس علم سے بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی کہ ہم اپنی مصالحت کی گفتگو میں کامیابی کے کتنے قریب آ چکے تھے۔ پھل درخت سے ٹھیک اسی وقت توڑا جانے والا تھا جب کہ صرف وہ درخت ہی نہیں بلکہ سارا باغ آندھی میں تباہ ہو کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

مجھ پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ میں نے دوسرے مسلمان لیڈروں کے ساتھ ساری اسلامی دنیا سے ایک پرجوش اپیل کی کہ وہ اس بنائے ہوئے جہاد کا بالکل خیال نہ کریں۔ اپنا فرض پورا کئے جائیں اور مغربی اتحادیوں کے ساتھ وفاداری کے ساتھ قائم رہیں۔ خاص طور پر برطانیہ اور فرانس کے ساتھ جن کی سمندر پار مقبوضات میں مسلمانوں کی آبادی لاکھوں تک شمار کی جا سکتی تھی۔ میں نے تو اپنی ذمہ داری پر ایک اعلان شائع کیا جس میں ترکی نے جو سخت غلطی کی تھی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میں نے بتایا کہ سلطنت عثمانیہ اور وہ سب طاقتیں جو وہ استعمال کرے گی جرمنی کے ظالمانہ اور شاہانہ فوجی مکر و فریب کے لئے لازمی طور پر کٹ پتلی کی طرح کام کریں گی۔ یہ کہ برطانیہ اور اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے میں ترک لوگ اپنے جرمن آقاؤں کے احکام کی تعمیل میں کام کر رہے تھے۔ یہ کہ سلطان اور اس کے مشورہ دینے والوں کو جرمنی افسروں اور دوسرے غیر مسلموں نے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ایسا قدم اٹھائیں۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ نہ تو خاص طور پر ترکی کو اور نہ عام طور پر اسلام کو مغربی طاقتوں کے خالص مدافعانہ کارروائیوں کے متعلق کسی قسم کے خطرہ کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ برطانیہ اور روس کی سلطنتوں اور فرانس کی جمہوریت نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ترکی کے تمام ملکوں کو اس شرط پر مکمل آزادی دینے کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ ترکی غیر جانبدار رہے ترکی اسلام کی ٹرسٹی (TRUSTEE) ہے اور ساری دنیا اس بات پر مطمئن ہے کہ

ترکی مقدس شہروں کو اپنے قبضہ میں باقی رکھے۔ سب کو یہ دیکھنا ہے کہ ٹرکی کی پوزیشن کسی طرح خطرہ میں نہ پڑے اور یہ کہ وہ اسلام کے نام پر یا اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے جنگ میں شریک نہیں ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ہمارا فرض بہ حیثیت مسلمان ہونے کے یہی ہے کہ ہم اپنے دنیاوی اور ظاہری حکمرانوں کی اطاعت میں وفادار۔ پر خلوص اور خدمت گذار رہیں۔

میرا خیال ہے کہ میرا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ میرے ان الفاظ نے جب وہ ادا کئے گئے اور جہاں سے بھی وہ ادا کئے گئے۔ ایسا صحیح اور مستقل اثر کیا جس کی اس وقت ضرورت تھی۔ مغربی طاقتوں کی مسلمان رعایا کی بڑی اکثریت نے اپنی اطاعت وفاداری کے ساتھ قائم رکھی۔ مسلمان سپاہی ساری دنیا میں لڑائی کے میدان پر عیسائی سپاہیوں کے ساتھ لڑے اور مرے۔ جہاد کا برا منصوبہ جو قیصر اور اس کے مشورہ دینے والوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لئے گھڑا تھا اور جس سے انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا بالکل ناکامیاب ہو گیا اور ۱۹۱۵ء کے ابتدائی مہینوں کے بعد اس کے متعلق بہت کم ذکر سنا جاتا تھا۔

بہر حال میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ حکومت ٹرکی سے جیسا کہ وہ ۱۹۲۳ء سے پہلے تھی۔ ۱۹۱۴ء کے آخری مہینوں میں ہماری اُن کوششوں میں ناکامیابی ہونا جو مصالحت کے لئے کی گئی تھیں۔ جدید تاریخ میں ایک افسوسناک انقلابی نقطہ شمار کیا جانا ضروری ہے اگر ٹرکی غیر جانب دار رہتی تو مشرق قریب کی تاریخ اور ساری اسلامی دنیا کی تاریخ گذشتہ چالیس سالوں میں بالکل مختلف ہوتی۔ سینکڑوں سال سے جو اسلام کا قدرتی مرکز اور متحد ہونے کا نقطہ رہ چکا تھا یعنی قسطنطنیہ میں سلطان کی حکومت وہ تباہ ہو چکا تھا۔ ٹرکی جیسا کہ ہم آئندہ چل کر بتائیں گے۔ مصطفیٰ کمال کی روح پھونکنے والی لیڈری کے ماتحت اپنی مصیبتوں سے باہر نکلی۔ وہ اپنی اصلی حالت پر آگئی اور اس کی روح تازہ ہو گئی۔ مگر وہ اپنی سلطنت سے محروم ہو گئی۔ لاکھوں عرب جو صدیوں تک ترکوں کی قابل برداشت حکومت کے ماتحت رہ چکے تھے اور جو نہ صرف وسط عرب کے بلند مقامات پر رہتے تھے بلکہ اُن ملکوں میں بھی بستے تھے جو زرخیز ہلالی خطہ میں آباد تھے۔ اب قومیت کی

مشکلات اور تکالیف۔ اُس کی خوشیاں اور اُس کے رنج محسوس کرنے لگے۔ حکومت برطانیہ ۱۹۱۸ء کے بعد سے اپنے ارادہ سے نہیں بلکہ محض اتفاق سے اُس مشرقی اقتدار کی وارث بن گئی جو مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں طویل عرصہ تک سلطنت عثمانیہ نے حاصل کر رکھا تھا۔ ولایت اور پاشالک (VILAYEI AND PASHALIK) کی جگہ جبریہ احکام کی گورنمنٹ قائم ہوگئی۔ شام میں فرانس کی مداخلت۔ ایشیائے کوچک میں یونان کے حملے اور بربادیاں۔ یہودی اور عرب مقاصد کے درمیان کشمکش اور اختلاف ملک عرب میں ابن سعود کا ایک نئی گورنمنٹ قائم کرنا۔ مکہ میں ایک مقامی سرداری سے چل کر خاندان شریفی کا سر برآوردہ ہونا اور دو سلطنتوں میں حکمران خاندانوں کی بنیاد ڈالنا۔ یہ سب پیچیدہ واقعات اور اُن کے علاوہ اور بہت سے نتائج اس بات سے پیدا ہوئے کہ نوجوان ترکوں نے جرمنی کے دباؤ میں آکر اُن صلح کی شرائط کو نامنظور کر دیا۔ جو ۱۹۱۴ء کے آخر میں پیش کی گئی تھیں۔

کچنر (KITCHNER) یقینی طور پر مشرق میں ہر ناگہانی مصیبت سے باخبر اور ہوشیار تھا۔ خواہ ۱۹۱۵ء کے شروع میں کچنر کی انتظامی قابلیت اور مغرب میں برطانیہ کی جنگی کوششوں کو کامیاب بنانے کے متعلق کیسے ہی شبہات پیدا کیوں نہ ہوگئے ہوں کچھ عرصہ پہلے انہوں نے میرے سامنے ایک اور تجویز پیش کی جو ایک قسم کے ڈپلومیٹک یا نیم ڈپلومیٹک کام کے متعلق تھی اور جس کی تائید کا بینہ سے ہو چکی تھی بلکہ حقیقت میں جس کے لئے شاہ جارج پنجم نے اپنی ذاتی منظوری دے دی تھی اور اس سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ یہ تجویز مصر کے متعلق تھی جہاں پر سیاسی حالت بہت نازک اور منتشر ہو چکی تھی خود کچنر کو ضروری احکام کے ساتھ بلا کر دفتر جنگ پر اپنے فرائض انجام دینے کے لئے مقرر کیا گیا۔ جب کہ وہ قاہرہ میں برطانوی نمائندہ کے عہدہ پر کام کرنے کے لئے واپس جانے کو انگلش چینل کے پار جانے والے جہاز میں بیٹھنے والے تھے مصر شہنشاہ عثمانیہ کی مقبوضات کا برائے نام ایک حصہ تھا اور خدیو مصر اُن کا برائے نام وائسرائے تھا یہ حالت ۱۸۸۲ء میں برطانوی قبضہ کے بعد سے صرف نام کے طور پر بلکہ اور کسی

صورت سے نہیں۔ برابر باقی رکھی گئی تھی۔ مصر کا ہر سیاست دان اور اہلِ حکومت برسوں سے یہ بات بے شمار مرتبہ کہتا تھا کہ مصر میں برطانوی قبضہ خالص طور پر بالکل عارضی ہے اور اس کے متعلق برطانوی لوگ بھی ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔ تاہم کسی نہ کسی طرح منطق کے اصول کے خلاف اور وعدوں اور عہد ناموں کے خلاف یہ قبضہ برابر چلتا رہا یہاں تک کہ اس صدی کے ابتدائی سالوں میں جیسا کہ میں نے ابتدائی باب میں لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر ہر مقصد اور غرض کے لئے برطانیہ کی ایک کالونی ہے پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں جیسا کہ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ میں مصر برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے واسطے ایک فوجی اڈہ تھا۔ جو جنگی تدابیر اور فوجوں کی نقل و حرکت کے لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء کے شروع میں برطانوی ہندوستانی اور نوآبادیات کی فوجیں جو مصر میں مقیم تھیں اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ تعداد برابر بڑھ رہی تھی۔ اسکندریہ (ALEXANDRIA) بہت بڑا سمندری بندرگاہ اور جہازوں کا مرکز تھا۔ نہر سوئز (SUEZ CANAL) پانی کے راستہ سفر کرنے کے لئے جنگی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اُس کے کنارہ پر سنائی (SINAI BANKS) کے مقام میں جو باوجودیکہ اصولی اعتبار سے مصر کا ایک حصہ تھا۔ ترکی فوجوں کے دستے مقیم تھے جن کا کام اس وقت صرف وہاں رہنا اور مدافعت کرنا تھا۔ مگر برطانوی جنگی مدبروں نے مصر کو خاموش اور بیکار مقصد کے لئے نہیں چھوڑ رکھا تھا۔ بلکہ ان کے نزدیک مصر ایک ایسا مرکز تھا جہاں سے ترکی کے خلاف ہر قسم کا حملہ کیا جا سکتا تھا۔ جہازوں میں بھر کر ہزاروں رنگروٹ برطانیہ سے۔ اسٹریلیا سے۔ نیوزیلینڈ اور ہندوستان سے اسکندریہ۔ پورٹ سعید۔ کنطارا (KANTARA) اور اسمٰعیلیہ کو پہنچائے جا رہے تھے جو ناقابل فراموش بہادری کے ساتھ مگر بلا کسی فائدہ کے اس بنجر اور چھوٹے سے چٹانی جزیرہ نما میں لڑنے اور مرنے کے لئے جاتے تھے جو دردانیال (DARDANELLES STRAITS) کے اُس یورپین سمندری کنارہ کی حفاظت کرتا تھا جو قسطنطنیہ تک چلا گیا ہے مصر کی اندرونی سیاسی حالت میں فوجی نقطۂ نظر سے حتی الامکان پائداری اور اس کا یقین ایک ضروری

ابتدائی شرط تھی تاکہ یہ بڑا فوجی اڈہ اور کام کرنے کا مرکز اچھی حالت میں محفوظ رکھا جاسکے۔ مصر میں ساری گڑبڑ اوپر سے شروع ہوئی۔ وہاں پر کوئی مصری سیاسی لیڈر خاص قابلیت والا نہ تھا۔ اور خود خدیو مصر۔ عباس حلمی خاص طور پر قسطنطنیہ میں موجود نہ تھے۔ جب اُن کو بلایا گیا تو وہ مصر واپس نہ آئے۔ اس لئے شاید یہ بات ضروری تھی کہ اتحادیوں کا یقین ان کے متعلق یہ ہو کہ وہ جرمنی کے طرف داروں میں تھے اور یہ کہ اتحادی ان کے متعلق یہی پروپگنڈہ صاف صاف الفاظ میں کریں بہرحال میری واقفیت عباس حلمی سے اچھی طرح بعد کے سالوں میں اس وقت ہوئی۔ جب وہ یورپ میں اپنی طویل جلاوطنی کے زمانہ میں رہتے تھے اور مجھے یقین ہے کہ اُن کے ساتھ ظلم ہوا اور ان کو غلط سمجھا گیا۔ میرے اندر ان کے لئے سچی محبت پیدا ہوگئی اور ان کے دماغ کی روشنی اور صفائی کی میں بہت تعریف کرنے لگا۔ انہوں نے مجھے بتایا جو مجھے یقین ہے کہ اُن کی کمزوری کی سچی کہانی تھی۔ وہ یہ کہ ٹرکی کے اعلان جنگ سے کچھ دن پہلے اُن پر ایک قاتل نے حملہ کیا اور اُن کے چہرے اور جبڑے کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد سے اُن پر اس زخم کا گہرا نشان عمر بھر باقی رہا جو اس حملہ کا نتیجہ تھا۔

سنہ ۱۹۲۰ء سے دوسری عالمگیر جنگ کے آخر تک جب اُن کی اچانک موت واقع ہوئی میں نے عباس حلمی سے بہت زیادہ ملاقاتیں کیں اور ہم دونوں بڑے پکے دوست ہوگئے ان کے پاس ایک چھوٹی سی کشتی تھی جس کا نام "نعمت اللہ" تھا۔ جو کم و بیش سردی کے مہینوں اور ابتدائی موسم بہار میں ریورا (RIVIERA) کے مقام پر ان کے گھر کا کام دیتی تھی۔ وہ عام طور پر آخری موسم بہار اور گرمیوں کا زمانہ پیرس اور سوئٹزرلینڈ میں صرف کرتے تھے۔ میں نے اکثر ان کے ساتھ نعمت اللہ کشتی میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا اور سوئٹزرلینڈ میں اُن سے میری اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ کہ وہ کبھی بھی برطانیہ کے خلاف نہ تھے۔ وہ اپنے انگریز دوستوں سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے۔ جب وہ خدیو مصر تھے تو قدرتی طور پر ان کو یہ بات بہت ناگوار تھی کہ بلا کسی قانونی حق یا اختیار کے اور حکومت و اقتدار کے لئے بلا کسی اخلاقی استحقاق کے

برطانیہ کے قابض افسر اور اہلکار اُن کے ملک کو اپنی ایک کالونی اور خود اُن کو کم وبیش ایک شاندار مہاراجہ سمجھتے تھے اور اُن کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے اکثر اُن کی مخالفت لارڈ کرومر (LORD CROMER) سے رہتی تھی۔ جو حقیقت میں گو نام کے لحاظ سے نہیں۔ مصر کا مطلق العنان حکمران تھا۔ بہر حال عباس حلمی نے مجھ سے اکثر کہا کہ لارڈ کرومر نہایت شریف آدمی تھا۔ یہ کہ اُس کی بات اُس کا عہد ہوتی تھی اور یہ کہ اُن کے ذاتی تعلقات سیاسی اختلافات کی وجہ سے خواہ کیسے ہی تلخ کیوں نہ تھے مگر وہ اپنی طرف سے لارڈ کرومر کی برابر عزت کرتے رہے۔ مگر لارڈ کچنر کے ساتھ ذاتی اختلافات بہت تلخ ہوگئے تھے اور انہوں نے لارڈ کچنر کو اُس جھگڑے کی وجہ سے جو اُن سے ہوا کبھی معاف نہیں کیا۔ عباس حلمی نے مجھ سے کہا کہ اُن کا یہ خیال تھا کہ لارڈ کچنر کے لئے یہ بات بڑی افسوسناک تھی کہ وہ کبھی اُس کام کے لئے اُن کے شکر گذار نہ ہوئے۔ جو انہوں نے شروع میں لارڈ کچنر کو مصری فوج کا سردار بنانے کے لئے اُن کی مدد میں کیا۔ جب کچنر کے پیش رو ریٹائرڈ ہوگئے تو اُس جگہ کے لئے دو یا تین امیدوار تھے اور عباس حلمی نے ظاہر کیا کہ انہوں نے خود ملکہ وکٹوریہ کے پاس تار بھیجا جس میں خاص طور پر کچنر کے تقرر کی درخواست کی تھی۔

عباس حلمی نے مجھ سے کہا کہ اگر وہ زخمی نہ ہوتے تو وہ ضرور قسطنطنیہ سے بچ کر باہر چلے جاتے۔ اُن کی کوئی خواہش یا تمنا نہ تھی کہ وہ وہاں رہیں اور جب کبھی اُن کو بہتر موقعہ ملتا وہ مصر جانا چاہتے۔ مگر برطانوی افسر کسی طرح بھی اُن کو وہاں رکھنے کی خواہش نہ رکھتے تھے۔ عباس حلمی کی رائے تھی کہ جیسا کہ اُن پر یہ ظاہر کر دیا گیا تھا کہ مصر میں اُن کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح اُن کو اس کے ساتھ ساتھ قربانی کا بکرا بھی بنا دیا گیا تھا۔ بہر حال اُن کے دل میں انگریزوں کی طرف سے کوئی تلخی نہ تھی خواہ بہ حیثیت قوم کے یا بہ حیثیت افراد کے وہ تمام قصہ کو ایک کرکٹ کے میچ کی طرح خیال کرتے تھے جس میں ان کو ہار ہوئی تھی اور ایک اچھے کھلاڑی کی طرح وہ کہا کرتے تھے۔ "کھیل اب ختم ہوگیا اور جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب ہم کو ایک جگہ بیٹھ کر کچھ کھانا پینا چاہیئے۔"

گو عباس حلمی اچھے مسلمان تھے اور خوش عقیدہ تھے جو پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔

مگر وہ عیسائیوں کے بزرگوں کی بھی بڑی تعریف کرتے تھے اور پیرس میں اُن سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ اور مجھے یقین ہے کہ عیسائیوں کے خیراتی اور نیک کاموں کے لئے اُن کے عطیات بڑے پیمانہ پر تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ روم کا گرجا اپنے دوستوں کے لئے اُن کی مصیبت کے وقت اس سے بہت زیادہ کام کرتا تھا جو کوئی فری میسنری (FREEMESONRY) کر سکتا ہو۔ وہ روپیہ کمانے میں بہت کامیاب تھے۔ انھوں نے اپنے لئے اُس وقت بھی بڑی دولت پیدا کرلی جب کہ مصر میں وہ اپنے اصلی سرمایہ کا بڑا حصہ کھو بیٹھے تھے۔ اُن کے اندر ایک عجیب خصوصیت تھی۔ اُن کی موت کے بعد یہ بات ظاہر ہوئی کہ انہوں نے اپنا روپیہ اکثر غلط گھوڑے پر لگایا۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ سب معزز بنیک والوں کی طرف سے یورپ کے بڑے مبادلہ کرنے والے ایجنٹوں کی طرف سے یا انگلستان کے دلالوں کی سے اپنے دل میں شبہات رکھتے تھے۔ مگر پھر بھی اُن کی یہ حالت تھی کہ ادنیٰ درجہ کے سازشی آدمیوں کے دھوکے میں آجاتے تھے اور وہ بڑی بڑی رقمیں سب قسم کے ناممکن منصوبوں کے لئے اُن کو حوالے کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے حلقۂ متعلقین میں بعض بے انتہا مشتبہ کیریکٹر رکھنے والے آدمی بھی شامل تھے۔ ایسے لٹنے والے آدمی جو خدا جانتا ہے کہ کس طرح اُن کا اعتماد حاصل کر لیتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی موت کے بعد اُن کے وارثوں کو معلوم ہوا کہ وہ دراصل اتنے دولت مند نہ نکلے جتنے کہ وہ پہلے رہ چکے تھے۔ اور یہ کہ ان کی دولت کا بڑا حصہ غائب ہو چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس کی وجہ بتا سکتا ہوں کہ یہ کس طرح واقع ہوا ہوگا دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ میں اور اس سے پہلے انہوں نے مجھے اکثر بتایا کہ مستقبل کی غیر مستقلی۔ روپے لگانے میں امکانی مشکلات یا امریکہ اور کینیڈا میں اپنے روپیہ پر کچھ کنٹرول حاصل کرنا۔ یا جنگ کے زمانہ میں اسی وجہ سے جنوبی امریکہ میں کنٹرول حاصل کرنا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ لڑائی کے زمانہ میں اپنے روپیہ کا فائدہ حاصل کئے بغیر بیکار ہو کر بیٹھ جائیں گے (حالانکہ اُن کو وہ سب حیلے آتے تھے جن سے کیوبا (CUBA) یا ٹینجیرز (TANGIERS) جیسے بے نقصان مقامات پہ تجارتی

کمپنیاں قائم کر سکیں اور سرمایہ کی بڑی رقمیں اور ضمانتیں اُن کو منتقل کر دیں) اُن کو مشکلات اور مجبوریوں کے امکانی سالوں کا بڑا خطرہ تھا جس میں وہ میڈاس (MIDAS) کی طرح سونے کے ڈھیر اپنے پاس رکھتے ہوں اور پھر بھی بھوک کی وجہ سے مر رہے ہوں۔

ان باتوں کا ذکر کر کے وہ دراصل مجھے یہ نصیحت کر رہے تھے کہ میں ان کی طرزِ عمل کی تقلید کروں۔ اس وجہ سے میں نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ کس طرح ان مشکلات پر قابو پا سکے۔ کیا اُنہوں نے ایسا کیا تھا کہ اپنی دولت کے بڑے حصہ کو محفوظ صندوقوں اور الماریوں میں رکھ دیں؟ قدرتی طور پر میں نے اُن کو بتایا کہ لڑائی کے زمانہ میں بنیک کے نوٹ اتنی بڑی تعداد میں خاص رکاوٹ پیدا کریں گے اور سونا اتنی مقدار میں جتنا کہ وہ چاہتے تھے بہت زیادہ وزنی ہو جائے گا جو کام نہ دے سکے گا۔ سوائے اس کے کہ تھوڑی رقموں کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ بہترین قسم کے جواہرات جو سب سے عمدہ ہوں اور جن کے بگڑنے کا خطرہ نہ ہو۔ وہ سونے کی طرح اپنی قیمت قائم رکھتے ہیں۔ اگر وہ مکمل قسم کے ہیں خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے تو جواہرات کے لئے خریدار ہمیشہ مل سکتا ہے۔ اور اُن سے یہ فائدہ ہے کہ جس کسی کے قبضہ میں وہ ہوں گے اس کے پاس ایک بڑی دولت ہوگی۔ خواہ وہ کسی جگہ پر اتفاق سے موجود ہو۔ میں نے قدرتی طور پر اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا کہ انہوں نے جواہرات کی صورت میں بڑی رقم لگا رکھی تھی بالخصوص اُن کے اس مکرر اصرار سے کہ وہ مجھ سے بھی ایسا ہی کرنے کو کہتے تھے۔

اُن کی موت قلب کی حرکت بند ہونے کی وجہ سے ایک دم صبح کے تین بجے جنیوا کے مقام پر ایک کمرہ میں واقع ہوئی اور بہت دیر بعد تقریباً دوپہر کے قریب ایسا ہوا کہ لوگ وہاں آئے اور ان کے مختلف صندوقوں اور الماریوں کو کھولا۔ میں نے قدرتی طور پر اُن کے بیٹے کو جو ان کا وارث تھا اس بات کی اطلاع دی کہ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اُن کے پاس جواہرات کی بڑی رقم موجود تھی۔ مگر مجھے اس پر تعجب ہوا اور تکلیف بھی ہوئی کہ اُن کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ سوائے تھوڑے سے نقد کے اُن کو کوئی اور چیز نہ مل سکی اس کی صرف دو وجہ ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اگر اُن کے پاس جواہرات موجود تھے تو انہوں نے

اُن کو دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر فروخت کر دیا تھا جب کہ اُن کا یہ خیال تھا کہ اب تیسری عالمگیر جنگ ہونے کا کوئی فوری امکان نہ رہا تھا۔ یا دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ سب دولت اُن کی موت اور اُن کی ذاتی متروکہ مال کے باضابطہ کھولے جانے کے درمیانی گھنٹوں میں غائب ہوگئی۔

سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء میں انہوں نے جو غلط تخمینے لگائے تھے اُن کی بنیاد پر لڑائی کے طوفان میں اتحادیوں سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ عباس حلمی کے صحیح خیالات یا ارادوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلاسکیں یا یہ معلوم کرسکیں کہ وہ ارادے کس طرح ناکامیاب ہوئے۔ مصر میں بہرحال اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں کی حالت تقریباً ایسی ہوگئی جیسے کہ وہاں کوئی باضابطہ حکومت نہ ہو اور ساری فضا معلق اور بے تکی ہوگئی ہو۔ مسلمانوں کی رائے عامہ کے متعلق انتشار اور غلط فہمی بہت گہری تھی۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر جن کا میں ذکر کرچکا ہوں یہ بات نہایت ضروری تھی کہ مصر کے اندرونی استحکام کو قائم رکھا جائے۔

اسی وجہ سے میرا مشن یہ تھا کہ میں رائے عامہ کو صاف اور پختہ بناؤں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنے کسی ساتھی کو اور لے لوں اسی لئے میں اپنے ایک پرانے اور عزیز دوست سر عباس علی بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اس زمانہ میں اُس مستقل کونسل کے ہندوستانی ممبر تھے جو لندن میں وزیر ہند کو مشورہ دیا کرتی تھی۔ ہم دونوں قاہرہ کے لئے جتنی جلد ممکن ہوسکا روانہ ہوگئے اور وہاں پر ہمارا استقبال شاہانہ اعزاز کے ساتھ کیا گیا۔ ہم وہاں پر برطانوی کمانڈر انچیف کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے رہے۔ ہم نے فوراً ایک بڑے نازک اور مشکل کام کی طرف توجہ کی جس کا تعلق مصری سوسائٹی کی بہت سے طبقوں کی بہت سی شاخوں سے تھا۔

سب سے پہلے شاہی محل تھا جس پر ہم کو قابو پانا تھا یا مصر کے حکمران خاندان کی خاص خاص شخصیتوں پر۔ وہ سلطان بھی تھے جو عباس حلمی کی عدم موجودگی میں نامزد کئے گئے تھے۔ اُن کے بھائی شہزادہ فواد (PRINCE FUAD) بھی تھے جو بعد میں شاہ فواد اول ہوگئے اور جن کے دوستانہ تعلقات جرمنی اور اٹلی دونوں سے تھے۔ بعض دوسرے با اثر شہزادے بھی تھے اور ان میں

سب سے زیادہ اہم سلطان کے بیٹے تھے جن کی شادی خدیو مصر کی بہن سے ہوئی تھی۔ وہ عالم اور مسلمان بزرگ بھی تھے جو الازہر یونیورسٹی کے شعبوں کے صدر تھے۔ یہ وہ بڑا ہی انتہا قدامت پسند اور ہمیشہ سے روایتی شریعت والا اسکول تھا جو نہ صرف مصر میں بلکہ سارے اسلام کے لئے مذہبی زندگی کا مرکز ہے۔ ان کے علاوہ مصر کے عام آدمی بھی تھے اور وہ پڑھے لکھے آدمی جو اپنے ہوٹلوں میں برابر بیٹھ کر ہر اخبار کی ہر اشاعت پر بڑی دلچسپی سے بحث کرتے تھے۔ گاؤں والے۔ کاشتکار لوگ اور وہ فلاحین (FELLAHIN) جو ہمیشہ سے مصر کی طاقت کا اصل ذریعہ رہ چکے ہیں۔

ہم نے اپنے کام کو یہ سمجھا کہ وہ لوگوں کو بتانے اور نصیحت کرنے کا ایک کام ہے ہم ان لوگوں کو جن سے ہم باتیں کرتے تھے سمجھا کر مطمئن کرتے تھے۔ خواہ وہ گفتگو پرائیوٹ ہو یا پبلک میں ہو اور یہ بتاتے تھے کہ اُن کا مفاد ہی نہیں بلکہ اُن کا یہ فرض تھا کہ بہ حیثیت اچھے مسلمان کے وہ اتحادیوں کے مقصد کو قائم رکھیں اور اس کی تائید کریں میں درحقیقت اپنے موجودہ اور ذاتی علم کی بنا پر بڑے اختیار اور یقین کے ساتھ بات کر سکتا تھا میں نے بتایا کہ ترکوں کو اتحادیوں کی طرف سے مناسب اور منصفانہ شرائط کا ہر ممکن موقعہ ملا۔ کہ برطانیہ اور فرانس اس کے لئے رضامند تھے کہ وہ روس پر اپنا تمام اثر ڈالیں تاکہ وہ آئندہ کے لئے ترکی کے مفاد و مقاصد کا تحفظ کرے اور سب سے اہم یہ بات تھی کہ غیر جانب داری ہی ترکی کو سانس لینے کا وہ موقعہ دیتی جس کی اس کو ضرورت تھی جب یورپ خود کو تباہ کرنے کے خوفناک رویہ میں مصروف تھا ترکی کو اس کا وقت مل سکتا تھا کہ وہ اپنے صوبائی حکومت کے وسیع اور ڈھیلے انتظام کو دوبارہ ترتیب دے سکے۔ عرب قومیت کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو مطمئن کر دے اور اُن سب تمدنی۔ سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کو پورا کرے جو ترکی سلطنت کو متحد اور مضبوط بنا دیتیں۔ یہ تمام فائدے اس طرح کھو دئے گئے جس طرح کوئی جواری ایک بار کی پھینک میں کھو دیتا ہے۔ جواری آخر کار کبھی جیتنے والے نہیں رہتے اور تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ سیاسی کھلاڑیوں کو کامیابی کا اتنا ہی کم موقعہ ہے جتنا کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں یا کسی تاش کے کھیل میں بازی لگانے

والوں کو ہوتا ہے۔

ہمارے مشن نے وہ نتائج پیدا کئے جن کی ہم کو امید تھی۔ پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں مصر کی اندرونی سالمیت اور اس امن و اطمینان کی وجہ سے اتحادیوں کو جو امداد حاصل ہوئی یہ وہ مشہور اور مسلسل اہمیت رکھنے والے واقعات تھے جو اس وقت تک شمار کئے جا سکتے ہیں جب کہ جنرل ایلنبی (GENERAL ALLENBY) نے فلسطین اور شام کے کنارہ کنارہ الیپو (ALEPPO) اور اناطولیہ کے کوہستان کی نیچے والی پہاڑیوں تک اپنی آخری فاتحانہ پیش قدمی کی۔

مصر سے میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اور راستہ میں ان ہندوستانی فوجوں کو دیکھا جو نہر سوئز کے علاقہ (CANAL ZONE) میں جمع تھیں اور جن کی تعداد بہت کافی تھی۔ اُن میں سے بہت سے مسلمان تھے۔ میں نے ان کی ہمت افزائی کی اور ان کو نصیحت کی کہ وہ اپنا فرض ادا کئے جائیں اور اُس ملک معظم کے لئے وفاداری کے ساتھ لڑیں جس کی خدمت کے لئے وہ حلف اٹھا کر پابند ہوئے تھے۔ ہندوستان میں میں نے اُس سرگرم تعریفوں اور شکریوں سے جن کے ساتھ میرا استقبال کیا گیا اور جو وائسرائے سے لے کر نیچے درجہ کے آدمیوں کی طرف سے تھے یہ محسوس کیا کہ ہم نے دراصل بہت اچھا کام کیا تھا۔ مصر کو ہمارے اس مشن کا میرے لئے خاص طور پر ایک یہ خوشگوار ذاتی نتیجہ نکلا کہ میری محبت سر عباس علی بیگ سے بہت پختہ ہوگئی اور وہ اُس وقت سے اور اُسکے بعد سے ساری عمر کے لئے میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہو گئے۔ اس نئی نسل میں اُن کے بیٹے بھی کچھ اس سے کم ممتاز قومی خادم نہیں رہے جتنا کہ وہ خود تھے اُن میں سے ایک بیٹے ماسکو میں پاکستان کے وزیر ہیں اور دوسرے بیٹے جو پہلے کراچی میں دفتر خارجہ کے مستقل صدر تھے اب اٹاوہ (OTTAWA) میں ہائی کمشنر ہیں۔

اُسی سال کے آخر میں میری واپسی لندن کو ہوئی اور مصر میں ہمارے مشن کو جو کامیابی ہوئی تھی اُس کے احساس سے پھر مجھے خوشی ہوئی اور میرا دل بڑھایا گیا۔ خود بادشاہ سلامت نے، وزیر اعظم نے اور کابینہ کے دوسرے ممبروں نے میرا پُرجوش شکریہ ادا کیا

اور مجھے یہ محسوس کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ میں دراصل صحیح خدمت کے قابل ہوا۔

اپریل ۱۹۱۶ء میں ملک معظم نے مجھے ایک خاص ذاتی امتیاز کا اعزاز عطا فرمایا۔ انہوں نے گیارہ توپوں کی سلامی کا اعزاز میرے واسطے منظور فرمایا اور صوبہ بمبئی میں اول درجہ کے حکمران شہزادہ کا درجہ اور فوقیت عطا فرمائی۔ ہندوستان کی سلطنت کا اختتام اور اس کے ختم ہونے پر ملک میں وسیع سیاسی اور تمدنی تبدیلیوں کی وجہ سے اس قسم کی عنایت آجکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر ۱۹۱۶ء کے حالات اور واقعات کے زمانہ میں یہ بہت بڑی عزت تھی اور بادشاہ سلامت کی طرف سے بہت زیادہ فیاضانہ اور قابل لحاظ کام تھا۔ کسی حکمران شہزادہ کو توپوں کی سلامی عطا کرنا اور اس میں توپوں کی تعداد مقرر کرنا فوقیت اور اعزاز کے لئے بہت اہم شمار کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے صرف ایک ایسی مثال ہو چکی تھی جس میں کسی ایسے شخص کو جو ملک رکھنے والا شہزادہ نہ ہو اس قسم کی سلامی عطا کی گئی ہو اور وہ مثال سر سالار جنگ کی تھی جو حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے۔ اور جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں وسط ہند اور دکن کو برطانوی حکومت کا وفادار رکھنے میں خاص طور پر کام کیا تھا۔ اخبار ٹائمس (TIMES) نے اس اعزاز پر رائے زنی کرتے ہوئے اپنے ایک ایڈیٹوریل میں اس طرح لکھا تھا کہ:۔

> یہ آغا خان کے حصہ میں آیا ہے کہ انہوں نے سر سالار جنگ کی نسبت ایک بہت زیادہ وسیع اور زیادہ بڑے میدان میں خدمت انجام دی اور برطانوی حکومت کے ایک سخت اور نازک موقعہ پر جو غدر کے واقعہ سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ مقامی اور صوبائی اثر استعمال کرنے کے علاوہ بہت زیادہ کام کیا۔"

لڑائی کے نتیجہ میں مجبوری طور پر مجھے اور میرے خاندان کو ایک بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ جس طرح اور بہت سے خاندانوں پر اس سخت زمانہ میں ساری دنیا کے اندر اس قسم کی مصیبت آئی تھی۔ میرے رشتہ کے بھائی آغا فرخ شاہ جو میرے لکھنے پر کرمان میں وہاں کے قبیلوں اور خاص میرے اسمٰعیلی مریدوں کے درمیان ایک سیاسی مشن میں وقف تھے۔

جرمنی ایجنٹوں کے ابھارنے سے قتل کر دئے گئے۔ ہندوستان کے نقصانات جو لڑائی کے میدان میں فلانڈرس (FLANDERS) اور عراق میں (MESOPOTAMIA) ہوئے تھے وہ بہت زیادہ تھے۔ میں خود اس وقت ایک مشکل تکلیف دہ اور طویل علالت کی وجہ سے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۶ء کے ابتدا میں مجھے بینائی کی سخت تکلیف اور مشکلات کا احساس شروع ہوا۔ میری نبض بہت زیادہ بے ضابطہ تھی اور باوجودیکہ میں کوئی خاص پرہیزی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ بلکہ ٹھیک طور پر کھا رہا تھا۔ مگر میرا وزن تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ پیرس کے ایک طبیب نے میری بیماری کے متعلق یہ تشخیص کی کہ وہ 'گریو' کی بیماری ہے۔ جس کے علامات یہ تھے کہ آنکھیں باہر کو نکل آئیں اور گلے میں تھوڑا سا ورم ہو جائے میں سوئٹزرلینڈ کے مشہور ڈاکٹر کوچر (DR. KOCHER) کے پاس برن (BERNE) کے مقام پر گیا جو اس زمانہ میں ہر قسم کے ورم کی بیماریوں کے متعلق سب سے زیادہ مستند اور بڑے ڈاکٹر شمار کئے جاتے تھے۔ تاکہ میں یہ معلوم کر سکوں کہ میری بیماری آپریشن کے لائق تھی یا نہیں سوئٹزرلینڈ کے ایک صحتی مرکز میں چند ہفتے زیر معائنہ رہنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ میری بیماری آپریشن کے قابل نہ تھی۔ صاف طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں تباہی کی طرف بہت تیزی کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں سوئٹزرلینڈ میں اٹھارہ مہینے اور اس سے زیادہ مقیم رہا۔ مگر میری حالت میں کوئی بہتری نہ ہوئی۔ بلکہ وہ رفتہ رفتہ خراب ہوتی چلی گئی۔

اس واقعہ سے جو بعد کو سوئٹزرلینڈ کی قانونی تاریخ میں "لیوسرن بمب" کے (LUCERNEBOMB) کے نام سے مشہور ہوا۔ برطانوی گورنمنٹ نے خوف زدہ ہو کر بہت ضروری اثر لیا۔ جرمنی کے خفیہ محکمہ کو اس کا یقین نہ تھا کہ میں درحقیقت بیمار تھا۔ بہر حال اُن کا خیال تھا کہ اُن کے ملک کا مفاد اس میں اچھی طرح حاصل ہوگا کہ میں اُن کے راستہ سے ہمیشہ کے لئے الگ ہٹا دیا جاؤں۔ انہوں نے اسکا انتظام کیا کہ ایک بمب مجھ پر پھینکا جائے اور اپنے منصوبہ میں یقینی کامیابی حاصل کرنے لئے انہوں نے اس کا بھی انتظام کیا کہ میرے ناشتہ کی کافی (COFFEE) میں زہر ملا دیا جائے مگر بمب نہ چل سکا اور میں نے وہ کافی نہیں پی۔ لڑائی کے ختم ہونے کے چند سال بعد تک سوئٹزرلینڈ والوں نے نہایت محنت کے ساتھ

اس تمام واقعہ کی تحقیقات کی اور اس تفتیش نے اُس زمانہ میں بہت بڑی شہرت حاصل کرلی تھی۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں بہرحال جو کچھ برطانوی حکومت نے مناسب سمجھا وہ یہ تھا کہ مجھ سے سوئٹزرلینڈ چھوڑنے کے لئے کہے۔ چنانچہ میں پیرس واپس چلا گیا۔

وہاں پر میرے دوستوں کی جماعت جن میں امریکی کالونی کے دوست بھی شامل تھے جن کا میں نے دوسری جگہ ذکر کیا ہے بہت زیادہ رنجیدہ اور خوف زدہ ہوئی۔ ان کے خیال میں جیسا کہ انہوں نے مجھ سے بعد میں کہا بالکل ختم ہوچکا تھا مگر میں خود اس وقت بھی امید رکھتا تھا گو اُس امید کی جھلک بہت کمزور تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں اتنے زیادہ مشہور ڈاکٹروں نے میرا معائنہ کیا تھا۔ سب قسم کے علاج اور دواؤں کے ڈھیر کا مجھ پر تجربہ کیا جاچکا تھا مگر کسی کا کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک پروفیسر "پیر میری" (PROFESSOR PIERRE MARIE) نے میرا معائنہ کیا اور ایک بالکل نئی اور عجیب تشخیص کی۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو گواٹر (GOITER) کا مرض بالکل نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے نئے طریقہ سے علاج شروع کیا اور ایک سال کے اندر میں پوری طرح اصلاح پر آنے لگا۔ ایک اثر بہرحال باقی رہا اور وہ یہ کہ میری آنکھوں نے پھر کبھی اپنی اصلی حالت دوبارہ حاصل نہیں کی۔

اس طویل علالت کا بہرحال یہ نتیجہ ہوا کہ میں ضرورتاً تین سال سے زائد عرصہ کے لئے سنہ ۱۹۱۹ء کی گرمیوں تک تمام قومی خدمت اور باہر کے کاموں سے الگ رہا۔

یہ ایک طویل گوشہ نشینی تھی جس کو میں نے آخرکار ایک کتاب لکھکر کچھ بہتر بنایا۔ اس کتاب کا نام انڈیا ان ٹرانزیشن (INDIA IN TRANSITION) ہے۔ جس میں ہندوستان اور تمام جنوبی و مشرقی ایشیا کے مستقبل پر میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے متعلق میں آخر میں مناسب موقعہ پر حوالہ دوں گا۔

باب نمبر ۹

سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ

سنہ ۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں میری تندرستی اصلی حالت پر آ گئی تھی اور مجھ میں پھر کام کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ مگر وہ دنیا جس میں نکل کر میں نے کام کیا میری گوشہ نشینی کے تین سالوں میں بہت زیادہ اور وسیع پیمانہ پر بدل چکی تھی۔ روس میں زار کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ جرمن والوں نے لینن (LENIN) اور اس کے ساتھی سازش کرنے والوں کو راستہ دے دیا تھا کہ وہ اپنے وطن میں آزادی کے ساتھ جو چاہیں سو کریں۔ بریسٹ لٹووسک (BPEST-LITOVSK) کا صلح نامہ ہو چکا تھا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں سب محاذوں پر مرکزی قوتوں کو شکست ہو چکی تھی۔ قیصر جرمنی تخت چھوڑ چکا تھا اور اسٹریا ہنگری کی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ یورپ کے بعض ملکوں میں سوشلسٹ (SOCIALISTS) کے فوجی انقلابات ظاہر ہو رہے تھے۔ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ پریسیڈنٹ ولسن (PRESIDENTWILSON) اس زمانہ میں نجات دلانے کے لئے ایک قسم کی علمی شخصیت شمار کئے جاتے تھے جو سب قوموں کے لئے اصول خود اختیاری کو تسلیم کرتے تھے۔ ہر مقام پر جنگ نے سیاسی احساسات کی طوفانی لہریں چھوڑ رکھی تھیں جو کبھی کم نہ ہوتی تھیں اور نہ اُن پر قابو پایا جاتا تھا۔

جو صلح کرانے والے پیرس میں اس لئے جمع ہوئے تھے کہ نہایت مخلوط اور پیچیدہ جذبات کے ساتھ دنیا کی اس حالت پر غور کریں جو مشکلات اور خطرات سے پریشان ہو رہی تھی اور جس نے ایسا خوف دلانے والا خلا اور بدنظمی پیدا کر دی تھی جس کو دور

کرنے کے لئے بہت سی قوموں کے آدمی ان صلح کرنے والوں کی طرف آنکھ لگائے ہوئے تھے تاکہ وہ جلد اور عمدگی کے ساتھ اس بدنظمی کو ایک باضابطہ دورِ حکومت میں بدل دیں۔ جنگ کے طویل اور خون آلودہ خوفناک خواب کے ختم ہونے پر سکون اور آرام کا خیال ایک قسم کی عجیب اور زبردست خوش فہمی کے ساتھ مخلوط ہو گیا تھا۔ صلح کی وجہ سے بے لوث، سیاسی، تمدنی اور اقتصادی امن و سکون کا زمانہ آنے والا تھا۔ ایسی زبردست شخصیت جیسے کہ میرے پرانے دوست لارڈ کرزن بھی (LORD CURZON) جو اس وقت پارلیمنٹ کے دارالامرا کے صدر (LEADER OF THE HOUSE OF LORDS) تھے۔ اس زمانہ کے حالات سے متاثر ہوئے اور نومبر ۱۹۱۸ء میں جو تقریر انہوں نے صلح نامہ کا اعلان کرتے ہوئے دارالامرا میں کی۔ اس میں بڑی سرگرمی کے ساتھ ایشیا کی یہ سطور ترنم کے ساتھ پڑھیں۔ جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہیں کہ:۔

"دنیا کا بڑا زمانہ اب از سرِ نو شروع ہوتا ہے"

جو کچھ ہو چکا تھا اُس کا اثر ہندوستان پر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ۱۹۱۷ء میں جب کہ جنگ کی کشمکش اپنی انتہائی سختی پر تھی برطانیہ کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقہ میں یہ عام احساس تھا کہ سلطنت کی جنگی امداد کے لئے ہندوستان نے جو حصہ لیا اس کے سپاہیوں کی بہادری۔ اُس کے لیڈر اور عوام کی مضبوطی ایسی تھی جس کو صرف رسمی طور پر ہی تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سے زیادہ حاصل کرنے کی مستحق تھی۔ اِس وجہ سے وائسرائے اور ایڈون مونٹگ (EDWIN MONTAGUE) وزیرِ ہند کی زوردار سفارش پر گورنمنٹ نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو ایک اعلان شائع کیا جس میں ہندوستان کے متعلق اپنے اغراض و مقاصد کا اظہار کیا۔ اُس اعلان کے الفاظ یہ تھے:۔

"ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو حکومت کے ہر شعبہ میں روز بروز زیادہ کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ایسے اداروں کو جو خود مختار ہوں رفتہ رفتہ ترقی دی جائے تاکہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت رفتہ رفتہ قائم ہو جائے اور وہ سلطنت برطانیہ کا ایک اہم جزو

ثابت ہو۔"

یہ نہایت اہم اعلان تھا۔ اس سے برطانوی حکومت اور اُس کے جانشینوں کا واضح ارادہ صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا اور یہ اُن خیالات سے ایک قسم کی بنیادی علیحدگی تھی جو ایکٹ ۱۸۳۳ء کے اصول کے خلاف ہندوستان میں برطانوی حکومت کے منظور شدہ اور بنیادی مقاصد بن چکے تھے۔ انتظامی اصلاحات کی ابتدائی اسکیموں میں ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۹ء تک کی کراس لینس ڈون (CROSS-LANSDOWNE) تجاویز میں اور ۱۹۰۹ء کے بعد والے چند سالوں میں مورلے منٹو اصلاحات میں اس قسم کا کوئی اشارہ بھی نہ پایا جاتا تھا کہ اصلی اختیارات اور ذمہ داری انگریزوں سے لے کر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں منتقل کرنے کا کوئی ارادہ ہے۔ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کا کبھی بھی ارادہ نہیں کیا گیا تھا۔ مگر اب وہ ایسے الفاظ میں ظاہر کر دی گئی تھی جس کو ہر شخص پڑھ سکتا تھا۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ اصل مسودہ میں جو کابینہ کے پاس بھیجا گیا "حکومت خود اختیاری" کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ مگر اور سب آدمیوں کے علاوہ لارڈ کرزن (LORD CURZON) نے ان الفاظ کو "ذمہ دار حکومت" کے الفاظ سے بدل دیا۔ اس طرح پر انہوں نے یہ بات لازمی اور ناقابل تلافی کر دی کہ جب کبھی اس اعلان کو پورا کرنے کے لئے دستوری اصلاحات نافذ کئے جائیں تو وہ ایسا نمونہ اختیار کریں جس کا نام "دوعملی حکومت" (DYARCHY) ہو جائے۔ چونکہ "ذمہ دار" کا لفظ اُن لوگوں کے لئے جو اس حکومت کو چلاتے ہیں یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی کے جواب دہ ضرور ہیں۔ اب کس کے جواب دہ ہوں؟ گورنر کے یا وائسرائے کے اور اس طرح پر برطانیہ کے پارلیمنٹ کے۔ یا ہندوستانی ووٹر اور ہندوستانی عوام کے؟ دوعملی حکومت۔ جو کبھی کام چلانے کے لئے ایک قسم کا سمجھوتہ ہو سکتی تھی۔ صوبوں اور مرکز دونوں مقامات میں وزیروں کے لئے لازمی طور پر مصیبت اور الجھن پیدا کرتی تھی۔ سیاسی اور روزمرہ عملی حکومت کی اصلاحات میں یہ طرز عمل نقطۂ نظر کے اس دوہراپن کا اظہار تھا جو تقریباً مجنونانہ تھا۔ جس میں اصولی ارادہ اور کام کرنے کے طریقہ میں ایسا اختلاف تھا

جو اس کے بعد سے ہندوستان کے ساتھ برطانوی رویہ کو ہمیشہ صاف طور پر ظاہر کرتا رہا۔ خبط یا جنون (SCHIZOPHRENIA) اچھے تعلقات قائم کرنے کے لئے بنیاد نہیں بن سکتا۔ بہرحال اسی میں اس بات کی وجہ معلوم ہوتی ہے جس سے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان وہ علیحدگی اور اجنبیت پیدا ہو گئی جو تلخ دشمنی کی حد تک پہنچ گئی اور جس کی وجہ سے آخر کار ایک تعجب خیز تیزی اور تکمیل کے ساتھ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قطعی اور مکمل خاتمہ ہو گیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں یہ سب باتیں مستقبل کے لئے موجود تھیں۔ جہاں تک میرے خیالات کا تعلق تھا میں اُس وقت ایک وسیع اور زیادہ دلیری والے منصوبہ میں مصروف تھا جس کو میں پہلی اپنی کتاب انڈیا ان ٹرانزیشن (INDIA IN TRANSITION) میں ظاہر کیا۔ میں نے کوشش کی کہ ہر وہ شخص جو ہندوستان و برطانیہ کے تعلقات کے لئے کوئی ذمہ داری محسوس کرتا تھا۔ اس منصوبہ سے دلچسپی لے اور خاص طور پر ایڈون مونٹگ (EDWIN MONTAGVE) جو وزیر ہند تھے۔ ایڈون مونٹیگ یہودی تھے جو برطانوی نمونہ اور طرز زندگی میں پوری طرح گھل مل گئے تھے۔ وہ روشن خیال اور قابل محبت تھے۔ وہ انگریز یہودی خاندانوں کے اُس ملے جلے مونٹیگ سیموئل آئسک طبقہ کے ایک فرد تھے جس نے گذشتہ نصف صدی میں برطانوی زندگی میں بہت مشہور حصہ لیا ہے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں میری عین خواہش تھی کہ برطانوی تحریک اور ہدایت کے بموجب خود مختار ریاستوں کا ایک جنوبی ایشیائی وفاق قائم کیا جائے جو جزیرہ نما ملایا سے لے کر مصر کے حدود تک چلا جائے۔ ایسا وفاق جو کم و بیش اُس ہی طرز کا ہو جیسے کہ کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) کا (کامن ویلتھ ایسا لفظ تھا جو درحقیقت سنہ ۱۹۱۹ء میں استعمال ہونا شروع نہیں ہوا تھا) مجھے اُس وقت یہ محسوس ہوتا تھا اور مجھے اب بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے لئے یہ ایک آسان اور قابل عمل اسکیم تھی اور دنیا کی مصیبتوں کے لئے اس سے بہتر حل تھا جو اُس وقت منظور کیا گیا۔ اگر برطانوی حکومت اس کو منظور کر لیتی اور اگر اس پر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ جنوبی ایشیا میں

ایک زبردست طاقت پیدا ہو جاتی۔ گویا طاقتوں کا ایک مجموعہ جس میں زبردست جمہوری ادارے قدرتی طور پر اور آسانی کے ساتھ پیدا ہوتے چلے جاتے۔ جو برطانیہ کے لئے اور جیساکہ بعد میں ثابت ہوا امریکہ اور جنوبی نوآبادیوں کے لئے سخت ضرورت کے موقعہ پر بہت مفید مدد بہم پہنچاتے اور جو بیرونی حملہ کے خلاف ایک مستقل حفاظتی دیوار بن جاتے۔

ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میری یہ تمام تجاویز اُن خیالات اور امیدوں کی تکمیل اور توسیع تھی جو میرے دماغ میں برسوں تک گوکھلے کی صحبت میں رہنے سے جڑ پکڑ گئے تھے۔ ۱۹۱۴ء کے موسم خزاں میں جب میں جنگ کے کام میں جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا مفید حصہ لینے کے لئے افریقہ سے لندن کو بہت جلدی کے ساتھ واپس ہوا۔ میری ملاقات گوکھلے سے ہوئی جو اُس وقت ذیابیطس کے مرض کی وجہ سے سخت بیمار تھے۔ اور جن کے لئے لندن کی ٹھنڈی اور کہرہ دار آب و ہوا قطعاً ناموافق تھی۔ مگر پھر بھی انہوں نے لندن میں اپنے قیام کو صرف مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے زیادہ طویل کر دیا۔ بہت سے دوسرے کاموں کے دباؤ کے باوجود ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملے اور ہندوستان کے متعلق اپنی تمام امیدوں اور خطروں پر بہت آزادی اور صفائی کے ساتھ بحث کی۔ ہم نے ایک مسودہ تیار کرنے کی کوشش کی جو ہم گورنمنٹ کو بھیجنے کا ارادہ رکھتے تھے اور جس میں ہم نے وہ تمام متفقہ امور رکھ دیئے تھے جن پر ہم دونوں اپنی گفتگو اور بحثوں کے بعد بہت مشکل اور محنت کے ساتھ پہنچے تھے۔

۱۹۱۵ء کے شروع میں گوکھلے کا انتقال ہو گیا۔ مگر مرنے سے پہلے وہ اپنی سیاسی وصیت نامہ کو مکمل کر چکے تھے جو انہوں نے میرے نام لکھا تھا اور جس میں مجھ سے یہ درخواست کی تھی کہ میں اس کو دو سال کے اندر شائع کر دوں جبکہ جیساکہ اُن کو امید تھی جنگ ختم ہو جائے گی اور ہندوستان اس قابل ہو جائے گا کہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کے بڑے کام کا مقابلہ کرے۔

مناسب وقت پر میں نے گوکھلے کے وصیت نامہ کو اُن کے حکم کے مطابق شائع کر دیا اور اپنی طرف سے میں نے اس میں ایک یاد داشت (MEMORANDUM) کا اضافہ کیا جس میں یہ عرض کیا گیا کہ جنگ کے بعد مشرقی افریقہ کو ہندوستان کی جنگی خدمات کے صلہ میں ہندوستانیوں کو آباد کرنے اور ترقی دینے کے لئے وقف کر دیا جائے۔

بہر حال جو کچھ ہو سکتا تھا اُس کے متعلق یہ سب خواب تھے اور اب بھی ہیں۔ تاریخ نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اصلاحات کی آخری اسکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں شائع کی گئی تھی بہت مختلف تھی۔ وہ بہت چھوٹے پیمانہ پر تھی اور صرف ہندوستان کے لئے محدود تھی۔ اور افسوس ہے کہ اس نے ذمہ دار حکومت کی طرف وہ پُرامن۔ رفتہ رفتہ اور قدم بقدم ترقی پیدا نہیں کی جس کی امید دلائی گئی تھی بلکہ اس کی بجائے بے انتہا بے چینی اور سخت قسم کے سیاسی طوفان کی فضا پیدا کر دی۔ ہندوستانی سیاست کے معتدل اور دستوری دماغ رکھنے والے لیڈر جیسے کہ میرے دوست سر فیروز شاہ مہتا اور گوکھلے تھے مر چکے تھے۔ نئی نسل نے بہت زیادہ دور رس مقاصد حاصل کرنے کے لئے اور وہ بھی جلدی کے ساتھ نئے نئے طریقے اختیار کئے۔

قبل اس کے کہ پارلیمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا بل پر غور کرے۔ ہندوستان کی حالت اکثر مرتبہ بدتری کی طرف آ چکی تھی۔ لارڈ جسٹس رولیٹ (LORD JUSTICE ROWLATT) کی صدارت میں جو کمیٹی اس لئے قائم کی گئی تھی کہ وہ سیاسی گڑبڑ کے قانونی پہلو پر غور کرے۔ اُس نے اپنی رپورٹ شائع کی جس میں یہ سفارش کی گئی کہ بغاوت کے جرموں پر فیصلہ دینے کے لئے خاص عدالتیں قائم کی جائیں۔ اس رپورٹ کی بہت مخالفت کی گئی۔ آئرلینڈ کی مثال ہندوستان کے سامنے تھی۔ حد پسندی نے دونوں فریقوں کو گھیر لیا۔ پارلیمنٹ نے رولٹ کمیٹی کی سفارشوں کو منظور کر لیا اور جوں ہی وہ بل جس میں وہ سفارشیں رکھی گئی تھیں قانون کی صورت میں پاس ہو گیا۔ کانگریس نے

ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اور اس قانون کی مخالفت میں ایک عام اسٹرائک شروع کر دیا۔ ان سخت اور تکلیف دہ مہینوں میں ایک مرتبہ سے زیادہ میں ضبط کرنے پر اصرار کر چکا تھا اور یہ اپنے مریدوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عام طور پر کل مسلم جماعت کے لئے۔ اس کے تقریباً پندرہ روز بعد ہی وہ خوفناک امرتسر والا واقعہ پیش آیا جس نے برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان کسی مفید اور مستقل مصالحت کی امید کو برسوں پیچھے پھینک دیا۔

اِس واقعہ کے صدمہ نے اور اس کی تلخ یادگاروں نے جو بعد میں باقی رہیں تعلقات کو برسوں کے لئے زہر آلودہ بنا دیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں ایسا آدمی ہوتا جو مایوس ہو جایا کرتا ہے تو میں اس زمانہ میں ضرور مایوس ہو جاتا۔ مگر میں ایسے معاملہ پر جس میں نہایت اعلیٰ سیاسی اصول شامل تھے برطانوی حکومت سے ایک صاف اور باعزت طریقہ عمل حاصل کرنے کی کوشش میں اتنا زیادہ مصروف تھا کہ نا امید ہونا میرے لئے ایسی تفریح کی چیز تھی جس کے لئے نہ میرا ارادہ تھا اور نہ جس کے لئے میرے پاس وقت تھا۔

دوعملی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس میں ہندوستان کے اندرونی معاملات کے متعلق بہت کافی اختیارات مرکز کی طرف سے صوبوں کے ذمہ دار حکام کو منتقل کر دئے گئے تھے۔ مرکزی دفتری حکومت کے اثرات لندن کے ہندوستانی دفتر میں ایسے ہی نمایاں تھے جیسے کہ وہ شملہ یا نئی دہلی میں تھے۔ اس وجہ سے مجھ سے کہا گیا کہ میں لندن کی اُس کمیٹی کا ممبر بن جاؤں جس کا یہ کام تھا کہ وہ انڈیا آفس کی مرکزیت کو ختم کرے اور اس کے کام کی دوبارہ ترتیب دے۔ یہ کام خاص طور پر ایسا تھا جس میں ان چند راستوں کو ختم کر دیا جائے جن کے ذریعہ سے وزیر ہند کو اطلاعات پہنچتی تھیں اور جن کے ذریعہ سے وہ اپنے محکمہ کو اور خود کو اُن لوگوں کی نگاہ میں محفوظ رکھتا تھا جن کے سامنے وہ آخرکار ذمہ دار اور جواب دہ تھا۔ یعنی برطانوی دارالعوام کے چنے ہوئے ممبر۔

ﮯ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو ۳۷۹ ہندوستانی قتل کر دیئے گئے تھے جب کہ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ایک غیر قانونی جماعت کو منتشر کرنے کیلئے گولی چلائی گئی تھی۔

یہ بڑا سخت کام تھا۔ مگر اس سے مجھ کو اندر کی وہ صاف تصویر نظر آگئی جو ایک بڑی انتظامی مشین کے چلانے میں ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ سے آجکل کی موجودہ حکومت چلائی جارہی ہے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا یہ کام اُسی زمانہ میں ہوا جب میں سخت سیاسی سرگرمی میں مصروف تھا جس میں میں نے خاص طور پر اپنی کوششوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ سلطنت عثمانیہ کی مکمل بربادی کو روکنے کی کوشش کی جائے اور مشرق قریب و مشرقِ وسطیٰ میں ایسا صلح نامہ ہوجائے جو نہ صرف منصفانہ اور صحیح ہو بلکہ جو قابلِ عمل بھی ہو۔

اسی لئے مجھ کو کچھ تفصیل کے ساتھ اس سیاسی اور بین الاقوامی کام کی اصلی تہ کو بیان کرنا چاہیئے۔ جس کے بھنور میں میں پھنس گیا تھا اُن بے شمار بڑے سوالات میں سے جو جنگ کے بعد فوراً فاتح سلطنتوں کے سامنے پیش آئے۔ ایک یہ بھی تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ کیا کیا جائے جس کے وسیع ملکوں پر ۱۹۱۸ء کے آخر تک اتحادیوں کا فوجی قبضہ تھا؟ یہ صحیح تھا کہ ترک اپنے وطن اناطولیہ (ANATOLIA) اور اپنے قدیم تاریخی دارالسلطنت قسطنطنیہ پر اپنا قبضہ باقی رکھتے تھے۔ مگر مغرب میں ٹری پولیٹینا (TRIPOLITANIA) سے لے کر مشرق میں کردستان (KURDISTAN) تک اور الیپو (ALEPPO) کے مشرق سے لے کر وادی حلفہ (WADI HALFA) تک وہ بڑے بڑے ملک جن کی آبادی مختلف قوموں اور مختلف کلچر کی تھی مگر جن کی اکثریت مسلمان تھی اور جو کسی زمانہ میں سلطان ٹرکی کے محکوم اور زیر اطاعت تھے۔ اب اتحادیوں کا ایک فوجی گورنر اُن پر حکمران افسر تھا۔

جنگ کے پرجوش زمانہ میں فتح کے بعد مال غنیمت کے بہت سے وعدے کئے گئے تھے۔ وہ مال غنیمت جو ٹرکی کے مفتوحہ جسم سے نوچ کر نکالا جائے گا۔ اُن میں سے کچھ وعدے ۱۹۱۹ء کے شروع تک پورے کئے جانے کے قابل تھے۔ اور باقی سب وعدے ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ میک ماہن (MACMOHON) کے

خطوط جو مصر کے قائم مقام ہائی کمشنر نے شریف حسین کے نام مکہ کو بھیجے تھے۔ وہ یا بالفور (BALFOUR DECLARATION) کے اُس اعلان سے جو انہوں نے ۱۹۱۷ء میں شائع کیا تھا کسی ممکن طریقہ پر مطابقت نہیں کرتے تھے۔ یہ دونوں سائیکس پکٹ صلح نامہ (SYKES-PICOT AGREEMENT) سے بہت زیادہ مختلف تھے جسکے ذریعہ سے برطانیہ اور فرانس نے سلطنت عثمانیہ کے بڑے بڑے رقبوں کو اپنے اپنے حصہ میں جو اُن کے زیر اثر علاقہ میں تھے تقسیم کرلیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ سختی کے ساتھ مہمل اور ناممکن تجویز یہ تھی کہ قسطنطنیہ روس کو دے دیا جائے (اس لئے کہ زار کے زمانہ میں روس کو ایک قسم کی تاریخی دلچسپی اس شہر سے تھی جو کسی وقت یونان وروم کے بائزنٹیم BYZANTIUM کا شہر رہ چکا تھا) یہ بات چھوڑی جاسکتی تھی چونکہ بالشویک (BOLSHEVIK) کے لیڈروں نے بریسٹ لٹووسک کے صلح نامہ میں (TREATY OF BREST-LITOVSK) جرمنی والوں سے اپنی صلح کے انتظامات خود کرلئے تھے اور چونکہ روس کی حکومت اور مغربی اتحادیوں کے درمیان کھلی ہوئی دشمنی کی حالت باقی تھی مگر ٹرکی کے لئے بہ حیثیت مجموعی ایک قابل برداشت صلح کے سمجھوتے کی امیدیں بہت کم معلوم ہوتی تھیں۔

تقریباً تمام برطانوی سیاسی لیڈر جن کا صلح کے مباحثوں پر کوئی اثر تھا صاف طور پر ٹرکی کے خلاف تھے۔ لائیڈ جارج (LLOYD GEORGE) وزیر اعظم۔ یونانی لیڈر وینی زلوس (VENIZELOS) کے دوست اور مداح تھے۔ لائیڈ جارج نے دیکھا کہ یونان اور اس کے ملک ویلز (WALES) میں تاریخی تجربہ اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے کچھ مناسبتیں ہیں۔ اس وجہ سے وہ بہت جوش کے ساتھ یونان کی طرف ہوگیا اور گو وہ عملی طور پر ٹرکی کے خلاف نہ تھا مگر وہ سلطنت عثمانیہ کے حشر کے متعلق بالکل بے حس اور بے تعلق تھا۔ آرتھر بالفور (ARTHUR BALFOUR) جس نے لارڈ روتھس چائلڈ (LORD ROTHSCHILD) کے نام اس خط پر دستخط کئے تھے جس میں اس بات کا اعلان تھا کہ برطانیہ کا یہ ارادہ ہے کہ یہودیوں کے لئے فلسطین میں ایک قومی وطن قائم

کیا جائے۔ وہ کھلم کھلا یہودیوں کا طرف دار تھا اور وہ تاریخی اور قومی اعتبار سے ترکوں کے بے انتہا خلاف تھا۔

چلتے چلتے میں یہ ذکر بھی کر دوں کہ یہودیت ایسی چیز تھی جس کا مجھ کو طویل اور ہمدردی کے ساتھ تجربہ ہو چکا تھا۔ بمبئی میں میرے ابتدائی اور مصروف زمانہ میں پروفیسر ہیفکن (HAFFKINE) میرے دوست یہودی تھے۔ اسی طرح اور بہت سے مشہور اور قابل روسی یہودی تھے جو اُس ہی نسل سے تھے اور زار روس کی اُن سخت اور بے رحم شرائط سے بچ کر مغربی یورپ میں نکل آئے تھے جو اُن پر عائد کی گئی تھیں ہیفکن (HAFFKINE) بہت سے یہودیوں کی طرح جو اُن سے پہلے تھے۔ یہ امید رکھتے تھے کہ سلطان ٹرکی سے کچھ مصالحت ہو جانا ممکن تھا جس کے ذریعہ سے ارض مقدس میں یہودیوں کی پُرامن آبادی کے لئے رفتہ رفتہ انتظام کیا جا سکے۔ یہودیوں کی ایک مقررہ تعداد یورپ سے (اور خاص طور پر اُن زیادہ آباد رقبوں سے جو اُس وقت روس کی حکومت میں تھے) نکال کر کاشتکاری اور زراعتی اراضی میں آباد کی جائے۔ دار السلطنت میں یہودی طبقہ کے مالدار لوگوں کو آباد کیا جائے اور اس کے لئے سلطان کی رعایا سے زمین خرید کر حاصل کی جائے۔ جیسا کہ ہیفکن (HAFFKINE) نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ میں نے خیال کیا کہ اس قسم کا یہودی پروگرام (ZIONISM) بہت مفید اور قابل عمل ہوگا۔ اس میں دراصل اس بات کا کوئی اشارہ نہ تھا کہ کوئی قومی یہودی سلطنت قائم کی جائے گی اور میرے نزدیک یہ اس قابل تھا کہ ٹرکی حکومت کے سامنے رکھا جائے۔ بہر حال سلطنت عثمانیہ میں اس قسم کی پہلی مثالیں ہو چکی تھیں جن میں اسی طرح لوگوں کو دوسری جگہ آباد کیا گیا تھا۔ خاص طور پر سرکیشیا والوں (CIRCASSIANS) کو جو مسلم مذہب رکھتے تھے مگر جو خالص یورپین خون سے تھے اور جن کو سلطان عبد الحمید نے نہایت اچھے نتائج کے ساتھ اُن دیہات میں آباد کیا تھا جو آجکل یردن (JORDAN) کی سلطنت کہلاتے ہیں۔ عبد الحمید کے لئے بہت اچھا ہوتا اگر وہ دنیا کے یہودیوں کی دوستی اور مصالحت حاصل کر لیتے۔ اور زیادہ وسیع اصول کی بنیاد پر یہودیوں اور عربوں کے لئے ہر قدرتی وجہ اس بات کی ہے کہ وہ ایسی دوستی

(SEMITIC PEOPLE) قومیں جن میں بہت کچھ ایک سا پایا جاتا ہے بہت گہرے دوست ہونے چاہئیں نہ کہ ایسے سخت دشمن جیسے کہ بدقسمتی سے گذشتہ تیس سالوں کے واقعات نے اُن کو دونوں طرف سے بنا دیا ہے۔ یہودیت کے لئے جو اُس وقت مشترکہ دلچسپی تھی اُس کو بڑھانے کے لئے ہیفکن (HAFFKINE) نے جب میں پہلی مرتبہ ۱۸۹۸ء میں پیرس گیا تو مجھے تعارفی خطوط دیئے جو اُن کے بہت سے یہودی دوستوں کے نام تھے جن میں وہ بزرگ ربّی زادک خان (SAVANT AND RABBI ZADEK KHAN) بھی شامل تھے۔ اور اُن کے ذریعہ سے میری ملاقات بیرن ایڈمنڈ ڈی روتھس چائلڈ (BARON EDMOND DE ROTHSCHILD) سے ہوئی۔ بیرن ایڈمنڈ پہلے یہودی تجربات میں شاہانہ فیاضی کے ساتھ حصہ لے چکے تھے۔ فلسطین کے بہت سے ابتدائی آبادکاریوں میں انہوں نے روپیہ لگایا تھا اور آبادیوں کی آخری بہبودی اُن کی مدد اور دلچسپی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب میں اُن سے ملا تو میرا تعارف اُن کے دو بیٹوں سے کرایا گیا۔ ایک کا نام جیمس (JAMES) تھا جو اُس وقت کیمبرج میں انڈر گریجوائٹ تھا اور دوسرے کا نام مورس (MAURICE) تھا۔ جو ایک لڑکا تھا جس نے ایک بحری کیڈٹ کا لباس پہن رکھا تھا۔ بیرن ایڈمنڈ اپنے مرتے دم تک میرے دوست رہے اور اب پچاس سال سے زائد عرصہ سے دونوں جیمس روتھ چائلڈ JAMES ROTH SCHILD اور بیرن مورس ڈی روتھس چائلڈ BURON MAURICE ROTHSCHILD میرے بہت اچھے اور گہرے دوست ہیں۔

ربّی خان (RABBI KHAN) نے اپنے اور اپنے دوستوں کی طرف سے ایک بیان تیار کیا۔ جس میں فلسطین کے اندر یہودیوں کو آباد کرنے کے متعلق خیالات کا اظہار کیا۔ یہ آبادکاری کے لئے ایک نہایت مفصل تجویز تھی اور ایسے پیمانہ اور طریقہ پر تھی جس سے ٹرکی کو بہت مدد اور قوت حاصل ہوتی۔ اس تجویز پر غور کرنے کے لئے ایک نہایت معقول وجہ یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ کوئی قومی حکومت نہ تھی بلکہ اُس میں بہت سی قومیں اور بہت سی نسلیں شامل تھیں۔ ربّی خان کی تجویز کے

ساتھ ہی منیر پاشا کے ذریعہ سے جو پیرس میں ٹرکی کے سفیر تھے۔ اور عزت بے (IZZETBEY) کے ذریعہ سے جو سلطان کے خفیہ امور کے سکرٹری تھے سلطان عبدالحمید سے ملنے کے لئے گیا۔ بہر حال وہ اسکیم خواہ اچھی تھی یا بُری سلطان نے نامنظور کر دی اور اس کے بعد میں نے اس کے متعلق کچھ نہ سنا۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی نامنظوری میرے نزدیک ہمیشہ کے لئے عبدالحمید کی سب سے بڑی غلطیوں میں شمار کی جائے گی۔

مگر جس طرح سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء کی شکست خوردہ ترکی اس سلطنت عثمانیہ سے مختلف تھی جو وہ سنہ ۱۸۹۰-۹۹ء تک تھی اسی طرح سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء کی اور اس کے بعد کی یہودیت دراصل ایک بالکل مختلف چیز تھی۔ اور یہودی لوگ ان بہت سے طبقوں میں سے صرف ایک طبقہ تھے۔ جو ٹرکی کا نقشہ بدلنے سے جتنا زیادہ ممکن ہو سکتا تھا اپنے لئے فائدہ حاصل کرنے کو بے چین تھے۔ عرب قومیت بھی کچھ اس سے کم ترقی نہیں کر رہی تھی اور اس کے لئے برطانوی حکومت میں اور اس کے نزدیک بہت سے طاقتور دوست اور جوشیلے حمایت کرنے والے موجود تھے

سر جلبرٹ کلیٹن (SIRGILBERTCLAYTON) ٹی۔ اے۔ لارینس (T.E.LAWRNCE) اور بہت سے ایسے سیاسی افسر جنہوں نے مشرق وسطیٰ میں کام کیا تھا۔ میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان سب آدمیوں نے ہر زمانہ میں کبھی تو کھلم کھلا اور کبھی خفیہ طور پر ٹرکی کی شکست سے بہت پہلے عرب قومیت کی ہمت افزائی کی تھی۔ برطانیہ نے فلسطین میں ایک فوجی حکومت پہلے سے قائم کر دی تھی۔ فرانس کے لوگ یہ عجیب دعویٰ پیش کرتے تھے کہ یروشلم کے (JERUSALEM) مقدس مقامات کی حفاظت کرنا ان کا تاریخی استحقاق ہے۔ یونان کے لوگ جن کی ہمت افزائی انگریزوں کے ایک جوشیلے اور یونانیوں کے طرفدار طبقہ نے کی تھی۔ اپنے ملک کی خطرناک توسیع میں مصروف تھے۔ صلح کانفرنس میں اصلی اختیار کا مرکز اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کلیمنسو (CLEMENCEAU) کا یہ حال تھا

کہ اُس کو ترکوں سے کوئی محبت نہ تھی۔ اور پریسیڈنٹ ولسن (PRESDENT WILSON) نے مجھ سے اپنی ایک ملاقات میں جو میں نے اُن سے کی یہ صاف طور پر تسلیم کیا کہ وہ دراصل اس تمام معاملہ کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔

اِن حالات میں فاتح قوتوں کی طرف سے جو کچھ مدد ٹرکی حاصل کر سکتا تھا وہ صرف ہندوستانی امداد ہو سکتی تھی۔ ٹرکی کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت کو جو دلچسپی تھی وہ قدرتی اور خود بخود پیدا ہونے والی تھی اور اُس کے علاوہ پر خلوص غیر مسلم شورش کا بھی بہت بڑا حصہ موجود تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ یورپین شہنشاہیت کے تصور کے خلاف کسی مرتب ایشیائی قوم کی قدرتی بغاوت کے علاوہ ہندوستانی قومیت کو برطانیہ کے خلاف اپنی کشمکش میں اور زیادہ متحد اور مضبوط بنایا جائے۔

مسلمانوں کو جو تعلق تھا اس کے وجوہ بہت گہرے اور تاریخی تھے۔ صرف ٹرکی ہی اس زمانہ کی دنیا میں ایک آزاد مسلم قوم کی حیثیت رکھتی تھی جو اس وقت تک پوری طرح زندہ تھی۔ اس کی کوتاہیوں کے باوجود قسطنطنیہ کی شاہانہ حکومت اسلام کے کارناموں کی دنیاوی عظمت کی ایک نمایاں اور مستقل یادگار تھی۔ خلافت کی صورت میں سنی مسلمانوں اور سنی خیالات کے فرقہ کے لئے ایک روحانی سلسلۂ اتحاد موجود تھا جس کی اہمیت بے انتہا تھی۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو ہندوستان میں اسلام کے مقدس مقامات کی حفاظت اور خلافت کے مستقبل کے متعلق بہت بے چینی بڑھ گئی۔ گاندھی میرے قدیم اور عزیز دوست گوکھلے کے بعد اُن کے جانشین کی حیثیت سے کانگریس کی سیاسی تحریک اور تنظیم کے لیڈر ہو گئے تھے اور انہوں نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا کہ ہندوستان کے تمام برصغیر میں برطانیہ کے خلاف جذبات کو ترقی دیں اور ان کو قائم رکھیں۔ اس مسئلہ پر شورش کا جو طوفان ہندوستان میں آیا وہ بہت خطرناک تھا۔ صلح کانفرنس میں جو ہندوستانی نمائندے تھے یعنی مہاراجہ بیکانیر اور لارڈ سنہا (LORDSINHA) اور جن کی تائید ایڈون مانٹگو (EDWINMONTAGU)

وزیر ہند نے بہت خلوص اور خاموشی کے ساتھ کی۔ انہوں نے ان مختلف تجاویز کی بہت سخت مخالفت کی جو ٹرکی کو تقسیم کرنے اور خلافت کو عملی طور پر ختم کرنے کے متعلق کانفرنس کے چاروں طرف بڑی سرگرمی کے ساتھ پروپیگنڈا کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔

یہ بات طے ہو چکی تھی کہ شکست خوردہ جرمنی کی قسمت کا پہلے فیصلہ کیا جائے۔ یہ مشکل کام بہت جلدی کے ساتھ پورا کیا گیا اور ۲۸ر جون ۱۹۱۹ء کو ورسیلز کے صلح نامہ (TREATY OF VERSAILLES) پر دستخط ہو گئے۔ اس کے بعد دوسری مفتوحہ قوموں کے متعلق بہت طویل مباحثے جاری رہے۔ میرے دوست سید امیر علی اور میں نے ایک زبردست کارنامہ شروع کیا اور وہ یہ کہ جہاں تک ٹرکی کا تعلق تھا برطانیہ اور ساری دنیا کی رائے عامہ کے سامنے اصلی حالات کو ظاہر کیا جائے۔ میں نے بہت سے با اثر سیاست دانوں سے پرائیویٹ ملاقات کی۔ ہم دونوں نے ٹائمس (THE TIMES) اخبار کو طویل خطوط لکھے۔ ہم نے پبلک اور پرائیویٹ موقعہ پر جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

وزیر اعظم نے جو خاص وعدے کئے تھے ان کی طرف ہم نے توجہ دلائی اور اخبار ٹائمس (THE TIMES) میں ایک خط کے اندر ان وعدوں کو لفظ بہ لفظ بیان کیا۔ لائیڈ جارج نے کہا تھا کہ ہم اس لئے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ٹرکی کو اس کے دارالسلطنت سے یا ایشیائے کوچک اور تھریس (THRACE) کے مالدار اور مشہور رقبوں سے محروم کر دیں ہم اس کے خلاف نہیں ہیں کہ ٹرکی کی سلطنت ترک قوم کے وطن میں قسطنطنیہ کو دارالسلطنت رکھتے ہوئے قائم رہے۔ مگر چونکہ وہ راستہ جو بحر روم اور بحر اسود کے درمیان ہے بین الاقوامی اور غیر جانب دار ہے اس لئے عرب۔ آرمینیا (ARMENIA) عراق (MESOPOTAMIA) شام (SYRIA) اور فلسطین (PALESTINE) ہماری رائے میں اس کے مستحق ہیں کہ ان کی جداگانہ قومی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

ہم نے کوشش کی کہ ان لوگوں کے نقطۂ نظر کو مختصر طور پر بیان کر دیں جن کی طرف سے ہم کو بولنے کا حق حاصل تھا۔

مسلمان کیا چاہتے ہیں؟ ہم کس بات کی کوشش کرتے ہیں؟ نہ وہ اور نہ ہم اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ٹرکی کے لئے کوئی نئی حیثیت قائم کی جائے۔ مگر ہم اس بات کو ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ انگلستان کا نیک نام قائم رکھنے کے لئے بلکہ سلطنت برطانیہ کے نیک نام کی خاطر وہ وعدہ جو وزیر اعظم نے انگلستان کی طرف سے دنیا کے سامنے کیا اور خاص طور پر دنیائے اسلام کے سامنے وہ وعدہ پورا کیا جائے اور یہ کہ ٹرکی کا بادشاہ جو سنی مسلمانوں کی وسیع جماعت کا خلیفہ ہے قسطنطنیہ تھریس (THRACE) اور ایشیاء کوچک (ASIA MINOR) پر خود مختار قابض کی حیثیت سے باقی رکھا جائے۔ یہ ملک کا وہ حصہ ہے جو خاص شام کے شمال سے ایجین کنارہ (AEGEAN COAST) سے لے کر بحر اسود (BLACK SEA) تک پھیلا ہوا ہے اور جس ملک میں ترک قوم کثرت سے آباد ہے۔ ہماری رائے میں یہ بے انصافی کا ایک بے رحم فعل ہوگا اگر اس ملک کا کوئی حصہ بھی ٹرکی کی حکومت سے اس لئے زبردستی چھینا جائے کہ کسی دوسری قوم کی خواہشوں کو پورا کرنا ہے۔ اس قسم کا فیصلہ مغربی ایشیا میں امن و سکون لانے کی بجائے مسلسل لڑائیوں کے بیج بودے گا اور جس کا اثر صرف اسی ملک تک محدود نہ رہے گا جہاں وہ لڑائیاں لڑی جائیں۔ اُن ہوس پرست لوگوں کی بدعہدی کی وجہ سے جنہوں نے اپنی بیمار قوم کو جو پہلے سے کافی مصیبت اٹھا چکی تھی زبردستی عالمگیر جنگ میں گھسیٹا۔ ٹرکی کو کافی سزا اس واقعہ سے مل چکی ہے کہ اس کے سب سے زیادہ مال دار صوبوں میں سے کچھ صوبے دنیوی اعتبار سے دوسروں کے قبضہ میں چلے گئے۔ مگر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ان ملکوں میں شاہ عثمانیہ کی روحانی حکومت کو قائم رکھنا جس سے اُن کا وقار باقی رہے اور مسلمانوں کے جذبات کو تسکین ہو ایسا کام ہوگا جو اُن ملکوں کے مسلمان حکمران اور گورنروں کی پوزیشن کو ناقابل حملہ بنانے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ مگر جہاں تک تھریس (THRACE) قسطنطنیہ اور ترک قوم کے وطنی ملکوں کا تعلق ہے مسلمانوں کے جذبات اس بات کے بالکل خلاف ہیں کہ کسی صورت میں بھی اُن ملکوں پر سلطان کی خود مختار حکومت میں مداخلت کی جائے۔

خود ہندوستان میں جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور ٹرکی کے ساتھ صلح نامہ پر دستخط کرنے کا وقت قریب آیا۔ شورش اس حد تک پہنچ گئی اور اس طرح پر منتفقہ صورت میں ہوئی کہ وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ (LORDCHELMSFORD) اور وزیر ہند ایڈون مونٹیگ (EDWINMONTAGUE) کو بہت پریشانی ہوئی (گو اُن کی ذاتی ہمدردیاں مجھے خوب معلوم تھا ترکوں اور ایشیا والوں کے ساتھ نہایت گرمجوشی کے ساتھ کام کر رہی تھیں) ان سب باتوں کے علاوہ وہ اس خیال سے پریشان ہوئے کہ مونٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات (MONTAGUE-CHELMSFORDREFORMS) جن پر اتنی بڑی امیدیں لگی ہوئی تھیں ایسی تکلیف اور دشمنی کی فضا میں عملی طور پر نافذ کی جانے والی تھیں۔

وائسرائے کی لیجیسلیٹو کونسل میں یہ تجویز کی گئی کہ میں لندن کو وزیر اعظم کے پاس ایک وفد کے لیڈر کی حیثیت سے بھیجا جاؤں جس سے نہ صرف مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کیا جائے بلکہ ہندوستان کی تمام جداگانہ آبادی کے خیالات کا اظہار ہو۔

اس وفد کے دوسرے ممبر یہ تھے۔ مسٹر چھوٹانی جو تحریک خلافت کے صدر تھے حسن امام جو ہندوستان کے مشہور وکیلوں میں سے تھے۔ اور ڈاکٹر انصاری جو کانگریس کے سربرآوردہ ممبر تھے۔ لائیڈ جارج سے ہماری ملاقات ہوئی مگر ہم نے محسوس کر لیا کہ ہمارا مشن ناکامیاب ہونے والا تھا۔ چونکہ اسی عرصہ میں ٹرکی کا صلح نامہ جو تاریخ میں سیورس کا صلح نامہ (TREATY OF SEVRES) کہلاتا ہے۔ تیار کیا جارہا تھا اور اس میں بڑے تعجب کی بات یہ تھی کہ ان حقیقتوں کا بہت کم لحاظ رکھا گیا تھا جو چند سال بعد مشرق قریب کو بالکل نئے طریقہ پر بدلنے والی تھیں۔ بدقسمت سلطان قسطنطنیہ میں ایک تنہا اور مجبور قیدی کی طرح سخت نگرانی میں رہتا تھا۔ ٹرکی۔ عرب اور یونان کے وفد بحر روم اور لندن کے درمیان بہت جلد آمد و رفت کر رہے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی بحثوں کو سنا جاتا تھا مگر اکثر اُن کو کوئی نہیں سنتا تھا۔ سیورس کا صلح نامہ (IRATYOFSEURES) ایسا نہیں تھا جس کو مصالحت کی گفتگو کرنے کے بعد کیا گیا ہو بلکہ وہ ایک قسم کا زبردستی سے کیا ہوا صلح نامہ تھا۔

پہلے قسطنطنیہ کے متعلق یہ وعدہ کیا گیا کہ وہ یونانیوں کو دے دیا جائے۔ پھر یہ وعدہ واپس لے لیا گیا۔ آخر کار یہ طے کیا گیا کہ تھریس (THRACE) اور ایڈریانوپل (ADRIANOPLE) جو یورپین ٹرکی میں تھے یونانیوں کو دیئے جائیں اور ایشیائے کوچک میں سمرنا (SMYRNA) بھی اُن کو دیا جائے۔ ٹرکی کو ایک قسم کی "لنڈوری ریاست" بنا کر چھوڑ دیا جائے جو ایشیائے کوچک کے پہاڑی علاقہ میں بحر اسود کے کنارے والے چھوٹے سے خطہ میں واقع ہو۔ آرمینیا (ARMENIA) کو شمال و مشرق میں ایک آزاد اور خود مختار حکومت بنا دینے کے متعلق بھی بات چیت ہو رہی تھی۔ بشرطیکہ روس اس بات پر مجبور کیا جا سکے کہ اس کو ہضم کر لے۔ ان تمام مختلف تجویزوں کو کاٹ چھانٹ کر ایک قسم کا نظام طے کر لیا گیا تھا۔ اگست ۱۹۲۰ء میں ٹرکی کے مجبور نمائندوں نے اس دستاویز پر دستخط کر دیئے جس میں یہ سب تجویزیں موجود تھیں۔

شکست خوردہ ٹرکی کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے کے لئے جو کوشش میں نے کی تھی اس کا پہلا دور ایک طرح پر ان واقعات کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ قبل اس کے کہ میں اس کے دوسرے دور کے واقعات بیان کروں جو بہت جلد اس کے بعد ظاہر ہوئے۔ اس بات پر غور کرنا مناسب ہوگا کہ اُن فیصلوں کا نتیجہ کیا ہوا جو ۲۰-۱۹۱۹ء میں صلح کرانے والے سیاست دانوں نے کئے اور جو اس مشورہ کے بالکل خلاف تھے جو ہم نے اُن کو دیا تھا۔

سلطنت ٹرکی کے ٹکڑے کرنے کے متعلق مسلمانوں کی مخالفت خواہ اُس کو کتنا ہی غلط سمجھا گیا ہو۔ ایک ایسی بنیاد رکھتی تھی۔ جس میں صحیح سیاست دانی اور مشرق وسطیٰ کی سیاسی اور ہمہ گیر حقیقتوں کی سمجھ پائی جاتی تھی۔ پہلے ہم نے یہ محسوس کیا کہ عرب لوگوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ایک واحد اور مضبوط عرب قوم پیدا کرنے کے قابل نہ ہوگا۔ جو بحر سے فارس تک اور ایلیگزینڈریٹا (ALEXANDRETTA) کو عدن اور بحر ہند تک پھیلی ہو اگرچہ اس وقت اس خیال پر بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا تھا کہ عرب لوگ ایک ظلم سے نجات پا گئے۔ حالانکہ چند سال بعد ہی عرب کے تمام قوم پرست بالکل مختلف راگ گانے لگے، ہم نے بہت

بڑی حد تک جو کچھ دراصل واقع ہوا اس کو پہلے سے دیکھ لیا تھا اور وہ یہ تھا کہ عرب کی چھوٹی قوموں کی ایک تعداد جو برسوں تک نوآبادیوں کے درجہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھے گی برطانیہ اور فرانس کی ماتحتی اور حکومت میں قائم ہو جائے گی۔ ہم نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ عرب لوگ دراصل صرف اپنے آقاؤں کو بدلتے رہیں گے اور جہاں کہیں کسی زمانہ میں یہ آقا مسلمان ترک رہ چکے تھے اب اُن کی جگہ یہ آقا عیسائی ہوں گے یا (جیسا کہ آخر کار فلسطین کے بہت بڑے حصہ میں واقع ہوا) یہ آقا یہودی ہوں گے۔ اب بھی تیس سال یا اس سے زائد گذر جانے کے بعد وہ عرب حکومتیں جو سلطنت عثمانیہ کی جانشین ہوئیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور جمہوریتوں کا مجموعہ بن گئی ہیں۔ گو اُن کی وہ حیثیت جو نہایت بدنامی کے ساتھ پروٹیکٹریٹ (PROTECTORATE) اور مینڈیٹڈ (MANDATED) حیثیت کہلاتی تھی اب ختم ہو چکی ہے اور اُن میں سے ایک حکومت بھی ایسی نہیں ہے جو تنہا اس قابل ہو کہ کسی زبردست مخالفت کا مقابلہ کر سکے اور عرب لیگ کے باوجود یہ حکومتیں اس قابل نہیں ہیں کہ تنہا یا سب مل کر سوویٹ روس (SOVIET RUSSIA) یا مغربی جمہوریتوں کے اثرات کی حقیقی مدافعت کر سکیں۔ اگر روس اور مغربی جمہوریتوں کے درمیان جنگ ہو جائے تو اُن عرب حکومتوں کا غیر جانب دار رہنا بالکل بےکار سا خواب ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے اس بات پر غور کیجئے کہ حالات کس قدر مختلف ہو جاتے۔ اگر پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ایک ایسا وفاقی اتحاد پیدا ہو جاتا جس میں ٹرکی، مشرق وسطیٰ کی عرب ریاستیں اور مصر شامل ہوتے جن کے پاس ایک واحد حفاظتی فوج موجود ہوتی اور جن کی خارجی پالیسی بھی متفقہ ہوتی۔ ہم مسلمانوں کا اس خیال پر یہ قدرتی عقیدہ کہ ٹرکی ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے قائم رہے بڑی عقلمندی کی بات تھی چونکہ اِس سے وہ عملی نتائج پیدا ہوتے جن سے مشرق وسطیٰ کی حفاظت اور سالمیت اُن ترکیبوں سے بہت زیادہ ہوتی جو بعد میں اس غرض سے کی گئیں۔ مثلاً دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر وہ بدلنے والی اور غیر معین پالیسی کی باتیں۔ برطانیہ کی سیاسی فوقیت و حکومت کا جزوی

طور پر الگ ہو جانا۔ امریکہ کی طرف سے جزوی طور پر مالی۔ اقتصادی اور فوجی امداد بہم پہنچانا۔ اُس نااتفاقی اور سیاسی بے چینی پر غور کیجئے جو حال کے سالوں میں مشرق وسطیٰ کی تقدیر میں لکھی تھی۔ اُس بیکار کوشش پر غور کیجئے جو اس مقصد کے لئے صرف کی گئی کہ ایک مشرق وسطیٰ کی فوجی تنظیم قائم کی جائے جو کسی حد تک این۔ اے۔ ٹی۔ او (N-A-T-O) کے برابر ہو اور اس پر غور کیجئے کہ یہ سب کتنی آسانی سے اور کیسی عزت کے ساتھ دور کیا جا سکتا تھا۔

بہرحال بکھرے ہوئے دودھ پر رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے پہلی عالمگیر جنگ کے فاتح دوسری عالمگیر جنگ کے فاتحوں کی طرح نہ تھے اور وہ اپنی کامیابی اور اپنے احساس فتح سے بدمست ہو گئے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ ایک زبردست نئی دنیا اپنے دل کی خواہش کے مطابق بنا سکتے تھے۔ مگر تاریخ نے بہت افسوس اور زور کے ساتھ ان کے اس یقین کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

سیورس کا صلح نامہ (TREATY OF SEVRES) گو وہ بہت سخت تھا مگر عملی طور پر وہ مردہ رہا۔ اس کے بعد ہی ۱۹۲۱ء کے موسم بہار تک واقعات اس صلح نامہ کے خلاف ظاہر ہو گئے تھے اور یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی تھی کہ اس پر دوبارہ غور کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ لندن میں ایک نئی کانفرنس طلب کی گئی۔ وائسرائے کی فرمائش پر میں نے اس مجمع کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ مگر اس کانفرنس کا جلسہ ناکامیاب ثابت ہوا۔ اس وقت جس بات کو ہر شخص نے مشرق اور مغرب میں یکساں بھلا رکھا تھا وہ یہ تھی کہ ٹرکی کے برباد شدہ ملک سے ایک ایسا سپاہی اور سیاستدان پیدا ہو گیا تھا جو مصطفیٰ کمال اتاترک کی ذہنیت اور قابلیت رکھتا تھا جس نے اپنی قوم کے انتہائی مصیبت کے زمانہ میں اپنی بُری طرح پِٹی ہوئی مگر ناقابل فتح قوم کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ قسطنطنیہ میں اس کو جانے کی اجازت نہ تھی اس لئے اُس نے اپنا عارضی دار السلطنت انگورا (ANGORA) میں جواب انقرہ (ANKARA) کہلاتا ہے قائم کر لیا جو اناطولیہ کے پہاڑی علاقہ میں ایک بلندی پر واقع ہے۔ اُس نے درہم برہم ترکی فوج کو

دوبارہ تیار کیا۔ دوبارہ اُس کو ساز وسامان دیا اور دوبارہ اُس کو ٹریننگ دی۔ اُس نے روس سے خفیہ طور پر سمجھوتہ کر کے اپنی فوج کو ہتھیار فراہم کئے اور اس کو یقین تھا کہ پیچھے سے اُس کی حفاظت کی جائے گی۔ اس طرح پر وہ اپنے ملک کے مقصد کی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہو گیا جو کسی دور و دراز ہونے والی کانفرنس کی میز پر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ جو اُسی کے وطن اور لڑائی کے میدان میں ہو گیا۔ اس بڑے کام کی وسعت اور اہمیت سے بہت کم آدمی شروع میں واقف تھے۔

یونان کے لوگ جو اس منظر کے سب سے زیادہ قریب اور جن کو اصل واقعات سے بہت زیادہ واقفیت ہونی چاہئے تھی۔ اپنی فوجی فتح اور ملکی توسیع کی خواہش میں اندھے ہو گئے تھے۔ انگورا میں ٹرکی کی عارضی حکومت قائم ہونے پر اعتراض کرتے ہوئے یونانیوں نے ایشیار کوچک میں بڑے حوصلہ مند اور شان و شوکت والے فوجی حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جو بعد میں بالکل تباہ کرنے والے ثابت ہوئے۔

ان پیچیدگیوں میں یوں اور اضافہ ہو گیا کہ برطانوی حکومت اس بات پر اڑ گئی کہ وہ اُن برطانوی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کرے جو ٹرکی میں موجود تھے۔ اس معاملہ میں کم از کم میں اس قابل ہوا کہ ٹرکی کے نئے افسروں سے براہ راست درخواست اور مداخلت کر کے ایک قسم کا علاج حاصل کر سکوں جو اس وقت کی روز افزوں نازک حالت کے لئے ضروری تھا۔ ترکوں نے قیدیوں کو رہا کر دیا اور وہ نازک حالت ختم ہو گئی۔

بہرحال ۱۹۲۲ء کی گرمیوں کے آخر تک حالات پہلے سے بہت زیادہ خراب معلوم ہوتے تھے۔ مصطفٰے کمال کی منتشر مگر بہادر فوجیں اپنے پہاڑی ملک میں لڑ رہی تھیں۔ انہوں نے یونانی حملہ کے زور کو روک رکھا تھا۔ اور اب فاتحانہ پیش قدمی کے پورے جوش میں تھیں۔ انہوں نے سمرنا (SMYRNA) کو فتح کر لیا تھا جو ایک بڑا یونان اور یوٹان (GRAECO-LEVANTINE PORT) کا بندرگاہ تھا اور ایشیار کوچک کے سمندری کنارہ پر واقع تھا۔ اس بندرگاہ کو بالکل لوٹ لیا تھا اور اتحادیوں کے جنگی جہازوں کی پوری جماعت کے سامنے جو اُس بندرگاہ پر پڑے ہوئے تھے وہاں کے سارے رقبہ کو آگ لگا دی

تھی۔ اب یونانی فوج ہی تھی جو منتشر اور شکست خوردہ ہوکر ادھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ مصطفےٰ کمال کی فوجیں قسطنطنیہ کے دروازہ پر آ پہنچی تھیں اور مطالبہ کر رہی تھیں کہ اُن کو تھریس (THRACE) اور ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے بلا کسی رکاوٹ کے آزادی کے ساتھ راستہ لینے کا حق حاصل تھا۔

یہ تمام حالت بہت خطرناک اور پریشان کن تھی۔ اتحادیوں کی ایک مشترکہ فوج جو برطانوی جنرل سر چارلس ہیرمنگٹن (SIR CHRLES HARMINGTON) کے کمانڈ میں تھی چانک اور قسطنطنیہ کے قرب و جوار پر قبضہ کئے ہوئے تھی جس کا نام ترکوں نے از سر نو استنبول رکھ لیا تھا۔ ہیرمنگٹن (HARMINGTON) ایک ہوشیار۔ بااحتیاط اور مستقل مزاج آدمی تھا اور وہ لندن سے احکام آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے ایک بے پروا اور بے سوچی سمجھی حرکت۔ خواہ وہ پرانی بندوق کی ایک بیکار گولی چلانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو، بہت جلد ایک عام جنگ کا باعث ہو سکتی تھی۔ گو پہلی عالمگیر جنگ کے اختتام پر گولہ باری بند ہوئے صرف چار سال سے کچھ کم عرصہ ہوا تھا مگر موقع پر فوجی کمانڈر کا کیریکٹر ہی اس سخت اور نازک حالت میں تنہا کام کرنے والا نہ تھا۔ برطانوی حکومت ایک عجیب غیر حقیقی اور جنگ جو ذہنیت میں مبتلا تھی صنعت و حرفت کے پیشہ والوں میں طویل اور صبر آزما بے چینی جس کے ساتھ ساتھ کوئلہ والوں نے بہت لمبا اسٹرائک بھی کر رکھا تھا اور بیکار آدمیوں کی بہت بڑی تعداد۔ ان سب کے بعد وہ مشکل اور پیچیدہ مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔ جس سے آئرلینڈ میں سب سے بڑی مصیبتوں کا خاتمہ ہوا۔ اور جو آئرلینڈ کے صلح نامہ (IRISH TREATY) پر دستخط ہو جانے کے بعد قطعی طور پر طے ہوگئی۔ مگر لائڈ جارج کی دوسری ملی جلی گورنمنٹ جو ۱۹۱۸ء کے کوپن الیکشن (COUPON ELECTION) میں بہت بڑی اکثریت کے ساتھ پھر برسر اقتدار ہوگئی تھی اب اپنا دور ختم کر چکی تھی۔ لبرل پارٹی (LIBERALS) والوں نے لائڈ جارج کے اس قصور کو در اصل کبھی معاف نہیں کیا تھا کہ اُس نے دسمبر ۱۹۱۶ء میں جب کہ جنگ کا مرکزی سیاسی خطرہ موجود تھا اسکوائتھ (ASQUITH) کو ایک دم

بڑی طرح نکال دیا تھا۔ کنزرویٹو پارٹی (CONSERVATIVES) کے آدمی پارلیمنٹ میں اس کی امداد کا بڑا ذریعہ تھے مگر وہ وزیرِ اعظم کی ناقابل علاج سیاسی وہم پرستی کی وجہ سے روز بروز بے قابو اور مشتبہ ہوتے جا رہے تھے۔ کیا لائڈ جارج کا یہ خیال تھا کہ چانک کے واقعہ (CHANAKCRISIS) سے جیسا کہ وہ اس وقت مشہور تھا اُس کو یہ موقعہ ملا کہ وہ اپنے مدد کرنے والوں کی جماعت میں اختلاف اور انتشار کو ختم کر دے گا جس سے اُس کی روز افزوں تنہائی جاتی رہے گی اور اس طرح پارلیمنٹ اور اپنی قوم کو ایک بڑی متفقہ کوشش کے لیے اپنے پیچھے جمع کر لے گا؟ کیا یہ ایک جواری کی پھینک کی طرح تھی یا اندازہ کی سخت غلطی تھی؟

میں اُس وقت لندن میں تھا جب یہ نازک واقعہ اپنے بدترین درجہ پر تھا۔ اور میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اس حد تک نہ بڑھنے پائے جس سے ایک قسم کی مصیبت ناک اور غیر منصفانہ جنگ شروع ہو جائے۔ اُس وقت میں مخالف رائے عامہ کے زبردست طوفان کے خلاف تنہا لڑائی نہیں لڑ رہا تھا۔ اب میرے ساتھ طاقتور اتحادی اور مدد کرنے والے موجود تھے۔ اخبار ٹائمس (THE TIMES) کے کالم میرے لئے کھلے ہوئے تھے جیسا کہ وہ اکثر میری قومی زندگی میں رہ چکے ہیں۔ لارڈ روتھر میر اول (FIRST LORD ROTHERMERE) جنہوں نے حال ہی اُن اخبارات پر اپنا ذاتی اقتدار حاصل کیا تھا جو اُن کے بھائی وسکاؤنٹ نورتھ کلف (VISCOUNT NORTHCLIFFE) نے جاری کئے تھے۔ میرے مستقل مدد کرنے والے تھے۔ اور لارڈ بیوربرک (LORD BEAVERBROOK) جو وہ شخص تھے جن کے اثر اور پرجوش پیروی کی وجہ سے جو انہوں نے ٹھیک وقت پر کی تھی۔ لائڈ جارج سنہ ۱۹۱۶ء میں بہ حیثیت وزیرِ اعظم کے اپنے اعلیٰ اقتدار پر پہنچے تھے مگر اب اُن کو سچے دل سے یقین ہو گیا تھا کہ لائڈ جارج ایسا راستہ اختیار کر رہے ہیں جس سے سوائے تکلیف اور مصیبت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہر حال پہلی بات یہ نہ تھی کہ لائڈ جارج کی شکست اور ناکامیابی کی ترکیبیں کی جائیں بلکہ غیر ضروری جنگوں میں

جو سب سے زیادہ غیر ضروری ہو سکتی تھی جو کسی زمانہ میں بھی لڑی گئی ہو اُس جنگ کو روکنا سب سے پہلا کام تھا۔

ستمبر کے شروع میں برطانوی گورنمنٹ نے چانک (CHANAK) کے متعلق ایک بیان شائع کیا جو جنگ جو اور غیر منصفانہ دونوں تھا۔ اور اس بیان کے آخر میں نوآبادیوں سے یہ اپیل کی کہ اگر ٹرکی سے کوئی دوسری جنگ ہو جائے تو اس میں برطانیہ کی مدد کی جائے۔ اس اعلان کے لہجہ نے برطانوی رائے عامہ کو بہت زیادہ خوف زدہ کر دیا چونکہ وہ اُس حالت میں نہ تھی کہ ان تمام تکالیف اور قربانیوں پر غور کرے جو جنگ کے شروع ہونے پر ضروری ہیں اور جو جنگ صرف یونان کی زیادتی اور ہٹ دھرمی کی حمایت میں کی جائے۔ اس کے خلاف چاروں طرف سے مخالفت کی آوازیں بہت زور کے ساتھ آنے لگیں۔ جو جماعت گورنمنٹ کی طرفدار اور یونان کی حامی تھی اس کے پاس صرف ایک ہی معقول وجہ تھی۔ اور وہ یہ کہ ترکوں کی فوجیں پہلے سے اتحادیوں کی ان قابض فوجوں کے قریب تھیں جن کی اکثریت برطانوی فوج کی تھی اور جو آبناؤں میں اور قسطنطنیہ کے رقبہ میں موجود تھیں۔ جنرل ہیرنگٹن (GENERAL HARMINGTON) اپنی طرف سے خاموشی کے ساتھ اس بات کا پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے اُن کی تھوڑی سی فوج کو لڑنا پڑے اور جس سے اُن کو اُس زبردست مضبوط اور مستقل فوج سے کسی قسم کی دشمنی کرنی پڑے جو مصطفیٰ کمال نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پھیلا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے دوست لارڈ ڈربی[۵] (LORD DERBY) کی مخلصانہ التجا پر ترک لیڈروں سے ملاقات کی اور اُن کو یہ بتایا کہ اتحادیوں کی فوج پر حملہ کرنے میں بہت سخت خطرے چھپے ہوئے تھے۔ اور میں نے اُن کو یقین دلایا کہ جب تک کوئی عارضی تصفیہ ہو جائے اس وقت تک اُن کی فوج کی جنگی پوزیشن کو کسی طرح کوئی خطرہ نہ ہوگا

---

۵ مجھے یاد ہے کہ ہم دونوں نیو مارکیٹ (NEWMARKIT) میں تھے اور لارڈ ڈربی (DERBY) نے مجھ سے کہا تھا کہ جتنا اثر میں رکھتا تھا وہ سب استعمال کروں۔

اگر وہ کسی حملہ کی حرکت سے باز رہیں۔ میں نے ان خیالات کو اپنے ترک دوستوں کے دلوں پر اتنے زور کے ساتھ جمایا جتنا کہ میں رکھتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں خوشی ہوتی ہے کہ اُن میں عقل سلیم نے کام کیا۔ اس کام میں مدد دینے کے لئے ایک اہم عنصر یہ تھا کہ فرانس نے مصطفےٰ کمال اور اُس کی حکومت سے خفیہ طور پر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ فرانس کا اثر جو مونسیور ریمنڈ پوانکار (MONSIEURRAYMOND POINCARE) کے ذریعہ سے استعمال کیا گیا وہ سب اس لئے تھا کہ پُر امن طریقہ پر فیصلہ کر لیا جائے۔ لڑائی کے رستے طے کرنا صرف ایک جلد بازی کی بات ہوتی۔ برطانوی عوام کو اگر ایک مرتبہ ان اختلافی مسائل پر غور کرنے کا وقت مل جاتا تو وہ متفق ہو جاتے اور اس کا اظہار کر دیتے اور وہ مضبوطی کے ساتھ صلح کے حامی تھے۔ اس وجہ سے مشرق وسطیٰ میں دوسری جنگ کا حقیقی خطرہ دور ہو گیا۔

لارڈ بیوربروک (LORDBEAVERBROOK) نے اس نازک حالت پر قابو پانے کا ایک مشرح حال اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ اس تمام زمانہ میں لارڈ بیوربروک ایسے ہی مصروف رہے جیسے کہ وہ مضبوط تھے۔ حالات کی رو سے بہت پریشان ہو کر وہ اکثر اس معاملہ پر مجھ سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی تھی کہ ہم دونوں پوری طرح متفق ہو جاتے تھے۔ اور یہ کہ ترکوں کو مدد کرنے کے لئے میری سب کوششوں میں اُن کی اخلاقی حمایت موجود تھی۔ وہ بھی اس صحیح اور عملی نتیجہ پر پہنچے تھے جو کافی مشہور ہو گیا تھا کہ برطانیہ کے لئے ٹرکی سے جنگ کرنا محض اس لئے کہ یونانی شہنشاہیت کی متروکہ پالیسی کی حمایت کی جائے ایسی زبردست غلطی تھی جو ہر حالت میں روکنی چاہیئے۔" بیوربروک نے اپنے دوست اور ہم وطن کنیڈا کے رہنے والے بونرلا (BONARLAW) کی مدد چاہی جو اس وقت کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر تھے اور دارالعوام میں گورنمنٹ کی طرف سے ووٹ دینے کے لئے اس پارٹی کی طاقت بہت زیادہ تھی۔

بیوربروک (BEAVERBROOK) کے الفاظ بونرلا (BONARLAW) سے کہے

سامنے صاف صاف یہ ہوتے تھے کہ "یہ لوگ لڑنا چاہتے ہیں۔"

یہ چار الفاظ لائڈ جارج کی ملی جلی حکومت کے لئے موت کا سبب ثابت ہوئے کنزرویٹو پارٹی کی ایک میٹنگ کارلٹن کلب (CARLTON CLUB) میں ہوئی۔ جو اس پارٹی کا تمدنی اور سیاسی اجتماع کا مقام تھا۔ وہ تقریر جس نے میٹنگ کو ہلا دیا۔ اور جس نے یہ فیصلہ کیا کہ لائڈ جارج کی مدد نہ کی جائے۔ بونر لا نے نہیں کی تھی جو اسوقت بہت زیادہ بیمار آدمی تھے بلکہ ایک ایسے پیچھے کی بینچ پر بیٹھنے والے اور نسبتاً غیر معروف پارلیمنٹ کے ممبر نے کی تھی جن کا نام اسٹینلی بالڈون (STANLEY BALDWIN) تھا۔ اور جو ایک سال سے کچھ کم کے بعد بونر لا کی جگہ وزیر اعظم ہونے والے تھے۔

لارڈ بیور بروک برابر مخلوط گورنمنٹ (COALITION GOVERNMENT) کی پالیسی پر جو یونانیوں کے موافق اور ترکوں کے خلاف تھی اپنے حملے جاری رکھے تھے۔ ۱۶ ردسمبر ۱۹۲۲ء کو جس دن دارالعوام بڑے دن کی تعطیل کے لئے اپنا اجلاس ملتوی کر چکا تھا۔ اخبار ڈیلی ایکسپریس (DAILY EXPRESS) نے گذشتہ ستمبر کے واقعات کا ایک مفصل اور سنسنی خیز حال لکھا۔ اس نے لکھا کہ سمرنا کی شکست سے دس دن کے اندر جب یونانیوں کی شکست شروع ہو چکی تھی اور یونان کی گورنمنٹ نے ایتھنس (ATHENS) میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایشیا کوچک میں ان کی فوجی طاقت بہت کمزور تھی۔ لائڈ جارج (LLOYD GEORGE) نے ان کی ہمت افزائی کی کہ وہ لڑائی کو برابر جاری رکھیں۔ ڈیلی ایکسپریس نے لکھا کہ لائڈ جارج نے یہ قدم اسوقت اٹھایا جب وہ اپنے خاص پرائیویٹ سکرٹری سر ایڈورڈ گرگ (SIR EDWARD GRIGG) کے ذریعہ سے اس بات کی تحقیقات کر چکے تھے کہ یونان کے سفارت خانہ سے تعلق رکھنے والے کسی آدمی نے یہ کہا تھا کہ یونان کی فوج کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ برطانیہ سے سامان جنگ اور روپیہ کی عملی مدد لئے بغیر لڑائی کو اور زیادہ دن تک چلا سکے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ڈیلی ایکسپریس نے پھر لکھا کہ جب ایتھنس (ATHENS) کی گورنمنٹ نے لائڈ جارج سے درخواست کی کہ وہ عارضی صلح کا انتظام کر دیں تو انکے پرائیویٹ سکرٹریں

میں سے ایک دوسرے پرائیوٹ سکرٹری نے یونان کے سفارت خانہ کو ٹیلیفون کیا جس میں اُن کو یہ نصیحت کی کہ "اُن کی حکومت کو بہت احتیاط کرنی چاہیئے کہ وہ ایسی غلطی نہ کریں جو ۱۹۱۸ء میں جرمنی والوں نے کی تھی اور مصیبت کے وقت ایک ذلیل عارضی صلح نامہ نہ کرنے پائیں"۔

لائڈ جارج پھر کبھی اپنے عہدہ پر واپس نہ ہوئے۔ ٹرکی کے متعلق ہمارے اور اُن کے درمیان اختلاف ہونے کے باوجود مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہوتی ہے کہ وہ اور میں ۱۹۴۰ء تک جب وہ ایتھنز (ANTBES) آئے اور میرے ساتھ کھانا کھایا۔ بڑی پختہ اور پرخلوص دوستی کے تعلقات رکھتے تھے جو اُن کی زندگی کے آخر تک قائم رہے۔ لائڈ جارج ایک بے انتہا مجبور کرنے والی خوبی کے آدمی تھے۔ بہ حیثیت سیاسی آدمی کے اُن کا کامیاب زمانہ بہت مختصر رہا یعنی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۲ء تک۔ اس اختصار کی وجہ اُن کی شخصیت کی خصوصیات سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ ایک ہیرے کی طرح تھے جو مختلف پہلوؤں پر کاٹا جائے جس کے ہر پہلو سے بہت تیز روشنی نکلتی ہو۔ مگر اُن کی تعداد اور اُن کی قسمیں اتنی زیادہ ہوں کہ اکثر فرق اور ایک دوسرے سے بے میل روشنی واقع ہوتی ہو۔ اُن کی زندگی میں صرف ایک ہی پہلو تھا جس میں یہ فرق اور متضاد باتیں ختم ہوگئی تھیں اور وہ پوری طرح ہم آہنگ اور ایک ہی طرح کام کرنے والے معلوم ہوتے تھے اور تھے یہ بہ حیثیت وزیر اعظم کے اُن کے شروع کے دو سال کا زمانہ تھا یعنی ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء تک۔ یہ زمانہ اُن کی اعلیٰ کوششوں اور عظمت کا زمانہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کے معترضین کی کوششوں کے باوجود کہ اِن کو نیچا دکھائیں اور ذلیل کریں وہی ایسے شخص تھے جنہوں نے پہلی عالمگیر جنگ کو اس طرح جیتا جس طرح اُن کے بڑے جانشین چرچل (CHURGHILL) نے دوسری عالمگیر جنگ کو جیتا۔ اس کامیاب پہلو کے علاوہ لائڈ جارج کے کیریکٹر کی شاندار اور زبردست ہمہ گیری نے اُن کو اس بات سے روکا کہ وہ اپنے زمانہ کی تاریخ پر اس حد تک اثر ڈالیں جس حد تک ان کی قابلیت۔ اُن کا تخیل۔ اُن کی عملی صلاحیتیں اور اُن کی دماغی فوقیت کی وجہ سے اُن کے

مداحوں کو جیسے کہ میں تھا اُن کی طرف سے ہر قسم کی امید تھی۔ اُن چار بڑے آدمیوں میں سے وہ ایک تھے جنہوں نے ورسیلز کے صلح نامہ (TREATY OF VERSAILLES) کو تیار کیا تھا۔ اور اُن کو یقین تھا (اور اس یقین سے میں بھی پوری طرح متفق تھا) کہ وہ اُن اختیارات کو جو جرمنی کے اوپر صلح نامہ کی شرائط کے بموجب فاتح قوموں کو دیئے گئے تھے۔ اس طریقہ پر استعمال کرتے جو اس طریقہ سے بالکل مختلف ہوتا جو اُن کے بعد کم تخیل رکھنے والے اور کم قابل جانشینوں نے استعمال کیا۔

اس زمانہ کے سب سیاست دانوں میں جن کو میں جانتا تھا صرف لائڈ جارج ہی مجھے یقین ہے تنہا ایسے آدمی تھے جو اس قابل تھے کہ ۱۹۲۰ء کے آخر سے ۱۹۳۰ء کے کچھ بعد تک جرمنی میں ویمر کی جمہوریت (WEIMAR REPUBLIC) کے اندر ایسی عزت حاصل کر سکیں۔ ایسی صحیح معاملہ فہمی کو جاری رکھیں اور جمہوری اداروں کو اس طرح استعمال کریں جن سے وہ جمہوریت اور ساری دنیا ایڈولف ہٹلر (ADOLF HITLER) اور دوسری عالمگیر جنگ سے نجات پا جاتی۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت آتش فشاں پہاڑ ختم ہو چکا تھا اپنی اندرونی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اپنی تیزی اور روشنی کی وجہ سے۔ میں نے لائڈ جارج کے متعلق یہاں پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے مجھے علم ہے کہ لارڈ ڈی ابیرنن (LORD D'ABERNON) متفق تھے۔ جن کو جرمنی کے متعلق بہت گہرا علم اور تجربہ تھا۔

میرے لئے مشرق وسطیٰ کی سیاست اور بین الاقوامی پالیسی سے عام طور پر اور ٹرکی سے خاص طور پر قریبی تعلق رکھنے کا مصروف زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ لازین کی پہلی ناکامیاب کانفرنس (LAVSANNE CONFERANCE) کے بعد دوسری کانفرنس ہوئی جو اس سے زیادہ بار آور تھی اور جس میں میرا یہ حصہ تھا کہ وہاں کے حالات کو صرف دیکھتا رہوں۔ برطانیہ کی نئی کنزرویٹیو گورنمنٹ (CONSERVATIVE GOVERNMENT) کے نمائندے لارڈ کرزن۔ (LORD CURZON) جو خارجی امور کے سکرٹری تھے۔ ترکوں نے ایک مضبوط اور قابل وفد بھیجا۔ برطانیہ کی ذہنیت اس وقت حقیقت پسندانہ معقول تھی

یہ بات طے ہوگئی کہ واقعات کو تسلیم کیا جائے اور نئی ٹرکی کو فی الواقع اور قانونی طور پر تسلیم کرلیا جائے اور اس دوبارہ زندہ ہونے والی اور مضبوط حکومت کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ نہ صرف اپنے وطن کے ملک جو اناطولیہ اور ایشیا کوچک کے بحری کنارہ پر تھے اپنے قبضہ میں باقی رکھے بلکہ تھریس (THRACE) ایڈریانوپل (ADRIANOPLE) اور استنبول (ISTANBUL) کو بھی اپنے قبضہ میں رکھے۔ ان شرائط پر اتفاق کرلیا گیا اور لازین کے صلح نامہ پر (TREATY OF LAUSANNE) دستخط ہوگئے اس کے بعد مونٹرو کنونیشن (MONTREUX CONVENTION) نے ان انتظامات کی ترتیب دی جو دردانیال (DARDANELLES) کے درمیان بین الاقوامی جہازوں کو راستہ دینے کے متعلق تھے۔

یہ ممکن ہے کہ ان سب باتوں کو برطانیہ کی بین الاقوامی شکست تصور کیا جائے۔ مگر اس کے خاص نتائج دراصل کیا نکلے۔ برطانیہ اور ٹرکی کے درمیان روزافزوں ہم آہنگی اور سمجھوتہ کا طویل زمانہ۔ اور دوسری عالمگیر جنگ میں برطانیہ اور ٹرکی کے دوستانہ تعلقات جو باوجودیکہ ان کو کمزور کرنے کے لئے کافی دباؤ ڈالا گیا۔ مگر وہ برطانیہ اور اُسکے شریک اتحادیوں کے لئے کافی مدد پہنچانے والے ثابت ہوئے۔ اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اگر ٹرکی کو ایک مرتبہ اور جھڑک دیا جاتا تو کیا ہو جاتا۔ روس (RUSSIA) اس سے بہت پہلے استنبول میں جم جاتا اور اگر خاص سمرنا میں نہیں (SMYRNA) تو شمال کی طرف بحری کنارہ پر اس کے جہاز اور ہوائی مشینیں بحرِ روم کے اندر دور دور تک قائم ہو جاتیں۔ مغرب کے سیاستدان جو اپنی سیاسی اور فوجی طاقت کے زعم میں سرکش ہو رہے تھے ایک اہم اور حساس ملک میں بے شمار پیچیدگیاں اور تکلیف پیدا کر دیتے۔ قسمت اور تاریخ نے جو دوسری طرف جارہے تھے ایشیا کوچک کو برسوں کے لئے پُرامن ترقی اور ترقی اقتصادی اور روحانی ازسرِنو تنظیم عطا فرمائی۔ نئی ٹرکی کے تجربہ کے خلاف اور ٹرکی کے لئے قابلِ تعریف بات وہ حالت تھی جو عرب ریاستوں کی اُسی زمانہ میں تھی۔ وہ تقسیم اور کمزوری کی ایک کہانی تھی۔ کارکن قوم پرست عناصر پر مختلف ملکوں میں موجود تھے وہ

برطانیہ اور فرانس سے مسلسل اختلاف رکھتے تھے۔ نسبتاً فرمانبردار اور اقلیت رکھنے والی ایک جماعت برسراقتدار تھی اور وہ اسی وجہ سے اپنے برطانوی اور فرانسیسی آقاؤں کے ساتھ وفادار تھی۔ مشرق قریب کی یہ وہ مختصر تاریخ تھی جو اتاترک (ATATURK) کے عروج سے لے کر دوسری عالمگیر جنگ کے شروع ہونے تک رہی۔ اُن غم آلودہ اور تکلیف دہ سالوں میں جو کچھ واقع ہوا میں اسکے لئے ایک تماشہ بین کی حیثیت سے رہا۔ گو کبھی کبھی اخبار ٹائمس (THE TIMES) میں ان پر نکتہ چین کی حیثیت بھی رکھتا تھا مگر اس کے بعد سے میں عملی حصہ لینے والوں میں نہیں رہا جیساکہ میں اس سے پہلے اتنے طویل عرصہ تک رہ چکا تھا۔

ایک اور سیاسی مسئلہ جو کچھ پیچیدگی اور اہمیت رکھتا تھا اور جس کے لئے میں نے اُن لڑائی کے بعد والے سالوں میں کافی وقت خرچ کیا اور دلچسپی لی وہ مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کا سوال تھا۔ خاص طور پر کینیا (KENYA) کی کالونی میں جو تیزی سے ترقی کر رہی تھی جیساکہ میں نے اس سے پہلے باب میں بیان کیا ہے مشرقی افریقہ کے بحری کنارہ پر عرصہ سے ہندوستانی آبادیاں قائم ہو گئی تھیں۔ ان آبادیوں میں خود میرے اسمٰعیلی مریدوں کی کافی بڑی اور روز بروز بڑھنے والی تعداد موجود تھی۔ جو وہاں کی جماعت کے لئے ایک با اثر اور مستقل عنصر بن گئی تھی۔ کینیا میں جہاں پر ۱۹۵۰ء کے بعد سے نسلی تعلقات ایک ایسا سیاسی مسئلہ بن گئے تھے جو بے انتہا نازک اور فیصلہ کن اہمیت رکھتا تھا۔ وہ صاف علامات تیس سال پہلے سے صاف طور پر نظر آتی تھیں جن میں وہ خطرات موجود تھے جو آئندہ چل کر پیش آنے والے تھے اور جن کی دھندلی صورت اس وقت دیکھ رہی تھی۔ کینیا کے اُن علاقوں میں جن کو "گورے پہاڑی علاقے" (WHITE HIGHLANDS) کہتے تھے ایسا رقبہ موجود تھا جس میں تیزی سے بڑھنے والی یورپین آبادی رہتی تھی جن کی اکثریت برطانوی تھی۔ وہ اس اُونچے اور وسیع کوہستانی مقام میں رہتے تھے جو بحری کنارہ کے خطہ اور وادی رفٹ (RIFT VALLEY) کے درمیان اور افریقہ کی بڑی جھیلوں کے درمیان واقع ہے۔ اور

جو خط استوا کے ملکوں میں ایک معتدل ملک شمار ہوتا ہے اور جو نہایت زرخیز، آب و ہوا کے اعتبار سے بہت خوشگوار اور وسیع زراعتی ترقی کے لئے بہت زیادہ موزوں ہے۔ تمام کینیا (HENYA) کا انتظام برطانوی کولونیوں کے دفتر کی طرف سے (BRITISH COLONIAL OFFICE) بہ حیثیت کراؤن کالونی (CROWN COLONY) کے ہوتا تھا۔ برطانیہ کے آباد ہونے والے جن کا غیر سرکاری لیڈر لارڈ ڈیلامیر (LORDDELAMERE) تھا اور جو قابل اور بے انتہا وحدت پسند اور اکل کھرا انگریز امیروں کے طبقہ کا آدمی (PEER) تھا۔ چند سالوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کو اپنے معاملات میں حکومت خود اختیاری کا زیادہ حصہ دیا جائے۔ وہ لوگ اس عام برطانوی جماعت سے جو گرم ملکوں میں تھی اس لحاظ سے مختلف تھے کہ وہ کینیا (KENYA) میں آباد ہو گئے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ کینیا (KENYA) کو اپنا مستقل وطن بنا لیں اور دراصل انہوں نے اس کو بنا بھی لیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کی پرورش وہیں پر کرتے تھے۔ وہ وہاں پر اس طرح نہیں رہتے تھے جس طرح عام طور پر برطانوی افسر، تاجر اور پودے لگانے والے ہندوستان، مشرق بعید اور مغربی افریقہ میں کچھ عرصہ کے لئے اپنا کام پورا کرنے تک رہتے تھے۔ مگر ہندوستانیوں نے جن کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی یہ دیکھا کہ ان برطانوی آباد ہونے والوں نے جو شورش حکومت خود اختیاری کے لئے شروع کی ہے اس میں اُن کی گوری قوم کی فوقیت قائم کرنا اور ہندوستانیوں کی مستقل سیاسی علیحدگی اور محکومیت پائی جاتی تھی اس وجہ سے انہوں نے اپنی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ مکمل سیاسی اور ووٹ دینے کی مساوات دی جائے۔ کولونیل آفس کے حکام تذبذب میں پڑ گئے اور وہ خود یہ اختیار نہ رکھتے تھے کہ اس معاملہ میں قطعی فیصلے صادر کر سکیں جو وہائٹ ہال (WHITEHALL) اور ڈوننگ اسٹریٹ (DOWNINGSTRFET) سے ہوا کرتے تھے۔ کینیا (KENYA) کے لئے یہ کبھی ممکن نہ ہوا کہ وہ اپنے لئے خود اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکے چونکہ کینیا (KENYA) کے تمام معاملات باہر والوں کے اثر اور مداخلت

کے ماتحت ہوتے تھے اور آخر کار بیرونی فیصلہ پر منحصر تھے۔

پہلی عالمگیر جنگ کے اختتام پر کینیا (KENYA) میں جس طرح کہ اور جگہ پر وہ رُکے ہوئے سیاسی حوصلے اور جذبات جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف تھے ایکدم چھوٹ نکلے۔ برطانیہ کے ووٹ دینے والے اور دارالعوام میں ان کے نمائندے زیادہ اکثریت میں کینیا کے مسائل سے بالکل بے خبر تھے۔ حالانکہ کینیا کے معاملات میں آخری بات طے کرنا ان کے ہاتھ میں تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے کراس کے بعد تک کینیا کے متعلق کو کونیل آفس (COLONIAL OFFICE) میں مختلف فیصلے سلسلہ وار کیئے گئے۔ ہر نیا فیصلہ اپنے پہلے فیصلہ کو منسوخ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس واقعہ سے بھی کوئی مدد نہ مل سکی کہ چند سالوں کے اندر کینیا میں مختلف گورنر اور کولونیوں کے لئے مختلف سکریٹری رہے۔ سنہ ۱۹۲۲ء تک اور ۱۹۲۳ء کے شروع تک کینیا کی حالت بہت گڑبڑ والی اور شورش سے بھری ہوئی تھی۔ برطانوی آبادکاروں کے جذبات اتنے سخت تھے کہ انہوں نے اپنا ایک فوجی خفیا دارہ قائم کرلیا تھا جس کے ذریعہ سے اس صورت میں جب کہ برطانوی حکومت جیسا کہ اُن کا خیال تھا ان کے خلاف طے کرے۔ تو ان کا ارادہ تھا کہ وہ ملک کے انتظام کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ ہندوستانیوں کے خیالات میں کینیا (KENYA) کے اندر اور خود اپنے وطن میں بہت جوش اور انتشار موجود تھا۔ بہر حال یہ کہنا مناسب ہے کہ بڑی سے بڑی کشمکش کے زمانہ میں بھی بیجا زیادتی کا ایک واقعہ بھی جس میں کوئی یورپین یا ایشیائی شریک ہو کینیا میں نہیں ہوا۔ دونوں فرقے باوجود گہری سیاسی خلیج کے جو ان کے درمیان حائل تھی اپنے ذاتی تعلقات میں اچھے رہے۔

میرے لئے یہ تمام حالات قابل افسوس تھے۔ چونکہ میں اپنے دوست گوکھلے کے سیاسی بیان میں ایک تتمہ لکھکر یہ تجویز دے چکا تھا کہ مشرقی افریقہ ہندوستانیوں کے آباد کرنے کے لئے علیحدہ کردیا جائے۔ میں نے حسب معمول اپنا یہ قدم اٹھایا کہ اخبار ٹائمس (THE TIMES) میں ایک خط بھیج کر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ اس میں جو فوری خطرہ مجھ کو اس وقت نظر آیا وہ یہ تھا کہ بعض جلدباز اور بے سوچے سمجھے کام کرنیوالے

آدمی ایسی حرکتیں کر ڈالیں گے جن کا اثر نہ صرف ہندوستانیوں کے دماغ اور تخیل پر ہوگا۔ بلکہ سارے ہندوستان پر نہ صرف اُس وقت بلکہ دور تک آئندہ زمانہ میں پڑتا رہے گا۔ خاص طور پر میں نے اس بات پر زور دیا کہ اگر کینیا میں آباد ہونے والے در اصل اس نظریہ کو تسلیم کرتے تھے کہ سلطنت برطانیہ آئندہ زمانہ میں در اصل ایسی اتحادی جماعت ہوگی جس میں سب قوموں۔ مذہبوں اور رواجوں کے آدمی شریک ہوں گے (اسوقت ہم میں کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) کا تصور پیدا نہ ہوا تھا مگر ہم تیزی سے اس کی طرف آرہے تھے) تو درحقیقت مشرقی افریقہ میں سلطنت کے کسی اور دوسرے مقام سے بہتر اس بات کا موقع تھا کہ وہاں کے سب لوگ اپنا تمام اثر اور تمام قوت ایک عام بہبودی کا احساس پیدا کرنے کے لئے صرف کریں اور پورے دل کے ساتھ اس واقعہ کو تسلیم کر لیں کہ تھوڑے عرصہ کے جذبات کو چھوڑ کر خود ان کے مفاد و مقاصد کے لئے آگے چل کر یہ ضروری ہوگا کہ ہندوستانیوں کی جماعت کینیا میں اتنی ہی کامیاب اور خوش ہو جتنی کہ وہ سیع تھی۔

ہندوستان کی حکومت ان تمام حالات کے خطرات سے بخوبی واقف تھی۔ لارڈ ریڈنگ وائسرائے (LORD READING THE VICEROY) لارڈ پیل (LORD PEEL) وزیر ہند اور سرتیج بہادر سپرو نے جو اس وقت ۱۹۲۳ء کی امپیریل کانفرنس (IMPERIAL CONFERANCE) میں ہندوستان کے نمائندوں میں سے تھے۔ اس بات پر زور دیا کہ ایک کانفرنس کی جائے۔ یا اگر ضرورت ہو تو بہت سی کانفرنسیں کی جائیں۔ جن میں ہندوستان کے نمائندے اور وہ سب لوگ شریک ہوں جن کا تعلق ایسے نوآبادی ملکوں کے انتظام سے ہے جیسے کہ کینیا۔ یوگنڈا (UGANDA) اور فجی (FIJI) جہاں پر ہندوستانیوں کی آبادی کا کافی حصہ تھا اور ان کانفرنسوں میں ان ملکوں میں بسنے والے ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق قائم کئے جائیں۔

اس معقول اور زبردست درخواست سے متاثر ہو کر اور نیز اس سے متاثر ہو کر کہ ایک کراؤن کالونی (CROWN COLONY) میں برطانوی آباد کاروں کی طرف سے

مسلح بغاوت کا خوفناک امکان تھا۔ برطانوی حکومت اب ایسی بے خبر نہ رہی تھی کہ اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے فوری عمل کرنے کی ضرورت کو محسوس نہ کرے۔ اس فضا میں جو تقریباً ایسی تھی کہ کسی وقت گولے کی طرح پھٹ پڑے۔ مجھ سے ہندوستان کی گورنمنٹ نے کہا کہ میں ہندوستانی وفد کو اپنی قیادت میں اس کمیٹی کے پاس لے جاؤں جو لارڈ زیٹلینڈ (LORD ZETLAND) کی صدارت میں اس لئے قائم کی گئی تھی کہ اس سارے نازک اور مشکل مسئلہ کے لئے کوئی حل نکالنے کا کام انجام دے۔

جب تک ہم لوگوں کا اس وفد کے لئے تقرر ہوا۔ لارڈ زیٹلینڈ مسٹر بالڈون کی چند روزہ پہلی گورنمنٹ کے ممبر بن چکے تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس کمیٹی کی صدارت کروں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میں اس جھگڑے میں ایک فریق کی حیثیت رکھتا تھا اور میں ہندوستانی نقطۂ نظر پر خاص طور سے بولنے والا تھا۔ اس لئے میرے لئے یہ نامناسب ہوگا کہ میں اس کمیٹی کا چیرمین رہوں۔ اس وجہ سے ہم نے اپنا چیرمین مسٹر جے۔ انچ۔ ہوپ سمپسن (J.H. HOPE SIMPSON) ممبر پارلیمنٹ کو بنایا میرے علاوہ اور دوسرے ممبر یہ تھے۔ سر بنجمن رابرٹسن (SIR BENJAMIN ROBERTSON) جو وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ اور ۱۹۲۰ء میں کینیا ایک سرکاری دورہ پر جا چکے تھے۔ دیوان بہادر ٹی۔ رنگا چریر (DIWAN BAHDUR T. RANGACHARIAR) اور مسٹر کے۔ سی۔ روئے (K.C. ROY) ہم نے اپنا کام اپریل میں شروع کیا اور جولائی میں ختم کر دیا۔ اس سال ۱۹۲۴ء کے اگست تک ایک لیبر گورنمنٹ (LABOUR GOVERNMENT) جو برطانیہ کی پہلی لیبر گورنمنٹ تھی۔ قائم ہو چکی تھی۔ جب ہماری رپورٹ دارالعوام میں پیش کی گئی تو جس وزیر نے اس کو پیش کیا وہ مسٹر جے۔ ایچ۔ ٹامس (J.H. THOMAS) تھے جو کالونیوں کے نئے سکرٹری آف اسٹیٹ (SECRETARY OF STATE FOR THE COLONIES) تھے

جم ٹامس (JIM THOMAS) اور میں گہرے دوست ہو گئے اور ان کی زندگی کے آخر تک ایسے ہی رہے۔ میں نے اس بات کا کبھی یقین نہیں کیا کہ اس ناخوشگوار معاملہ میں جس نے ان کی سیاسی زندگی کو ختم کر دیا۔ انہوں نے نیک نیتی کے علاوہ کسی اور طرح پر

کام کیا۔ اُن کی صاف اور خوشگوار طبیعت نے اُن کو ایک مشکل اور تکلیف دہ حالت میں لا ڈالا ہو جس سے نکلنے کی ترکیب صرف استعفا تھا۔ جو انہوں نے بلا تأمل دے ڈالا جم ٹامس (JIM THOMAS) بڑے دل والے آدمی تھے۔ ان کے جذبات بہت نفیس اور کشادہ تھے جن کی میں ہمیشہ قدر و عزت کرتا تھا۔

باوجودیکہ ہم نے اُس گرم موسم کے بہت سے ہفتے انڈیا آفس کے کمیٹی گھر میں خرچ کئے اور کالونیل آفس (COLONIAL OFFICE) سے طویل مباحثے کئے۔ مگر ہماری بحثوں پر کوئی مہر یا نشان ایسا نہ لگ سکا جس سے وہ پارلیمنٹ کا کوئی ایکٹ بن جائیں تاہم میرے خیال میں ایک سمجھوتہ کی حیثیت سے اُن کی بذات خود ایک اصلی قیمت تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ صرف ادھوری تجویزیں تھیں۔ مگر یہی وہ سب کچھ تھا جس کے متعلق سفارش کرنے کی ہم میں طاقت تھی یا ہم کو اختیار تھا۔

قومی زندگی میں برسوں رہنے کے بعد ایک واقعہ پر مجھے پورا یقین ہوگیا ہے۔ وہ یہ کہ عارضی سمجھوتہ کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ایک مشکل وقت پر ایک قسم کا پل تیار کرکے دیدیتا ہے۔ جس پل کو آئندہ چل کر استعمال کرنے کے بعد یہ اکثر ممکن ہو جاتا ہے کہ اصلاحات کی وہ مکمل تجویزیں پوری طرح نافذ کر دی جائیں جو شروع میں ایک دم نامنظور کر دی جاتیں۔

ووٹ دینے کی مساوات اور پہاڑی علاقوں میں بے روک ٹوک آباد ہونے کے مسائل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ ڈیلامیر (DELAMERE) اور ان کے دوست بدستور اپنی پوزیشن پر قائم تھے۔ مگر ہندوستانیوں کی درآمد کے متعلق ہم نے ایک ناخوشگوار قانون کی منسوخی حاصل کرنی جو کینیا کی گورنمنٹ نے جاری کیا تھا اور جس سے در اصل مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کی آمد بالکل ختم ہو جاتی۔ سکرٹری آف اسٹیٹ (SECRETARY OF STATE) نے بہر حال یہ حق اپنے لئے باقی رکھا کہ وہ کسی وقت کسی قسم کا قانون نافذ کر سکتے ہیں۔ اگر افریقہ کے مفاد کو باہر والوں کی آمد سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔ مسٹر ٹامس (MR. THOMAS) نے اعلان کیا کہ سمندر کے کنارہ والی

نچی زمین کے علاقے ہندوستان کے زراعت پیشہ مہاجروں کے لئے وقف کر دیئے گئے ہیں۔ ایک حد تک ان باتوں سے فائدہ ہوا۔ مگر اس وقت یہ بات ظاہر تھی جیساکہ اب بھی ہے کہ معقولیت اور استقلال اُن مشکل اور پیچیدہ قومی حالات میں پیدا کرنا ممکن ہے جو مشرقی افریقہ میں ادھوری تجویزوں اور سمجھوتوں کی وجہ سے ترقی کر گئے تھے کسی حد تک میرا خیال ہے کہ ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم نے بہتر فضا ضرور پیدا کر دی اور ہندوستانی نقطۂ نظر کو زیادہ وسیع طریقہ پر سمجھا دیا وہ اچھا خاصہ قابل عمل عارضی طریق کار کو جو برسوں تک کینیا میں جاری رہا اور جو یوگنڈا اور UGANDA AND ٹانگانیکا TANGANYIKA میں بھی تھا۔ ہماری کمیٹی کے کام کا نتیجہ تھا اور ہماری مفصل سفارشوں کا جو ہم نے کی تھیں۔

ایک واقعہ اس وقت ظاہر تھا اور اب بھی تیس سال بعد وہ اس کا مستحق ہے کہ اس پر زور دیا جائے۔ وہ یہ کہ مشرقی افریقہ کے مسائل کو کبھی بھی برطانیہ کی مخالف سیاسی پارٹیوں کے درمیان وجہ اختلاف بننے کی اجازت نہ دی جائے۔ میں اس معاملہ میں دلچسپی لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چونکہ خود میرے مرید جو خالص ہندوستانی نسل کے ہیں آجکل مشرقی افریقہ میں تقریباً پچاس ہزار کی تعداد میں ہیں۔ پندرہ ہزار کینیا میں ستائیس ہزار ٹنگانیکا میں اور چھ ہزار یوگنڈا میں۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں میں نے اخبار ٹائمس (THE TIMES) میں ایک مضمون بھیجا جس میں میں نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا جو اصولاً ان تمام گذشتہ سالوں کے واقعات سے بالکل نہ بدلے تھے۔ اس میں مَیں نے لکھا کہ:-

"ہم کافی عرصہ کے لئے یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ برطانیہ کے لوگ مشرقی افریقہ کی آبادی کے ٹرسٹی ہیں۔ خواہ اس آبادی کی قومیت اور رنگ کچھ ہی ہو۔ ٹرسٹی کے وہ فرائض کبھی پوری طرح انجام نہیں دئیے جا سکتے جب تک برطانیہ کے سب طبقوں کی باجبر رائے عامہ اور دو خاص سیاسی پارٹیوں کے درمیان ایک قسم کا مضبوط اشتراکی سمجھوتہ اور احساس فرض پیدا نہ ہو جائے۔ مشرقی افریقہ میں مختلف قوموں کے درمیان

حقیقی اتفاق کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اُن میں سے کوئی قوم یہ یقین رکھے کہ اُن کے ٹرسٹی آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور یہ کہ ان کی نظر میں ایسے خاص آدمی ہیں جن پر وہ مہربان ہیں۔ افریقہ کی کالونیوں کا ٹرسٹی ہونا بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ یہ اُن بڑے کارناموں میں جو قدرت نے برطانوی قوم کے سامنے رکھے ہیں۔ برطانوی قوم کی کامیابی یا ناکامیابی کی کسوٹی ہے۔"

صرف وقت بتا سکے گا کہ وہ ذمہ داری کس طرح پوری کی جائے گی۔ مشرقی افریقہ میں جو واقعات ہوئے ان کے بیان کرنے میں حاشیہ آرائی سے کے طریقہ پر بہر حال مناسب ہوگا کہ میں یہ ذکر کروں کہ سر ایولنگ بیرنگ (SIR-EVELYNBARING) نے جو کینیا (KENYA) کے گورنر تھے ایک بیان اس موقعہ پر شائع کیا جب اسمٰعیلیوں کی امامت کا وارث ہونے کی حیثیت سے میری اڑسٹھویں [48] سالگرہ منائی گئی۔ وہ بیان بہت زیادہ جوش۔ مہربانی اور اخلاق کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں میری قومی زندگی کا ایک پہلو ختم ہو گیا جس میں بہت سخت اور مختلف کاموں کے پانچ یا چھ سال شامل تھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۲۹ء تک یا اس کے بعد تک میرے لئے ایسا زمانہ آیا جو صرف میری ذاتی اور پرائیویٹ زندگی کے لئے صرف ہوا۔

بہر حال میرا خیال ہے کہ میں اس بات کو واضح کر دوں کہ قومی معاملات میں میری حالت ایک اعتبار سے ہمیشہ ایسی رہی کہ میں ان میں صرف شوقیہ حصہ لیتا رہا۔ میری قومی زندگی جیسا کہ میں نے بتایا ہے مسلسل اور صاف طور پر واضح دوروں میں چلتی رہی ہے مگر وہ فرائض اور ذمہ داریاں جو وراثتاً مجھ پر عائد ہوتی ہیں ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی کم نہ ہوئیں۔ اسمٰعیلیوں کے امام کی حیثیت سے میرا قدرتی کام یہ ہے کہ میں اُن کا قانونی اور دستوری لیڈر رہوں اور میں ان مختلف کونسلوں اور اداروں کی نگرانی کروں جو بہت سی اور دور دور پھیلی ہوئی اسمٰعیلی جماعتوں نے قائم کئے ہیں اور یہ جو ہر علاقہ میں اپنا انتظام خود کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اس جماعت کے ہزاروں آدمیوں سے برابر خط و کتابت میں مصروف رہتا ہوں۔ یہ خط و کتابت اُن سب معاملات پر ہوتی ہے جس کے متعلق

وہ میری ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اور یہ جماعت جیسا کہ میں نے بتایا ہے ایسی ہے جو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ چین کی بڑی دیوار سے لے کر جنوبی افریقہ تک۔ یہ میرا کام ہے اور یہ میری روزانہ زندگی کا مقررہ اور باضابطہ کام رہا ہے جو تقریباً ستر سال سے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک جاری ہے۔

باب نمبر ۱۰

قومی زندگی سے کچھ عرصہ کیلئے آرام

گھوڑوں سے۔ اُن کی نسل بڑھانے سے۔ ان کی تربیت اور اُن کی دوڑ سے مجھے اپنی تمام عمر بڑی دلچسپی رہی ہے اور قدرتی طور پر یہ دلچسپی اُون روایات کا ایک حصہ ہے جو ورثتاً مجھ کو ملی ہیں اور اُس ماحول کا جس کے اندر میری پرورش کی گئی۔ لندن اور دوسرے مقامات پر جو نمائشیں ہوئی ہیں اُن میں ایرانی صنعت و فن کو دیکھنے سے مغربی عوام کو یہ سمجھنے میں شاید مدد مل چکی ہے کہ ایران کے اس حکمران طبقہ کی زندگی میں جس کی اولاد سے میں ہوں کھیل اور تفریح نے کتنا بڑا اور اہم حصہ لیا ہے۔ شکار اپنی بہت سی شکلوں میں ان کے لئے صرف ایک دل بہلانے کا مشغلہ ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ اُن کی عمر بھر کے لئے ایک بڑی معروفیت کا کام تھا۔ اُن کے شکاری کتے۔ اُن کے باز ان کے گھوڑے بے انتہا خوبصورت۔ بے انتہا تیز اور اتنے اعلیٰ قسم کے ہوتے تھے جو امکانی طور پر وہ پیدا کر سکتے تھے یا خرید سکتے تھے۔ میرے دادا اپنی جوانی کے زمانہ میں فتح علی شاہ کے دربار میں اس زبردست بادشاہ کے لاڈلے داماد ہونے کی حیثیت سے ان تمام رائج۔ کھلے میدان میں ہونے والے اور جسمانی تربیت والے کھیلوں میں اور ایک بگڑی ہوئی مگر قومی سوسائٹی کے مشغلوں میں اسی طرح پورے طور پر مصروف رہتے تھے جس طرح کہ ان کے زمانہ کے دوسرے آدمی رہتے تھے۔ جب اُن کی مصیبتوں اور آوارہ گردیوں کا زمانہ ختم ہو گیا اور وہ بمبئی میں مقیم ہو گئے تو انہوں نے قدرتی طور پر اور خوشی کے ساتھ وہی طرز زندگی پھر اختیار کیا جو اس سے مختلف نہ تھا جس سے وہ اپنی جوانی میں واقف تھے اور جیسا کہ میں نے اس کتاب کے شروع میں ظاہر کیا ہے یہی وہ فضا تھی

جس کے اندر میں نے اپنی شعوری زندگی کی ابتدا سے اپنا بچپن اور لڑکپن صرف کیا۔

جب میرے والد کا انتقال ہوا تو انہوں نے ایک بڑا اور شاندار کھیل اور تفریح کا سامان چھوڑا۔ یعنی باز۔ شکاری کتے۔ اور اسّی نوے کے درمیان دوڑ کے گھوڑے۔ اس سامان کے بڑے حصہ کو میری والدہ نے قدرتی طور پر کم کر دیا۔ مگر انہوں نے گھوڑوں میں سے بیس یا تیس گھوڑے رکھ لیے۔ میری نابالغیت کے زمانہ میں یہ گھوڑے تمام مغربی ہندوستان کے میلوں میں میرے نام سے اور میرے جھنڈوں کے ساتھ دوڑائے جاتے تھے۔ میں نے اس سے پہلے مختصر حال ان کامیابیوں کا بیان کیا ہے جو ان سالوں میں مجھے اور میرے ساتھ میرے رشتہ کے بھائی اور میرے گھوڑ دوڑ کے شریک۔ آغا شمس الدین کو حاصل ہوئیں۔

ہندوستان کی گھوڑ دوڑوں میں اس جلد اور مستقل شہرت کا ایک اثر یہ ہوا کہ جب تک میری عمر انتیس سال کے قریب تھی۔ میرے بہت سے دوست ہو گئے۔ جو گھوڑ دوڑ کے حلقوں میں اہمیت رکھنے والے اور با اثر آدمی تھے۔ ان میں دو بھائی بھائی تھے۔ لارڈ ولیم اور لارڈ مارکس بیرسفورڈ (LORD WILLIAM AND LORD MARCUS BARESFORD)۔ لارڈ ولیم خاص طور پر اپنی ذات سے ایک زبردست اور نرالی شخصیت والے آدمی تھے۔ وہ ہندوستان کے تین وائسرائوں کے مسلسل طور پر ملٹری سکرٹری رہ چکے تھے۔ یعنی لارڈ رپن کے (LORD RIPON) لارڈ ڈفرن (LORD DUFFERIN) کے اور لارڈ لینسڈاون (LORD LANSDOWNE) کے اس عمدہ جگہ اور کلیدی عہدہ پر عرصہ تک رہنے کی وجہ سے جہاں پر انہوں نے اپنے آقاؤں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور اس کو قائم رکھا تھا۔ ان کو بہت سے مختلف اور دور رس معاملات کے میدانوں میں مثلاً فوجی۔ سوشل۔ سیاسی اور بین الاقوامی معاملات میں مسلمہ اثر اور اختیار حاصل ہو گیا تھا اور اسی بیرونی ممالک کے ان شاندار اور با اختیار آدمیوں کے ساتھ جو ہندوستان میں آتے تھے اور قدرتی طور پر حکمران شہزادوں کے ساتھ ان کے تعلقات ہو گئے تھے۔ وہ بالکل بے خوف اسپ سوار تھے۔ جن کے متعلق

یہ کہا جاتا تھا کہ شکار کھیلتے وقت گر جانے سے۔ پولو کھیلنے سے اور خندقوں اور جھاڑیوں پر گھوڑا کدانے سے اُن کے جسم کی ہر ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ چودہ سال تک ملٹری سکریٹری رہنے کے زمانہ میں وہ ہندوستان کے گھوڑ دوڑ جیتنے والوں میں ایک سر برآوردہ اور مشہور آدمی ہو گئے تھے۔ پہلے تنہا اپنی ذات سے اور پھر دو شہزادوں کے ساتھ شریک ہوکر۔ یعنی مہاراجہ دربھنگا کے ساتھ جو ایک بے انتہا مالدار زمیندار تھے اور مہاراجہ پٹیالہ کے ساتھ جو سکھوں کے مشہور شہزادہ تھے۔ یہ ہمیشہ کہا جاتا تھا کہ گھوڑ دوڑ میں بازی لگانے والے لارڈ ولیم سے ہمیشہ خائف رہتے تھے اور اُن کے سامنے کانپتے رہتے تھے چونکہ وہ بڑی بڑی بازیوں میں جیتنے کا مشکل فن بہ حیثیت ایک پرانے استاد کے خوب جانتے تھے۔ وہ میرے خاندان کے اور میرے بچپن ہی سے بڑے دوست تھے اور جب کبھی وہ بمبئی آتے تھے ہماری اُن سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔

جب ۱۸۹۸ء میں میں پہلی مرتبہ انگلستان گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ گھوڑوں کی نسل کشی اور گھوڑ دوڑ میں میری موروثی اور ذاتی دلچسپی کے متعلق لوگوں کو بہت کچھ علم تھا اور یہ واقفیت صرف گھوڑ دوڑ والے حلقوں میں ہی نہ تھی بلکہ انڈیا آفس میں عدالتوں میں اور پرنس آف ویلز (PRINCEOFWALES) کے ذاتی حلقہ والے آدمیوں میں بھی تھی۔ میری عمر اُس وقت اتنی کم تھی کہ مجھ کو یہ بات معلوم ہونے کے بعد ایک خوشگوار تعجب ہوا۔ یا تو لارڈ ولیم بیرسفورڈ (LORDWILLIAMBERESFORD) نے یا اُن کے بھائی لارڈ مارکس نے (LORD MARCUS) چونکہ میں کبھی یہ معلوم نہ کرسکا کہ اُن میں سے کس نے یہ قدم اٹھایا تھا کہ بہ حیثیت مالک کے میرے نشانات کو انگلستان میں رجسٹری کرا دے وہ دونوں جانتے تھے کہ ہندوستان میں میرے خاندان کے گھوڑ دوڑ کے نشانات ہمیشہ سے سبز اور سرخ رہ چکے تھے۔ اسمٰعیلی جھنڈے کے رنگ بھی یہی ہیں اور جب میرے مورث ایران اور مصر دونوں ملکوں میں دنیاوی بادشاہ تھے تو سبز اور سرخ اُن کے جھنڈوں کے رنگ تھے۔ چند سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ انگلستان میں میرے نشانات

سبز اور چاکلیٹ رنگ کے رجسٹری کئے گئے۔ میں نے اس کے متعلق مسرز ویدربائی سے (MESSERS WETHERBY) دریافت کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ جب رجسٹری کی گئی تھی اس وقت سبز اور سرخ رنگ نہیں مل سکے۔ مگر انہوں نے مجھے یہ کبھی نہ بتایا کہ یہ لارڈ ولیم تھے یا لارڈ مارکس یا کوئی اور صاحب تھے جنہوں نے سبز اور چاکلیٹ رنگ کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے بہت سال بعد میرے بڑے بیٹے نے ایسا کیا کہ سبز اور سرخ رنگ کا مجموعہ حاصل کر لیا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس وقت تک میں بھی ان رنگوں کو بدل سکتا تھا مگر اُس زمانہ میں میرے سبز اور چاکلیٹ رنگ ایسے خوش قسمت شمار ہوتے تھے اور اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ ان کا بدلنا نہ قرین مصلحت تھا اور نہ قابل عمل۔ فرانس میں اور عام طور پر یورپ میں میرے گھوڑ دوڑ کے رنگ اب بھی اور ہمیشہ سبز اور سرخ رہتے ہیں۔

میں فوراً ایپسم (APSOM) کے گرانڈ اسینڈ (GRAND STAND) کا اعزازی ممبر بنا دیا گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میری سب سے پہلی اصلی گھوڑ دوڑ ۱۸۹۸ء کے موسم بہار میں ایپسم کے میلہ میں ہوئی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ مشہور گھوڑے رے رونالڈ (RAYRONALD) نے شہر اور آس پاس کے سب گھوڑوں کے مقابلہ میں جیت حاصل کی۔ مجھے یہ خیال کر کے فخر ہوتا ہے کہ میں نے اپنے دوستوں سے کہدیا تھا کہ یہ بہت عمدہ گھوڑا تھا جو گھوڑوں کی نسل کشی کی تاریخ میں یقینی طور پر اپنا سکہ جمائے گا اور یہ کہ اس کی عمر اور وزن کا لحاظ کرتے ہوئے اُس کی یہ خاص جیت کچھ بہت تعجب خیز نہ تھی۔ کچھ عرصے بعد میں ڈربی گیا (DERBY) میں نے وہاں پر ایک گھوڑے پر جس کا نام جدہ (JEDDAH) تھا ایک اشرفی کی چھوٹی سی بازی چھیاسٹھ اور ایک کے حساب سے لگائی۔ گو میری بازی چھیاسٹھ اور ایک تھی مگر اس گھوڑے نے دراصل سو اور ایک پر بھاگنا شروع کیا اور پھر ہر شخص کو اس پر تعجب ہوا کہ اس نے ڈربی کی دوڑ جیت لی۔ میرے دوست پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) نے اتفاق سے مجھے وہاں احاطہ میں تاک لیا اور وہ میرے

پاس ہنستے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ جس گھوڑے کا نام جیدہ ہو وہ یقینی طور پر آغا خان کا ہونا چاہیئے۔

اسکٹ کے مقام پر (ASCOT) میرے پاس پچاس سال سے زائد سے شاہی خانگی بلہ یعنی رائل ہاؤس ہولڈ بیج موجود ہے۔ یہ بلہ مجھ کو پہلے ملکہ وکٹوریہ نے دیا تھا اور پھر یہ مسلسل طور پر مجھے دوبارہ عطا کیا جاتا رہا۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کی طرف سے۔ شاہ جارج پنجم کی طرف سے۔ شاہ جارج ششم کی طرف اور ملکہ ایلزبتھ دوم کی طرف سے۔

شروع ہی سے گھوڑ دوڑ سے میری دلچسپی کبھی محض عارضی اور بیکاری کا مشغلہ نہیں رہی ہے۔ انگلستان میں یا یورپ کے دوسرے مقامات پر ۱۸۹۸ء اور اسکے بعد سے میں برابر گھوڑ دوڑ کے میلوں میں گیا اور وہاں پر میں نے گھوڑوں کی قسموں کو بہت غور کے ساتھ دیکھا۔ ہندوستان میں۔ بمبئی میں۔ پونا میں یا کلکتہ میں میں نے کبھی جہاں تک امکانی طور پر ہو سکا کسی گھوڑ دوڑ کے میلہ کو نہیں چھوڑا۔

۱۹۰۵ء میں فرانس میں میری ملاقات مسٹر ڈبلو۔ کے۔ وینڈربلٹ سے ہوئی (W. K. VANDERBILT) جو اس وقت ملک میں مشہور گھوڑوں کے مالک شمار ہوتے تھے۔ گو وہ مجھ سے عمر میں بہت زیادہ بڑے تھے۔ مگر اُن کو اس سے خاص دلچسپی ہو گئی کہ وہ اُن سارے بھیدوں کو مجھے بتا دیں جو اس انتظام کے متعلق تھے جو وہ اپنے گھوڑ دوڑ کے بڑے اصطبلوں میں کرتے تھے۔ انہوں نے میرا تعارف اپنے ٹرینر یعنی گھوڑے سدھانے والے سے کرایا جس کا نام ولیم ڈیوک (WILLIAM DUKE) تھا۔ جس کو انہوں نے یہ سخت ہدایات دی تھیں کہ مجھ کو جب کبھی میں چاہوں یہ اجازت دے دی جائے کہ میں اُن کے گھوڑوں کی جانچ کرنے اور ان کو سدھانے کے لئے اُن کے اصطبلوں میں چلا جایا کروں۔ مسٹر وینڈربلٹ نے مجھ سے کہا: میرا خیال ہے کہ آپ کو اس میں زیادہ خوشی ہو گی کہ میرے اصطبلوں کا آزادی کیساتھ انتظام کریں بہ نسبت اسکے کہ آپ میرے گھر کا آزادی کیساتھ انتظام کریں۔ جب کبھی میں پیرس میں ہوتا تھا ولیم ڈیوک (WILLIAM DUKE) میرے پاس

خبر بھیج دیتے تھے کہ ان کو گھوڑوں کی کچھ اہم جانچ پڑتال کرنی ہیں اور میں اکثر صبح سویرے اُن کے اصطبلوں میں چلا جایا کرتا تھا اور اس جانچ پڑتال کو غور سے دیکھا کرتا تھا۔ ان سولہ سالوں میں یعنی ۱۸۹۸ء سے پہلی عالمگیر جنگ کے شروع ہونے تک جب میں نے یورپ کی گھوڑ دوڑ نسل کشی اور گھوڑوں کی تربیت کو غور سے دیکھا مگر اس میں کوئی عملی حصہ نہ لیا۔ میرے دماغ پر چند بڑے گھوڑوں کا اثر ہوا اور میرے دل میں اُن کی یاد اچھی طرح باقی ہے۔ اُن کے علاوہ اور گھوڑے بھی ایسے ہی اچھے بڑے اور کامیاب تھے مگر اُن کی اور اُن کے کاموں کی یاد میرے دماغ میں اس طرح قائم نہیں رہی۔ میں بلا تامل کے کہہ سکتا ہوں کہ ان سب گھوڑوں میں جو میں نے انگلستان میں دیکھے ٹیٹرارک (TETRARCH) اور اسپیرمنٹ (SPEARMINT) ایسے دو گھوڑے تھے جن کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے ایسی گھوڑیاں بھی دیکھیں جیسے کہ آرڈپیٹرک (ARDPATRICK) اور سنسٹر (SUNSTER) انگلستان میں اور سارڈن پیل (SARDANAPALE) فرانس میں۔ سیپٹر (SCEPTRE) اور پریٹی پولی (PRETTYPOLLY) صرف ایسی دو گھوڑیاں ہیں جن کے متعلق مجھے کبھی علم ہوا جو اپنی قسم اور خصوصیت کے اعتبار سے اُن دو بڑے گھوڑوں کے مقابلہ کی تھیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان دونوں میں رفتار کی تیزی۔ قوت۔ سانس اور اعضا کی صحت ایسے پیمانہ پر تھی جو کسی نر گھوڑے کی برابر ہو۔ وہ ایسی عمدہ تھیں کہ ان کو اس وقت تک دوڑاتے رہے جب ان کی عمر پانچ سال کی ہوگئی تھی اور ان کی اولاد نے اپنا اثر انگلستان کے گھوڑوں کی اچھی نسل پر چھوڑا ہے۔ عام طور پر بہر حال اس میں شبہ نہیں ہے کہ خالص نسل کا نر گھوڑا مادہ گھوڑی سے بہت زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ ان گھوڑوں میں سے کسی نے بھی مجھ پر اپنی طاقت کے متعلق وہ قائم رہنے والا اثر نہیں چھوڑا جو انگلستان کے اسپیرمنٹ (SPEARMINT) اور ٹیٹرارک (TETRARCH) سے میں نے حاصل کیا اور ایک اور مشہور فرانسیسی گھوڑے سے جس کا نام پریسٹیج (PRESTIGE) تھا مجھے اسکا بالکل یقین نہیں ہے کہ پریسٹیج سب سے زیادہ اثر ڈالنے والا دوڑ کا گھوڑا نہیں تھا جو میں اپنی

عمر میں دیکھ چکا تھا مسٹر وینڈربلٹ (MR. VANDERBILT) کے پاس ایک اور گھوڑا تھا جس کا نام مینٹے نن (MAINTENON) تھا۔ اور وہ بھی اسی زمانہ میں ان کے پاس تھا جب پریسٹیج (PRESTIGE) یہ دونوں گھوڑے دوڑ میں اکثر ساتھ ساتھ آزمائے جاتے تھے۔ مینٹے نن (MAINTENON) بہت اچھا گھوڑا تھا اور اس نے فرانس کی ڈربی (DERBY) جیتی تھی مگر سخت دوڑ میں وہ کبھی پریسٹیج (PRESTIGE) سے بیس گز کے اندر بھی نہ آسکا۔ ولیم ڈیوک نے (WILLIAMDUKE) جو ان دونوں گھوڑوں کو سدھاتے تھے مجھ سے بار بار کہا کہ کوئی وزن بھی یعنی تین (اسٹون) تک وزن بھی ان دونوں گھوڑوں کو برابر نہیں لا سکتا تھا۔ بدقسمتی سے پریسٹیج (PRESTIGE) کبھی کسی ایک اہم دوڑ میں حصہ نہ لے سکا۔ اگر اس کو ایسی دوڑ کا موقع ملتا تو وہ پوری رفتار سے جیت جاتا۔ اس نے کبھی شکست نہیں کھائی اور وہ کبھی ہلکی سرپٹ سے زیادہ نہیں بڑھا چونکہ کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ اس میں کتنی قوت ہے۔ اور وہ اس کو ظاہر کرسکتا تھا۔ اگر کبھی اس کی ضرورت ہوتی کہ وہ ایسا کرے۔ اس کی صبح کے وقت سرپٹ دوڑ میں بھی یہی بات ہوا کرتی تھی۔ جو جاکی (JOCKEY) اس پر سواری کیا کرتے تھے انہوں نے ڈیوک (DUKE) کو بتایا تھا کہ وہ دراصل اس لئے ڈرتے تھے کہ اس گھوڑے کو آگے بڑھائیں خواہ وہ بڑھانا اس کی انتہائی رفتار سے کتنا ہی کم ہو۔ چونکہ ان کو خطرہ تھا کہ مبادا وہ ان کو لے کر بھاگ جائے۔ وہ بہت اچھے مزاج کا گھوڑا تھا۔ اور میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ مسٹر وینڈربلٹ (M.R. VANDERBILT) نے اس کو کیوں بہت سستی قیمت میں فروخت کر دیا اور اس سے بہت کم مؤثر گھوڑے سانڈ گھوڑوں کی حیثیت سے رکھ لئے۔ یہ سچ ہے کہ پریسٹیج (PRESTIGE) کے لئے اچھی گھوڑیاں نہ ملیں مگر پھر بھی اس نے سارڈن پیل (SARDANAPALE) گھوڑا ضرور پیدا کیا۔

جب سارڈن پیل (SARDANAPALE) اپنی انتہائی طاقت اور انتہائی عروج پر تھا اور پیرس کی گرانڈ پرکس (GRAND PRIX DE PARIS) اور فرانس کی ڈربی

(DERBY) جیت چکا تھا اس وقت پہلی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی تھی جیسا کہ میں نے لکھا ہے میں اس وقت افریقہ میں تھا۔ جب میں یورپ واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ گھوڑ دوڑ تمام عملی اغراض کے لحاظ سے مردہ ہو چکی تھی۔ میں خود ان واقعات اور ان کاموں میں مصروف اور بے انتہا منہمک تھا جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ میں سنہ ۱۹۱۹ء تک جب لڑائی کے بعد پہلی ڈربی (DERBY) کی دوڑ ایپسم (APSOM) کے مقام پر ہوئی کسی گھوڑ دوڑ کے میدان میں نہیں گیا یا گھوڑ دوڑ کی کسی شکل میں دوبارہ کم سے کم طریقہ پر بھی شریک نہیں ہوا۔ اس وقت سے آگے چل کر سنہ ۱۹۲۱ء تک میں نے پھر اس بات کی عادت ڈالی کہ گھوڑ دوڑ کے ہر اہم میلہ میں جایا کروں جہاں کہیں بھی میرے رہنے کا اتفاق ہو۔ انگلستان میں۔ فرانس میں۔ بلجیم میں۔ اٹلی میں۔ ہندوستان میں یا مصر میں۔ عرصہ ہوا جب میں نے ارادہ کیا تھا۔ یعنی سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۸۹۹ء کے زمانہ میں۔ کہ میں کچھ گھوڑے یورپ میں رکھوں۔ مگر میرے عزیز رشتہ کے بھائی آغا شمس الدین کی موت کی وجہ سے جن کے ساتھ میں نے ارادہ کیا تھا کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں یورپ میں ایک اصطبل جاری کروں۔ میری تمام امیدیں اور خیالات اس معاملہ کے متعلق ختم ہو گئے۔

ایک روز سنہ ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں مسز ایڈون مونٹیگ (MRS. EDWIN MONTAGUE) کے مکان پر ایک ڈنر میں مجھے مسز ایسکوائتھ (MRS. ASQUITH) کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا جو سابق وزیر اعظم کے بیٹے کی بیوی تھیں اور جو مسز جارج لیمٹن (MRS. GEORGE LAMBTON) کی بہن تھیں۔ ہم دونوں نے گھوڑوں کے متعلق باتیں کیں اور انہوں نے مجھ سے اتنے زور کے ساتھ اصرار کیا جتنا کہ وہ کر سکتی تھیں کہ میں انگلستان میں گھوڑوں کی اچھی نسل کشی اور دوڑ کا کام شروع کروں۔ انہوں نے کہا کہ آپ میرے بہنوئی جارج کو کیوں نہیں بلا لیتے اور ان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ آپ کے لئے کچھ گھوڑیاں اور کچھ بچھیرے خرید کر لیں۔

رٹز (RITZ) ہوٹل میں اپنے کمرہ کے اندر واپس آ کر میں بیٹھ گیا اور

میں نے جارج لیمبٹن (GEORGE LAMBTON) کو ایک خط لکھا کہ وہ آکر مجھ سے مل جائیں۔ چنانچہ وہ آئے اور ہم دونوں کی گفتگو سے بہت فائدہ ہوا۔ انہوں نے میرا تعارف رچارڈ ڈاسن (RICHARD DAWSON) سے کرایا جو آئرلینڈ کے مشہور کھلاڑی تھے۔ اور یہ سفارش کی کہ میں ان کو اپنے گھوڑے سدھانے کے لئے رکھ لوں اور وہ خود اس بات پر راضی ہو گئے کہ میرے لئے کچھ گھوڑوں کے بچھیرے خرید کر لیں۔ جب میں پیرس واپس گیا تو میں نے ولیم ڈیوک (WILLIAM DUKE) کو بلایا جن کے آقا مسٹر وینڈربلٹ (VANDERBILT) مر چکے تھے اور اس وجہ سے وہ آزاد تھے کہ کسی دوسرے آدمی کے پاس کام کر سکیں۔ انہوں نے فرانس میں میرے لئے بچھیروں کو خریدنا اور ان کو سدھانا شروع کیا۔ انگلستان میں مسٹر لیمبٹن (MR. LAMBTON) نے خریدنے کا اور مسٹر ڈاسن نے (MR. DAWSON) سدھانے کا کام شروع کیا۔ پھر میں نے خود ان بچھیروں کی نسل کا مطالعہ شروع کیا جو ڈوول (DEAUVILLE) اور ڈونکاسٹر (DONCASTER) میں فروخت کے لئے آتے تھے۔ ڈونکاسٹر کے بچھیروں میں میں نے خاص طور پر ایک بچھیرے کا انتخاب کیا جو ان گھوڑیوں میں سے ہوا جس پر میں نے اپنے اصطبل کی بنیاد رکھی۔ اس بچھیری کا نام میں نے ٹیریسینا (TERESINA) رکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسی گھوڑے سے جس کا نام ٹریسری (TRACERY) تھا ایک دوسرے بچے کا انتخاب کیا۔ میں نے لیمبٹن (LAMBTON) کو تار دیا اور ڈاسن (DAWSON) کو بہت جلد ضروری خط لکھا کہ اس بچھیرے کو فوراً خرید کر لیں۔ یہ بچھیرا وہی تھا جس کا نام پیپرس (PAPYRUS) ہوا اور جس نے ۱۹۲۳ء میں ڈربی کی دوڑ جیتی (DERBY WINNER) مسٹر لیمبٹن اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کو بہت چھوٹا اور موٹی مضبوط قسم کا جانور معلوم ہوتا تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کو کسی بچھیرے کی ساخت اور شکل پر کتنا کم بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اگر اس کی ٹانگیں درست ہیں اور وہ نہ تو اتنا بڑا ہے جیسے دیو

اور نہ اتنا چھوٹا ہے جیسے بونا۔ تو یہ کافی ہے۔ نسل کے نہایت اہم پہلو کے علاوہ میرے پاس ایک قاعدہ ہے جس کے ذریعے سے کسی بچھیرے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا آئندہ چل کر وہ بہت اونچا اور وزنی ہو جائیگا یا وہ ایک ٹٹوڑ (PONY) کے قد سے آگے نہ بڑھے گا؟ کیا اس کی ٹانگیں ایسی مضبوط معلوم ہوتی ہیں کہ وہ ٹانگوں کی سخت محنت کو برداشت کر سکے مثلاً سرپٹ دوڑ کو اور اس کے علاوہ سدھانے کی دوسری سخت مشقوں کو؟

عام پبلک گھوڑ دوڑ میں بہت دلچسپی لیتی ہے۔ ان کی نظر میں اپنی اپنی پسندیدہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ اور ان کی پسند اور ناپسند الگ الگ ہوتی ہے۔ مگر بہت کم دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ دوڑ کے گھوڑے کو سدھانے کی فن کی بنیاد کس چیز پہ ہے۔ اس کی غرض بالکل وہی ہوتی ہے جو ایک مشت زن پہلوان کے سدھانے کی ہوتی ہے۔ ایک مشت زن پہلوان کشتی لڑنے والا پہلوان یا بوجھ اٹھانے والا پہلوان ایک ہوشیاری کے ساتھ سوچ کر نکالے ہوئے اور باضابطہ طور پر مقرر کئے ہوئے پروگرام کے مطابق مختلف قسم کی اعصابی ورزش اور حرکتیں روزانہ انجام دے کر اپنے تمام جسم کو تمام رگوں اور پٹھوں کو اپنی تکلیف اٹھانے اور تکلیف دینے کی طاقت کو ترقی کے پورے اور سب سے زیادہ مکمل درجہ پر لے آتا ہے۔ جو اس دن کے لئے کار آمد ہوتی ہے جو اس کے آزمائشی اور فیصلہ کن مقابلہ کا دن ہوتا ہے

گھوڑے کے لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا نہیں ہوتا ہے کہ اُس سے محنت کرا کر اُسی قسم کی باقاعدہ اور سائنس کے ذریعہ سے مقرر کی ہوئی ورزشیں اور مشقیں کرائی جائیں جو ایک انسان پہلوان سے کرائی جاتی ہیں۔ گھوڑے کے اعصاب کو بنانے اور مضبوط کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور اس قوت کو بڑھانے کا جو ان اعصاب کے اندر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو ٹہلایا جائے۔ دوڑایا جائے۔ اور اگر ضرورت ہو تو تھوڑا سا کدایا جائے۔ بڑا سدھانے والا وہی شخص ہے جو اس بات کو جانتا ہے کہ ان ورزشوں کے ڈھنگ اور طریقہ کو کس طرح مقرر کیا جائے

جس سے اس کے گھوڑے اپنی جسمانی طاقت کے عروج پر پہنچ جائیں اور اپنی دوڑ کے سب سے زیادہ اہم موقعہ پر وہ تازہ دم قوی اور اپنی اعصابی طاقت کیساتھ جو انتہائی درجہ پر ہو پائے جائیں ۔ جس طرح پر انعامی پہلوان جو جیت جاتا ہے وہی ہوتا ہے جو اپنی اہلیت کے انتہائی عروج پر اس وقت آجاتا ہے جب وہ میڈیسن اسکوائر گارڈن (MADISON SQUARE GARDEN) اکھاڑے کے اندر قدم رکھتا ہے ۔

یورپ کی گھوڑ دوڑ کے متعلق جو باتیں مجھے تیس سال کے اندر یاد رہی ہیں یعنی ۱۹۲۲ء سے کہ جب میرے جھنڈے پہلی مرتبہ انگلستان اور فرانس کے گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں نظر آئے ۔ ۱۹۵۲ء تک ۔ وہ باتیں گھوڑوں اور آدمیوں دونوں کے متعلق اتنی مختلف قسم کی ہیں کہ اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا ۔

میرے حافظہ کے پردہ پر بڑے بڑے کھلاڑی آتے ہیں اور جاتے ہیں انگریز ۔ امریکہ والے اور فرانسیسی ۔ اپنی جداگانہ خصوصیات اور اپنی مزاج اور نقطۂ نظر کی تبدیلیوں کے ساتھ مجھے یاد آتے رہتے ہیں ۔ مثلاً مجھے فوراً مسٹر جوزف وائڈنر جو فلیڈیلفیا (MR. JOSEPH WIDENER OF PHILADELPHIA) کے رہنے والے تھے یاد آتے ہیں ۔

یہ امریکہ کے مالکان اسپ میں سے میرے بہت گہرے اور مہربان دوستوں میں سے تھے ۔ گھوڑوں کی اچھی نسل پیدا کرنے کے متعلق اُن کی رائے اور اُن کے خیالات بہت سخت تھے ۔ بالخصوص اس موضوع پر کہ گھوڑے کی اچھی نسل کے لئے مادہ کو نر کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت ہے ۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے کہا کہ چونکہ اُن کو یقین تھا کہ ماں کا اثر باپ کے اثر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے ۔ اگر وہ اپنے اس نظریہ کو انسانوں پر استعمال کریں گے تو انسانی خاندان کی نسل بہت جلد کمزور ہو جائے گی ۔ اگر ان کے نوجوان وائڈنر WIDENER لڑکیوں سے شادی نہ کریں گے ۔ کیا میرا یہ مذاق ٹھیک تھا؟ بہر حال وہ اتنے مہربان ضرور تھے کہ میری یہ بات سن کر ہنسنے لگے ۔

میرے دوست لارڈ ویورٹری (LORD WAVERTREE) مرحوم وہ دوسرے شخص تھے جو نر گھوڑے کو کم اہمیت دیتے تھے اور مادہ گھوڑے کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ لارڈ ویورٹری درحقیقت اس معاملہ میں اُن سب سے آگے بڑھ گئے تھے جن کو میں جانتا ہوں چونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر آپ کے پاس اچھی قسم کی گھوڑیاں موجود ہیں تو اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے کہ آپ ان کو کس قسم کے گھوڑوں سے ملا کر بچہ لیتے ہیں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ کو بہترین اور سب سے زیادہ مناسب نسل لینے کی کوشش اس طرح کرنی چاہیئے کہ نر اور مادہ دونوں کا خیال رکھا جائے اور اصولی اعتبار سے اس کو آپ جتنا مکمل بنا سکتے ہیں بنایا جائے۔ یہ نسل قریبی رشتہ دار جانوروں کے ملانے اور بے رشتہ والے غیر خون کو ملانے یعنی ان دونوں طریقوں سے بنائی جائے۔ کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ آیا کوئی خاص بچھیرا اپنی ماں اور اپنے مادری مورثوں کی اکثریت کا اثر لیتا ہے یا اپنے باپ اور اپنے پدری مورثوں کی اکثریت کا اثر لیتا ہے۔ اس طرح پر دو گھوڑے جو آپس میں حقیقی بھائی بھائی ہوں۔ اگر وہ ایک ساتھ پیدا نہیں ہوئے ہیں تو یقین کے ساتھ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے اندر ایک سی یا مختلف قسم کی خصوصیات ہوں گی۔ اُن میں سے ایک اپنے باپ کے پدری مورثوں کی خصوصیات ظاہر کرے گا اور ایک بہت بڑا گھوڑا ثابت ہوگا۔ اور دوسرا اپنی ماں کے مادری مورثوں کی خصوصیات کو ظاہر کرے گا اور ایک کمزور گھوڑا ہوگا اس کے خلاف یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے دونوں یا اُن میں سے ایک کے اندر باپ یا ماں کے مادری مورثوں کا اثر پایا جائے اور وہ ناکامیاب ثابت ہوں۔ اس طرح بہت زیادہ مطالعہ کرنے کے بعد کافی غور و فکر کرکے اور کافی تجربہ کی ناپ تول کرکے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجھ کو یہ بات صرف اتفاق پر چھوڑ دینی چاہیئے۔ چونکہ پہلے یہ کہدینا قطعی ناممکن ہے کہ فلاں گھوڑا جس کے اندر دنیا کا بہترین خون موجود ہے۔ آئندہ چل کر کسی کام کا ہوگا یا نہیں اور یہ بات اس وقت بھی صحیح رہے گی جب اُس کے خاص بھائی یا بہن نے کسی قسم کا کام کیا ہو۔

میں نے مسٹر لیمبٹن (MR. LAMBTON) کو مشورہ دیا کہ وہ چند بہترین گھوڑیاں خرید کر لیں اور انہوں نے خود بھی بعض عمدہ گھوڑیاں منتخب کیں مثلاً ممتاز محل اور قوس (COS) انہوں نے دو نہایت اچھے بچھیروں کا انتخاب بھی کیا۔ یعنی ڈایوفن (DIOPHON) اور سالمن ٹراوٹ کا (SALMON TROUT) مجھے یقین ہے کہ میری فوری کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ میں نے یورپ میں اپنی گھوڑ دوڑ کی زندگی دو سب سے بڑے سدھانے والوں کے ساتھ شروع کی جو دنیا کے سب سے زیادہ مشہور سدھانے والوں میں سے تھے اور جنہوں نے میرے گھوڑوں کی نگرانی کا کام کیا۔ وہ ولیم ڈیوک (WILLIAM DUKE) اور رچارڈ ڈاسن (RICHARD DAWSON) تھے۔

ایسے قابل سدھانے والے جیسے کہ رچارڈ ڈاسن تھے۔ آجکل بھی بلاشبہ موجود ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس میں ان کی برابر اعلیٰ قسم کی دلیری ہو۔ اگر وہ اٹلی کا میڈیم ٹیسیو (MADAMETESIO) نہیں ہے۔ ڈاسن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی قربانی اس غرض کے لئے کر بیٹھتے تھے کہ ان کا گھوڑا اپنی زندگی کے سب سے زیادہ اہم موقعہ پر اپنی بہترین حالت میں ثابت ہو اور اس کے اعصاب پوری طرح پر ترقی پا گئے ہوں۔ جو کچھ میں آجکل سنتا رہتا ہوں اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قاعدے جو انگلستان اور فرانس کے اکثر سدھانے والوں میں رواج پا گئے ہیں پہلے کی نسبت بہت زیادہ نرم ہیں۔ عام طور پر آجکل کے سدھانے والے اپنے گھوڑوں سے وہ کام نہیں لیتے اور ان کو اس سے زیادہ آرام پہنچاتے ہیں جو ڈاسن (DAWSON) اور ڈیوک (DUKE) کیا کرتے تھے یا اس بارہ میں وہ آدمی کیا کرتا تھا جس کو میں سب سے بڑا سدھانے والا شمار کرتا ہوں یعنی فرینک بٹرس (FRANKBUTTERS)۔

آجکل محنت سے بچنا بہت پایا جاتا ہے اور آجکل بہت ہلکا اور پھس پھسا کام کرنے کی عادت ہے۔ اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا ہے کہ تقریباً سب سدھانے والے

موجودہ فیشن ایبل خیالات کی تائید کرتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر اُن میں سے کوئی شخص پرانے زمانہ کے سخت آدمیوں کے مقابلہ میں آتا یا میڈم ٹیسیو کے (MADAMETESIO) مقابلہ میں آتا تو وہ بہت بری طرح اپنا اظہار کرتا اور بری طرح ناکامیاب ہوتا۔ اس کی وجہ جو بیان کی جاتی ہے بلاشبہ یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں بہت سے گھوڑے سدھانے کے عمل میں تھک کر بیکار ہو جاتے تھے۔ مجھے لوگوں نے بتایا ہے کہ جپلن (GIPLIN) نے جو پُرانے زمانہ کے سب سے بڑے سدھانے والوں میں سے تھا۔ اپنی اس بچھیری کو ڈربی کی دوڑ سے کچھ دن پہلے تھکا کر بیکار کر دیا تھا جس سے اُس کو ڈربی کی دوڑ جیتنے کی امید تھی۔ جپلن اس واقعہ سے بالکل بھی پریشان نہ ہوا۔ اس نے مالک سے معافی بھی نہ مانگی۔ بلکہ اُس نے کہا کہ اگر وہ اس بچھیری سے سرپٹ دوڑ کا کام نہ لیتا جس کی وجہ سے وہ تھک کر بیکار ہوگئی تو وہ کبھی ڈربی کی دوڑ نہ جیت سکتی۔ اور یہ کہ اس کا فرض تھا کہ وہ جیتنے کے لئے ہر موقعہ کو استعمال کرے۔ بجائے اس کے کہ ناکافی تیاری کی وجہ سے شکست کو یقینی بنالے۔

۱۹۳۱ء سے آئندہ سالوں تک میری یہ خوش قسمتی رہی کہ میرے گھوڑوں کو سدھانے کے لئے میرے نہایت عزیز دوست مسٹر فرینک بٹرس (MR.FRANKBUTTERS) میرے پاس رہے جن سے میرے خاندان کے سب آدمی بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ مسٹر بٹرس (MR.BUTTERS) دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ کامیاب سدھانے والوں میں سے تھے۔ وہ بہت زیادہ دلخوش آدمیوں میں سے تھے جن سے ملنے کا کسی کو اتفاق ہو سکتا ہو اور ان کی فطرت ایسی پاک اور صاف تھی جیسے کہ ہیرا۔ مگر بغیر اس کی سختی کے۔ انہوں نے اپنی زندگی اسٹریا اور ہنگری میں شروع کی (AUSTRIAANDHUNGARY) اور فوراً اپنے پیشہ کے انتہائی عروج پر پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ اٹلی (ITALY) منتقل ہو گئے اور وہاں پر بھی بہت جلد چوٹی پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے لارڈ ڈربی (LORDDERBY) کے اصطبل کا انتظام

اور ایسے گھوڑوں کے ساتھ جیسے فیروے (FAIRWAY) وغیرہ وہ برطانیہ میں برسوں تک مشہور سدھانے والے رہے اور انہوں نے اپنے آقا کو وہاں کا مشہور اور سربرآوردہ گھوڑوں کا مالک بنا دیا۔ جب انہوں نے لارڈ ڈربی (LORD DERBY) کو چھوڑ دیا اور میرے پاس آگئے تو بہت جلد کایا پلٹ ہوگئی اور میں پھر ایک سربرآوردہ مالک اور گھوڑوں کی اچھی نسل پیدا کرنے والے کی حیثیت سے سب سے آگے ہوگیا۔ میرے لئے انہوں نے شاندار گھوڑوں کا ایک سلسلہ یکے بعد دیگرے سدھایا۔ مثلاً بہرام۔ محمود۔ تہران اور فردوسی اور ان کے علاوہ بہت سے اعلےٰ قسم کے دو سالہ بچے۔ بڑے گھوڑوں کے ساتھ کامیاب ہونے کے علاوہ اُن کے اندر زیادہ تعجب خیز چیز اُن کا وہ طریقہ تھا جو وہ بالکل معمولی گھوڑوں کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اُن کے اندر یہ تعجب خیز اہلیت تھی کہ وہ ہر گھوڑے سے وہ کام لے سکتے تھے جو وہ اپنی بہترین حالت میں دے سکتا تھا۔

بعض باتوں میں بٹرس (BUTTERS) اور ڈیوک (DUKE) ایک سے تھے۔ خاص طور پر اس معاملہ میں کہ اُن میں سے کوئی بھی اُن بچھیروں کی مفصل ظاہری صورت کو جو اُن کے سامنے آتے تھے وہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ جو بہت سے سدھانے والے دیتے ہیں۔ مسٹر ڈیوک (MR-DUKE) کی یہ عادت تھی کہ وہ اُن لوگوں کی بہت زیادہ ہنسی اُڑاتے تھے جو بچھیروں کا انتخاب اُن کی ظاہری صورت۔ ساخت اور شکل پر کرتے تھے اُن کی رائے یہ تھی کہ ہر بچھیرا ایسا ہی اچھا ہے جیسا کہ دوسرا۔ بشرطیکہ اُس کو مناسب طریقہ پر سدھایا جائے اور اُس کے اندر تندرستی اور اعصابی قوت کی قدرتی خصوصیات موجود ہیں اور سب سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ اس میں آرام کرنے اور سونے کی اہلیت پائی جائے۔ جب انہوں نے میرے لئے بچھیرے خرید کئے تو انہوں نے یہ زحمت کبھی گوارا نہ کی کہ ان کی مفصل جانچ پرتال کریں۔ دراصل مجھے اس میں بھی شبہ ہے کہ کبھی انہوں نے ان کے متعلق دوبارہ خیال کیا۔ جب کبھی نیلام ہوا کرتا تھا اور وہ اس بچھیرے کو خریدنے میں ناکامیاب رہتے تھے جس کی بولی انہوں نے بولی تھی تو وہ کبھی ناامید نہ ہوتے تھے بلکہ ہنس کر اس کو ٹال دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ دوسرا بچھیرا غالباً اس سے زیادہ بہتر ہوگا

اُن کے نزدیک یہ بات ایسی تھی جیسے کہ کسی ٹوپی کے اندر ہندسوں کو رکھ دیا جائے اور پھر اُن میں سے کسی ہندسہ کو باہر نکال لیا جائے۔ اور وہ ہندسہ قدرتی طور پر جمع کا ہندسہ ہی نکلے۔ گویا ان کو اپنے سدھانے کے طریقوں پر مکمل اور قطعی بھروسہ تھا۔ ان کو دراصل اپنے اوپر بھروسہ تھا۔ اُن بچھیروں پر نہ تھا جن کو وہ سدھاتے تھے۔ اس زمانہ سے بہت پہلے جب وٹمن (VITAMINS) کا اور گھوڑے کی صحت اور اعصابی قوتوں کو قائم رکھنے کے دوسرے قدرتی طریقوں کا استعمال عام طور پر رائج ہوا۔ وہ ان سب چیزوں کو استعمال کرتے تھے۔ ڈیوک (DUKE) ایسے آدمی تھے جن کے دشمن بہت زیادہ تھے ان کی دشمنی کا سبب حسد تھا۔ وہ لوگ جن کے قیمتی بچھیرے اُن بچھیروں سے شکست کھا جاتے تھے جو ڈیوک (DUKE) نے کم قیمت میں چھانٹ لئے تھے یہ کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے گھوڑوں کو نشہ والی دوائیں کھلاتے ہیں۔ یہ بات سچ سے بہت دور اور بالکل غلط ہے۔ وہ یہ سنکر ہنسا کرتے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ اُن کی دوا یہ تھی کہ اول قسم کا کھانا بہت کافی تازہ اور عمدہ گھاس تازہ وٹمن (VITAMIN) تازہ ہوا کی کافی مقدار گھوڑے کو دی جائے اور ہر گھوڑے سے سخت محنت کا کام لیا جائے۔

اس زمانہ میں فرانس کی وہ زمینیں جہاں گھوڑے سدھائے جاتے تھے بہت خراب تھیں۔ گو اب مجھ سے لوگوں نے کہا ہے کہ حال میں ان کی حالت بہت بہتر ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے ڈیوک (DUKE) اپنے گھوڑوں کو کم و بیش گھوڑ دوڑ کے میدان میں سدھایا کرتے تھے۔ اُن کا ایک بہت اچھا قاعدہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اُن ملکوں میں جہاں سدھانے کی زمینیں خراب تھیں۔ پبلک کو کسی گھوڑے کا اندازہ لگانے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ جب تک وہ ایک مرتبہ اپنی اصلی حالت ظاہر کر چکا ہو اس کے بعد اگر اس میں کوئی ظاہری بدلی ہوئی کیفیت پائی جاتی تھی تو اس کو پبلک پسند نہیں کرتی تھی۔ اچھے سدھانے والے کو چاہیئے کہ وہ ایسے گھوڑے کو نہ رکھے جو اس طرح دوڑے بلکہ اس کو اصطبل سے باہر نکال دے۔ گھوڑے کو چاہیئے کہ وہ اپنی حالت میں ایک سا رہے جب کہ وہ اس کو ایک مرتبہ

ظاہر کر چکا ہے۔ مگر پبلک کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی سدھانے والے سے یا مالک سے یہ امید رکھیں کہ وہ اپنے گھوڑے کو خراب زمینوں پر سدھا کر درست کر لے۔ اس کے برخلاف فرینک بٹرس (FRANK BUTTERS) کو اپنے گھوڑوں کو تیار کرنے کے لئے دوڑ کرانے کی ضرورت کبھی نہ ہوتی تھی۔ اگر ان کے دوسالہ بچے اس قابل تھے کہ وہ جیت سکیں تو وہ ہمیشہ پہلی مرتبہ جب وہ دوڑتے تھے جیت جاتے تھے۔ مثلاً اُس مشہور گھوڑے بہرام نے ڈربی کی دوڑ جیتنے سے پہلے صرف ایک دوڑ دوڑ دوڑی تھی۔ یعنی دو ہزار گنی والی۔ اور وہ اسی طرح اس میں دوڑا جس طرح کہ وہ ڈربی میں دوڑا۔ اُس کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ دو یا تین مرتبہ اس کی آنکھیں کھولی جائیں۔

مجھ سے اکثر دریافت کیا گیا کہ میں کون سے گھوڑے کو جو میں نے پیدا کیا سب سے بڑا گھوڑا سمجھتا ہوں۔ جب تک تلیار (TULYAR) میدان میں نہ آیا تھا میں بلا تامل کہہ دیتا کہ وہ گھوڑا بہرام تھا۔ مگر تلیار نے ایسی اہلیت دکھائی کہ وہ ہمیشہ کافی کام کر جاتا تھا اس وجہ سے یہ مشکل ہے کہ اس کی خصوصیات کا اندازہ بہرام کے مقابلہ میں کیا جا سکے بہرام غالباً اُن گھوڑوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ گھوڑا تھا جو میں اب تک دیکھ چکا ہوں شروع ہی سے وہ سردار معلوم ہوتا تھا اور سردار کی طرح کام کرتا تھا۔ تلیار (TULYAR) دوڑتے وقت شکاری کتا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنی جوانی کے زمانے میں اس مشہور فلائنگ فوکس (FLYING FOX) کو دیکھا جس کی عمر اُس وقت دو اور تین سال کی تھی۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ تلیار کی مانند وہ اس طرح دوڑتا تھا کہ اس کا سر اس کے جسم کی برابر ایک لائن میں رہتا تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی نیچے رہتا تھا عام طور پر ہر گھوڑا اس طرح دوڑتا ہے کہ اس کا سر اُس کے جسم سے کچھ بلندی پر رہتا ہے اور بعض اس طرح دوڑتے ہیں کہ ان کے سر کافی اوپر رہتے ہیں مگر تلیار (TULYAR) اور فلائنگ فوکس (FLYING FOX) صرف ایسے دو گھوڑے ہوئے ہیں ان گھوڑوں میں سے جن کو میں نے دیکھا ہے۔ جو اس قاعدہ کی مستثنیات میں سے ہیں مگر موجودہ لارڈ روزبری

(LORD ROSEBERY) نے جو انگلستان کی گھوڑ دوڑ میں بڑی شخصیت رکھتے ہیں (اور جن کے متعلق یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ سب جگہ پھیلی ہوئی ہے کہ وہ اپنی گھوڑ دوڑ کے انتظام میں زیادہ دلچسپی کے ساتھ حصہ نہیں لیتے ہیں) مجھے بتایا کہ وہ مشہور گھوڑا ایکلپس (ECLIPSE) جو دنیا کے تقریباً سب اچھے گھوڑوں کا مورث شمار کیا جاتا ہے اس طرح دوڑتا تھا کہ اس کا سر بالکل نیچے پڑا ہوا ہوتا تھا اور وہ تقریباً ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمین کو سونگھ رہا ہے۔ تلیار (TULYAR) گولی کی طرح دوڑ لگاتا ہے اور تیر کی طرح سیدھا چلا جاتا ہے۔ ہم کو بہر حال یہ واقعہ نہ بھولنا چاہیئے کہ تلیار (TULYAR) بہرام کے خلاف دوڑ کا بڑا گھوڑا ہونے کی حیثیت سے بہت چھوٹے قد کا گھوڑا شمار کیا جاتا ہے۔ بہرام موجودہ زمانہ میں ڈربی کی دوڑ جیتنے والے گھوڑوں میں سب سے اونچا گھوڑا تھا اور تلیار غالباً ان میں سب سے نیچا اور چھوٹے قد کا ہے۔ اور ہم اس پرانے مقولہ سے باہر نہیں جا سکتے کہ "اچھی چیز جو بڑی ہو اس اچھی چیز سے بہتر ہے۔ جو چھوٹی ہو۔

مجھے بہر حال اس کا یقین نہیں ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی دوسرا پہلو نہیں ہے۔ بہت سے صحیح رائے رکھنے والے اور پرکھنے والے آدمیوں نے جیسے کہ فرینک بٹرس (FRANK BUTTERS) اور کیپٹن گریر مرحوم نے (CAPTAIN QREER) مجھے بتایا کہ انگلستان کے گھوڑوں کی نسل پیدا کرنے والے قد اور ہڈی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور یہ کہ ہم کو سانڈ گھوڑے کو کم دوڑانے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے اندر طاقت کا وہ ذخیرہ جمع رکھا جا سکے جو چھوٹے قد کے آدمیوں اور جانوروں میں اکثر پایا جاتا ہے میرا خیال ہے کہ اس میں بہت کچھ اصلیت ہے اور اس وجہ سے مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہوتی ہے کہ تلیار (TULYAR) آئرلینڈ (RELAND) میں آئندہ نسلوں پر اثر ڈالتا رہے گا اور اس بات کو روکے گا کہ قد اور ہڈی پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے۔ ہم میں سے بہت لوگوں کو امید تھی کہ ڈربی دوڑ جیتنے والا "منا" (MANNA) بھی جو ایک چھوٹے قد کا گھوڑا تھا اس بات میں مدد دے گا کہ قد کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے

مگر بدقسمتی سے منا نسبتاً ناکامیاب رہا۔ وہ مشہد ہاپیرین بھی (HYPERION) درصل ایک چھوٹے قد کا گھوڑا تھا اور وہ سب زمانہ کے سب سے بڑے سانڈ گھوڑوں میں سے تھا۔ مگر ہم کو اس قسم کے ایک سے زیادہ ہاپیرین (HYPERION) گھوڑوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر ہم اس موجودہ روش کے خلاف کامیابی حاصل کرنا چاہیں کہ مضبوطی اور اعصابی طاقت کو گھوڑے کے رگ پٹھوں اور ہڈیوں پر قربان کر دینا چاہیئے (یعنی اس رائے کی تردید کے لئے کہ گھوڑے کی قوت کو اس کے قد اور ساخت کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔)

اس طرح پر اپنے گذشتہ زمانہ کو دیکھتے ہوئے اور اپنی گھوڑوں کی ملکیت ان کی اچھی نسل پیدا کرنا اور ان کے دوڑانے کی باتوں کو یاد کرتے ہوئے میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں اپنی کامیابیوں۔ اپنے انعامات۔ اپنے اچھے گھوڑوں کی فروخت وغیرہ کے متعلق تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ جن لوگوں کو اس قسم کی معلومات کی ضرورت ہے تو وہ بہت اچھی طرح پر اس کتاب میں درج ہے جس کا نام "رفس گائڈ ٹو دی ٹرف" (RUFFSGUIDETOTHETURF) ہے۔ مجھے جو باتیں یاد ہیں وہ گذشتہ پچاس سال سے زائد عرصہ کی باتیں ہیں وہ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ سے شروع ہوتی ہیں اور وہ ان جوکیوں (JOCKEY) گھوڑوں کے مالکوں اور گھوڑوں کے سدھانے والوں کے متعلق ہیں جو عرصہ ہوا مر چکے ہیں اور سواری کے ان قاعدوں کے متعلق ہیں جو اب بالکل بھولے جا چکے ہیں سوائے اس کے کہ ان کا ذکر پرانی کتابوں اور تصویروں میں پایا جائے۔ مثلاً وہ پہلے ڈیوک آف ویسٹمنسٹر (DUKEOFWESTMINISTER) تھے جو دیکھنے میں بہت مہربان اور شریف معلوم ہوتے تھے مگر ان کے اندر تیز مزاجی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ جب مسٹر گلیڈ اسٹون نے (MR. GLADSTONE) جو بہت سال پہلے ان کو ڈیوک کا رتبہ دے چکے تھے۔ آئر لینڈ کی خود مختار حکومت کی حمایت کرنے کا اعلان کیا (IRISH HOMERULE) تو ان ڈیوک نے بری طرح پر مسٹر گلیڈ اسٹون کی تصویر کو اپنے گھر سے باہر نکال کر پھینک دیا اور اس کو عام نیلام کے لئے بھیج دیا۔ وہ چھوٹے

قد کے آدمی تھے اور ہلکے جسم کے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ اکثر اپنے بہترین گھوڑوں پر اُن کی جانچ کرنے کے لئے خود سوار ہوا کرتے تھے۔ اُن کے اندر لباس کے متعلق ایک خاص وہم تھا۔ وہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ خواہ کوئی موقعہ ہو مورننگ کوٹ یا فراک کوٹ کے ساتھ نیلی قمیص۔ نیلا کالر اور نیلی ٹائی پہنا کرتے تھے۔

ایک دن ڈیوک آف ویسٹ منسٹر (DUKE OF WESTMINISTER) اپنے اصطبلوں میں گئے اور وہاں پر ایک گھوڑے نے جس کا نام ویمپائر (VAMPIRE) تھا اُن پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے فوراً حکم دیا کہ ویمپائر کو ہلاک کر دیا جائے۔ اُن سے التجا کی گئی کہ وہ اس گھوڑی کو معاف کر دیں اور آخر کار وہ اس کے لئے رضامند ہو گئے دو تین سال بعد اس گھوڑی نے ان کو وہ مشہور گھوڑا دیا جس کا نام دی بیٹ (THE BAT) تھا اور اس کے بعد وہ مشہور گھوڑا دیا جس کا نام فلائنگ فوکس (PLYINGFOX) تھا۔

ایک اور ڈیوک آف پورٹ لینڈ (DUKE OF PORTLAND) تھے جن کو میں بعد کے سالوں میں بہت اچھی طرح جان گیا۔ ۱۹۳۵ء کی ڈربی دوڑ کے بعد انہوں نے مجھے ان سب چیزوں کو بتایا جو ان کے بڑے گھوڑے سینٹ سائمن (ST-SIMON) اور میرے بڑے گھوڑے بہرام (BAHRAM) میں ملتی جلتی تھیں۔

ایک اور صاحب مسٹر جے۔ بی بلنڈل (SIR J. B. BLUNDELL) تھے۔ جو میرے دوست بیرن ایکارڈ سٹین (BARON VON ECKARDSTEIN) کے خسر تھے وہ قد کے اونچے۔ بلند آواز والے۔ خود پر بھروسہ کرنے والے بلکہ شاید مطمئن طبیعت والے یقینی طور پر خود ترقی کئے ہوئے آدمی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک نہایت نرم دل اور فیاض آدمی تھے۔ بہرحال ٹوٹینہم کورٹ سٹرک (TOTTENHAM COURT ROAD) پر ایک فرنیچر اسٹور (FURNITURE STORE) کے بانی اور مالک ہونے کی حیثیت سے اُن کو اعلیٰ زمیندار طبقہ کا وہ چھوٹا سا سازشی گروہ اچھا نہیں سمجھتا تھا جو ان دنوں میں جوکی کلب (JOCKEY CLUB) پر حکومت کر رہا تھا۔ اکثر بار بار انہوں نے ڈیوک کو کلب کا ممبر نہ ہونے دیا اور ان کی ووٹوں کو رد کر دیا۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ ان ڈیوک کا

انتقال ہونے والا تھا۔ اس پر سب کو بہت افسوس ہوا اور اس کے بعد فوراً ان کو جوکی کلب کا ممبر منتخب کرلیا۔

دو اور صاحب تھے یعنی ریوبن اور آرتھر سیسون (REUBEN AND ARTHUR SASSOON) جو آپس میں بھائی بھائی تھے۔ یہ دونوں نہایت مہربان پرانے لوگوں میں تھے جن سے میری ملاقات ہوئی۔ نہایت فیاض اور شریف۔ اُن میں کسی قسم کی بناوٹ یا شان پرستی نہ پائی جاتی تھی۔ وہ بڑی سے بڑی سوسائٹی میں بہت زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ اور وہ دونوں شاہ ایڈورڈ (EDWARD) کے گہرے ذاتی دوستوں میں تھے۔ مجھے ہمیشہ سے یہ بات معلوم ہے کہ وہ شاہ ایڈورڈ کے لئے گھوڑ دوڑ کے میلوں میں ان کی طرف سے معمولی بازی لگایا کرتے تھے۔ ان کی بازی پچیس سے پچاس پونڈ تک کی ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ دونوں بھائی اس بازی کو ایسی احتیاط، محنت اور گہری تحقیقات کے بعد لگایا کرتے تھے جیسی کہ وہ ہزاروں پاؤنڈ کی بازی ہو۔

سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ میں گھور دوڑ کے متعلق جو بڑا واقعہ دراصل پیش آیا وہ سواری کے طریقہ میں وہ انقلاب تھا جو امریکہ سے شروع ہوا۔ لارڈ ولیم بیرسفورڈ (LORD WILLIAM BERESFORD) اپنے ہمراہ ٹوڈ سلون (TOD SLOAN) کو لائے جو اپنے امریکی طریقہ پر سواری کرتا تھا۔ گھوڑوں کے سب مشہور مالکوں نے مثلاً ڈیوک آف ویسٹ منسٹر (DUKE OF WESTMINISTER) اور پورٹ لینڈ نے شروع شروع میں اس کی ہنسی اڑائی۔ مگر اس نے ہر شخص کی ترکیب کو خاک میں ملا دیا۔ ہر دوڑ سلون (SLOAN) اور اس کے امریکی ساتھیوں نے جیت لی جو انگلستان اور فرانس دونوں پر چھا گئے۔ پرانے فیشن کے سردار جو اتنے زیادہ بوڑھے ہوگئے تھے یا اتنے زیادہ سخت تھے کہ زمانہ اور انقلاب کے ساتھ ساتھ چل سکیں اپنا کام چھوڑ کر بیٹھ رہے اور بالکل ریٹائرڈ ہوگئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد گھوڑوں کو نشہ والی دوائیں دینے کا رواج جاری ہوگیا اور یہ بھی بحر اوقیانوس کے اُس پار یعنی امریکہ سے ہی آیا۔ اس سے بھی ہر شخص کو پریشانی ہوئی اور اس میں کئی سال لگ گئے کہ اس رواج کو انگلستان اور فرانس میں

قطعی طور پر قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور اس کے ملزموں کو سختی کے ساتھ سزا دلائی جائے۔ امریکہ کے طریقہ پر سواری کرنا۔ بہرحال بالکل دوسری چیز تھی۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہوگئی اور اس کے بعد کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ گھوڑ دوڑ میں وہ پرانا فوجی سواروں کی طرح بیٹھنے کا طریقہ پھر استعمال کریں۔ جس میں بالکل سیدھی نشست ہوتی ہے اپنے طریقہ پر گھوڑ دوڑ کے معاملہ میں یہ انقلاب ایسا بڑا تھا جیسا کہ بارود کی ایجاد جنگ کے میدان میں۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اس کے نتائج یہ ہوئے کہ گذشتہ حالات میں بے انتہا ترقی ہوگئی۔ مگر حسنیات اور خوش پرستی کے اعتبار سے یہ کہنا پڑے گا کہ پرانے طریقہ کی نشست کو چھوڑنا جس سے سوار اور گھوڑا دونوں میں ایک قسم کی شان اور نزاکت پائی جاتی تھی۔ بڑے نقصان کی بات ہے۔

مجھ سے اکثر یہ سوال کیا گیا ہے کہ آجکل کے بہترین گھوڑے پرانے زمانہ کے بہترین گھوڑوں کے مقابلہ میں کیسے رہتے ہیں۔ یعنی ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی زمانہ کے گھوڑوں اور اس صدی کے ابتدائی سالوں کے گھوڑوں کے معاملہ میں کیا آجکل کے گھوڑے دراصل اپنے پہلے گھوڑوں سے بہت زیادہ بہتر ہیں؟ ذاتی طور پر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں بہت ترقی ہو چکی ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو گھوڑ دوڑ کا فن جس کے اندر بے شمار اور مفصل طریقے اچھی نسل پیدا کرنے اور گھوڑوں کا انتخاب کرنے کے موجود ہیں ایک بیکار اور وقت ضائع کرنے والی چیز ہو کر رہ جاتا۔ گھوڑے اور گھوڑی کو ملانے میں انتخاب کرنے کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی نسل کو مسلسل طریقہ پر بہتر بنایا جائے۔ جس میں عارضی انتخاب قدرتی انتخاب کی مدد کرے۔ ہم لوگ جو دوڑ کے گھوڑوں کی نسل پیدا کرتے ہیں اس کا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ان دونوں کا اجتماع (یعنی عارضی اور قدرتی طریق انتخاب کا) اگر ہوشیاری اور سائنس کے اصول پر کر لیا جائے تو وہ نسلی خصوصیات اور اوصاف کے اندر مستقل اور نمایاں ترقی پیدا کر سکتا ہے اور ضرور پیدا کرتا ہے۔ وقت نے اس بات کی جانچ کر لی ہے صرف بڑی بڑی

دوڑوں میں نہیں بلکہ معمولی دوڑوں میں بھی اور یہ جانچ عرصہ تک صفتوں کو مقابلہ کے لئے تقسیم کرنے کے بعد۔ مثلاً ۱۹۱۴ء میں اور موجودہ دن میں کی جا چکی ہے۔ اس طرح پر نقشے بنا کر جانچ کرنے کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ آجکل کے گھوڑے پہلے گھوڑوں کی نسبت زیادہ تیز دوڑنے لگے ہیں۔ مستثنیٰ گھوڑوں کو چھوڑ کر تیزئ رفتار کا اوسط اندازہ سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔

ہم سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ پچھلے زمانہ کے گھوڑے سرپٹ دوڑ اس سے دوگنے اور تین گنے فاصلہ کی دوڑ سکتے تھے۔ جتنا کہ آجکل معمولاً دوڑی جاتی ہے۔ ہندوستان کے محکمۂ مویشیان نے بھی اپنے بعض خبطی قسم کے آدمیوں کو پیش کیا۔ جن کا یہ خیال تھا کہ معمولی ہندوستانی گھوڑا یعنی کیٹی (KATTY) اچھی نسل کے گھوڑے سے بہتر ہے چونکہ وہ بغیر رکے ہوئے ایک سی رفتار سے میلوں ہوئے ہولے بھاگے چلا جا سکتا ہے۔ اس میں کیا رکھا ہے۔ ہم نے گھوڑوں کی نسل رفتار کی تیزی کے لئے پیدا کی ہے۔ اور ان بیوقوف اور خبطی آدمیوں کے لئے یقینی طور پر یہ جواب کافی ہے کہ انگلستان کا اچھی نسل کا گھوڑا اسلئے نہیں ہوتا کہ وہ چھ یا سات میل سرپٹ دوڑ لگانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ یا یہ کہ وہ سارے دن چلایا جائے۔ وہ صرف چند فرلانگ پوری تیز رفتار سے دوڑ سکتا ہے اور پھر لیٹ کر آرام کرے گا اور سو جائے گا (ہندوستانی کیٹی (KATTY) گھوڑے کو قدم قدم چلنے دو۔) اس مختصر اور تیز دوڑ میں اس انگلش گھوڑے نے وہ سب کام کر لیا ہے جو دوسرا گھوڑا کر سکتا تھا۔ مگر اس میں اس کے جسم اور قوت پر وہ طویل اور سخت محنت نہیں پڑی ہے۔ فاصلہ کتنا ہی ہو۔ زیادہ یا کم۔ اچھی نسل والا گھوڑا سست گھوڑے کو ضرور شکست دے دے گا۔ چونکہ اس کے اندر وہ مزید قوت ہے جس سے وہ ضروری محنت لی جا سکتی ہے۔ دوڑ کا گھوڑا ایک خاص مقررہ مقصد کے لئے پیدا کیا جاتا ہے اور وہ اس مقصد کو

بہت اچھی طرح پر پورا کرتا ہے۔ نسل کشی اور انتخاب کے متعلق اصلی واقعات تمام نظریات کی تائید کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ (اور یہ بات مجھے ایسی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے تردید کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے) انگلستان کے اچھی نسل والے دوڑ کے گھوڑے کی خصوصیت میں ایک مستقل اور مسلسل ترقی ہوئی ہے۔

باب نمبر ۱۱

ہندوستان میں خود مختار حکومت کے آثار

سنہ ۱۹۲۲ء کے آخر سے آئندہ چند سالوں تک میں نے قومی زندگی میں بہت کم حصہ لیا۔ ان سالوں میں ہندوستان کے اندر قومی جذبات کی شدت برابر بڑھتی رہی۔ کانگریس کے اندر مہاتما گاندھی کی ذاتی لیڈری اور ان کے اختیارات زیادہ ہوتے چلے گئے۔ دونوں نہرو۔ باپ اور بیٹے۔ اور ولابھائی پٹیل (VALLABHAIPATEL) صرف ایسے لیڈر تھے جو رتبہ کے اعتبار سے گاندھی کے لگ بھگ تھے۔ ملک میں بعض وقت سخت مخالفت ہوتی تھی۔ اور اس کو ناخوشگواری کے ساتھ دبایا جاتا تھا اور کبھی مقابلتاً امن اور سکون ہو جاتا تھا۔ مسلمانوں میں یہ احساس برابر قوی ہوتا گیا کہ ان کو لازمی طور پر اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنا چاہیئے۔ لارڈ چیمسفورڈ (LORD CHELMSFORD) کے بعد لارڈ ریڈنگ (LORDREADING) وائسرائے مقرر ہوئے اور لارڈ ریڈنگ کے بعد لارڈ اروِن (LORDIRWIN) جو ایڈورڈ ووڈ (EDWARDWOOD) کے نام سے مسٹر بالڈون (MR. BALDWIN) کی پہلی گورنمنٹ میں وزیر رہ چکے تھے۔ وہ بے انتہا پرخلوص سنجیدہ مزاج والے اور گہرے مذہبی عقیدہ کے آدمی تھے۔ برطانیہ کا یہ وعدہ کہ درجہ بدرجہ چل کر حکومت خود اختیاری دی جائے گی۔ ابھی تک ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کے درمیان بہ حیثیت ایک قطعی اور آخری فیصلہ کے

قائم تھا۔ شورش برابر بڑھتی چلی جارہی تھی۔ چونکہ مختلف حکومتیں جو یکے بعد دیگرے برسر اقتدار ہوتی تھیں وہ سب یکساں طور پر اس کے مخالف معلوم ہوتی تھیں کہ اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے ابتدائی قدم اٹھائے جائیں۔

میں بڑی دلچسپی کے ساتھ ان واقعات اور میلانات کا مطالعہ کرنے والا بن رہا تھا مگر اس سے زیادہ کچھ اور بھی کر رہا تھا یعنی میری ذاتی پرائیویٹ زندگی جس نے مجھ کو گھیر رکھا تھا بہت مصروف۔ مکمل اور پُر از واقعات ہو گئی تھی۔ میں ہر سال ہندوستان جایا کرتا تھا۔ میری بیوی جنوبی فرانس میں مقیم تھیں۔ میرا بیٹا علی جس کی بچپن کی کمزوری دور ہو چکی تھی انگلستان میں اپنے اتالیق مسٹر سی ڈبلو ویڈنگٹن (C. W. WADDINGTON)[۵] کے ساتھ رہتا تھا۔ ۲۳-۱۹۲۴ء کے موسم سرما میں میری بیوی اور بیٹا میرے ساتھ ہندوستان آئے۔ اس زمانہ میں گھوڑ دوڑ کے لئے میری دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ میری بیوی گھوڑ دوڑ میں میرے ساتھ فرانس کے اندر رہتی تھیں مگر انگلستان میں نہیں رہتی تھیں۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں وہ بیمار پڑ گئیں اور تمام سال بالکل بیکار ہو کر رہ گئیں۔ ڈاکٹروں نے سب قسم کی تشخیصیں کیں۔ بدہضمی سے لے کر "اعصابی شکایت" تک۔ سال کے آخر میں ان کو بہت تکلیف ہوئی اور اس وقت ڈاکٹروں نے آخر کار ان کی حالت پر کچھ توجہ دی اور یہ تجویز کیا کہ اپینڈی سائیٹس کا آپریشن کیا جائے۔ چنانچہ دسمبر میں اپریشن کیا گیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کو دراصل اپینڈی سائٹس کی بیماری نہ تھی۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ ان کو برابر صحت ہوتی جارہی ہے۔ مگر ایک دن دوپہر بعد میں بواس (BOIS) کی طرف گاڑی میں بیٹھ کر گیا ہوا تھا۔ جب میں شفاخانہ میں واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میری بیوی میری عدم موجودگی میں مر چکی تھیں۔ جمے ہوئے خون کا چھوٹا سا ٹکڑا جسم سے الگ ہو کر دل کے پاس تک پہنچ گیا اور اس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ اُن کی عمر اُس وقت سینتیس ۳۷ سال

---

۵ یہ پہلے میو کالج اجمیر کے پرنسپل تھے۔

کی تھی۔

اس واقعہ کو ایک سال گذر گیا۔ سنہ ۱۹۲۸ء کے شروع میں میں نے مل اینڈری کیرن (MLLE ANDREE CARRON) سے جو چیمبری ایکس لیس بینس (CHMBER, AIX-LES-BAINS) کی رہنے والی تھی۔ شادی کی تجویز پیش کی۔ میں کیرن اور ان کے خاندان کو بارہ یا چودہ سال سے جانتا تھا۔ جب وہ بالکل نوجوان لڑکی تھی۔ جب میں نے اُن سے شادی کی تجویز کی تو ان کی عمر تیئیس سال کی تھی۔ میری تجویز منظور کرنے سے پیشتر انہوں نے ایک عرصہ تک اس پر تامل کیا اور اس کے تقریباً دو سال بعد ایسا ہوا۔ یعنی دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء میں کہ ہم دونوں کی شادی۔ ایکس لے بینس (AIX-LES-BAINS) کے مقام پر ہو گئی۔ اس شادی کے متعلق ایک قابل تمسخر افسانہ پھیل گیا۔ جس کو اخبار والوں نے ایجاد کیا اور جاری کیا۔ وہ یہ تھا کہ میری ملاقات کیرن (CARRON) سے ایک چاکلیٹ کی دوکان پر ہوئی۔ جہاں میں مٹھائی خریدنے کے لئے گیا تھا اور وہ وہاں پر کاؤنٹر کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ اس بیان میں ایک لفظ بھی سچائی کا نہیں ہے۔ واقعہ اس طرح پر ہوا۔ جب ہماری مجوزہ شادی کی خبر اخبار والوں تک پہنچی تو ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ میں ایک عورت سے شادی کرنے والا تھا۔ جس کا نام چیمبری والی کیرن (CARRON OF CHAMBERY) تھا۔ اخبار کے رپورٹر چیمبری پہنچ گئے تاکہ وہاں کیرن کا پتہ لگائیں اور آخر کار وہاں پر اُن کو ایک کیرن نام کی عورت ملی۔ جو ایک مٹھائی کی دوکان پر شکر بیچ رہی تھی۔ اس کو دیکھکر اخبار والے کہنے لگے کہ کیرن (CARRON) مل گئی اور انہوں نے فوراً اپنے اپنے اخبار والوں کو ٹیلیفون کیا کہ انہوں نے اس مل کیرن کا پتہ لگا لیا ہے۔ جس سے آغا خان شادی کرنے والے ہیں۔

وہ لڑکی جو اس مٹھائی کی دوکان پر کام کر رہی تھی مجھ سے کبھی نہ ملی تھی وہ مجھ کو بالکل نہیں جانتی تھی۔ مل کیرن (MLLE. CARRON) اس سے بالکل

مختلف عورت تھی جو اپنی بہن کے ساتھ پیرس (PARIS) میں برسوں تک کپڑا سینے کی دوکان کرتی رہی تھی اور اس کو اپنی زندگی میں کبھی چاکلیٹ سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ مگر یہ افسانہ اڑ کر خوب پھیل گیا اور اس کے متعلق سچا واقعہ کبھی ظاہر نہ ہوا۔

ہماری شادی برسوں تک بہت خوشگوار اور اچھے جوڑ کی شادی ثابت ہوئی ہمارے ایک بچہ پیدا ہوا۔ یعنی میرا دوسرا بیٹا۔ صدرالدین۔ جو ۱۷ جنوری ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوا۔ میری بیوی ہر جگہ میرے ساتھ جاتی تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں انگلستان کے اندر ان کو بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ نے شرف ملاقات بخشا اور ایسکٹ (ASCOT) کے مقام پر ان کو لنچ پر مدعو کیا۔ وہ برسوں تک میری سوشل زندگی میں بہت پوری طرح اور مصروفیت کے ساتھ شریک رہیں۔

اس عرصہ میں میری سیاسی اور قومی زندگی پھر شروع ہو رہی تھی۔ لارڈ اروِن (LORD IRWIN) وائسرائے نے ایک اہم اعلان میں ہندوستانیوں پر وہ بات ظاہر کر دی تھی جو برطانوی نگاہ میں ہندوستانیوں کی دستوری ترقی کا آخری درجہ تھا۔ مگر وائسرائے نے ٹھیک ٹھیک یہ نہ بتایا کہ اس درجہ پر پہنچنے کے لئے کیا قدم اٹھائے جائیں گے یا یہ کہ اس کو حاصل کرنے کا راستہ کون سا ہے۔

لارڈ ارون (LORD IRWIN) نے کہا کہ اُن شبہات کی وجہ سے جو برطانیہ اور ہندوستان دونوں کے اندر اس کے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کا قانون پاس کرنے سے برطانوی حکومت کے جو اغراض ہیں ان کا دراصل کیا مطلب ہے مجھ کو یہ بات صاف طور پر بتا دینے کا اختیار دیا گیا ہے کہ برطانوی حکومت کے فیصلہ کے مطابق یہ بات ۱۹۱۷ء کے اعلان میں رکھ دی گئی ہے کہ ہندوستان کی دستوری ترقی کا قدرتی نتیجہ جو اس اعلان میں موجود ہے یہ ہے کہ ہندوستان کو مرتبۂ نوآبادیات دے دیا جائے۔ وہ الفاظ ڈومینین اسٹیٹس (DOMINION STATUS) یعنی مرتبۂ نوآبادیات۔ ہندوستانیوں کے ولولے اور امنگوں کا بارہ سال بلکہ اس سے زائد عرصہ تک مرکز بنے رہے اور ان کو متحد کئے رہے۔ اور اس عرصہ میں آزادی کی

طرف برابر زیادہ زور اور زیادہ کشش کے ساتھ کوشش ہوتی رہی۔ اور آخر کار اس کے نتیجہ میں ایک نہیں بلکہ دو آزاد اور خودمختار حکومتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک مسلم اور دوسری ہندو۔ یہ دوسری حکومت ایسی تھی جس نے فوراً ہی اس تعلق کے نام و نشان کو بھی دور پھینک دیا جس کا نام ڈومنین یعنی نوآبادی (DOMINION) ہے اور اس بات کا اعلان کر دیا جس کے کرنے کا اس کو دستوری حق تھا اور جس کی اس میں اہلیت تھی) کہ وہ کامن ویلتھ (COMMON WEALTH) کے اندر ایک جمہوری حکومت ہے۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں بہر حال ان سب باتوں کی کوشش کرنا ضروری تھا کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا اور اس نے اپنی اسکیم حکومت خود اختیاری اور ڈومینین اسٹیٹس (DOMINION STATUS) یعنی مرتبہ نوآبادیات کے لئے تیار کی۔ مگر وہ آخر تک کانگریس کی اس قسم کی سب اسکیموں کی طرح اس کے مہلک اور متعصب نقص کی وجہ سے خراب ہو گئی اور وہ یہ نقص تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں کے ان دعووں کو جو انہوں نے بہ حیثیت قوم اندر قوم کے کئے تھے بہت کم کر دیا تھا۔ بلکہ درحقیقت ان کو بھلا دیا تھا۔ مسلمانوں کی رائے اس وجہ سے بہت بیدار ہو گئی۔ ایک شاہی کمیشن اس وقت ہندوستان میں دورہ کر رہا تھا۔ اس قسم کا کمیشن کسی سیاسی یا دستوری مسئلہ کو طے کرنے کے لئے خواہ وہ وطن میں ہو یا وطن سے باہر۔ برطانیہ کا قدیم اور مشہور آلہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کمیشن بہت با اثر طریقوں سے اور بہت وسیع تفصیل کے ساتھ شہادتیں لے رہا تھا۔ اس کے چیرمین سر جون سائمن (SIR JOHN SIMON) تھے جو بڑے قانونی اور سیاست دان تھے اور اس وقت وہ اپنی مشہور زندگی کے تقریباً انتہائی عروج پر تھے۔ اس کمیشن کے ممبروں میں وہ ضدی قسم کے مگر ذاتی طور پر منکسر المزاج آدمی تھے۔ یعنی مسٹر کلمینٹ اٹیلی (MR. CLEMENT ATTLEE) جن کی ہندوستانی معلومات پر اس تجربہ سے بڑا گہرا اور دیر پا اثر پڑنے والا تھا۔ وائسرائے نے اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ جب سائمن کمیشن (SIMON COMMISSION) اپنی رپورٹ شائع کر دے گا تو یہ ارادہ تھا کہ گورنمنٹ کے آدمیوں برطانوی ہندوستان کے

نمائندوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کے درمیان ایک کانفرنس منعقد کرنی چاہیئے۔ تاکہ جس طریقہ پر دستوری ترقی یقینی طور پر کی جائے گی اسکے متعلق آپس میں اتفاق ہو جائے۔

اس وجہ سے یہ طے کیا گیا کہ دلی کے اندر ۱۹۲۸ء کے آخر میں ایک کل ہند مسلم کانفرنس منعقد کی جائے جس میں مسلمانوں کی یہ رائے معلوم کی جائے کہ کس طرح پر ہندوستان کی آزادی وجود میں آنی چاہیئے۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس کانفرنس کی صدارت کروں مجھے یقین ہے کہ یہ کانفرنس اس قسم کے ان سب اجتماعات کے طویل سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم کانفرنسوں میں ثابت ہوئی۔ جس نے تمام برصغیر کی مکمل اور قطعی آزادی کے لئے راستہ بتایا۔ یہ نہایت وسیع اجتماع تھا جس میں مسلمانوں کے خیالات کے سب رنگوں کی نمائندگی کی گئی تھی۔ میں اس کے اہم اور دیرپا سیاسی فیصلوں کا بانی ہونے کا دعوی کرسکتا ہوں۔ طویل مکمل اور آزاد بحثوں کے بعد ہم اس قابل ہوئے کہ بالاتفاق چند اصولوں کا مجموعہ منظور کرلیں جن کو ہم نے ایک اعلان کی صورت میں شائع کیا۔ وہ اصول حسب ذیل تھے :-

ا۔ ہندوستان کی وسیع حدود اور اس کی قومی تقسیموں کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے حالات کے مطابق جو طرز حکومت ہوسکتا ہے وہ صرف وفاقی قسم کا طریقہ ہی ہوسکتا ہے جس میں اس کے اندرونی ریاستوں کو مکمل خود اختیاری اور سب بقیہ ضروری اختیارات دے دیئے جائیں۔

۲۔ اب یہ ملک کا مسلمہ قانون ہے کہ مسلمانوں کو مختلف ہندوستانی قانون ساز جماعتوں میں اپنے نمائندوں کو انتخاب کرنے کا حق حاصل ہے اور مسلمانوں کو بغیر ان کی مرضی کے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ ان صوبوں میں جہاں مسلم اقلیت میں ہیں ان کی نمائندگی کسی صورت میں اس سے کم نہ ہوگی جو وہ موجودہ قانون کے مطابق رکھتے ہیں (یہ

وہ اصول ہے جس کو ویٹیج کہتے ہیں) (WEIGHTAGE)

۴۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کو مرکزی اور صوبائی کابینہ میں ان کا مناسب حصہ دیا جائے۔

ہم اس بات کے لئے راضی ہو گئے کہ اسی قسم کا ویٹیج (WEIGHTAGE) سندھ میں اور ان دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ہندو اقلیتوں کے لئے منظور کیا جائے۔ مگر ہم نے اس بات پر اصرار کیا کہ مسلمانوں کا مناسب تناسب سب سول ملازمتوں میں اور ان سب اداروں میں جو قانوناً خود مختار ہیں مقرر کیا جائے۔ میں نے خود اس کا مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی تعلیم۔ زبان۔ مذہب۔ ذاتی قانون اور خیراتی اداروں کے تحفظ اور ترقی کے لئے مناسب قانونی حفاظت مہیا کی جائے یہ سب وہ باتیں تھیں جن کے لئے برسوں تک میں اتنی سختی کے ساتھ لڑتا رہا تھا جتنا کہ مجھ سے ممکن تھا۔ میں نے یہ بھی مناسب سمجھا کہ اپنے ہم مذہب اور ہم وطنوں کو ان خطرات سے متنبہ کر دوں جو آسانی کے ساتھ کانگریس کے بہکائے میں آجانے سے پیدا ہوتے ہیں اور جس میں کانگریس کی اس نیک نیتی کا بڑے زور اور متانت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے جو دراصل غیر معین ہے اور جس کا کوئی عملی وجود ثابت نہیں ہوتا ہے۔

جو اصول ہم نے قائم کئے تھے وہ اس زمانہ کے بعد سے ہمارے لئے رہنمائی کرنے کی روشنی ہونے والے تھے۔ جن کو ہم اپنے تمام معاملات میں ملحوظ رکھنے والے تھے جو برطانیہ کے ساتھ ہوں یا ہندو نمائندوں اور تصفیہ کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔ ہندوستان کی گورنمنٹ کے ساتھ یا کانگریس پارٹی کے ساتھ ہوں اصلاحات کی اسکیموں کی کسی بحث کے متعلق ہوں اور ملک کے انتظام کے لئے نئی تجاویز کے متعلق ہوں۔ اب ہمارے پاس اپنی قانونی کتاب موجود تھی اور ہمارا ارادہ نہ تھا کہ ہم اس سے منحرف ہوں۔

اس کانفرنس کا اتفاق اور اتحاد خاص طور پر قابل ذکر اور اہم تھا چونکہ اس نے

مسٹر محمد علی جناح کو اپنے مسلمان ساتھیوں سے متفق ہو کر ان کے درمیان واپس بلا لیا۔ اس واپسی میں واقعی بہت دیر ہو گئی تھی اور اس وقت وہ واپسی پرائیویٹ قسم کی تھی اور اس کے متعلق تبدیل خیال کا کوئی پبلک اعلان ان کی طرف سے نہ ہوا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے مسٹر جناح نے کلکتہ میں کانگریس پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کی تھی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ کانگریس میں رہنا یا کسی اور ایسے گروہ کے ساتھ رہنا جو سارے ہندوستان پر حاوی ہونے کا دعوےٰ کرے اور جو دراصل ہندوؤں کا محکوم ہو۔ ان کے لئے ممکن نہ تھا اور ان کے مستقبل کے لئے بیکار تھا۔ ہم نے آخر کار ان کو اپنے خیال کے مطابق بنا کر جیت لیا۔

اگر ہندوستان کی سیاسی اور دستوری ترقی کو شطرنج کے ایک طویل اور سختی کے ساتھ کھیلے ہوئے مقابلہ سے تشبیہ دی جاسکتی (میں جانتا ہوں کہ یہ تشبیہ نامکمل ہے چونکہ اس ہندوستانی سیاست کے کھیل میں ہمیشہ کم از کم تین کھیلنے والے رہے۔) تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ایک خاص طور پر قطعی فیصلہ کرنے والے کھیل کے لئے نقشہ جم چکا تھا اور اس وقت کافی سستی چھا گئی تھی۔ حالانکہ ہر شخص اس بات کو سوچتا تھا کہ آئندہ کون سی چال چلنی چاہیئے۔ سائمن کمیشن (SIMON COMMISSION) نے اپنی رپورٹ تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ برطانیہ میں عام الیکشن ہونے کے بعد مسٹر بالڈون (BALDWIN) کو استعفےٰ دینا پڑا اور مسٹر رامسے میکڈونالڈ (MR. RAMSAY MACDONALD) نے اپنی دوسری لیبر پارٹی کی حکومت قائم کر لی۔ مگر باوجودیکہ لیبر پارٹی تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ تھی تاہم اس کو دارالعوام میں مکمل اور قطعی اکثریت حاصل نہ تھی اور وہ جس طرح پانچ سال سے پہلے تھا لبرل پارٹی کی مدد کی محتاج تھی۔

۱۹۲۹ء میں دنیا کا نقشہ بہت تیزی کے ساتھ اور بہت حیرت ناک طریقہ پر بدل گیا۔ وال اسٹریٹ (WALLSTREETCRASH) کے واقعہ سے مالی بدحالی کے سال شروع ہو گئے۔ چیزوں کے بھاؤ اتنے سستے ہو گئے کہ عملی طور پر مغرب کے

ہر ملک میں بیکار آدمیوں کی تعداد برابر بڑھتی گئی۔ جس سے جرمنی اور دوسرے مقامات پر مایوس آدمیوں نے نہایت مایوس اور خطرناک تدبیریں استعمال کرنی شروع کیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک کے زمانہ میں جو مختصر اور دھوکے کی روشنی کا زمانہ آیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ ہم اس زمانہ کے قریب تھے جس کو سر ونسٹن چرچل (SIR WINSTON CHURCHILL) نے "خطرناک تیس والا" زمانہ بیان کیا ہے۔

میں نے سنہ ۱۹۲۹ء کے پہلے تین مہینے مصر میں صرف کئے۔ جہاں پر میں مصر کے حالات کا گہرا مطالعہ کرتا رہا۔ اور جہاں پر میرے رہنما اور سکھانے والے پروفیسر نیوبری تھے (PROFESSOR NEWBURY) جو مصر کے حالات جاننے میں بہت ممتاز آدمی تھے۔ وہ میرے ساتھ وادی نیل کی تمام قدیم یادگاروں کو دیکھنے کے لئے ابوسمبل (ABU SIMBAL) تک اور وہاں سے واپسی تک برابر سفر میں رہے۔

مصر میں برطانوی ہائی کمشنر لارڈ لوئیڈ (LORD LLOYD) تھے جن سے میری واقفیت ہندوستان میں اچھی طرح ہو چکی تھی۔ جب وہ بمبئی کے گورنر تھے اور وہ ان کا نہایت کامیاب زمانہ تھا۔ لارڈ لائیڈ۔ کرومر (CROMER) اور کرزن (CURZON) کے ہم خیال اور مضبوط طبیعت کے شہنشاہیت پسند آدمی تھے۔ اور عنقریب اپنے گھر کی حکومت سے مخالف ہونے والے تھے اور اس جگہ سے استعفے دینے والے تھے جس پر ان کا خیال تھا کہ وہ حکومت کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ وہ بہت قابل قدر دماغی قابلیتوں کے آدمی تھے اور اپنے مقصد میں بہت مستقل مزاج تھے چونکہ وہ ایک نہایت گہرے اور غیر متذبذب جذبہ کے ساتھ برطانیہ کے شہنشاہی مستقبل کی عظمت پر نہایت پرجوش یقین رکھتے تھے۔ اس لئے یہ ان کے لئے ایک درپردہ نعمت ثابت ہوئی کہ وہ دوسری عالمگیر جنگ کے شروع میں انتقال کر گئے۔ حالانکہ اس وقت وہ جس طرح کہ سیاست دانوں کا شمار کیا جاتا ہے مقابلتاً ایک نوجوان آدمی تھے۔ ان کے جذبات فی الواقع بہت تلخ ہو جاتے اگر وہ کچھ اور

زمانہ تک زندہ رہتے اور یہ دیکھتے کہ ہندوستان میں برطانوی جھنڈا بالکل سرنگوں ہو گیا ہے اور وہ برصغیر تقسیم ہو کر بھارت کی جمہوریت اور یقینی طور پر پاکستان کی اہم جمہوریت بن گیا ہے۔

میرے لئے وہ ذاتی طور پر بہت مہربان اور فیاض میزبانوں میں سے تھے مگر مجھے اس بات کا بہت تکلیف کے ساتھ احساس کرنا پڑتا تھا کہ وہ مصر کے حکمران طبقے کے سب حصوں میں اچھے شمار نہیں کئے جاتے تھے اور ہر دلعزیز نہ رہے تھے۔ شاہ فواد نے جن سے میری واقفیت تیس سال سے زائد عرصہ سے تھی اور جن کے ساتھ اُس زمانہ میں خاص طور پر میرے بہت قریبی تعلقات رہے۔ جب برطانوی گورنمنٹ نے مجھے پہلی عالمگیر جنگ کے شروع میں ایک مشن لے کر مصر بھیجا تھا۔ مجھ سے خاص طور پر کہا کہ میں لارڈ لائیڈ (LORD LLOYD) کے پاس جاؤں اور اُن سے ملوں۔ وہ مجھ سے پرائیویٹ طور پر ابدین محل (ABDIN PALACE) میں ملے۔ ہم دونوں بہت دیر تک تنہا باتیں کرتے رہے اور ہماری گفتگو بہت معنی خیز مگر رنج دینے والی رہی۔ بادشاہ اس وقت بیمار تھے۔ گو کسی کو ان کی بیماری کی خطرناکی کا اندازہ نہ تھا۔ وہ علانیہ طور پر روتے تھے کہ ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا اور ان کی طرف سے غفلت برتی جاتی تھی۔ اور اس بات پر بھی روتے تھے کہ برطانوی ہائی کمشنر بڑی بے رحمی کے ساتھ اس بات کو روکتا تھا کہ ان کو اپنے ملک پر حکومت کرنے کے سلسلے میں کسی موثر بات کے کہنے کی اجازت دی جائے۔

انہوں نے کہا کہ "لائیڈ (LLOYD) ڈوری ہلاتا ہے اور سب کٹ پتلیاں اسکے مطابق ناچنے لگتی ہیں۔ کرومر (CROMER) نے عباس حلمی کو ایک کٹ پتلی بنا رکھا تھا اور لائیڈ (LLOYD) مجھے ایک مردہ لاش بنا رہا ہے۔"

محمد علی کلب میں جو مصر کے لیڈروں کے لئے ایک جگہ جمع ہونے کا بڑا مقام تھا جہاں پر وہ باتیں کر سکتے تھے۔ اپنے مرغوب تاش کھیلتے تھے اور اپنی بے شمار سیاسی اور تجارتی اسکیموں اور تجویزوں کے لئے پروپیگنڈا کرتے تھے میں نے ہی کہانی ایک دفعہ

اور ملاقاتی سے لے کر دوسرے تک سنی۔ فیلڈ مارشل لارڈ ایلنبی نے (FIELD MARSHAL LORD ALLENBY) جن کے غیر متذبذب احساس انصاف کی وہ بڑی تعریف کرتے تھے۔ ان سے ایسے وعدے کئے تھے جن سے اُن کو روز افزوں آزادی کی امید ہوگئی تھی۔ مگر اب ان کو معلوم ہوا کہ وہ "ڈوریاں" جو ایلنبی (ALLENBY) نے ہائی کمشنر کے واسطے مخصوص کر رکھی تھیں۔ لائیڈ (LLOYD) نے اُن کو بدل کر" لوہے کی زنجیروں" میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ صرف میرے ہی الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ وہی ٹھیک جملے ہیں جو مجھ سے ایک سے زیادہ مصری وزیروں نے کہے۔

لارڈ لائیڈ (LORD LLOYD) نے مصر میں اتنا مختلف رویہ کیوں ظاہر کیا؟ حالانکہ یہ وہ شخص تھے جو ہندوستان میں بہت آزاد خیال رہ چکے تھے اور جنہوں نے ہمیشہ اس دستور اور قانون کی روح کے مطابق عمل کیا تھا جس کے ماتحت وہ حکومت کرتے تھے اور وہ اس دستور اور قانون کے ظاہری الفاظ کی پیروی بھی کرتے تھے۔ انہوں نے درحقیقت کیوں ہائی کمشنر کی حیثیت سے کام نہ کیا بلکہ ایک وائسرائے کی حیثیت سے کام کیا جس کو مکمل اور قطعی اختیارات حاصل ہوں کیا اس کا یہ جواب نہیں ہو سکتا کہ جب وہ ہندوستان میں بہ حیثیت گورنر بمبئی کے تھے اس وقت مونٹیگ چیمسفورڈ دستور (MONTAGUE-CHELMSFORD CONSTITUTION) کے مطابق جس کے اصول وہ آزادی اور فیاضی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ خانگی حکومت چند خاص اور صاف طور پر مخصوص کئے ہوئے حلقہ جات عمل و انتظام تک محدود تھی اور ان ٹھیک طرح پر بنائی ہوئی حدود کے اندر لائیڈ (LLOYD) کو دخل دینے کی نہ کوئی ضرورت پڑتی تھی نہ اس کے لئے کوئی عذر پیش کرنا پڑتا تھا۔ مگر مصر میں اُن کا آہنی ہاتھ دستانہ سے خالی ہوگیا (اور وہ پابندی جاتی رہی) چونکہ وہاں پر سارا تعلق پانی کی طرح غیر مستقل اور غیر معین تھا۔ اور اس بات کے لئے کوئی صاف طور پر نمایاں حد نہ تھی کہ بادشاہ اور اُس کے وزرا اور برطانوی ہائی کمشنر کے اختیارات کے جداگانہ حلقوں کو معین کریں اور اُن کو الگ الگ تقسیم کر دیں۔ مصری لوگ

خیال کرتے تھے کہ اُن کا ملک ایک آزاد اور خود مختار حکومت کا ملک ہے اور یہ کہ بادشاہ اور اس کے مشیر قطعی طور پر خود اپنے مالک تھے نہ صرف ان معاملات میں جو اندرونی تھے اور جو ملک کے روزانہ انتظام اور عملی حکومت کے متعلق تھے بلکہ درحقیقت تمام بیرونی تعلقات میں بھی۔ ان کے نزدیک ہائی کمشنر کا صرف یہ کام تھا کہ وہ برطانوی مفاد کا خیال رکھے اور یہ دیکھتا رہے کہ مصر کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا ہے اور کسی ایسے بیرونی اجتماع میں شریک نہیں ہوتا ہے جو برطانیہ کے ساتھ دشمنی رکھتا ہو یا اس کے لئے مضر ہو۔ اس کے برعکس جارج لائیڈ (GEOPG ELLOYD) کو اپنے اختیارات کی یا بادشاہ اور ان کے وزرار کے اختیارات کی کوئی واضح حد نہ ملی اور انہوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ گہری نگرانی نہ کریں گے اور سختی کے ساتھ ہدایات نہ دیں گے تو ساری جماعت ان کے قبضہ سے باہر ہو جائے گی۔

۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں سائمن کمیشن (SIMONCOMMISSION) نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ برطانوی حکومت میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی تفصیل اور اس کی موجودہ زمانہ کی حالت جو اس رپورٹ میں بیان کی گئی وہ ایسی فاضلانہ تھی جیسی کہ وہ واقع تھی بہرحال یہ بات اس کے تعمیری کام کے متعلق تھی جس میں کہ کمیشن کی رپورٹ ان بلند امیدوں اور ارادوں سے بہت کم ثابت ہوئی جو اس کمیشن کے مقرر ہونے پر پیدا ہوئے تھے۔ اس نے خاص طور پر کانگریس کے لیڈروں کو ناامید کیا اور انہوں نے اس کی مخالفت کو بہت زور کے ساتھ اور بلا کسی شک و شبہ کے ظاہر کیا۔ لارڈ اروِن (LORDIRWIN) وائسرائے ۱۹۳۰ء کے ابتدائی زمانہ میں رخصت پر انگلستان گئے ہوئے تھے۔ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ ملک معظم کی حکومت کی یہ تجویز تھی کہ لندن میں ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (RounoTABLEconFERENCE) منعقد کی جائے جو ملک کے مستقبل پر غور کرے اور اس کے دستور میں ترمیم کرے یہ اعلان ایسے وقت پر آیا جب ملک میں بہت کشیدگی پھیلی ہوئی تھی اور جس وقت سول نافرمانی کی تحریک جو مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی اپنے انتہائی زور پر تھی

اس اعلان سے اس وقت فوری طور پر وہ کشیدگی کم ہوگئی اور وائسرائے کو اس کا موقعہ ملا کہ وہ ایسی پرسکون سیاسی فضا میں جو چند ہفتے پہلے ناممکن معلوم ہوتی تھی پبلک کے نمائندوں کے ایک وفد* سے ملاقات کریں "تاکہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ اور اس کے افراد پر بحث کی جا سکے اور ان سیاسی مجرموں کو معافی دینے کے سوال پر بحث کی جا سکے جو سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں جیل بھیجے گئے تھے۔ اس پہلی میٹنگ میں بہرحال کوئی بات بالاتفاق طے نہ ہوسکی۔ مہاتما گاندھی پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے یہ وعدہ کرنے سے انکار کیا کہ کانگریس اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوگی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے جو اپنا اجلاس لاہور میں کیا اس میں یہ تجویز پاس کی کہ سول نافرمانی کو پھر تازہ کیا جائے۔

وائسرائے نے اپنے امید افزا۔ ہمدردانہ اور عاقلانہ رویہ کو قائم رکھا۔ اگر کانگریس بہرحال شروع ہی سے اس کے لئے تیار نہ ہوئی کہ وہ ہندوستان کی سیاسی پریشانیوں سے باہر آنے کے لئے کوئی راستہ معلوم کرنے کی کوشش میں تعاون کرے تو پھر بھی وہ کوشش ضرور کی جائے گی۔ اس کے لئے کانگریس کے حدود سے باہر والے آدمی اور ہندوستان کے سیاسی خیالات اور احساسات کے نمائندے اور مشہور آدمی جتنی تعداد میں ممکن ہوں گے مدعو کئے جائیں گے۔ مسٹر نہرو نے اپنی سوانح عمری میں جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اور جب وقت ہندوستان کی آزادی کا سارا مسئلہ غیر طے شدہ تھا۔ اس کانفرنس کے ڈیلی گیٹوں کی ذاتی قابلیت کے متعلق بعض کٹتی ہوئی باتیں اور اعتراض کے جملے استعمال کئے ہیں۔ تاریخ کے طویل میدان نگاہ میں بہرحال یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کا یہ ایسا قابل قدر اور اہم اجتماع تھا۔ جن کا پس منظر اور نقطۂ نظر بہت مختلف تھا اور جو سب صداقت کے ساتھ اس کے لئے بے چین تھے کہ اس آزادی اور خود مختار حکومت کے لئے کوئی

---

* اس وفد کے ممبر یہ تھے۔ مہاتما گاندھی۔ سر تیج بہادر سپرو۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مسٹر ایم۔ اے جناح اور مسٹر وی۔ جے پٹیل جو اس وقت انڈین نیشنل اسمبلی کے صدر تھے۔

پُرامن اور باعزت راستہ تلاش کریں جس کے متعلق واضح طور پر اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اغراض و مقاصد ہیں:-

برطانوی نمائندوں میں وہاں کے وزیر اعظم مسٹر رامسے میکڈونلڈ (MR.RAMSAY MACDONALD) شامل تھے اور لارڈ چانسلر لارڈ سنکی (LORD SANKEY) وزیر ہند مسٹر وجوڈ بین (MR-WEDGWOOD BENN) کنزرویٹو مخالف پارٹی کے نمائندے سر سموئیل ہور (SIR SAMUEL HOARE) جو آگے چل کر ان چند سالوں میں جو ہندوستان کی قسمت کے لئے بہت نازک اور فیصلہ کُن تھے۔ وزیر ہند ہونے والے تھے۔ اور لارڈ ریڈنگ (LORD READING) جو لبرل پارٹی کے لیڈر تھے اور پہلے وائسرائے رہ چکے تھے۔ برطانوی ہندوستانی وفد جس کا ایک ممبر میں بھی مقرر کیا گیا تھا مسلمان۔ ہندو اور پارسی نمائندوں پر شامل تھا۔ جو سیاسی خیالات کے بہت سے مختلف فرقوں سے لئے گئے تھے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی نمائندگی کرنے والے ڈیلی گیٹ بھی اس میں شامل تھے۔ مسلمانوں میں مسٹر ایم۔ اے جناح۔ سر محمد شفیع۔ سر ظفر اللہ خان اور مولانا محمد علی تھے اور دو ڈیلی گیٹ عورتیں تھیں۔ بیگم شاہ نواز اور مسز سوباروین (MR. SUBBAROYAN) ہندوؤں میں تیج بہادر سپرو۔ رائٹ آنریبل وی۔ ایس سرینواس شاستری (V.S.SRINIVASA SASTRI) سر سی۔ پی راماسوامی آئر (SIR C.P. RAMSWAMY AYAR) سر چمن لال سیتلواڈ (SETALVAD) مسٹر ایم۔ آر جیکار (JAYKAR) اور دیوان بہادر رام مڈلیر (MUDLIYAR) - پارسیوں میں سر فیروز سیٹھنا (SIR PHIROZ SETHNA) سر کاؤس جی جہانگیر (COWASJI) اور سر ایچ۔ پی موڈی (H.P.MODY) - مسٹر امبیڈکار (AMBEDKAR) جو خود پیدائشی اچھوت تھے پسماندہ طبقوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور سر ہنری گڈنے (SIR HENRY GIDNEY) اینگلو انڈین جماعت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ حکمران شہزادوں کی نمائندگی بھی بہت مؤثر و شاندار تھی جس میں

بہت سے وہ نام شامل تھے جو ہندوستان کی قدیم دلیری اور عظمت کی تاریخ میں بہت بڑے اور بہت مشہور نام رہ چکے ہیں۔ برودہ کے مہاراجہ گائیکوار اُنکے لیڈر تھے۔ ان کے دوسرے ساتھی مہاراجہ بیکانیر۔ پٹیالہ۔ بھوپال۔ کشمیر۔ ریوا اور جام نگر تھے۔ جن کو شاید لاکھوں برطانوی شہری "رنجی" (RANJI) کے ناقابلِ فراموش نام سے زیادہ جانتے ہیں جو کرکٹ کے لئے مشہور ہیں۔ بہت سے شہزادے اپنے دیوانوں کو ساتھ لے گئے تھے جو ان کے وزیر اعظم تھے۔ ان میں اس قابلیت اور امتیاز کے سیاست دان بھی شامل تھے جیسے کہ سر اکبر حیدری اور سر مرزا اسمٰعیل اور ان کے علاوہ دوسرے مشہور آدمی۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے موسم خزاں میں ہم لندن کے اندر جمع ہوئے مسلم وفد کا لیڈر منتخب ہونے کا اعزاز مجھے ملا۔ ہم نے اپنا ہیڈ کوارٹر رٹز ہوٹل (RITZ HOTEL) میں قائم کیا جہاں پر عرصہ سے میرا معمول تھا کہ میں قیام کروں۔ جب کبھی میں لندن میں ہوں۔ یہ کوئی رسمی بات نہیں ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کی قابل قدر جماعت کا لیڈر منتخب ہونا بڑی عزت کی بات تھی۔ ایسی جماعت جس میں اس قابلیت کی شخصیتیں شامل تھیں جیسے کہ مسٹر ایم۔ اے جناح جو بعد میں پاکستان کے بانی اور قائداعظم ہوئے۔ یا سر محمد ظفر اللہ خاں جو برسوں تک بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہندوستان کے نمائندہ رہ چکے تھے اور پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ مقرر ہوئے۔ یا میرے قدیم اور آزمودہ دوست سر محمد شفیع جو مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔

اس طرح منتخب کئے جانے کی خوشی میرے لئے اپنی زندگی کے نہایت خوشگوار اور اہم زمانہ کی مسرتوں میں سے تھی۔ اس زمانہ میں مل اینڈری کیرن (MLLE ANDREE CARRON) سے میری شادی ہوئے بارہ مہینے گذر چکے تھے اور اسی زمانہ میں مجھے وہ ناقابل فراموش تجربہ بھی ہوا تھا کہ میں بلنہم گھوڑے سے ڈربی کی دوڑ جیت چکا تھا۔

اِس مشہور سال کے آخر میں جو میرے لئے ایک قابل یاد سال بن گیا ہے۔ راؤنڈٹیبل کانفرنس کا پہلا مکمل اجلاس ہوا جس کا باقاعدہ افتتاح دارالخواص (HOUSE of LORDS) میں ہوا اور جس کی صدارت ملک معظم شاہ جارج پنجم نے کی۔ میرے ساتھیوں نے مجھے یہ مزید اعزاز بخشا کہ مجھے کانفرنس میں برطانوی ہندوستان کے شعبہ کا چیرمین منتخب کرلیا۔ یعنی تمام برطانوی ہندوستان کے سب نمائندوں کا۔ سوائے حکمران شہزادوں کے جو قدرتی طور پر خود اپنے نمائندے ہوکر آئے تھے اور جو اپنی حیثیت سے اپنی مختلف ریاستوں اور علاقوں کے خود مختار بادشاہ تھے۔

بادشاہ سلامت نے جو اپنی سخت خطرناک علالت سے حال ہی میں صحتیاب ہوئے تھے اپنی افتتاحی تقریر میں ہم سب سے ایک نہایت موثر اپیل کی کہ ہم اس کام کی اہم نوعیت پر غور کریں جو ہم نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"میں آپ کی کارروائیوں کی روش کو نہایت گہری اور ہمدردانہ دلچسپی کے ساتھ دیکھتا رہوں گا جو درحقیقت بغیر بے چینی کے نہ ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس میں اس سے زیادہ اعتماد بھی ہوگا۔ ہندوستان میں میری رعایا کی زندگیوں پر جن مادی حالات کا اثر پڑتا ہے اُن سے میں بہت متاثر ہوتا ہوں اور وہ آپ کے آئندہ غور و فکر کے زمانہ میں میرے خیالات میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔ اکثریت اور اقلیت والی جماعتوں کے مناسب مطالبات بھی میرے ذہن میں موجود ہیں اور اسی طرح ہندوستان کے سب مردوں اور عورتوں کے مطالبات۔ یعنی شہر میں رہنے والے اور زمین جوتنے والے زمیندار لوگ اور کاشتکار لوگ۔ قوی لوگ اور کمزور لوگ۔ مالدار لوگ اور غریب لوگ اور ان قوموں فرقوں اور مذہبوں کے سب آدمی جو اس سیاسی ادارہ میں شامل ہیں۔ ان باتوں کا میں بہت زیادہ خیال رکھتا ہوں۔ مجھے اِس میں شبہ

نہیں ہے کہ حکومت خود اختیاری کی اصل بنیاد اس میں ہے کہ یہ سب مختلف مطالبات آپس میں گھل مل جائیں جس سے باہمی ذمہ داری اور پابندی پیدا ہو اور اُن مطالبات کو تسلیم کیا جائے اور اُن کو پورا کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت جو اس بنیاد پر قائم ہوگی وہ اپنے معزز مقاصد اور خیالات کو عملی جامہ پہنائے گی۔"

اس کے بعد دوسری بلیغ اور موثر تقریریں ہوئیں۔ پھر کانفرنس سینٹ جیمس محل (ST-JAMES PALACE) میں منتقل ہو گئی اور وہاں اس نے جم کر اپنا پیچیدہ اور مشکل کام شروع کیا۔ ہم کو صرف سطحی طور پر ہم آہنگی حاصل ہوئی مگر اس کے نیچے جذبات اور نقطۂ نظر کے بہت گہرے اور مشکل اختلافات تھے۔ جن کا اثر شروع ہی سے ضرور پڑنے والا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سیاسی حالت اور ہندوستان و برطانیہ کے اُن تعلقات کو جو ۱۹۳۰ء کے موسم خزاں میں تھے مختصر طور پر دوبارہ بیان کیا جائے۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ نے ایسی اسکیم پیش کی جس میں مرکز کی ذمہ داری کو ختم کر دیا اور ہندوستان میں وفاقی نظام حکومت قائم کرنے کے خیال کو بھی آئندہ کے لئے ایک طویل اور غیر معین زمانہ تک ملتوی کر دیا۔ یہ بات دراصل کسی شخص کے لئے بھی قابل اطمینان نہ ہوسکتی تھی چونکہ اس سے کوئی قابل عمل سمجھوتہ پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ایک قسم کی ٹالبازی تھی جو موجودہ اور دراصل نہایت تیز سیاسی کشمکش کے متعلق کی جا رہی تھی۔ حکومت خود اختیاری کے متعلق ہندو تحریک کی تمام کوشش اس خیال پر جمع ہوگئی تھی کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کی جائے اور فوراً جمہوریت کا قیام عمل میں آجائے جو بالکل مردم شماری کے اعداد کے مطابق ہو۔ اور جس میں مذہبی اختلافات کا صرف اتنا ہی لحاظ رکھا جائے اور اس سے زیادہ بالکل نہ رکھا جائے جتنا کہ مردم شماری کے لحاظ سے پایا جائے۔ مگر مسلمانوں کی رائے پختہ طریقہ سے اس بات پر جم گئی تھی کہ مرکزی حکومت کی طرف سے خود مختار اور آزاد صوبائی حکومتوں کو

خود حکومت کرنے کے اختیارات تقسیم کئے جائیں قطعی طور پر کسی شخص نے بھی اس وقت تک کل ہند وفاقی نظام حکومت کے تصور کی تشکیل نہیں کی تھی جس میں تمام ریاستیں حصہ لیں گی۔ اس وجہ سے کانفرنس میں شریک ہونے والی بڑی پارٹیوں میں سے کسی نے بھی کوئی معینہ اسکیم پیش نہیں کی بلکہ وہ سب ایک دوسرے کے خلاف مطالبات پیش کرتے رہے۔ برطانوی حکومت قدرتی طور پر اس چکر میں تھی کہ کیا کرے جب اس کے سامنے ایسی چیز رکھی گئی جو متضاد اور ناقابل حل مطالبات اور ضد مطالبات کا ایک سلسلہ معلوم ہوتی تھی۔

سب سے پہلا ضروری کام جو مجھ کو معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے جس سے برٹش انڈیا وفد کے مسلمان اور ہندو فرقوں میں جو خلیج حائل ہو رہی تھی اس پر پل باندھ دیا جائے۔ جب ہم وہ پل باندھ چکیں گے تب ہی ہم اس قابل ہوں گے کہ ہم برطانوی نمائندوں کے سامنے اپنی مشترکہ تجاویز ہندوستان کی دستوری ترقی کے متعلق پیش کر سکیں۔

اُن لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور جن کی کوششیں جوش اور شوق کے ساتھ ان ہی مقاصد کے لئے یا ان سے قریبی مشابہت رکھنے والے مقاصد کے لئے جاری تھیں۔ میرے دوست ہز ہائی نس نواب بھوپال تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے حکمران شہزادوں میں ایک سر برآوردہ شخصیت رکھتے تھے۔ وہ عقیدت مند مسلمان تھے۔ وہ نہایت موثر زور اور قوت ارادی رکھنے والے آدمی تھے۔ ان کی جسمانی طاقت بہت زیادہ تھی۔ وہ کھیل کے شوقین اور پہلوان آدمی تھے اور اول درجہ کے پولو کھیلنے والے تھے۔ وہ بہت پکے ہندوستانی قومیت کے حامی تھے جو یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی نیم کالونی والی حیثیت کو ختم کر دیا جائے اور اس کی محتاج اور دوسرے پر بھروسہ رکھنے والی حالت کو دور کر دیا جائے۔ وہ اس معاملہ میں مجھ سے بالکل متفق تھے کہ اگر ہم لوگ جو برٹش انڈیا میں رہتے ہیں ایسے طریقے اور ذریعے معلوم نہ کر سکے جس سے ہم اپنے اختلافات رائے کو طے کر سکیں تو ہم ملک معظم کی حکومت کے سامنے

مطالبات کی کوئی معینہ شکل لے کر نہیں جا سکتے۔ اور اس حالت میں دیسی ریاستوں کے متعلق غور کرنا تو بالکل چھوڑنا ہی پڑے گا۔ جب ہم دونوں پہلی مرتبہ نواب صاحب کے مکان پر ملے تھے اس وقت سے میرا یہ پختہ یقین تھا کہ یہ معاملہ ایسا ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے اور جس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی وجہ سے میں اس مسلم ہندو سمجھوتہ کا بڑا حامی بن گیا تھا جو ایک آزاد اور خود مختار ہندستان کے بارے میں جو ہماری آخری رائے ہو اس کے متعلق آپس میں کر لیا جائے۔ یا تو یہ بات طے کر لی جائے کہ ہندوستان صحیح معنوں میں ایک وفاقی حکومت کا ملک ہوگا یا ایسی حکومت ہوگی جیسے کہ کنیڈا (CANADA) میں ہے جس میں خاص اور سب سے اوپر کے اختیارات مرکزی حکومت کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں۔

اپنے ہندو ساتھیوں سے متفق ہونے سے پہلے ہمارے لئے یہ ضروری تھا کہ ہم اپنے مسلم وفد کے اندر پورا اتفاق پیدا کر لیں۔ ابتدا میں بعض مسلمان ڈیلی گیٹ خاص طور پر مسٹر جناح وفاقی نظام کے تصور پر شکوک رکھتے تھے جیسا کہ ان کی حالت اس کانفرنس سے بہت پہلے تھی۔ میں خوب جانتا تھا کہ اس کے خطرات نہ دور تھے اور نہ غیر اہم۔ ایک ترقی کرنے والی جمہوریت کو بہت سی ایسی ریاستوں میں تبدیل کر دینا جس میں شخصی حکومت ایک مقررہ اور جیسا کہ اس وقت معلوم ہوتا تھا ایک ناقابل تلافی رواج کی صورت اختیار کرے، ایک خطرناک اور نیز پیچیدہ قسم کی جدت شمار کی جا سکتی ہے۔ اور اس میں یہ بھی خطرہ تھا کہ چونکہ حکمران شہزادوں کی اکثریت ہندو تھی اس لئے اس وفاقی نظام میں بہ حیثیت مجموعی مسلم جماعت کا سیاسی اثر اور اقتدار بہت کم ہو جائے گا۔ بہر حال مجھے اس کا یقین تھا کہ وفاقی اسکیم میں جو بھی عارضی مشکلات اور خطرات شامل ہوں پھر بھی وہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا سب سے بہتر اور سب سے زیادہ قابل منظوری حل پیش کرتی تھی۔ اور اس سے وہ موقعہ ہاتھ آ گیا تھا جو شاید پھر کبھی نہ مل سکے اگر اس سکیم کو موثر بنانے کے لئے کسی سمجھوتہ کی ضرورت محسوس ہوتی تو اس کے ظاہری اور مختلف فائدوں کے مقابلہ میں

یہ شمار کیا جاتا کہ ہم کو بہت کم قیمت ادا کرنی پڑی۔

مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہے کہ جب ہم نے اپنے مسلم وفد کے درمیان وفاقی نظام کی حمایت میں فیصلہ کر لیا تو مسٹر جناح جو اس کے بہت سخت مخالف رہ چکے تھے اب آئندہ تمام بحثوں اور تصفیہ کی باتوں میں ہمارے نہایت وفادار اور پر خلوص مددگار ساتھی بن گئے۔

چونکہ حکمران شہزادوں نے کسی وفاقی طرز حکومت کے لئے اپنی رضامندی دیدی تھی اس لئے اب صرف یہ بات باقی رہ گئی تھی کہ ہندو نمائندوں کی مرضی اور حاصل کر لی جائے۔ میں نے ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اگر انہوں نے ایک وفاقی ہندوستان نہ کہ متحدہ ہندوستان کے اصول کو تسلیم کرنے کی رعایت ہم کو دے دی تو وہ اور ہم دونوں ملک کے لئے بہ حیثیت مجموعی بہت بڑی اور فوری سیاسی ترقی اور فائدے حاصل کریں گے۔ جو قانونی تحفظات ہم چاہتے تھے وہ یہ تھے۔ صحیح معنوں میں ایک وفاقی دستور حکومت۔ اس بات کا وعدہ کرنا کہ پنجاب اور بنگال میں جو مسلم اکثریت ہے وہ دستور کی کسی مصنوعی حیلہ بازی کے ذریعہ سے اقلیت میں منتقل نہ کر دی جائے گی۔ سندھ کو بمبئی کے صوبہ سے علیحدہ کرنا اور اس کا جداگانہ صوبہ قائم کرنا۔ ممالک مغربی و شمالی میں (N.W.F) دستوری حکومت کا مکمل نظام جاری کرنا۔ اس بات کا یقین دلانا کہ فوج اور سول ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ایک مقررہ تناسب قانونی طریقہ پر مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ ہم کو اس قسم کا یقین دلا دیں گے تو ہم اس کے بدلہ میں ان کے ساتھ مل کر برطانیہ کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ پیش کریں گے۔ میں اس سے بھی آگے چلا گیا اور میں نے ایک خاص رعایت کے طور پر یہ بات پیش کی کہ کسی منتخب شدہ ہندوستانی لیڈر کی قیادت میں سارے ہندوستان کا کمانڈ ہوگا اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے کے لئے ہم مسلم جماعت کو مجبور کریں گے۔ سر چمن لال سیٹالوڈ نے (SIR OHIMANLAL SETALVAD) اپنی سوانح عمری میں میری ان تجویزوں کا حوالہ دیا ہے۔ اُن کی شہادت جو قلم بند ہو چکی ہے کم از کم

یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اگرچہ پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں وہ سب باتیں حاصل ہوئیں جن کی اس میں امید کی جاتی تھی۔ اور اگرچہ آخر میں صرف یہی نہ ہوا کہ مرتبہ نوآبادیات ہندوستان کو نہ مل سکا بلکہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم ہو گئی۔ تو کم از کم ان سب اہم واقعات کی ابتدائی جھلک ہندو وفد کے اس انکار میں پائی جاتی ہے جو انہوں نے میری تجویز کو منظور کرنے کے لئے کیا۔ مجھے یقین ہے کہ سپرو اور شاستری اپنے دلوں کی گہرائی میں ہم مسلمانوں کی تجاویز کو منظور کرنا چاہتے تھے مگر ان کو اپنے ہندو ساتھیوں کا خوف تھا اور سب سے زیادہ مہاسبھا کے اثر کا خوف تھا۔

مجھے اپنا پختہ یقین باقاعدہ طور پر تحریر میں ضرور لے آنا چاہیئے کہ اگر اس وقت اور اسی صورت میں میری تجویزیں منظور کر لی جاتیں تو آئندہ کی تاریخ ایک بالکل مختلف راستہ اختیار کرتی اور اب سے بہت پہلے ہندوستان میں ایک وفاقی نظام حکومت موجود ہوتا جس میں ہندو اور مسلمان ملک کی روزمرہ کی حکومت میں شریک ہوتے اور وہ سیاسی اعتبار سے مطمئن ہوتے اور ہندوستان کی بہ حیثیت مجموعی بہتری کے لئے دونوں مل کر قناعت کے ساتھ کام کرتے۔

آئندہ باب میں مجھے ہندو رائے کی اس مسلسل ہٹ دھرمی اور زیادتی کا حوالہ دینے کا موقعہ ملے گا جس نے بہت آگے چل کر اس دستور حکومت کو نامنظور کر دیا جو برطانوی کابینہ کے مشن نے پیش کیا تھا۔ اس دستور حکومت کا مسودہ اصولی اور تفصیلی اعتبار سے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے شروع ہونے پر تیار ہونے لگتا۔ اگر ہندو نمائندے جب ہم ان سے نواب بھوپال کے مکان پر ملے تھے میری اس تجویز کو جو میں نے مسلمانوں کی طرف سے پیش کی تھی اسی خلوص کے ساتھ منظور کر لیتے جس خلوص کے ساتھ وہ کی گئی تھی۔

چونکہ ہم کو وہ منظوری نہیں دی گئی اس لئے پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی بقیہ کارروائی کچھ زیادہ ضروری اور عملی اہمیت رکھنے والی نہ رہی۔ اس لئے کہ وہ بنیاد جس پر اس کی تجاویز کی عمارت قائم کی جاتی بہت غیر معین اور کمزور تھی بجائے اس کے کہ

مضبوط اور پختہ ہوتی - ایک کامیاب اور آگے بڑھنے والا قدم اس وقت بہت اہمیت رکھنے والا معلوم ہوتا تھا مگر بعد میں وقت اور بڑے واقعات کی رو نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ معمولی اور عارضی قسم کا تھا - وہ یہ تھا کہ والیان ملک نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ وفاقی حکومت کے نظریہ کو منظور کرتے ہیں۔ کانفرنس کے برطانوی نمائندوں نے اپنے نقطہ نظر سے جو شاید غیر قدرتی نہ تھا اس نظریہ کی تعریف کی - کہ یہ اہم اور تعمیری ترقی کا ثبوت تھا اور اس سے اس کام میں حقیقی مدد ملے گی کہ برطانوی پارلیمنٹ کے تمام اختیارات ہندوستانی وفاقی پارلیمنٹ کو منتقل کر دیئے جائیں -

اس بات کا اور زیادہ اثر پڑا کہ لارڈ ریڈنگ نے (LORDREADNIG) جو دارالخواص میں لبرل پارٹی کے لیڈر تھے والیان ملک کے مندرجہ بالا طرز عمل کو بڑی خوشی سے مگر خاص یقین کے ساتھ منظور کر لیا تھا - لارڈ ریڈنگ کو اس وقت بہ حیثیت سابق وائسرائے کے ایک شاندار وقار حاصل تھا اور وہ پختہ یقین رکھتے تھے کہ انتظام اور عملی اختیارات کے تمام بڑے شعبوں میں مرکزی ذمہ داری کو بڑی اہمیت ہے - مسٹر رامسے میکڈونلڈ (MR. RAMSAYNACDONALA) وزیر اعظم کے نزدیک یہ بات کانفرنس کی نجات اور کامیابی معلوم ہوئی تھی نہ کہ ایسی تباہی جیسا کہ وہ اس وقت معلوم ہوتی تھی جس سے مصیبت پیدا ہو جائے مسٹر میکڈونلڈ کی حالت کانفرنس کے تمام زمانہ میں بہت پیچیدہ اور نازک رہی گو وہ بالکل نرالی نہ تھی چونکہ وہ اس قسم کی حالت تھی جس کا ان کو اپنی زندگی میں اکثر مقابلہ کرنا پڑا تھا - اپنے اختیارات کے انتہائی عروج پر انہوں نے حالات کا مقابلہ بڑے ضبط اور ہوشیاری کے ساتھ کیا - مگر اس واقعہ کو نظر انداز کرنا مشکل ہے کہ انکی سیاسی ہوشیاری اور باریک بینی کے باوجود وہ اُس گاڑی چلانے والے کے مانند تھے جس کی گاڑی میں آٹھ جیدار (SPIRITED) گھوڑے لگے ہوئے ہوں مگر اس کو اس بات کا احساس ہو کہ ان میں سے کوئی جوڑا اپنی مرضی کے راستہ پر جا سکتا ہے - اور وہ

غالباً ضرور چلا جائے گا اور گاڑی کو اس راستہ سے بالکل مختلف سمت کی طرف لے جائے گا جس طرف وہ خود جانے کا ارادہ کرتا ہے۔

کانفرنس کے ہندوستانی نمائندوں کے لئے مسٹر میکڈونلڈ کو ہمارا چیرمین ہونا پڑا اور وہ دراصل ہمارے چیرمین رہے اور ہماری سب کارروائیوں پر بہت ہوشیاری اور فیاضانہ غیر جانب داری کے ساتھ صدارت کرتے رہے۔ وہ بہت عقلمند اور قابل قدر آدمی تھے۔ جمہوری اور دستوری رواج و نظریات کے ان پیچیدہ راستوں میں جن میں ہم اپنا طویل سبق حاصل کر رہے تھے۔ وہ ہمارے رہبر، ہمارے فلسفی اور ہمارے دوست ثابت ہوئے۔ اپنی پارٹی کے لئے جو سنہ ۱۹۳۰ء سے اپنے عہدوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ بہ حیثیت لیڈر کے ظاہر ہوتے تھے جس کو پرانے زمانہ کی شہنشاہیت اور رکاوٹ پیدا کرنے والے ذاتی اغراض کے خلاف ایک طویل جہاد میں شریک ہونا پڑتا تھا اور وہ ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کے لئے ایک نجات دلانے والے اور بنیاد ڈالنے والے کی حیثیت سے ظاہر ہوتے تھے جو وہ دراصل ہونا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء ایسی تاریک پیشین گوئیوں اور مصیبت و رنج کے ایسے علامات کا سال تھا جو اس وقت ظاہر ہونے والے تھے مگر اس زمانہ میں باوجودیکہ میکڈونلڈ کو دارالعوام میں وہ مضبوط اور خالی از خطرہ اکثریت حاصل نہ تھی جس کی وجہ سے ان کے فیصلے یقینی طور پر مستقل اور موثر ہوسکتے تھے۔ وہ اپنی پارٹی کے کامیاب لیڈر بنے رہے۔ اس حیثیت میں ان کو اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان کے معاملات پر ان کی رائے سب سے زیادہ آگے بڑھی ہوئی اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور یہ کہ وہ اور اُن کی پارٹی مرتبہ نو آبادیات کے راستہ پر بہت تیزی کے ساتھ سفر کرنے کا شوق رکھتے تھے جس کے اندر بہت کم اور معمولی قسم کی مخصوص رکاوٹیں اور پابندیاں ہوں گی۔ مگر کنزرویٹو پارٹی کی مخالف جماعت جس کے صبر کو بہت سختی کے ساتھ آزمانے کا امکان میکڈانلڈ کے اختیار میں نہ تھا۔ برطانیہ کے شہنشاہانہ مفاد کی نگرانی بڑی احتیاط کے ساتھ کر رہی تھی۔ پارلیمنٹ کے اندر اور

پریس (PRESS) کے حلقوں میں کنزرویٹو پارٹی کا سخت اور داہنے بازو والا عنصر ایسے زبردست اور با اختیار قلعوں کا مالک تھا جہاں سے وہ میکڈونلڈ کا مقابلہ کر سکتے تھے بلکہ شاید اس کو شکست بھی دے سکتے تھے۔ اگر وہ ان کے خیالات کو زیادہ سختی کے ساتھ نظر انداز کرتا۔

ان حالات میں یہ شاید ناگزیر تھا کہ امید اور نیک نیتی کی خاص فضا وہاں پر پھیلنی چاہیے اور یہ کانفرنس کا ایک بڑا ظاہری کارنامہ ہوگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ محض صوبائی خود مختاری سے کچھ زیادہ اور بالاتر چیز منظور کی جا چکی ہے اور وہ یقیناً مل جائے گی۔ ہم میں سے جو سرتیج بہادر سپرو کی طرح قانون دان تھے وہ ان معاملات کی تفصیل میں بہت لطف کے ساتھ مصروف ہو گئے جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ ہندوستان کی خود مختار حکومت کے راستہ میں ایک اہم اور مستقل ترقی کا باعث بنیں گے۔ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے دل کے اندر ہمیشہ اس بات کا شبہ رہا کہ ہمارے کام سے کوئی حقیقی اور مستقل نتائج برآمد نہ ہوں گے چونکہ ۱۹۳۰ء کے ہندوستان میں جو بڑے حقائق ظاہر ہوتے تھے ان کو فراموش کیا جا رہا تھا۔

یہ بات فراموش کر دی گئی تھی کہ سب سے پہلے اور سب سے آگے اور ہمیشہ کے لئے مسلمان اور ہندو قوموں میں جو اس برصغیر میں آباد تھیں۔ بنیادی اختلافات موجود تھے اور یہ اختلافات اس برصغیر کے شمال و مغرب اور مشرقی دو حصوں میں رہنے والے مسلمان اور باقی حصہ میں رہنے والی ہندو اکثریت کے درمیان بہت زیادہ واضح تھے۔

اس بات کو فراموش کر دیا گیا تھا کہ پڑھے لکھے آدمی جو باوجودیکہ تمام ہند آبادی میں صرف دس فی صدی تھے۔ چار پانچ کروڑ کے درمیان تعداد رکھتے تھے اور ان کو صرف یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہت کم اقلیت میں ہیں اس بات کو فراموش کر دیا گیا تھا کہ یہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ برطانیہ کے سب آدمی اپنا بستر بوریا لے کر ہمیشہ کیلئے

اور قطعی طور پر ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہی اُن کی آخری غرض تھی جس کے لئے وہ محنت کر کے کوشش کرتے تھے اور در حقیقت وہ حالت ۱۹۴۷ء میں پیدا کر دی گئی۔ طویل کاغذی دستور کی تمام تفصیلات جس کے اندر احتیاط کے ساتھ تمام تحفظی قانون رکھے گئے ہوں جس کے اندر خیالی اور نظریاتی اصول کے مطابق اختیارات کا صحیح توازن قائم رکھا گیا ہو اس دستور کے اندر درج ہونے کے لئے ہو یہ سب باتیں ان لوگوں کے نزدیک مہملیات کا ایک فریب دینے والا اور نقصان پہنچانے والا مجموعہ تھا۔ اور بکلیف وہ حیلہ بازیوں کا ذخیرہ تھا جس کے ذریعہ سے وہ سب چیزیں جن کو برطانیہ ایک ہاتھ سے دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی وہ دوسرے ہاتھ سے واپس لے سکتی تھی اور واپس لے لیگی۔

اس بات کو فراموش کر دیا گیا تھا کہ والیان ملک جن کے پاس دولت قابلیت ذاتی کشش۔ وقار اور برطانوی تعلق کے ساتھ پرخلوص وفاداری۔ یہ سب چیزیں موجود تھیں۔ پھر بھی درحقیقت ان کے پاس بہت کم اختیار تھا اور ان کا اثر بہت کم تھا۔ وہ قدرتی طور پر انگریزوں کے ایسے منحوس شاگرد نہ تھے جیسا کہ اُن کے مخالف پروپیگنڈا کرنے والے ان کو ثابت کرتے تھے۔ مگر اپنے اثر سے لوگوں کی رائے پر قابو پانے کے لئے ان کے حقیقی اختیارات اور ان کی اہلیت طویل عرصہ کے بعد بالکل ختم ہوگئی تھی اور اس عرصہ میں اُن کی رعایا اور ہندوستان کے سب آدمی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ بے اختیار تھے اور کوئی آزاد رائے رکھنے یا کوئی آزاد فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھے اگر وہ رائے یا وہ فیصلہ ان برطانوی ریزیڈنٹوں کی پالیسی کے خلاف تھا جو مختار کل تھے۔ اس طرح پر آہستہ آہستہ وفاقی دستور کے لئے انکی حمایت جس نے برطانوی حکمران طبقہ پر کافی اثر کیا ایسی ثابت ہوئی جس میں بہت کم حقیقت تھی اور جو ایسے سایہ کی طرح تھی جس میں اختیار و قوت کا کوئی وجود نہ تھا۔

۱۹۳۱ء کے موسم خزاں میں جب دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس وقت دنیا کی حالت بہت زیادہ بدل چکی تھی اور اسی طرح پر ہندوستان اور برطانیہ کے

تعلقات کی حالت بہت بدل چکی تھی۔ اقتصادی مصیبت نے اپنی مکمل تیزی اور سختی کے ساتھ یورپ اور برطانیہ پر حملہ کر رکھا تھا۔ آسٹریا کے مشہور کریڈٹ انسٹالٹ بینک (CREDITANSTALTBANK) کے فیل ہو جانے پر روپیہ ملنے میں ایک عام اور فوری پابندی پیدا ہو گئی تھی اور دنیا کی تجارت میں ایک طویل اور گہرا تنزل ہو گیا تھا۔ برطانیہ میں بیکار آدمیوں کی تعداد بڑھ کر تیس لاکھ کی وسیع اور خوفناک تعداد کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مے رپورٹ (MAYAEPORT) کے شائع ہونے سے ایک بڑی سیاسی مصیبت اور زیادہ جلدی کے ساتھ آ گئی۔ یہ رپورٹ ملک کی اقتصادی اور مالی حالت کی ایک مستند اور باقاعدہ تفصیل تھی جو سرکاری حکم سے کی گئی تھی اور جس میں کفایت شعاری کرنے کے لئے بہت سی ایسی سفارشیں کی گئی تھیں جو مسٹر رامسے میکڈانلڈ کی کابینہ والوں میں اکثر کے نزدیک مکمل طور پر ناقابل منظوری تھیں۔ ستمبر میں بادشاہ سلامت نے اپنی سالانہ اور پسندیدہ تعطیل کو جو وہ بالمورل (BALMORAL) کے مقام پر گذار رہے تھے ختم کر دیا اور لندن واپس آ گئے اور سیاسی جماعتوں کے مختلف لیڈروں کو اپنی ملاقات کے لئے طلب فرمایا اس کے بعد ایک قومی گورنمنٹ بنائی گئی جس کا یہ کام تھا کہ اس نازک معاملہ کو طے کرے۔ مسٹر رامسے میکڈونالڈ (MR. RAMSAYMACDONALD) وزیر اعظم تھے جن کی حمایت کنزرویٹو اور لبرل پارٹی کے آدمی کرتے تھے مثلاً مسٹر بالڈون (MR. BALDWIN) سر آسٹن چیمبرلین (SIRAUSTEN. CHAMBERLAIN) سر جون سائمن (SIRJOHN-SIMON) اور سر ہربرٹ سموئیل (SIRHERBERTSAMUEL) اس گورنمنٹ کے قیام کے بعد جو عام الیکشن بہت جلد کئے گئے ان میں اس گورنمنٹ کی حمایت کرنے والے خاص طور پر کنزرویٹو اور نیشنل لبرل (CONSERVATIVESANDNATIONALLIBERALS) بڑی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے اور دارالعوام میں لیبر پارٹی کی نمائندگی گھٹ کر بہت قلیل تناسب کی رہ گئی تھی جس میں پرانے وزیروں میں دارالعوام کے اندر صرف مسٹر جارج

لینسبرے (MR. GEORGE LANSBURY) باقی رہ گئے تھے جو بڑے زبردست صلح کے حامی تھے اور مسٹر ایٹلی (MR. ATTLEE) باقی رہ گئے تھے۔

یہ تبدیلیاں دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس پر اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکیں۔ مگر ان تمام واقعات کے باوجود جن کی وجہ سے برطانیہ اور برطانوی حکومت پہلے سے مصروف تھی اور جو نہایت اہم تھے۔ کانفرنس کو ملتوی نہیں کیا گیا۔ اس عرصہ میں لارڈ ارون (LORD IRWIN) وائسرائے کے صبر اور دوسروں پر اثر ڈالنے کی طاقتوں نے اپنا کام کیا (اُن کو مسٹر محمد علی نے اپنے ایک تاریخی جملہ میں "طویل قامت عیسائی" کہا تھا) اور مہاتما گاندھی لندن آنے کے لئے تیار ہو گئے۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت سے گئے مگر عام طور پر یہ خیال تھا کہ گو گاندھی کانگریس کے نمائندہ اور نامزدہ لیڈر کی حیثیت سے نہیں آئے تھے مگر جہاں تک ہندو اکثریت کا تعلق تھا اُن کی آواز میں پورا اختیار اور فیصلہ کرنے کا حق موجود تھا۔

ہم مسلمان اپنی طرف سے یہ امید رکھتے تھے کہ مہاتما گاندھی جو اپنے وسیع ذاتی وقار کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سیاسی احساس بھی رکھتے تھے اس بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے کہ مسلمان اور ہندوؤں کا متفقہ محاذ بنانا بذات خود ایک بڑا ترقی کا قدم شمار کیا جائے گا اور سب کو اس کا احساس تھا کہ ایسا کرنے سے وہ بے نظیر موقعہ مل جائے گا جس سے ہم راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں وہ دستور کھینچ تان کر کے منظور کرا سکتے ہیں جو صحیح معنوں میں برطانوی ہاتھوں سے اختیارات لے کر ہندوستانی ہاتھوں کو منتقل کر دے گا اور جو ہندوستان کو دنیا کی ایک بڑی طاقت کی حیثیت دے گا۔ گو ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی ایسی چیز کی پیش بینی کر لیتے یا اس کی امید رکھتے جیسی کہ ۱۹۴۷ء کے آخری فیصلہ سے حاصل ہوئی مگر جب وہ وہاں پہنچے تھے تو ان کو لازمی طور پر یہ امید تھی جیسا کہ ہم میں سے بہت سے آدمیوں کو جو شرق سے گئے تھے کانفرنس کے موقعہ پر تھی کہ اصلی اختیارات ضرور منتقل کر دئے جائیں گے اگرچہ ہندوستان اور وہائٹ ہال (WHITE-HALL) کا

تعلق ایک یا دو ریشمی ڈوریوں کے ساتھ پھر بھی باقی رہے۔

مہاتما گاندھی لندن میں نومبر ۱۹۳۱ء میں کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے وارد ہوئے۔ اُن کے ساتھ ہندوستان کی مشہور شاعرہ مسز سروجنی نیڈو تھیں ہماری پہلی ملاقات جو دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ڈیلی گیٹ ہونے کی حیثیت سے ہوئی وہ رٹز ہوٹل میں خاص میرے کمرہ کے اندر آدھی رات کے وقت واقع ہوئی۔ اس وجہ سے یہ مناسب موقعہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے اس بیان میں کچھ دیر کے لئے رکوں اور ان دو مشہور شخصیتوں کے متعلق اپنے تاثرات اور ان باتوں کو جو مجھے یاد ہیں مختصر طور پر تحریر کروں۔

مختلف طریقوں پر میں مہاتما گاندھی کو پینتالیس ۴۵ سال سے زائد عرصہ سے جانتا تھا اور ان سے تعلقات رکھتا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کے متعلق ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء میں سنا جب وہ اور میں دونوں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مستقبل اور اُن کی حیثیت کے متعلق بہت مصروفیت کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ ایسا مستقل مسئلہ تھا جو برسوں تک ہماری توجہ کو مصروف کرتا رہا۔ اس وقت مہاتما گاندھی کا فلسفہ صرف مجتمع ہونا شروع ہوا تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کا وہ بڑا ذاتی فیصلہ نہیں کیا تھا جس میں موجودہ مادی ترقی سے بے تعلقی اور انحراف پایا جاتا تھا۔ دس یا بارہ سال تک ہم اور وہ دونوں مختلف موقعوں پر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ہماری ملاقات عام طور پر جنوبی افریقہ کے ہندوستانی مسئلہ کے کسی پہلو پر ہوا کرتی تھی۔ اسی زمانہ میں ہم دونوں پہلی عالمگیر جنگ کے کچھ عرصہ بعد لندن میں موجود تھے۔ جنوبی افریقہ کی جنگ شروع ہونے پر جس طرح مہاتما گاندھی نے کیا تھا اسی طرح انہوں نے برطانوی حکومت کو اپنی امداد فوجی زخمیوں کو اٹھانے اور میدان جنگ میں شفاخانہ کا کام کرنے کے لئے پیش کی۔ اپنے دماغی اور روحانی ترقی کے راستہ پر بہر حال وہ کافی دور تک سفر کر چکے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ہندوستان اور اُن کے ہم وطنوں کی نجات اسی میں تھی کہ وہ موجودہ صنعتی اور مادی ترقی کو جو آجکل کی تہذیب کے نام سے مشہور ہے

ترک کر دیں۔ سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کی شورش کے زمانہ میں جو ہماری ملاقاتیں ہوئیں ان کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اُس کے بعد سے مہاتما گاندھی اپنی بقیہ زندگی تک دنیا کی تاریخ میں ایک بڑی شخصیت رکھتے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ مہاتما گاندھی کے فلسفیانہ نقطۂ نظر اور ان کے سیاسی طرز عمل میں بعض گہرے اختلافات تھے جن کو دور کرنے کی وہ اپنی تمام عمر بغیر مکمل کامیابی حاصل کئے ہوئے کوشش کرتے رہے۔ ان کی زندگی پر جن ہستیوں نے خاص اصلاحی روحانی اثرات ڈالے وہ حضرت مسیح تھے جیساکہ وہ انجیل میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ ٹالسٹائے تھے (TOLSTOY) تھورو (THOREAU) تھے اور ہندو رہبانیت کی مختلف شکلوں کے بیان کرنے والے بعض اصحاب تھے۔ اُس صوفی کی خالص متفکرانہ زندگی سے اُن کو کوئی ہمدردی نہ تھی اور نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی جو دنیا سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ یا ان پادریوں سے خواہ وہ بدھ مذہب کے ہوں یا عیسائی ہوں جو ایک حلقہ میں بند رہنے کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گاندھی کا فلسفہ یہ نہ تھا کہ اس دنیا کو چھوڑ دو بلکہ یہ تھا کہ اس کی اصلاح کرو اور اس اصلاح کے لئے باہمی اور تمدنی انسانی محبت ایک تیز شعلہ کا کام کرے۔ مگر اس کام کے لئے ان کے نزدیک ایک حد تک ترک دنیا کرنا ضروری تھا۔ ہمارے زمانہ کے صنعتی اور حرفتی انقلاب کی پیداوار کے ساتھ یہ رویہ برتنا خصوصیت کے ساتھ دو متضاد چیزوں کا جمع کرنا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ سب آدمیوں کو اس اختیار سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جو سائنس نے قدرت کے اوپر انسان کے ہاتھوں میں رکھ دیا ہے اور جس سے عام طور پر انسانی بہبودی ہر جگہ پھیلائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کا خیال تھا کہ انسان کی موجودہ تمدنی اور روحانی ترقی کی سطح پر اگر بعض آدمی ان فائدوں کو منظور کر لیتے تھے تو عوام کی اکثریت ان سے محروم ہو جائے گی اور وہ نسبتاً اور قطعی طور پر پہلے سے بدتر حالت میں ہو جائیگی۔

یہ متضاد چیزوں کا اجتماع جس کی جڑ ایک گہرے دماغی اور روحانی اختلاف میں پائی جاتی تھی اُن کی ساری زندگی میں ان کے سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ عزیز

دوستوں کے ساتھ جو تعلقات رہے ان میں۔ان کی تعلیمات میں اوران کے طرز عمل میں ہمیشہ ظاہر ہوتا رہا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ پونا میں میری ان سے طویل گفتگو ہوئی۔ جب وہ سخت بیمار رہ چکے تھے اور ان کا اپریشن ہو چکا تھا۔ وہ سیسون شفاخانے میں (SASSOON HOSPITAL) زیر علاج تھے۔ جہاں میں ان کو دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ اس شفاخانہ کی جو تعریف وتوصیف انہوں نے کی۔ اس برطانوی سرجن کی جس نے ان کا اپریشن کیا تھا۔ ان مشورہ دینے والے ڈاکٹروں کی اور وہاں کے تیمار داری کرنے والے عملہ کی۔ وہ سب تعریفیں بے لوث اور بے شمار تھیں۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے کہ چونکہ ہندوستان کی آبادی کے لاکھوں آدمیوں میں سے ہر شخص کا علاج اسی پیمانہ پر نہیں کرایا جاسکتا اس پر ایسی ہی توجہ نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے یہ ایک غلطی ہوگی کہ پونا میں ان کے لئے ایسا علاج مہیا کیا جائے۔ جس طرح ہر شخص سمجھتا تھا وہ بھی بہرحال سمجھتے تھے کہ سیسون شفاخانہ کو ختم کر دینا ایک قسم کا جرم ہوگا اور ہر اس چیز کو ختم کرنا جو وہاں موجود تھی اور جس کے لئے وہ قائم تھا۔ اور یہ کہ اس کے فوائد کسی نہ کسی تک ضرور پہنچنے چاہییں چونکہ وہ سب آدمیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ مگر وہ کس حد تک پہنچیں اور کس حد تک نہ پہنچیں؟ اسی طرح گاندھی محسوس کئے جاتے تھے اور آخر کار ان کا فلسفہ سوال کرتے کرتے ختم ہو جاتا تھا اور اس میں ایک اعتراض اور اختلاف کا پہلو بھی ساتھ ساتھ پیدا ہو جاتا تھا۔

پونا کے شفاخانہ میں اپنے بستر پر لیٹ کر مہاتما گاندھی نے اس مکمل ہم آہنگی کے ناممکن ہونے کا مقابلہ کیا۔ نامکمل ہم آہنگی کا یہ یقینی واقعہ ہے جو اس دنیا میں اسی طرح ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے کسی وقت وہ مادی ترقی کی موافقت میں معلوم ہوتے تھے اور دوسرے وقت وہ اس کے خلاف معلوم ہوتے تھے۔ بعض نکتہ چینیوں کو اس واقعہ سے یہ موقعہ ملا کہ وہ یا تو مہاتما گاندھی کے اس خلوص پر شبہ کریں جو ان کو مسیحی اور ٹالسٹائے کے اصول ونظریات کے ساتھ تھا یا عملی سیاست اور اقتصادیات کی

دنیا میں ان کی کوششوں کی کامیابی پر شبہ کریں۔ اگر یہ محسوس کرلیا جائے تو اس سے زیادہ منصفانہ اور زیادہ فیاضانہ ہوگا کہ اس قسم کے اندرونی اور بیرونی زندگی کے اختلافات اور تضادات میں صرف مہاتما گاندھی ہی تنہا آدمی نہ تھے۔ کیا اس قسم کے اختلافات ہم سب کے لئے زندگی کی بنیاد ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ زندگی کی روحانی اور مادی دونوں حالتوں میں۔ اگر ہم اپنے لئے اور اپنے ساتھی انسانوں کے لئے کسی کام یا خدمت کے لائق ہونا چاہتے ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم جب بہترین طریقہ پر ہم سے ہوسکے ان اختلافات کی روشنی میں زندہ رہے بغیر گذر کرسکتے ہیں؟

۴۶-۱۹۴۵ء میں ہماری آخری گفتگو اپنے طریقہ میں مہاتما گاندھی کی تمام روحانی اور دماغی زندگی کا چھوٹے پیمانہ پر عکس اُتار رہی تھی۔ جہاں پر وہ ہوئی اور جن حالات میں وہ ہوئی۔ اس سیدھی بات کو بہت زور کے ساتھ ثابت کررہے تھے کہ ہماری اس دنیا میں جیسی کہ وہ ہے ہم اختلافات سے کبھی نجات نہیں پاسکتے۔ میں گاندھی سے سیاسیات پر گفتگو کرنے کے لئے آیا تھا۔ مگر چونکہ میں خود ہندوستان کی سیاسیات میں عملی طور پر حصہ لینے والے آدمیوں میں نہ رہا تھا اس لئے میں ایک حد تک اپنے قدیم اور قابل قدر دوست نواب بھوپال کے ساتھی کی حیثیت سے آیا تھا۔ نواب بھوپال جو اس وقت کے موجودہ چیمبر آف پرنسس (CHANCELLOR OF THE CHAMBER OF PRINCES) کے چانسلر تھے۔ اس زمانہ کے مسلمان اعلیٰ طبقہ میں ایک آزاد خیال آدمی تھے۔ چونکہ انہوں نے قائداعظم کے اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ اس برصغیر کا صرف تقسیم کرنا ہی مسلمانوں کو وہ چیز دے سکتا ہے جس کی ان کو ضرورت تھی۔ میں اپنی طرف سے اس وقت بھی یہ امید رکھتا تھا کہ مکمل اور قطعی کاٹ چھانٹ روکی جاسکتی تھی۔ اگر کوئی ایسی چیز منظور کی جاسکتی جو اس دستور کے طرز پر ہوتی جو برطانوی کابینہ کے مشن نے تجویز کیا تھا۔ اب میں صاف طور پر دیکھتا ہوں کہ میرا وہ خیال غلط تھا اور یہ کہ جسم کے ایک حصہ کا کاٹنا ہی اس کا واحد علاج تھا۔ مہاتما گاندھی نے اور میں نے ان معاملات پر

گفتگو کی۔ ہم نے جنوبی افریقہ کے متعلق بھی گفتگو کی۔ پھر میں نے موضوع بدل دیا اور دریافت کیا " آپ کی مارکس کے اصول کے متعلق اور خود مارکس کے متعلق کیا رائے ہے؟ (MARX) انجلس کے متعلق (ENGELS) لینن کے متعلق (LENIN) اور اسٹیلن کے متعلق (STALIN) ان کا جواب اتنا ہی مخصوص تھا جتنا وہ ہوشیاری کے ساتھ دیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا " میں خود سو فی صدی کمیونسٹ ہو جاؤں گا اگر مارکس کی آخری منزل اس کی پہلی منزل بن جائے اور اگر لینن کے اقتصادی نظریات کو فوراً عملی جامہ پہنا دیا جائے "۔

اگر۔ اسی بات میں ان کا تضاد دیا پایا جاتا تھا جیسا کہ مارکس نے بتایا تھا کہ حکومت انقلاب کی آخری حالت میں نہیں بلکہ اس کی پہلی حالت میں ختم ہو جائے۔ اگر لینن (LENIN) کے اس مقولہ کو کہ " ہر شخص سے اس کی اہلیت کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اُس کی ضرورتوں کے مطابق دیا جائے "۔ فوراً عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ تب حقیقت میں مارکس کی بہترین حکومت کا زمانہ (MILLENIUM) شروع ہو جائے گا۔ میں نے اُن کی تردید اسٹیلن (STALIN) کی مسلمہ دلیل کے ساتھ کی۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں جیسی کہ وہ آجکل ہے سرمایہ پرست اور شہنشاہیت پسند حکومتیں موجود ہیں جن کی پیداوار کی قابلیت امن قائم رکھنے اور فائدہ پہنچانے کے لئے صرف نہیں کی جاتی ہے بلکہ وہ ایک ظالمانہ اور شاہانہ جنگ کے ہلاکانی مقاصد کا ذریعہ بننے میں لگائی جاتی ہے۔ ایسی دنیا میں کمیونسٹ حکومت کو لازمی طور پر اس طرح منظم ہونا چاہیئے کہ وہ خود اپنی حفاظت کر سکے اور ایک آزاد سوسائٹی کا قیام کس طرح ممکن ہے۔ جب حکومت درحقیقت کمزور ہو جائے اور جس میں ایک منظم سوشلزم کے ذریعہ سے دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی ابتدائی اور لازمی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔

گاندھی نے کہا " اچھا۔ ایک ملک میں ایسا کرنا چاہیئے۔ ایک ملک میں حکومت کی تنظیم کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس کی پولیس۔ اس کی مسلح فوج۔ اس کے سزا دینے کے قانون اور اس کے جبریہ عمل کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ایک حکومت کو اس طرح پر کمزور

ہوجانا چاہیے۔ جو خوشی وہاں پر پھیلے گی وہ اتنی بڑی ہو گی اور اس قدر دیرپا ہو گی کہ دوسرے ملکوں میں محض شرم کی وجہ سے تمام سرمایہ پرست اور شہنشاہیت پسند سوسائٹیاں اور حکومتیں کمزور ہو کر ختم ہو جائیں گی۔"

اس زمانہ میں زندگی کی بنیاد اور تہ کے اندر جو اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے اس کو نہ گاندھی دور کر سکتے تھے نہ کوئی اور دوسرا آدمی۔ ہم کو مجبوراً دوسرے درجہ کی اور غالباً اس سے بھی کم درجہ کی چیزوں کو برابر برداشت کرنا پڑتا ہے محض اس وجہ سے کہ ہم اپنے مکمل نصب العین اور اپنی خاطر خواہ چیز کو حاصل نہیں کر سکتے۔ گاندھی بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے گو وہ یہ امید رکھتے تھے کہ بنی نوع انسان مارکس (MARX) کی آخری حالت کو حاصل کر سکتی ہے۔ یہ ایسی منزل ہے جس پر پہنچنا اگر کبھی ممکن ہو سکا تو کسی دوسرے راستہ سے چل کر ہو سکے گا نہ کہ اس فوری اور چھوٹے راستہ سے کہ مسیح۔ محمد اور بدھ کی زندگیوں میں سے چند حصے منتخب کر کے ان پر عمل کیا جائے۔

سنہ ۱۹۳۱ء کی اس موسم خزاں والی رات کو رٹز میں آدھی رات کے وقت گاندھی سے میری جو ملاقات ہوئی اس میں ان کی ساتھی مسز نائیڈو (MRS.NAIDU) اپنے رنگ میں کچھ کم دلکش شخصیت نہ رکھتی تھیں۔ جتنی عورتوں سے میں اب تک مل چکا ہوں ان میں وہ سب سے زیادہ قابل قدر عورتوں میں سے تھیں۔ بعض طریقوں میں وہ ایسی قابل قدر تھیں جیسے کہ خود مس نائٹنگیل (MISS NIGHTINGALE) شادی کے بعد اُن کا گھر حیدرآباد میں ہو گیا باوجودیکہ ان کے ذاتی میلانات اور ان کی تربیت انتہائی طور پر جمہوریت کے مطابق تھے مگر وہ شاعرہ تھیں ان کے حساس اور افسانہ پسند تخیل پر اس وقت کے نظام حیدرآباد کے جو موجودہ ایگزالٹیڈ ہائی نس کے باپ تھے کیریکٹر کی روشنی اور اُن کی جدت اور نرالا پن کا اثر پڑا تھا۔ وہ ایک شریف اور خوف زدہ قسم کے آدمی تھے۔ جن کا احساس اور جذبہ بہت نازک اور ستھرا تھا

مگر پھر بھی اُن کو نظر کی بڑی صفائی عطا ہوئی تھی اور ان میں فیصلہ کی آزادی اور فیاضی پائی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے پاس ایک کمزور اور غمگین جسم کے اندر ایک بڑا دل موجود تھا۔ ان کے اندر بھی شاعرانہ شوق موجود تھا۔ اور اُن کی بعض اردو نظمیں درحقیقت شاعری کے نام سے عزت پا سکتی ہیں۔ مسز نیڈو نظام کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں مگر وہ خود بھی ایک حقیقی شاعرہ تھیں جو محبت اور زندگی کے متعلق روحانی دنیا اور شہوانی دنیا کے متعلق بہت زور اور جذبہ کے ساتھ لکھتی تھیں۔ اس جذبہ اور زور کی آمیزش میں جو اُن کی فطرت میں داخل تھا بُغض، نفرت اور بدنیتی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ بڑی زبردست قوم پرست تھیں۔ جن کا یہ پکا خیال تھا کہ انگریزوں کو لازمی طور پر ہندوستان اور ہندوستان کی قسمت کو ہندوستان کے آدمیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر مغربی تہذیب اور مغربی سائنس اور سب سے زیادہ انگریزی زبان کی جو تعریف مسز نیڈو کرتی تھیں وہ بہت گہری اور بے انتہا تھی۔ انہوں نے اپنے تعصب سے آزاد ہونے کا قابل فخر ثبوت رڈیارڈ کپلنگ (RUDYARDKIPLING) کی موت پر دیا۔ کپلنگ کی مکمل شہنشاہیت پسندی، ہندوستانیوں کی قابلیتوں اور سیاسی اہلیت کے متعلق اس کی رائے کے نہایت سخت حدود۔ گو وہ ان کی ذہانت اور وفاداری کی خصوصیات کا اعتراف کرتے تھے۔ مسز نیڈو کے نقطۂ نظر سے بالکل برعکس سمت پر تھے۔ تاہم جب ان کا انتقال ہوا تو مسز نیڈو نے ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے ان کی ذہانت کی تعریف کا مکمل اور فیاضانہ حصہ ادا کیا۔ اس شاعر، ناولسٹ اور قصوں کے بے نظیر بیان کرنے والے کے متعلق اس بات کو سب دلیلوں سے بالاتر ہو کر واضح کر دیا کہ ایک فنکار کی قابلیت کا دوسرے فنکار کی طرف سے اعتراف کرنا اس سے بالکل جدا تھا اور اس پر اس کا کوئی اثر نہ تھا کہ ان میں ایک فن کار دوسرے کی قومی اور سیاسی

فلسفہ سے گہری اور مستقل نفرت رکھتا تھا۔

رٹز ہوٹل میں آدھی رات کے وقت میرے نشست کے کمرہ میں جو دو مشہور آدمی اُس روز آئے تھے وہ اس قسم کے تھے۔ ہم پریس کے فوٹوگرافروں کے سامنے ایک ساتھ فوٹو کے لئے جمع ہوئے اور پھر اپنی باتیں کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ میں نے مہاتما جی سے یہ کہہ کر بات شروع کی کہ "اگر وہ درحقیقت اپنے آپ کو مسلمانوں کا صحیح باپ ظاہر کریں گے تو مسلمان اس کا جواب اس طرح دیں گے کہ اپنی انتہائی قابلیت کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کے لئے مہاتما جی کی کوشش میں اُن کی مدد کریں گے۔"

مہاتما جی نے میری طرف منہ کیا اور کہا۔ "میں سچائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کے لئے میرے اندر پدرانہ محبت کے جذبات موجود ہیں لیکن اگر آپ اس معاملہ کو سیاسی ضرورت کی غرض سے رکھتے ہیں تو میں اس پہ ایک تعاونی جذبہ کے ساتھ گفتگو کرنے کو تیار ہوں۔ میں جذبات کی کسی حالت میں اپنے آپ کو نہیں ڈال سکتا ہوں۔"

یہ شروع ہی سے ایک سرد جھٹکا تھا اور اس کی ٹھنڈ کا اثر ہماری تمام بقیہ گفتگو پر قائم رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ حالانکہ میں نے صحیح جذباتی تعلق اور قرابت کا ایک فوری اور اصلی ثبوت پیش کیا تھا پھر بھی مہاتما جی کی طرف سے اس کا ردعمل اسی کے مانند نہیں ہوا۔

اس کے برسوں بعد ۱۹۴۰ء میں میں نے مہاتما جی کو یہ بات یاد دلائی انہوں نے کہا کہ ان کو وہ واقعہ پوری طرح یاد ہے اور کہنے لگے کہ "مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ نے میرے اس جواب کو غلط سمجھا۔ میرا یہ مطلب نہ تھا کہ مجھے کسی جذباتی تعلق کا احساس نہ تھا اور مسلمانوں کی بہبودی کے لئے میرے اندر کوئی احساس نہ تھا بلکہ میرا صرف یہ مطلب تھا کہ مجھے پوری "خون کی برادری" کا احساس تھا۔ مگر اس "برتری" کا احساس نہ تھا جو باپ ہونے میں شامل ہوتی ہے۔"

میں نے اپنی طرف سے اُس "باپ" کے لفظ سے صرف یہ مطلب لیا تھا کہ میں اُن کی عمر کی کمزوری کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لئے احترام کا اظہار کروں۔ اور وہ کمزوری درحقیقت اُن کی صحت یا دماغی قوت سے متعلق نہ تھی۔ میرا مطلب یہ نہ تھا کہ میں کسی برتری کی طرف اشارہ کروں۔

یہ بُری قسم کی ابتدائی غلط فہمی جو محض الفاظ کے استعمال کرنے پر ہوئی اس وقت کے فوری اثر سے زیادہ اثر ڈالتی رہی چونکہ اُس نے یہ اثر پیدا کیا جو صرف اسی رات کو قائم نہ تھا بلکہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے تمام زمانہ میں باقی رہا کہ ہندو مسلم دوستانہ مفاہمت (ENTENTE) کے لئے ہماری کوششیں خالص طور پر سیاسی تھیں اور ان کے اندر طویل مصاحبت کے مستقل جذباتی تعلقات اور ایک دوسرے کی تہذیب و کلچر کی تعریف نہ پائی جاتی تھی۔ اس طرح پر کسی دوستانہ مفاہمت میں جو ہم پیدا کر سکتے تھے کوئی خلوص اور قلبی تعلق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم "سرد سیاست" کی طرف لوٹ کر آ گئے تھے۔ جس کے اندر جذباتی سمجھوتہ کی وہ روح پھونکنے والی گرمی نہ تھی جو ہماری بحثوں پر اثر ڈالے اور اُن کو تقویت پہنچائے۔

اس ابتدائی گفتگو میں ہم کچھ زیادہ دور تک نہ پہنچ سکے۔ اُس کے بعد ایک اور سلسلہ گفتگو کا شروع ہوا اور وہ عام طور پر آدھی رات کے وقت رٹز ہوٹل میں میرے کمروں کے اندر ہوا۔ میں بحیثیت میزبان اُس کی صدارت کرتا تھا اور مسٹر جناح اور سر محمد شفیع ایک طرف سے اور مہاتما گاندھی دوسری طرف سے مفاہمت کی گفتگو کرتے تھے ان بحثوں کی کہانی بہت طویل ہے اور افسوس ہے کہ وہ خاص طور پر بار آور نہ تھی۔

یہ تمام گفتگو غیر رسمی طور پر ہوئی اور اُن کی کوئی تحریری یادداشت نہیں رکھی گئی۔ میں نے بہت کم بات کی اور بحث کا بڑا حصہ مسٹر جناح اور سر محمد شفیع کے لئے چھوڑ دیا۔ اور دوسرے ڈیلی گیٹوں کے لئے جو وقتاً فوقتاً اس بحث میں حصہ لیتے تھے۔ خاص طور پر سر ظفر اللہ خان۔ مسٹر شوکت علی اور شفاعت علی خاں مرحوم۔ اس تنازعہ کا بڑا حصہ مجھے فٹز جیرالڈ (FITZ GERALD) کے ان اشعار کو یاد دلاتا تھا۔

"میں خوب نوجوان تھا تو بڑے شوق سے ڈاکٹروں اور مذہبی بزرگوں کے پاس جایا کرتا تھا اور بہت سی دلیلیں سنا کرتا تھا۔ اس کے متعلق اور اُس کے متعلق۔ مگر میں ہمیشہ اسی دروازہ سے باہر آجاتا تھا جس دروازہ سے میں اندر جاتا تھا۔"

ہمیشہ بحث لوٹ پلٹ کر چند بنیادی نقطہائے اختلاف پر آجاتی تھی۔ مثلاً کیا ہندوستان میں ایک قوم ہے یا دو قومیں؟ کیا اسلام صرف ایک مذہبی اقلیت ہے یا مسلمانوں کو اُن رقبوں میں جہاں وہ اکثریت میں تھے خاص سیاسی حقوق اور ذمہ داریاں حاصل ہونی چاہئیں؟ کانگریس کا رویہ ہماری نظر میں نظریاتی اور غیر حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ وہ بہت سختی کے ساتھ ایک قوم والے نظریہ کو تسلیم کرتے تھے۔ جس کے متعلق ہم جانتے تھے کہ وہ تاریخی اعتبار سے قابل تائید نہیں ہے۔ ہم مانتے تھے کہ برطانوی راج کے آنے سے پہلے ہندوستانی برصغیر کے مختلف رقبے کبھی ایک ملک کی حیثیت سے نہ تھے۔ یہ کہ برطانوی راج نے ایک عارضی اور چند روزہ اتحاد پیدا کر دیا تھا اور جب وہ راج چلا جائے گا تو وہ اتحاد کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ مختلف قومیں جن کے اندر گہرے نسلی اور مذہبی اختلافات موجود ہیں ہمیشہ کے لئے ایک مقام پر سونے والے نہیں رہ سکتے بلکہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور جاگیں گے اور اپنے اپنے جداگانہ راستوں پر چلے جائیں گے اس لئے تفصیلی معاملات میں ہم

خواہ کتنا ہی قریب ہو کر متفق ہو جائیں مگر اصولی نقاط پر یہ آخری اختلاف دور نہیں کیا جا سکتا۔

مہاتما نے ایک ابتدائی اور بنیادی شرط لگانے کی کوشش کی۔ وہ یہ تھی کہ قبل اس کے کہ مسلمان اپنے لئے کسی تحفظی امور کا مطالبہ کریں اُن کو چاہیئے کہ وہ کانگریس کے سوراج کے مفہوم کو۔ یعنی حکومت خود اختیاری کو اپنا آخری مقصد تسلیم کر لیں۔ اس کا مسٹر جناح نے بہت صحیح طریقے پر یہ جواب دیا کہ چونکہ مہاتما نے یہ شرط دوسرے ہندو ممبروں پر نہیں لگائی تھی جو مختلف ڈیلی گیشن لے کر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے اسلئے یہ شرط مسلمانوں پر وہ کیوں لگاتے ہیں؟ اس پر ایک اور سخت رکاوٹ پیدا ہو گئی۔

ہماری شرائط برابر یکساں رہیں۔ یعنی مرکز کے لئے بہت کم اختیارات دیے جائیں سوائے فوج اور امور خارجہ کے۔ باقی تمام اختیارات منتقل کر دیے جائیں۔ خاص طور پر اُن صوبوں کو جن میں مسلمان اکثریت میں تھے مثلاً پنجاب بنگال۔ سندھ۔ بلوچستان اور ممالک مغربی و شمالی۔ ہم اس معاملہ میں بہت سختی کے ساتھ مستقل رہے۔ چونکہ ہم جانتے تھے کہ اُن مسلمانوں کی اکثریت جو بنگال اور پنجاب میں رہتی تھی اسی طرح مستقل تھی۔

مہاتما گاندھی کو اس کا پوری طرح اندازہ تھا کہ ہم لوگوں کا اُن کے حلقہ میں شامل رہنا کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کو کون جانتا تھا؟ شاید مہاتما گاندھی ہمارا نقطۂ نظر تسلیم کر لیتے۔ مگر پنڈت مالویہ اور ہندو مہاسبھا نے ہمارے خلاف بہت بڑا دباؤ ڈالا اور وہ دلیلیں استعمال کیں جن کی بنیاد محض خیالی سیاسی نظریات اور اصول پر تھی اور جو ہندوستان کے حقائق سے بالکل تعلق نہ رکھتی تھیں۔ جیسا کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم نے ثابت کر دیا۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا موشگافی زیادہ سے زیادہ باریک ہوتی گئی۔ اوراس کے متعلق دلیلیں زیادہ سے زیادہ خیالی اور نظریاتی ہوتی گئیں مثلاً کوئی قوم غیر معینہ اختیارات اپنے صوبوں کو منتقل نہیں کرسکتی۔ اُن ترکیبوں کی حدود قائم کرنے کے لئے کوئی دستوری طریقہ نہیں تھا جس سے ایک اکثریت رکھنے والی قوم کو بدل کر ایک اقلیت رکھنے والی قوم بنایا جاسکے۔ یہ سب بہت دلفریب درسگاہی مسائل ہیں مگران کا کوئی تعلق ہندوستانی زندگی کے صحیح واقعات اوراعداد سے نہیں ہے۔

یہ مناسب ہے کہ مجھے ایک عملی اصلاح کا ذکر ضرور کرنا چاہیئے جو ہماری سب بحثوں سے پیدا ہوئی اور جس نے آخر میں ۱۹۴۷ء کے تصفیہ میں کچھ کام کیا یہ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی تھی اور ایک صوبہ کی حیثیت سے اس کا قیام جس میں ایک گورنر ہو اور جہاں یہ خود اسی صوبہ کا انتظام ہو۔ اس سے پہلے نتیس سال کے عرصہ تک ان دونوں کا مسلسل تعلق تاریخ میں ایک غیر قدرتی اور وقت کے نامناسب واقعہ رہ چکا تھا۔ اس کی بناء پر سندھ کی موجودہ پستی اور تنزل سمجھ میں آسکتی ہے اور وہ حسد اور رقابت جو بمبئی اور کراچی کے درمیان پیدا ہوئی۔ یعنی بمبئی وہ بڑا شہر تھا جو حکومت کرتا تھا اور کراچی وہ چھوٹا شہر تھا جو محکوم تھا۔

بمبئی کے صوبہ میں آئی۔ سی۔ ایس کے افسر جو اپنی ملازمت کے سب سے اونچے درجوں پر پہنچتے تھے وہ مرہٹی اور گجراتی ضلعوں میں برسوں گذارنا پسند کرتے تھے۔ نسل۔ زبان۔ مذہب اور ملک کی قدرتی ساخت کے اعتبار سے سندھ صوبہ کے دوسرے حصوں سے مختلف تھا۔ اس میں ملازمت کرنے کے لئے بالکل مختلف نقطۂ نظر۔ ذہنیت اور تربیت کی ضرورت تھی سندھ کے متعلق بہت سے معاملات میں مثلاً ذرائع آمد ورفت سڑکیں اور اندرونی ترقی۔ وہ انتظامی مرکز جس سے سندھ بہت دور تھا غفلت

برتتا تھا اور جس کے ساتھ اُس کا تعلق یا تو سمندر کے راستہ سے ہوتا تھا یا خود مختار دیسی ریاستوں کے علاقوں سے گذر کر ہو سکتا تھا۔

سندھ کو جدا کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لئے ایک خاص کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کے مسلمان نمائندوں نے جن میں سے ایک میں بھی تھا اس معاملہ پر فرقہ وارانہ حیثیت سے بحث نہیں کی۔ بلکہ ہم نے اس بات پر زور دیا کہ سندھ کو بمبئی سے اس بنیاد پر علیحدہ کر دینا چاہیئے کہ یہ اس کے باشندوں کے لئے ایک عام انصاف کا کام ہوگا اور یہ عملی اور انتظامی وجوہ پر کیا جائے گا۔ ایک یا دو ممبروں کے علاوہ جو بمبئی کے نمائندہ تھے اور جو علیحدگی کے خلاف تھے ہمارے دوسرے ہندو ساتھیوں نے ہماری تائید کی اور ہماری تجویز منظور کر لی گئی۔

اس خاص کمیٹی کے چیرمین ارل رسل (EARL RUSSELL) مرحوم تھے جو موجودہ ارل کے بڑے بھائی تھے جو برٹرینڈ رسل (BERTRAND RUSSELL) کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ بہت زندہ دل اور دلچسپ شخصیت رکھنے والے تھے جو اپنی شروع زندگی میں ایک طوفانی ازدواجی زندگی کی قانونی اور سوشل پیچیدگیوں اور مشکلات کو برداشت کر چکے تھے اور ان پر قابو پا چکے تھے وہ پہلے ارل۔ لارڈ جون رسل (LARD GOHN RUSSELL) کے پوتے تھے جو ملکہ وکٹوریہ کے مشہور وہگ پارٹی (WHIG) کے وزیر اعظم تھے۔ وہ انگلستان کی اس وہگ پارٹی کی قدیم حکومت کے اندرونی حلقہ میں پیدا ہوئے تھے اور پرورش پا چکے تھے اس وجہ سے وہ خود اعلیٰ پیمانہ پر غیر جانبدار تھے اور فرقہ وارانہ احساس نہ رکھتے تھے۔ خدا نے ان کو ایک عجیب حافظہ کی قوت عطا فرمائی تھی جس میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود تھا اور اُن میں بحیثیت ایک قصہ گو کے بڑے کمالات تھے۔

کانفرنس کے ختم ہونے پر زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ جنوبی فرانس میں

اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی موت کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔ چونکہ مجھے امید تھی کہ ہماری دوستی ہماری بقیہ زندگی تک جاری رہے گی اور اُس کو خوشگوار بناتی رہے گی۔

اُن کی پہلی بیویوں میں سے ایک بیوی جو میرے اس زمانہ کے مکان سے زیادہ دور نہ رہتی تھی جو اینٹی بے (ANTIBES) کے مقام پر تھا کچھ ان سے کم قابل قدر اور اچھوتا کیرکیٹر رکھنے والی نہ تھی۔ وہ دُبلی پتلی۔ ناقابل نقل اور ناقابل شکست ایلیزبتھ (ELIZABETH) تھی جو ایلیزبتھ اور اپنے جرمن باغ کے نام سے مشہور تھی۔ اُس نے آخر تک اپنے باغ لگانے کے شدید شوق کو قائم رکھا۔ وہ موجنس (MOUGINS) کے دیہاتی کلب اور گولف کھیلنے کے میدان سے زیادہ دور نہ رہتی تھی۔ اُس نے وہاں کے باغات اور گلکاری کے اکثر حصہ کا نقشہ بنایا۔ میری بیوی پرنسس اینڈری (ANDREE) اور میں نے ایک مرتبہ سے زیادہ اپنے باغ کے متعلق اُن سے مشورہ کیا تھا۔

راونڈ ٹیبل کانفرنس کا پھر ذکر سنیئے۔ آخر میں اس کے بہت سے طویل اجلاسوں سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ مہاتما گاندھی ہندوستان واپس چلے گئے۔ ہمارے سب کام کا مجموعی نتیجہ نقشہ جات اور تاریخ وار اندازا جات کا ایک وسیع سلسلہ تھا۔ بہت سی تقریریں ہوتی تھیں اور کوئی مقررہ سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ دوسری کانفرنس ختم ہو گئی۔ سب ڈیلی گیٹ روانہ ہوگئے اور ہم انتظار میں رہے کہ وہ تیسری راونڈ ٹیبل کانفرنس درحقیقت کب ہوگی مگر اس کے متعلق سرکاری طور پر معلوم ہوا کہ وہ جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی (JMATSSLECTCOMMITTEE) کی حیثیت سے ہو گی جس کو پارلیمنٹ نے 'مارکواس آف لن لتھ گو' کی (MARBUFSS OF LINLITHGOW) صدارت میں مقرر کیا تھا۔ اور جو ہندوستان کے وفاقی دستور کا مسودہ تیار کرنے والی تھی۔

اس اثنا میں سیاسیات کے باہر میری معمولی زندگی اطمینان سے

ساتھ چلتی رہی جس میں بہت سے واقعات پیش آتے رہے۔ میری بیوی پرنسس اینڈری (ANDREE) پہلی دو راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کے مصروف اور طویل اجلاسوں کے زمانہ میں میرے لئے بیش قیمت امداد اور سہارا دینے والی ثابت ہوئیں۔ چونکہ ان کانفرنسوں میں مہمان نوازی اور میل جول کی بھرمار تھی۔ پارٹیاں۔ دعوتیں اور بے شمار ڈنر جن میں میری بیوی میری مسلسل خوشگوار اور کامیاب شریک کار رہیں۔ جنوری سنہ ۱۹۳۳ء میں میرا دوسرا بیٹا صدرالدین نیولی (NEUILLY) کے مقام پر جو پیرس کے باہر تھوڑے فاصلہ پر ہے وہاں کے امریکی سفارت خانہ میں پیدا ہوا۔ اس سال کے آخر میں پرنسس اینڈری میرے ساتھ پہلی مرتبہ ہندوستان گئیں۔ ہم اپنے بیٹے کو جنوبی فرانس میں چھوڑ گئے تھے۔ ہم نے سارے ملک میں سفر کیا اور بہت سے مشہور خوب صورت اور تاریخی مقامات کو دیکھنے گئے۔ ہم کچھ دن مشہور مہاراجہ بیکانیر کے پاس ٹھیرے۔ کلکتہ میں ہم گورنر سر جان اینڈرسن (SIR JOHN ANDERSON) کے مہمان کی حیثیت سے رہے کچھ عرصہ کے لئے ہم پہاڑوں پر گئے اور وہاں سے برما تک سفر کیا۔ ہم اپریل سنہ ۱۹۳۴ء میں اپنے مکان پر کینس (CANNES) میں واپس آئے اور اس چھوٹے سے مضبوط اور تندرست لڑکے کو دیکھ کر خوش ہوئے جو اب کافی بڑا ہو گیا تھا۔

میں پھر سیاسی زندگی میں پوری طرح مصروف ہو گیا۔ ہندوستانی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تیسری قسط شروع ہونے والی تھی۔ برطانیہ کے اندر بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں جو میکڈانلڈ۔ بالڈون (BALDWIN) کی قومی حکومت قائم ہونے کا نتیجہ تھیں مسٹر رامسے میکڈانلڈ (MR-RAMSAY-MACDONALD) اس وقت بھی وزیر اعظم تھے۔ مگر اب دارالعوام میں ان کو جو مدد ملتی تھی وہ کنزرویٹو پارٹی کی بڑی اکثریت سے ملتی تھی جس کے مالک مسٹر بالڈون (MR. BALDWIN) تھے۔ اس کی وجہ سے مسٹر بالڈون ہندوستان کے متعلق ہماری تجویزوں اور

بحثوں سے براہ راست اور قریبی واسطہ رکھنے کے قابل نہ رہے تھے۔ مگر تمام اہم معاملات میں بلاشبہ اُن سے مشورہ لینا برابر جاری رہا۔ اس کو ہر شخص سمجھتا تھا کہ تمام باا‌ثر فیصلے اسی آدمی کی طرف سے کئے جاتے تھے جو انڈیا آفس کا انچارج تھا۔ اور یہ درحقیقت سر سیموئل ہور (SIR SAMUELHOARE) تھے۔ وہ بہت حساس۔ دور اندیش۔ وسیع الخیال اور نہایت تیز ذہن سیاسی آدمی تھے۔ جن کو ہماری درمیانی بیسویں صدی کی دنیا کے حقائق سے پوری واقفیت تھی اور جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا وہ اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ پکے شہنشاہیت پسندوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔

سنہ ۱۹۳۴ء کے موسم بہار میں جائنٹ سلیکٹ کمیٹی (JOINTSELECTCOMMITTEE) لندن کے مقام پر جمع ہوئی۔ لارڈ لن لتھگو آگے چل کر ہندوستان کے وائسرائے ہونے والے تھے۔ اس کمیٹی کے ممبر بہت مختلف تھے اور مضبوط۔ برطانوی نمائندوں میں کنزرویٹو پارٹی کی بڑی اکثریت لازمی طور پر شامل تھی ہندوستان کے متعلق مختلف ممبروں کا علم اور تجربہ اپنی نوعیت اور مقدار کے اعتبار سے مختلف تھا۔ ایسے معزز اور بااثر لیڈر جیسے کہ لارڈ ڈربی (DERBY) اور سر اوسٹن چیمبرلین (SIRAUSTINCHABERLAIN) شروع میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ دوسرے اصحاب ایسے بھی تھے جو آزادی کے ساتھ ہندوستانی مسائل کے متعلق کسی وفاقی حل کے خیال ہی سے اختلاف کرتے تھے۔ ہندوستان کی نمائندگی بہ حیثیت مجموعی اچھی تھی۔ مہاتما گاندھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ مگر ہندوستانی قوم کا ترقی یافتہ عنصر اچھی خاصی تعداد میں موجود تھا جو کانگریس کے علاوہ اور دوسرے حلقوں سے لیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے دوران میں جو کچھ واقعہ ہوا جب میں اس پر نظر ڈالتا ہوں تو اب مجھے مسٹر جناح کی عدم موجودگی کا اتنا ہی افسوس ہوتا ہے جتنا کہ

مہاتماجی کی عدم موجودگی کا۔ ہم مسلمانوں کے لئے یہ بے انتہا بدقسمتی ہوئی کہ ہم نے اس پر اصرار نہ کیا کہ مسٹر جناح کو اپنے ساتھ رکھیں۔ اگر وہ ڈیلیگیشن کے ممبر ہوتے تو وہ ایسا کام کرتے جو میں خیال کرتا ہوں کہ ان راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کا سب سے زیادہ مفید نتیجہ شمار کیا جاتا۔ یہ وہ مشترکہ یاد داشت (JOINT MEMORANDUM) تھی جس نے ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی تاریخ میں پہلی مرتبہ برطانوی حکومت کے سامنے سب فرقوں کی طرف سے ایک متفقہ مطالبہ پیش کیا جس میں تقریباً ہر اہم سیاسی پہلو جو متنازعہ تھا موجود تھا۔ وہ اس کی تفصیل کرتا تھا کہ آئندہ ترقی کرنے کے لئے نتیجہ میں کون سا بڑا اقدام اٹھے گا۔ یعنی دراصل وہ آخری قدم جو مرتبہ نوآبادیات حاصل ہونے سے پہلے اٹھایا جائے گا۔ اس کے ذریعہ سے ہم نے یہ کوشش کی کہ آئندہ ذمہ داری کے منتقل ہونے کا عمل یقیناً برابر جاری رہے اس پر سب غیر سرکاری ہندوستانی ڈیلیگیٹوں نے دستخط کئے۔ اس کا مسودہ ڈیلیگیشن کے ہوشیار سکرٹری نے اور میں نے تیار کیا تھا۔ اس میں یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں عملی طور پر ہر اختیار منتقل کر دیا جائے سوائے چند آخری منظوریوں کے جو برطانوی گورنمنٹ کے لئے مخصوص رکھی جائیں گی اگر ان اصول پر دستور منظور کر لیا جاتا تو آئندہ کے سب نازک حالات میں بہت کم مشکلات پیش آتیں۔ مثلاً ۱۹۳۹ء میں ہندوستان کا اعلان جنگ۔ وہ مسائل جو ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن (CRIPS MISSION) کے سامنے آئے۔ اور اختیارات کا آخری اور مجموعی طور پر منتقل کیا جانا۔ اگر یہ دستور پوری طرح قائم ہو جاتا اور اس کو ایک کام چلانے والا طریقہ سمجھ کر منظور کر لیتے تو آگے چل کر مناسب وقت پر یہ بات نسبتاً بہت آسان ہو جاتی کہ ان مخصوص اختیارات میں کاٹ چھانٹ کر دی جاتی۔ جو ہمارے مسودہ میں دستوری ترقی اور دستوری نظام حاصل ہونے کا آخری درجہ شمار کیا گیا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا بل کے متعلق جوائنٹ کمیٹی (JOINT COMMITTEE) کے سامنے

میں نے جو شہادت دی تھی اُس میں میں نے کہا تھا کہ :-

"میں" ذمہ دار حکومت" کے الفاظ کو تسلیم کرتا ہوں گو ایک نصب العین کی حیثیت سے میں" حکومت خود اختیاری" کو ترجیح دیتا ہوں جو یا تو امریکہ کے وفاقی نظام کے مطابق ہو یا سوئٹزرلینڈ کے طریقہ پر ہو جس میں آخری اختیارات اِنی شی ایٹو (INITIATIVE) ریفرنڈم (REFERENDUM) یعنی عام رائے شماری اور شاید ریکال (RECALL) پر چھوڑ دئے جائیں مگر موجودہ حالت کے اصلی واقعات کو تسلیم کرنا ضروری ہے 'ذمہ دار حکومت' لازمی طور پر ہمارے لئے وہ راستہ ہونا چاہیئے جس سے ہم آئندہ چل کر ایسا نظام پیدا کرلیں جو بڑی ریاستوں کے اس مجموعہ کے لئے مناسب ہوگا جو ہندوستان آگے چل کر بن جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ ایسا راستہ اس چیز میں مل جائے گا جو امریکہ کے وفاقی نظام کے مانند ہو"

جیسا کہ ہمارا خیال تھا اس مشترکہ یادداشت کی تمام خوبیوں کے باوجود کانگریس نے اس کو منظور نہیں کیا اور اس وجہ سے برطانوی گورنمنٹ اپنی طرف سے مجبور ہو گئی کہ اس کو نامنظور کردے۔ اس کی جگہ انہوں نے وہ دستور پیدا کیا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے اندر پایا جاتا ہے۔ جس میں برطانوی مداخلت کے لئے بہت سی خامیاں چھوڑ دی گئیں اور درحقیقت ان معاملات کے متعلق جن پر ہندوستانی وطن پرست یقین رکھتا تھا کہ ان کا طے کرنا پوری طرح ہندوستان کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ برطانوی گورنمنٹ نے اصلی فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھا مثلاً ہندوستان کا دوسری عالمگیر جنگ میں شریک ہونا اس کی سب سے بڑی ناکامیابی یہ تھی کہ وہ کوئی بنیاد نہ رکھتا تھا جس پر کوئی عمارت بنائی جاسکے۔ سر اسٹیفورڈ کرپس (SIRSTAFFORD CRIPPS) اپنے ۱۹۴۲ء والے مشن میں اور لارڈ ایلیگزنڈر آف ہلز بورو (LORDALEXANDER OF HILLSBOROUGH) اور پیتھک لارنس (PETHICKLAWRENCE) اپنے بعد والے مشن میں اس ناخوشگوار واقعہ سے بہت رکاوٹ میں پڑ گئے۔ اس ایکٹ میں یہ بھی نہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے

درمیان اختلاف کو دور کرنے کے لئے جو کوشش کی جائے اس میں کوئی زور پیدا کیا جائے۔ ۱۹۴۲ء اور ۴۷-۱۹۴۶ء کے آزمائشی زمانہ میں اس ایکٹ کا کھوکھلاپن اور اس کی خامیاں بہت اچھی طرح ظاہر ہوگئیں۔ ایکٹ کے اندر ہندوستانی آزادی کے صحیح معنی کی وضاحت نہ کرنا اور اس کے اندر مخصوص اختیارات کا موجود ہونا ایسی باتیں تھیں جن سے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ نے ایک متحدہ ہندوستان کے وجود میں آنے کو ناممکن بنادیا تھا۔ اس کو ضرور ختم کرنا تھا اور اس بات کی کوشش کرنا تھی کہ ہندوستان کی آزادی کی تعمیر پھر شروع کی جائے اس وقت یہ بات بہت سختی کے ساتھ واضح ہوگئی کہ ہندوستان کا متحد ہونا ناممکن تھا تاوقتیکہ اس کی بنیاد بے حد وسیع وفاقی یا اجتماعی بنیادوں پر نہ رکھی جائے۔

۱۹۴۷ء کے دوسرے کابینہ مشن نے آخر کار ایسا دستور تجویز کیا تھا جس سے ہندوستان کا اتحاد قائم رہتا مگر اس کی قیمت یہ ادا کرنی پڑتی کہ تمام آخری اختیارات ایک وفاقی ہندوستان کی تین مجموعی ریاستوں کو منتقل کر دئے جائیں۔ یہ اس قسم کا دستور تھا جس کے لئے ہماری ۱۹۳۴ء والی مشترکہ یادداشت قدرتی طور پر اور مستقل طریقہ سے رفتہ رفتہ زمین تیار کر سکتی تھی۔ کانگریس کا رویہ اس آخری کوشش کے متعلق صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ نیم گرم تھا اور وہ بھی راستہ میں ختم ہوگیا۔ آخر میں جو حل رہ گیا تھا وہ صرف وہی تھا جو واقع ہوا اور وہ دو عجیب جوڑواں پیدا ہونے والے بچے جو سیام کے بچوں کی طرح تھے یعنی مسلم انڈیا اور اور ہندو انڈیا۔ جو ایسی بے چینی اور بے آرامی کے ساتھ ایک جگہ رہ چکے تھے ایک تیز اور سخت جراحی عمل کے ذریعہ سے جدا کر دئے گئے۔

باب نمبر ۱۲

لیگ آف نیشنز کی شخصیتیں اور وہاں کی پالیسیاں

مشترکہ یادداشت تیار کرنے کے بعد اور ۱۹۳۴ء میں مشترکہ انتخابی کمیٹی کا کام ختم ہونے پر میرا تعلق ہندوستانی سیاست سے ختم ہو گیا۔ بہر حال مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں پبلک معاملات کے ایک نئے راستہ کی طرف چل رہا ہوں اور ایسی نئی مصروفیتوں میں لگ رہا ہوں جو ۱۹۳۰ء سے دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے تک میری زندگی کا خاص مشغلہ اور دلچسپی کا ذریعہ ہونے والی تھیں۔

انڈیا آفس میں سر سیموئل ہور (SIR SAMUELH OARE) کے ساتھ میرے قریبی تعلقات ہونے کی وجہ سے ان مصروفیتوں میں ترقی ہو گئی۔ ہندوستانی معاملات پر ہماری سرکاری بحثوں کے درمیان جو وقت ہم کو ملتا تھا اس میں ہم دونوں اکثر اور روز افزوں ترقی کے ساتھ عالمگیر معاملات کی تحقیقات کیا کرتے تھے جو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی زمانہ میں ایک نہایت دلچسپ اور ساتھ ہی خطرناک موضوع شمار کیا جاتا تھا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیانی زمانہ میں وہ عجیب آسان اور قابل فہم خوش بینی جس نے بہت سے آدمیوں کی امیدوں کو بڑھا رکھا تھا۔ تیزی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک گہری اور بڑھنے والی بے چینی پیدا ہو گئی۔ پہلی

عالمگیر جنگ کے فوراً بعد والے سالوں میں جو مغالطے پیدا ہوئے تھے ان کو یاد کرنے سے افسوس ہوتا ہے۔ میں نے عام طور پر مشہور ذہانت والے آدمیوں کو جو عادتاً ان حلقوں میں رہتے تھے جو باخبر شمار کئے جاتے تھے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "جنگ نے دنیا کو غریب نہیں بنایا بلکہ اس کو مالدار بنا دیا ہے اور یہ کہ اس کا ظاہری خرچہ قیمتوں کے کنٹرول اور اقتصادی انتظام کے ذریعہ سے سب وصول ہو چکا ہے"۔ جب سستے کا زمانہ آیا صرف اس وقت اس کا اندازہ ہوا کہ جنگ کی قیمت ضرور ادا کرنی پڑتی ہے۔ جب وہ احساس پیدا ہو گیا تب یہ بات بہت سختی کے ساتھ ظاہر ہو گئی کہ دنیا ایک نئی مصیبت کی طرف جھک رہی تھی۔

جیسا کہ اب ہے ایسا ہی اس وقت تھا کہ جرمنی اور جرمن لوگوں کے مسئلہ کو نظرانداز کرنا ممکن نہ تھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ آجکل یورپ کی مشکلات اور معاملات کی گتھی جرمنی کے اندر پائی جاتی ہے۔ جرمنی کے مسئلہ کو قطعی طور پر حل کئے بغیر دنیا میں حقیقی اور مستقل امن و سکون کی درحقیقت کوئی امید نہیں ہے وہ حل یا تو اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو روس اور دوسری طرف وہ مغربی حکومتیں جو امریکہ کی قیادت کے ماتحت ہیں ان دونوں کے درمیان ایک آزاد اور پُرخلوص سمجھوتہ ہو جائے یا اس طرح ہو سکتا ہے کہ جرمنی کو مغربی یورپ سے ملا کر اور اس میں شامل کر کے متحد بنا لیا جائے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی زمانہ میں جرمنی کا مسئلہ ہمارے لئے ایسا ہی خطرناک تھا۔ اس قسم کے سوالات کہ مغربی دنیا کس طرف کو جا رہی تھی۔ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کس طرح کرے گی۔ امن اور جنگ کا بڑا تنازعہ۔ یہ سب باتیں اس سوال سے بالکل ناقابل علیحدگی تھیں کہ جرمنی میں کیا ہونے والا تھا۔

آٹھ کروڑ نہایت ذہین۔ محنتی۔ قابل اور خوب تعلیم یافتہ آدمیوں کی آبادی جو رائن (RHINE) اور وسٹولا۔ (VISTULA) بحر شمالی اور ایلپس (ALPS) کے درمیان ایک نسبتاً چھوٹے رقبہ میں تنگی کے ساتھ بند کر دی گئی تھی

اور جن کے رشتہ داروں کی نوآبادیاں اس حکومت کی سرحد کے باہر اسٹریا کے سڈیٹن لینڈ میں (SUDETANLAND) اور دور تک رومینیا (RUMANIA) اور روس کے حصوں میں موجود تھیں۔ جو متحد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر جس کو اپنی مذہبی اور ملکی جنگ کی طویل تاریخ کا بھی علم تھا۔ اس قسم کی آبادی یورپ کے درمیانی اور مرکزی حصہ میں ایک مستقل اور وسیع پیمانہ کا مسئلہ بن گئی تھی۔ یہ اپنی قسم کی واحد مثال نہ تھی۔ مطلق العنان اٹلی بہت اچھی طرح ابھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ مسولینی (MUSSOLINI) کے شاہانہ حوصلے ایتھوپیا (ETHOPIA) اور البانیا (ALBANIA) کے ساتھ اس کا طرز عمل اور بحر روم کے متعلق اس کی باتیں سب کو معلوم تھیں۔

مسولینی (MUSSOLINI) اپنے جرائم اور اپنی حماقتوں کے باوجود جن کی وجہ سے بے عزتی کے ساتھ اسکا تنزل اور اسکی موت واقع ہوئی بہت سے اعتباروں سے ایک شاندار اور زبردست شخصیت کا آدمی تھا۔ اسنے اٹلی کے اندر دو جنگوں کے درمیانی زمانہ میں وہ سیاسی نئی تحریک پیدا کی جو بعض صورتوں میں اُس مذہبی نئی تحریک کے مشابہ تھی جو ویسلے (WESLEY) نے انگلستان کے اندر اٹھارھویں صدی میں پیدا کی تھی۔ مسولینی کی نئی تحریک نے عوام کے ہر طبقہ پر اثر نہیں کیا تھا اور اسی طرح میتھوڈزم (METHODISM) کی تحریک نے نہیں کیا تھا۔ مگر اس کے اکثر جذبات اٹلی کی سوسائٹی پر بہ حیثیت مجموعی چھا گئے تھے اور ان کا اثر خود فیسسٹ پارٹی (FASCISTPARTY) کے حلقوں سے باہر تک پہنچ گیا تھا۔ مثلاً اٹلی میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کو کوئی جگہ اس دنیا کے اندر ملنی چاہئے اور یہ احساس ہوا کہ جب انگلستان۔ اسپین اور پرتگال جیسی قوموں نے سمندر پار علاقوں میں وسیع محکوم قومیں پیدا کر لی تھیں تو اٹلی کو جو روم (ROME) کی جانشین اور وارث ہے اور جو یورپ میں اپنے جزیرہ نما کی حدود سے باہر اپنی توسیع کرنے سے روک دی گئی ہے اب یہ مبارک حق حاصل ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ روم (ROME) کے شاہانہ مشن کی سمندر پار ملکوں میں تجدید کرے۔ اس وجہ سے

بہت جوش کے ساتھ ایتھوپیا (ETHIOPIA) پر تمام توجہ لگا دی گئی۔ پہلے تو اس لئے کہ ایڈووا (ADUWA) کی ذلتٓ کو دور کریں اور دوسرے اس لئے جو اس سے زیادہ اہم تھا کہ اُن بلند خط استوا کے ملکوں میں (جو آب ہوا کے اعتبار سے جنوبی امریکہ کے بہت سے ملکوں کے مانند تھے) ایک وسیع یورپین کالونی بنائی جائے۔ جس کے آدمی کسی دن وہاں کی قدیم امہاری (AMHARIC) آبادی کے رئیس طبقہ سے اسی طرح اپنا خون ملالیں اور گھُل مِل جائیں جس طرح اسپین والوں نے اُن کا' (INCAS) قوم سے ملالیا تھا اور جو لوگ قومی اعتبار سے اُن سے کمتر تھے ان کو اپنے مستقل غلام یا چپراسی کے درجہ تک گھٹا دیں۔

مشرق بعید کے دور مقام پر جاپان اس معاملہ میں مصروف تھا۔ جو "چین کا معاملہ" (THE CHINA INCIDENT) کہلانے لگا تھا۔ جاپان کے لیڈروں کے نزدیک جو اس زمانہ میں تھے اس پالیسی کی ضرورت بہت سخت اور اہم معلوم ہوتی تھی کہ جاپان کی کولونیوں کو بڑھایا جائے۔ وہ اس وقت بھی منچوریا کے (MANCHURIA) معاملات میں بہت زیادہ پھنسا ہوا تھا۔ جب کبھی ہندوستان کی سیاسی ترقی کی دستوری باریکیوں پر غور کرنے سے ہور (HOARE) اور میں دوسری طرف متوجہ ہوتے تھے تو مندرجہ بالا قسم کے موضوعات پر جو اصلی ضروری اور ناخوشگوار تھے ہم دونوں بار بار گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

ان کو رفتہ رفتہ اس کا علم ہوگیا کہ جب سے ہندوستان نے بین الاقوامی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی محدود حصہ تھا اور جہاں تک مجھے کسی کام میں لگانے اور میری خدمات سے فائدہ حاصل کرنے کا تعلق تھا میرے ساتھ حکومت ہندوستان نے سرد مہری کا برتاؤ کیا تھا اور قصداً میرے ساتھ غفلت برتی تھی۔ نئی دہلی اور شملہ میں اس پالیسی کی

ٓ ۱۸۹۶ء میں ایڈووا کے مقام پر حبش نے اٹلی کو بُری طرح شکست دی تھی۔

وجوہ کی تفصیل معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ہور (HOARE) نے ان کی تدبیروں کو بہت جلد معلوم کرلیا۔ انڈین سول سروس کے اعلیٰ عہدہ دار یعنی وہ طاقتور اور آپس میں خوب گھٹی ہوئی دفتری حکومت جو ہندوستان پر حکومت کرتی تھی۔ نہ اس کی خواہش مند تھی اور نہ اس میں اس کی اہلیت تھی کہ وہ ایسے آزاد حیثیت اور آزاد خیالات والے آدمی کی قدر کریں جیسا کہ میں تھا اور جو اس قسم کے اکثر مسائل کا براہ راست علم رکھتا تھا۔ ان عہدہ داروں کو بڑی تکلیف کے ساتھ اس کا احساس بھی تھا کہ اگر مجھ کو کوئی سرکاری بین الاقوامی عہدہ دے دیا جائے گا اور اس کی وجہ سے میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ وائسرائے کی ہدایات حاصل کروں تو ایسی حالت میں مجھے تامل نہ ہوگا کہ میں دفتری پالیسی کے متعلق وائسرائے سے اپنے خیالات کا اور اگر ضرورت ہو تو اپنے اعتراضات کا اظہار کروں اور اس معاملہ میں بلا معقول وجوہ کے اگر میری تجاویز کی تردید کی جائے گی تو مجھے اسی طرح اس میں بھی تامل نہ ہوگا کہ میں اپنا استعفیٰ پیش کر دوں اور اپنے استعفے کے وجوہ مکمل طور پر اور پورے یقین کے ساتھ وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کو بتا دوں۔ اگر کسی بین الاقوامی کانفرنس میں مجھے ہندوستان کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کام کرنا پڑا تو اس کا کوئی موقعہ نہ ہوگا کہ میں سرکاری عہدہ داروں کا خاموش پٹھو اور نمائشی کٹھ پتلی بن کر کام کروں۔ اسی وجہ سے دفتر والوں کا خیال تھا کہ میں بجائے فائدے کے ان کو زیادہ تر نقصان پہنچانے والا ثابت ہوں گا اور بالآخر میں یہ ظاہر کر دوں گا کہ دفتر والے غلطی پر تھے۔

قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ دفتری حکومت والوں نے اس بدمذاقی اور خوف کو حق بجانب کرنے کے لئے جو وہ میری طرف سے رکھتے تھے دلائل اور وجوہ پیدا کر لئے۔ انہوں نے کہا کہ میں دوڑ کے گھوڑوں کا مالک تھا۔ میں ادبیات اور فنون لطیفہ کا شوقین تھا۔ میں نے علی گڈھ یونیورسٹی کی بنیاد بہ حیثیت ایک فرقہ وارانہ ادارہ کے ڈالی تھی۔ گو وہ ایک کلچرل ادارہ کی حیثیت بھی رکھتی تھی

اور چونکہ میں اسماعیلیوں کا امام تھا۔ اس لئے میری پہلی وفاداری ہمیشہ کے لئے میرے مریدوں کے ساتھ ہوگی۔ ان وجوہ کی بناء پر گورنمنٹ یہ خطرہ نہیں لے سکتی تھی کہ مجھے کسی ملازمت میں داخل کرلے۔ میں یہ بات دیری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سکریٹریٹ کے کاغذات اور مسلیں میرے متعلق یادداشت اور واقعات سے بھری پڑی تھیں اور ان سب میں ایک لفظ "نہیں" آخر میں میرے متعلق آجاتا تھا۔ سر سیموئل ہور (SIR SAMUEL HOARE) نے اس تمام تفصیلی اور نمائشی کارروائی کو خوب دیکھا اور پہچان گئے کہ اس کی اصلیت کیا تھی یعنی یہ کہ وہ "کور التعصب" تھا۔

جب ہتھیاروں کو کم کرنے والی کانفرنس (DISARMAMENT CONFERENCE) کے لئے انتظامات ہونے والے تھے اور بین الاقوامی لیگ کے لئے ہندوستانی وفد کا تقرر ہونے والا تھا سر سیموئل ہور نے (SIR SAMUEL HOARE) اس تمام معاملہ کو خاص قوت اور تکمیل کے ساتھ شروع کیا اور وائسرائے کی توجہ اس واقعہ کی طرف مبذول کرائی کہ میں اس بات کا مستحق تھا کہ کوئی زیادہ مفید ملازمت مجھ کو دی جائے اور اس بات پر اصرار کیا کہ مجھے بین الاقوامی میدان میں ہندوستان کی خدمت کرنے موقعہ دیا جائے۔ کسی شخص نے میرے متعلق یہ فقرہ استعمال کیا تھا "سفیر بغیر سرکاری کام کے" (AMBASSADOR WITHOUT PORTFOLIO) وزیر ہند نے اس بات پر زور دیا کہ میرے لئے یہ نہایت مناسب وقت تھا کہ مجھے سرکاری حیثیت عطا کی جائے۔

میرا خیال ہے کہ میں اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں نے اپنے نئے کام میں ایسا دماغ لگایا جو اس کے خاص مسائل سے اچھی خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ یورپ اور مشرق کی سیاسی اور سوشل تاریخ میں میری ابتدائی تعلیم و تربیت بہت مکمل ہوچکی تھی۔ سن بلوغ کے بعد سے میں نے مستقل طور پر وسیع مطالعہ کیا تھا۔ میں اس زمانہ میں اور اب بھی اخباروں کا بڑی محنت کے ساتھ

مطالعہ کرنے والا تھا اوران سیاسی رسالوں اورسہ ماہی رسالوں کا جو خاص طور پر برطانیہ اور فرانس میں ہمارے موجودہ زمانہ کے تمام خاص واقعات اور میلانات پر بہت زوردار اور بسا اوقات بہت عالمانہ بحث کرتے ہیں۔ بہت سالوں تک میں قومی اور بین الاقوامی دونوں قسم کے معاملات میں ایک نہایت مصروف زندگی بھی بسر کر چکا تھا۔

اب میں ۱۹۳۲ء کے موسم بہار کی بین الاقوامی فضا اور اس زمانہ کے بین الاقوامی میلانات اور واقعات کو یاد دلاتا ہوں روس کی حکومت (U.S.S.I) یہ کوشش کر رہی تھی کہ وہ دنیا کی نظروں میں کم از کم عارضی اور سطحی عزت حاصل کرے۔ ہم کو اب یہ بات معلوم ہے کہ پہلی پنج سالہ اسکیم کے خوفناک اور منتشر کرنے والے نتائج کے بعد اس کی حالت بہت نازک اور خطرناک تھی۔ اسٹیلن (STALIN) جو اس وقت اپنے ملک کا واحد مالک تھا ایسا زمانہ چاہتا تھا جس میں بیرونی کشیدگی نرم اور ہلکی ہو جائے لیٹونیو و (LITVINOV) جو اس کا وزیر خارجہ تھا انگلستان کو خوب جانتا تھا۔ اس کی بیوی انگلستان کی تھی اور اس کو برطانوی سیاست دانوں کی ہوشیاری اور حکمت عملی کا ذاتی علم تھا۔ ان امکانات کا بھی علم تھا جو ان کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے۔ جن کو مناسب طریقہ پر استعمال کرنے سے روس (RUSSIA) اپنا مناسب مقام دنیا کی قوموں میں حاصل کرتا تھا۔

لیٹونیو و (LITVINOV) خود اپنے ملک کی عزت بڑھانے کی اسکیم کا بہت خواہش مند تھا۔ اور اس کے اس شوق میں کسی قسم کی بناوٹ نہ تھی۔ وہ اپنے ملک کو دنیا کے سامنے ایک پوری طرح ایماندار عورت کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ گو وہ منتظمہ عورت اپنے دروازہ پر کچھ فکر اور تامل کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کے وجوہ آئندہ چل کر ظاہر ہو گئے تھے۔ بہرحال لیٹونیو و (LITVINOV) اور اس کے مشن کے (MISSION) دوسرے ممبروں کے ساتھ

کم از کم سوشل تعلقات قائم رکھنا ممکن تھا۔ خود اپنی تحریک پر میں نے اس سرد مہری کو دور کیا اور میں نے لیٹوینوو کے اعزاز میں ایک خاص ڈنر پارٹی دی مجھے شبہ ہے کہ اس سے میرے ان برطانوی ساتھیوں کو تعجب ہوا اور ایک قسم کی خفیہ فرحت ہوئی جن کو وفد کے سابقہ ہندوستانی ممبروں کے متعلق یہ تجربہ تھا کہ وہ کام کرنے میں بہت تامل اور فکر کیا کرتے تھے اس ڈنر پارٹی سے جو خوشی اور تسکین لٹوینوو کو حاصل ہوئی وہ ظاہر تھی۔ اس ڈنر نے اس دوستی کی بنیاد ڈالی جو اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ لٹوینوو (LITVINOV) جنیوا (GENEVA) میں رہے اور اس نے روس (RUSSIA) کے دوسرے سفیروں کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں شامل کر لیا اور اس کے بعد یہ لوگ ہمیشہ مجھ کو اپنے سوشل جلسوں میں مدعو کرتے رہے ۔ لٹوینوو (LITVINOV) نے دراصل اس کی ابتدا کی کہ بہ حیثیت ایک مہمان نواز سفیر کے ظاہر ہو اور اس کو اس معاملہ میں کافی اور حقیقی سوشل کامیابی حاصل ہوئی۔ میرے قدیم دوست بیرن مورس دی روتھس چائلڈ (BARONMAURICEDEROTHSCHILD) نے جن کے پاس دیہات میں ایک خوب صورت بنگلہ تھا جو جنیوا سے (GENEVA) زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ مختصر غیر رسمی لنچ پارٹیاں دینا شروع کیں جن میں لٹوینوو (LITVINOV) اور اُن کے ساتھیوں کو برطانیہ اور فرانس کے سربرآوردہ مہمانوں اور دوسرے ملکوں کے نمائندوں کے ساتھ ایک جگہ جمع کیا جاتا تھا۔

امریکہ نے پریزیڈنٹ ولسن (PRESIDENTWILSON) کی بات نہیں مانی تھی۔ اور لیگ آف نیشنز (LEAGUEOFNATIONS) میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا امریکہ نے نہایت سختی کے ساتھ بالکل علیحدگی اختیار کرنے والے طریقہ پر اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ امریکہ کو خود اپنی قسمت پر بھروسہ تھا۔ مگر ۱۹۳۲ء تک تجارتی تنزل کے اثرات تمام شمالی امریکی براعظم میں بہت تیزی کے ساتھ محسوس کئے جا رہے تھے ہارڈنگ کولج علیحدگی (HARDING-COOLIDGEISOLATIONISA)

زمانہ ختم ہورہا تھا۔ انگلستان کا محکمۂ امور خارجہ اس بات کا روز افزوں احساس رکھتا تھا کہ امریکہ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ساری دنیا سے بے تعلق ہوکر بیٹھ جائے۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ ہتھیاروں کو کم کرنے والی کانفرنس کے (DISMAMENT CONFERENCE) ذریعہ سے ایک ایسا آسان طریقہ مل جائے گا جس سے جنیوا (GENEVA) کی اس بین الاقوامی فضا کی چھان بین کی جائے جو عرصہ سے غیر معروف رہی تھی۔ ویمر جرمنی (WEIMAR GERMANY) سوویٹ روس (U.S.S.R) کے برخلاف۔ اس وقت بین الاقوامی برادری کی ایک معزز ممبر تھی۔ جو برطانیہ اور فرانس کے ساتھ کم از کم سطحی مساوات کا درجہ رکھتی تھی۔ کیا اسٹریسمین (STRESEMANN) برآنڈ (BRIAND) اور آوسٹن چیمبرلین (AUSTIN CHAMBERLAIN) لوکارنو (LOCARNO) کے مقام پر دل ہلادینے والے خلوص کے ساتھ نہ ملے تھے اور کیا برائنڈ (BRIAND) نے اس واقعہ کو اپنی زبردست تقریر کے ذریعہ سے مشہور نہیں کردیا تھا جو ان الفاظ سے شروع ہوتی تھی۔ آبا۔لے۔کانو (A BAS LES CANNONS) (اپنی بندوقوں کو نیچے پھینک دو۔)

سنہ ۱۹۳۲ء میں وہ خاص لفظ جس پر زور دیا جاتا تھا "قلتِ اسلحہ" تھا (DISARMAMENT) ہتھیاروں کو کم کرنا، ایسا تصور تھا جس سے بہت سی بلند اور نیک امیدیں وابستہ تھیں۔ خوش بینی اس وقت بھی بہت زوروں پر تھی (یہ کہا جاتا تھا کہ) سب قوموں کے نمائندوں کو ایک میز پر جمع کرو جو اصولاً ہتھیاروں کو کم کرنے پر متفق ہوں اور ان کو موقعہ دو کہ وہ ہتھیاروں کو کم کرنے کی عملی تفصیلات تیار کریں۔ مثلاً بندوقوں اور رائفلوں کو کم کرنا۔ لڑائی کے جہاز کو ختم کرنا۔ ہوائی جہاز کے سامان اور استعمال کو محدود کرنا۔ اس طرح پر دنیا کا امن یقینی اور مستقل بنایا جاسکتا ہے۔

اس خوش بینی کے پیچھے شبہ اور خوف کی ایک لہر زور مار رہی تھی۔ کیا

اس کے آئندہ نتائج ایسے ہی روشن تھے جیسا کہ بہت سے آدمی یقین کرنے کی کوشش کرتے تھے؟ کیا ویمر جرمنی (WEIMAR GERMANY) ایسی ہی تھی جیسا کہ وہ بظاہر معلوم ہوتی تھی؟ ایبرٹ (EBERT) اور اسٹریسمین (STRESEMANN) جا چکے تھے۔ بروننگ (BRUNNING) روز افزوں مخالفانہ طاقتوں کے ایک عجیب بھنور کے خلاف لڑ رہا تھا ان میں سے بعض طاقتیں اقتصادی تھیں مگر ان میں سے اکثر طاقتیں بہت زور شور اور خوفناکی کے ساتھ سیاسی طاقتیں تھیں۔ کیا وہ سب کوششیں بیکار ہو چکی تھیں جو اس بات کے لئے کی گئی تھیں کہ جرمنی کو جمہوریت کے لئے تیار کریں؟ کیا پہاڑ نے دردِ زہ کی کافی تکلیف اُٹھانے کے بعد صرف ایک بیکار چوہے کا بچہ پیدا کیا تھا؟

اُس زمانہ کی رائج سیاسی اصطلاح میں ایک نیا لفظ استعمال ہونا شروع ہوا تھا۔ وہ "ناززم" تھا (NAZISM) جس کے متعلق ہم سے کہا گیا تھا کہ اس کے معنی اقومی تمدن کے ہیں۔ وہ اٹلی کے "فیسزم" (FASCISM) کی بجائے بالکل جرمنی زبان کا مخلوط لفظ تھا اور وہ اس وقت بھی جرمنی کے ہزاروں نوجوانوں کی وفاداری اور ان کے خیالی اور قدیم افسانہ والے نصب العین پر اپنا اثر ڈال رہا تھا اور اس کا تعلق اس شخص سے تھا جو ایڈولف ہٹلر (ADOLF HITLER) کہلاتا تھا۔

جنیوا (GENEVA) میں جرمنی کے مشن کا فوجی مشیر جنرل بلومبرگ (GENERAL BLOMBERG) تھا جو بعد میں فیلڈ مارشل ہو گیا تھا۔ وہ شاہ جارج ششم کی تاجپوشی کے موقعہ پر ہٹلر (HITLER) کا نمائندہ تھا اور آخر کار کچھ پر اسرار حالات کے درمیان جو کہا جاتا ہے کہ اس کی نامناسب شادی کی وجہ سے پیش آئے وہ اپنے درجہ سے گر کر بے عزت ہو گیا تھا۔ میرے اور اس جرمنی سپاہی کے درمیان بہت اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اُس سے میں نے اُن آدمیوں کے متعلق بہت زیادہ سنا جو اُس وقت

جرمنی پر حکومت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ان کو حقارت کے طور پر "چھوٹے پست قامت آدمی" کہا کرتا تھا جنہوں نے اسٹریسمین (STRESMANN) کے پورے ناپ والے جوتوں میں اپنا پیر ڈال رکھا تھا۔ اس کو اس حالت سے بڑی بے چینی ہوتی تھی جو اس کے خیال کے مطابق ان لوگوں کی اصولی آزادی پرستی اور سیاسی معاملات میں ان کی عملی ناقابلیت کے جمع ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔

یہ وہ تکلیف دہ سمندر تھا جس کے اندر میں اس وقت کود پڑا تھا۔ نئی دہلی کی سکرٹریٹ (SECRETARIAT) میں وزیر ہند کی مرضی کے مطابق کام ہوتا تھا۔ میں ہتھیاروں کو کم کرنے والی کانفرنس میں (DISARMAMENT CONFERENCE) ہندوستانی وفد کا ممبر مقرر کیا گیا۔ لہٰذا ہر میں سر سیموئل ہور (SIR SAMUEL HOARE) کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کا کمانڈ رکھنے والا تھا مگر ان کی عدم موجودگی میں مجھے اُن کا پورا چارج لینا تھا۔ ۱۹۳۲ء کی لیگ اسمبلی میں (ASSEMBLY OF THE LEAGUE) مجھے ہندوستان کا خاص نمائندہ بھی مقرر کیا تھا۔ اس طرح پر میری قومی زندگی کا وہ پہلو شروع ہوا جو بہت عرصہ تک چلتا رہا اور بلا کسی تبدیلی کے اس زمانہ تک برابر چلتا رہا جب ہٹلر (HITLER) کی فوجیں پولینڈ (POLAND) کے اندر داخل ہوئیں اور دنیا کے امن کا وہ ڈھانچہ جس کو قائم رکھنے کے لئے لیگ نے ایسی سخت کوشش کی تھی نہایت بے رحمی کے ساتھ توڑ دیا گیا۔

وہ خوش بینی جو سنہ ۱۹۳۲ء میں جنیوا کے اندر (GENEVA) پھیلی ہوئی تھی ایسی ذہنیت سے تعلق رکھتی تھی جس سے میں پوری طرح متفق نہ ہو سکا۔ میں نے یقین کے ساتھ یہ بات محسوس کی کہ ہماری امیدوں کو بارآور بنانے کے لئے زیادہ سخت اور زیادہ اصلی اور حقیقی کوشش کی ضرورت تھی۔ اس نئے میدان میں جہاں مجھ کو طلب کیا گیا تھا میں نے اپنے خیالات اور عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی۔ لیگ (LEAGUE) کے چودھویں مکمل اجلاس میں

اُس خلوص اور جوش کے ساتھ جو میرے امکان میں تھا میں نے ایک مفصل تقریر کی (جس میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا :-)

"ہم نے معلوم کیا ہے کہ ہتھیاروں کا استعمال ابھی تک زوروں پر ہے اور بے امنی کا احساس اب بھی باقی ہے۔ یہ بات کسی طرح یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ وہ جنگ جو جنگ ختم کرنے کے لئے کی گئی تھی لڑنے کے بعد کامیاب ہوئی۔ اخلاقی اعتبار سے ہم کو لازمی طور پر یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ خوف۔ بدنیتی اور شبہات کے نقصان دینے والے اثرات کو دور کریں۔ مادی اعتبار سے یہ قطعی طور پر ضروری ہے کہ اب اُس کوشش کو گھٹا کر کم سے کم درجہ پر لایا جائے جو لڑائی کے زمانہ میں سامان جنگ تیار کرنے کے لئے کی گئی تھی اور اس کی وجہ سے دوسری چیزیں نہیں بنائی گئی تھیں ہندوستان کے دور و دراز مقامات پر اور اسی طرح یورپ میں عالمگیر جنگ نے ماتم کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کر دی اور ایک تلخ سانحہ کی وراثت چھوڑی۔ میرے ہموطنوں میں سے دس لاکھ سے زیادہ آدمی لڑائی پر بھیجے گئے۔ ان میں سے پچاس ہزار سے زیادہ مارے گئے۔ خاص ہندوستان میں ہتھیاروں کا جو پیمانہ اور جو تعداد رکھی جاتی ہے اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کو ظالمانہ حملہ کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کی فوجوں کی مقدار کا اندازہ اس کے رقبہ کی وسعت اور اس کے حالات کی مختلف صورتوں سے لگانا چاہیئے۔ یہ واقعہ اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ہندوستان کا رقبہ سارے یورپ کے نصف رقبہ سے زیادہ ہے اور اس کی آبادی ساری دنیا کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ ہے۔ ہر ملک کے امن پسند شہریوں کے دل سے یہ بلند آواز زور کے ساتھ نکل رہی ہے کہ فوجی بار کو کم کیا جائے

اُس مالی دباؤ کو کم کیا جائے جو اس فوجی بار کی وجہ سے پڑتا ہے۔ جنگ کے غیر معین طریقوں کے خلاف عام آبادی کی حفاظت کا انتظام کیا جائے اور سب سے بالاتر یہ ہے کہ ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں کہ جنگ کا خیال تک آنے پائے۔

ہم میں سے بہت سے آدمیوں کے الفاظ جو اس زمانہ میں دوسری عالمگیر جنگ کو روکنے کی کوشش کرتے تھے منہ سے نکل کر ہوا میں ضائع ہو گئے مگر اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کوشش جو کی گئی تھی کرنے کے قابل نہ تھی یا ہم اس کوشش کے کرنے میں صحیح نہ تھے۔ جنیوا (GENEVA) کا وسیع محل جو لیگ آف نیشنز (LEAGUE-OFNATIONS) کا مرکز اور دفتر تھا اب اس مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ تعمیر کیا گیا تھا۔ مگر موجودہ یونائیٹڈ نیشنز آرگنیزیشن (UNITEDNATIONS ORGANIZATION) جو اس بربادی اور غمناک واقعہ کے بعد پیدا ہوئی جس کو دور کرنے کی ہم نے کوشش کی تھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہم نے جو محنت کی تھی وہ بالکل بیکار نہ رہی چونکہ اب نئے زمانہ میں اور نئی اصطلاحات کے ساتھ وہ ہمارا پہلا کام ہی جاری کیا گیا ہے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۹ء کے بقیہ درمیانی زمانہ میں لیگ کا کام اور اسکی شاخ ہتھیاروں کو کم کرنے والی کانفرنس (DISARMAMENTCONFERENCE) کا کام اتنا زیادہ رہا کہ میرے وقت اور میری دلچسپیوں کا بڑا حصہ اس میں صرف ہوا میں جنیوا (GENEVA) میں بیک وقت مہینوں تک رہتا تھا اور اس اثنا میں بہت سے پریشان کن اور مغالطہ دور کرنے والے واقعات پیش آئے۔ مثلاً جاپان کا تنہا ہو کر لیگ کی ملامت کرنا۔ جرمنی کا لیگ سے باہر ہو جانا جو بالکل ڈرامے کا کھیل سا تھا اور پھر ایتھوپیا (ETHIOPIA) میں مسولینی (MUSSOLINI) کے ظالمانہ حملہ کا براہ راست اعلان۔ اس زمانہ کے شروع میں مسٹر آرتھر ہنڈرسن (MRARTRUR HENDERSON) سے جو ہتھیاروں کو کم کرنے والی کانفرنس کے صدر تھے میری گہری دوستی ہو گئی۔ ہنڈرسن شاید ان مشہور سیاستدانوں میں

تھے جو برطانیہ کی مزدور تحریک (LABOUR GOVERNMENT) کے سلسلہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مسٹر رامسے میکڈانلڈ (RAMSAY MACDONALD) کی دوسری لیبر حکومت (LABOUR ADMINISTRATION) کے زمانہ میں وہ نہایت کامیاب اور نہایت پسندیدہ سکرٹری امورخارجہ رہ چکے تھے مگر اس تیز اور ڈرامے والی تبدیلی میں جس کے بعد قومی گورنمنٹ قائم ہوئی۔ وہ اپنے لیڈر کی حمایت اور تائید کرنے کے قابل نہ ہوسکے۔ اسی وجہ سے انہوں نے برطانیہ میں مزدور تحریک کے ساتھ اپنی جوشیلی اور قابل فخر وفاداری کو باقی رکھا مگر اس کے اس فیصلہ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے عہدہ اور اختیارات سے محروم کر دئے گئے۔ یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی تھی کہ دنیا کے لئے اور اسی طرح برطانیہ کے لئے یہ بڑی بدنصیبی ہوگی کہ وہ ہنڈرسن کی دور اندیشی۔ اُن کے تجربے اور بین الاقوامی معاملات کے میدانوں میں ان کی حکمت عملی سے محروم ہوجائے اور یہ وہ صفات تھیں جن کی وجہ سے ہنڈرسن نے ایک قابل یادامتیاز حاصل کیا تھا۔

اسی وجہ سے ہنڈرسن (HENDERSON) کو ہتھیاروں والی کانفرنس (DISARMAMENTCONFERENCE) کا صدر مقرر کر دیا۔ اور اپنی بے وقت موت تک وہ اس جگہ پر اپنے فرائض بہت دلیری اور امتیاز کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ گو اس میں ان کو بہت مایوسی اور نہایت سخت اور دل شکن کشاکش کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ہماری واقفیت بہت جلد اتنی زیادہ ہوگئی کہ ہم دونوں کے درمیان ایک پرخلوص اور محبت والی دوستی پیدا ہوگئی۔ جس کے اندر بہت جوش پایا جاتا تھا۔ اُن کا دماغ اور اُن کے کارنامے ایسے ہی قابل یاد تھے جیسا کہ ان کا کیریکٹر قابل پسند تھا۔ جس طرح اس نسل کے بہت سے لیبر لیڈروں کا حال تھا اسی طرح ہنڈرسن بھی عام آدمیوں کی صحیح اولادمیں سے تھے جنہوں نے دنیا میں اپنا ترقی کا راستہ بہت نیچے اور چھوٹے درجہ سے شروع کر کے اس بلند ذمہ دار اور یکتا مرتبہ تک بنالیا تھا جو ان کو اس وقت حاصل تھا۔ وہ بہت

متحمل مزاج اور ایمان دار تھے۔ بہت ہوشیار۔ پریشان نہ ہونے والے خاموشی سے باتیں کرنے والے اور چٹان کی طرح سخت دیانت والے تھے۔ نوجوان نسل کے ایک لیبر لیڈر مسٹر مورگن فلپس (MORGANPHILLIPS) نے یہ کہا تھا کہ برطانیہ کی مزدور تحریک کے ابتدائی اصول میتھوڈزم (METHODISM) کی تحریک میں پائے جاتے ہیں اور وہ مارکس کی تحریک میں (MARXISM) نہیں پائے جاتے ہیں یہ بات آرتھر ہنڈرسن (ARTHURHENDERSON) کے متعلق بالکل سچ تھی چونکہ وہ اپنی تمام عمر ایک نہایت عقیدتمند میتھوڈسٹ (METHODIST) رہ چکے تھے۔ اُن کی بیوی اُن کے اس طویل اور مشکل راستہ میں اُن کی وفادار ساتھی رہ چکی تھی وہ بڑے شیریں اخلاق اور بہت فیاض کیریکٹر کی عورت تھی۔ وہ بہت مضبوط اور سچی تھی اور اپنے طرز پر بہت عقلمند عورت تھی۔

اَن تیب (ANTIBES) کے مقام پر میرے بنگلہ میں ہنڈرسن (HENDERSON) اکثر میرے مہمان رہا کرتے تھے۔ برنہارڈ بیرن (BERNHARD BARON) جو لکھ پتی اور بنی نوع انسان سے محبت کرنے والے آدمی تھے۔ کبھی کبھی مونٹے کارلو (MONTECARLO) کے مقام پر آتے جاتے تھے تاکہ وہاں کے پبلک ناچ گھر میں (CASINO) ایک یا دو گھنٹہ صرف کریں اور وہاں سے ہنڈرسن خوشی سے ان کے ساتھ گھوڑے کی سواری کرنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ ہنڈرسن اطمینان کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھے رہتے تھے اور انتظار کرتے رہتے تھے جب تک کہ بیرن (BARON) واپس آجائیں۔ ہنڈرسن اتنے ہی مستقل مزاج تھے جتنے کہ وہ نیک تھے اور وہ اتنے ہی بے نفس تھے جتنے کہ وہ دلیر تھے۔ اس مشکل اور آزمائشی زمانہ میں جب ہم نے جنیوا (GENEVA) میں اپنا کام کیا ہم دونوں مشورہ اور مدد لینے کے لئے ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔

۱۹۳۵ء ایک قابل یادگار سال تھا۔ یہ وہی سال تھا جس میں مسولینی (MUSSOLINI) نے ایتھوپیا (ETHIOPIA) پر حملہ کیا۔ یہ وہی سال تھا جسمیں

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ وجود میں آیا۔ ہندوستانی قانون سازی کا یہ آخری بڑا جزو جو برطانیہ کی پارلیمنٹ نے وضع کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے بارہ سال بعد وہ مختصر اور ڈرامائی قانون بنایا گیا جس نے برطانوی راج کا ہندوستان میں خاتمہ کر دیا۔ یہ وہی سال تھا جس میں میرے بڑے اور اچھے دوست شاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی (SILVER JUBILEE) ہوئی۔ میں نے پوری طرح شکرگذاری محبت اور وفاداری کے ان جذبات میں حصہ لیا جن کے ساتھ بادشاہ کی رعایا نے ملک معظم اور ملکہ میری (QUEEN MARY) کا بڑے امتیاز سے استقبال کیا تھا۔ میرے لئے یہ سال بہرام کا سال تھا۔ چونکہ اس گرمی کے موسم میں اس شاندار گھوڑے نے دو ہزار گنی کی دوڑ جیتی اور سینٹ لیجر (ST. LEGER) کی دوڑ جیتی۔ اس شاندار واقعہ کو تفریح باز اخبار نویسوں نے "گھوڑ دوڑ کا سہ چند اعزاز" (TRIPLE CROWN OF THE TURF) کہا تھا۔ یہ پہلا گھوڑا تھا جس نے یہ اعزاز حاصل کیا۔ جب سے کہ بتیس سال قبل اس کو روک سینڈ گھوڑا حاصل کر چکا تھا (ROCKSAND)

میں ایپ سم (APSOM) کے مقام پر اس وقت موجود تھا جب میرے گھوڑے بہرام نے ڈربی (DERBY) کی دوڑ جیتی تھی۔ "فریڈی فوکس (FREDDIE FOX) اس کا سوار تھا۔ اس کی کامیابی کے بعد قدرتی طور پر میں اس کو خود اندر لے کر آیا۔ یہ میرے لئے بڑی عزت کی بات تھی کہ میری گھوڑ دوڑ کی کامیابی پر بکنگھم محل (BUCKINGHM PALACE) میں ایک خوشی کا ڈنر دیا گیا جس میں جاکی کلب (JOCKEY CLUB) کے دوسرے ممبروں کے ساتھ میں ملک معظم اور ملکہ معظمہ کا مہمان تھا۔ ملکہ میری (MARY) نے خود حکم دیا تھا کہ میز کی آرائش میرے گھوڑ دوڑ کے رنگین نشانات کے مطابق کی جائے جو سبز اور چاکلیٹ (CHOCLATE) رنگ کے تھے۔

جب بہرام نے سینٹ لیجر (ST. LEGER) کی دوڑ جیتی تھی میرا ماحول

کچھ زیادہ خوش کرنے والا نہ تھا۔ اس وقت میں اپنے فرائض انجام دینے کے لئے پھر جنیوا میں (GENEVA) واپس آگیا تھا۔ بہرحال میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ وہاں پر میری حاضری سب سے زیادہ رہی۔ مجھے یقین ہے کہ لیگ کی اسمبلی (ASSEMBLY) کا صرف میں ہی ایسا ممبر تھا جس کو اس کام کے لئے باہر جانا پڑا کہ اس کے گھوڑے نے سینٹ لیجر (ST.LEGER) کی دوڑ جیتی تھی۔

مگر اس زمانہ میں بین الاقوامی منظر بہت تاریک تھا۔ اور اس کے آسمان پر بہت سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر امن اور امید کی معمولی جھلملاتی ہوئی روشنیاں جن کو چمکتا ہوا چھوڑ رکھا تھا۔ اب ایک ایک کرکے بجھتی جارہی تھیں۔ مسولینی (MUSSOLINI) نے جب ایتھوپیا (ETHIOPIA) پر حملہ کیا اس سے ٹھیک دو ہفتہ پہلے میں نے لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) اسمبلی (ASSEMBLY) میں تقریر کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ محض چکنے چپڑے الفاظ اور بہت زیادہ لفاظی کے ساتھ باتیں کرنے کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اپنی طرف سے اور اپنے ملک کی طرف سے میں نے اتنی صفائی اور سنجیدگی کے ساتھ تقریر کی جتنی کہ مجھ سے ممکن تھی (جو حسب ذیل تھی :-)

"ہندوستان کو اس بات سے تکلیف ہے کہ لیگ میں عمومیت اور عالمگیری باقی نہیں رہی اور اس بات سے کہ لیگ یورپ اور یورپ کے فائدوں کے لئے اپنی طاقت کا بہت بڑا حصہ صرف کرتی ہے۔ ان ڈرامے والی ناکامیابیوں سے ہتھیاروں کو کم کرنے کی کانفرنس (DISARMAMENT CONFERENCE) سے جو عرصہ تک چلتی رہی اور بیکار رہی اور اس واقعہ سے کہ جو حکومتیں لیگ کی ممبر ہیں ان میں ہتھیاروں کو جمع کرنے کا کام پورے زور کے ساتھ ہو رہا ہے ہندوستان کو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے جو اعتراضات لیگ پر ہیں وہ اس کی فروگذاشتوں کے متعلق ہیں اس کے نصب العین کے متعلق نہیں ہیں۔ دنیا مختلف راستوں کے درمیان کھڑی ہوئی ہے۔ وہ کون سا راستہ اختیار کرے

اس کے لئے عقلمندی سے کام لینا چاہیئے"

جب ۱۹۳۵ء ختم ہونے کے قریب تھا میں اسمٰعیلیوں کا موروثی امام ہونے کی حیثیت سے اپنی طلائی جوبلی منانے کے لئے بمبئی کو روانہ ہوا۔ اس وقت سے نصف صدی گذر چکی تھی۔ جب میں ایک چھوٹا۔ کم نظر اور سنجیدہ لڑکا تھا اور میرے چاروں طرف میرے ڈاڑھی رکھنے والے بزرگ موجود تھے اور میں گدی پر بیٹھا تھا اس خوشی کی انتہا یہ تھی کہ وہ قدیم رسم ادا کی جائے کہ مجھے سونے میں تولا جائے اس سے پیشتر جماعت خانہ میں ایک خاص عورتوں کی پارٹی منعقد کی گئی جس میں میری پیاری والدہ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف اور میری بیوی میرے بائیں ہاتھ کی طرف بیٹھیں۔ تولنے کی رسم واقعی طور پر بہت شاندار اور دل کو حرکت دینے والی تھی جس نے میرے اور میرے مریدوں کے درمیان باہمی محبت کی تیز لہریں پیدا کیں۔

ہماری خوشیاں بہرحال میرے قدیم۔ پختہ اور اچھے دوست شہنشاہ جارج پنجم کی وفات کی تکلیف دہ خبر کی وجہ سے بہت کم ہوگئیں۔ ان کا انتقال جنوری سنہ ۱۹۳۶ء میں سنڈرنگھم (SANDRINGHAM) کے مقام پر ہوا۔ مجھے ہماری دوستی کے سب سالوں کا خیال آتا رہا۔ ان آزمائشوں اور امتحانوں کا خیال آتا رہا جو جنگ اور صلح کے زمانہ میں اس دوستی نے برداشت کئے اور ان کی اس مسلسل مہربانی اور توجہ کا خیال آتا رہا جو سب سے بڑے اور چھوٹے معاملات میں میرے واسطے ظاہر کی۔ وہ آخری الفاظ جو مجھے اُن کی طرف سے موصول ہوئے وہ درحقیقت میری جوبلی کے موقع پر مبارکبادی دینے کا پُرجوش پیام تھا۔ اُن کی یاد کا احترام کرتے ہوئے ہم نے فوراً تمام مزید خوشیاں ترک کردیں اور میں نے اپنے مریدوں کے سامنے جو جمع ہوئے تھے حسب ذیل بیان پڑھ کر سنایا:۔

"ملک معظم کی وفات کی افسوسناک خبر سنکر مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میری طلائی جوبلی منانے کے

سلسلہ میں سوائے خالص مذہبی رسوم کے اور تمام کارروائیاں روک دی جائیں۔ ہم بہت بڑا ماتم کر رہے ہیں۔ میں خود سیاہ کپڑے پہنوں گا۔ اور میرے سب آدمی اپنا قومی ماتمی لباس پہنیں گے ملک معظم صرف ایک بڑے حکمران ہی نہ تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں ایک بڑے آدمی تھے۔ ملک معظم ذاتی طور پر ہمیشہ سے میرے اوپر بے انتہا مہربان تھے۔ مجھے یقین ہے کہ نئے ملک معظم جن کو دنیا اور اپنی ساری سلطنت کا بہت اچھا علم ہے۔ ملکہ وکٹوریہ۔ شاہ ایڈورڈ اور شاہ جارج کے لائق جانشین ثابت ہوں گے"

باوجودیکہ آئندہ کے چند مختصر مہینوں میں واقعات بہت افسوسناک طریقہ پر مختلف ہو گئے تھے۔ مگر میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے بیان کے اس آخری جملہ پر پشیمان نہیں ہوں اور نہ میں اس کو واپس لیتا ہوں۔ میں عرصہ سے اس دلکش۔ شاندار اور قابل محبت آدمی کو جانتا تھا جو ۱۹۳۶ء میں اس جنوری کے دن اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا تھا اور جس کے چاروں طرف ساری سلطنت کی وفاداری۔ محبت۔ طویل اور شاندار حکومت کی بلند امیدیں جمع ہو گئی تھیں۔

میں پہلی مرتبہ اُن سے یارک ہاؤس (YORK HOUSE) کے مقام پر سینٹ جیمس محل (ST. JAMES'S PALACE) میں ۱۸۹۸ء میں ملا تھا جب وہ چار سال کے بچے تھے۔ اُن کی والدہ جو اس وقت ڈچز آف یارک (DUCHESS OF YORK) کہلاتی تھیں۔ دو چھوٹے لڑکوں کو جو ملاحوں کا لباس پہنے ہوئے تھے مجھ سے مصافحہ کرانے کے لئے ڈرائنگ روم میں لائیں۔ وہ لڑکے اپنے گھر میں ڈیوڈ (DAVID) اور برٹی (BERTIE) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بڑے لڑکے کی شاندار شخصیت نے فوراً میرے تخیل پر اپنا سکہ جما لیا۔ اس کے چہرہ سے ذہانت اور مہربانی ٹپکتی تھی اور اس کی گفتگو میں ایک خالص قسم کی صفائی پائی جاتی تھی جن کا بہت اثر پڑتا تھا میرے پاس اب بھی

ان دونوں لڑکوں کے فوٹو موجود ہیں جیسے کہ وہ اس وقت تھے اور اُس پر اُن کے نام ان کی والدہ کے لکھے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد والے سالوں میں میری ملاقات الکثران سے ہوتی رہی جو اُنکی طویل اور مصروف زندگی کے مختلف اور مسلسل حالات میں ہوئی جس کی وطن پرست اور قومی خدمات کی انتہا پر وہ تخت پر بیٹھے تھے اور انہوں نے وہ فرائض انجام دینے شروع کئے تھے جن کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو بڑی محنت کے ساتھ تیار کیا تھا۔ مجھے وہ شرمیلا دبلا پتلا لڑکا یاد ہے جو اٹھارہ انیس سال کی عمر میں فرانسیسی زبان سیکھنے کے لئے پیرس (PARIS) میں مقیم تھا اور وہ لڑکا جو بعد میں اپنی زندگی کے اندر پیرس کا دلدادہ ہونے والا تھا، اس وقت تعجب سے کہا کرتا تھا کہ اس پیرس میں میرے دادا نے کیا دیکھا تھا، مجھے اُس کے ابتدائی سال بہ حیثیت پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) کے یاد ہیں مجھے وہ بہادر نوجوان سپاہی بھی یاد ہے جس نے ہر طرح پر اس بات کی کوشش کی کہ لارڈ کچنر (KITCHENER) کے اس سخت حکم کی تعمیل نہ کی جائے کہ تخت کے وارث کو میدان جنگ میں جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ میں اس آدمی کو جانتا تھا جس کے دل پر ہمیشہ سے اس خونریزی اور بربادی کا احساس جما ہوا تھا جو اس زمانہ کی خندقی جنگ سے ہوتی تھی۔ مجھے وہ آدمی یاد ہے جس نے بہت ترشی اور صداقت کے ساتھ اپنی سوانح عمری میں یہ بات کہی ہے کہ "میں نے جنگ کے متعلق بائیسکل پر سیکھا۔ جب وہ اپنی وزنی فوجی بائیسکل کو بے انتہا دور تک فلانڈرس (FLANDERS) کی کیچڑ والی سڑکوں پر لڑکاتا ہوا لے جاتا تھا اور وہاں سے ایسے مقامات پر پہنچتا تھا جیسے کہ پوپرنگھے (PAUPERINGHE) اور مونٹابن (MONTAUBAN) اور ییپرس (YPRES) کے چاروں طرف والے دیہات۔ مجھے وہ آدمی یاد ہے جس نے بعد کے سالوں میں رائل البرٹ ہال کی (ROYAL ALBERT HALL) سالانہ رسم کے موقعہ پر

لارنس بنین (LAWRENCE BINYON) کی یہ نظم جس کا عنوان "فور دی فالن" (FOR THE FALLEN) ہے دلدادگی اور نقصان کے وجدانی احساس کے ساتھ پڑھی تھی۔

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد والے سالوں میں مجھے وہ "سفیر سلطنت" (AMBASSADOR OF EMPIRE) یاد ہے جنہے کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) کے ملکوں۔ اپنی سلطنت کے ملکوں اور ساری دنیا کا مسلسل سفر اپنے ملک اور اپنی قوم کی خدمت کرنے کے لئے کیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے درمیانی ابتدائی زمانہ میں میری ملاقات اُن سے ایک مرتبہ سے زیادہ ہوئی اُس زمانہ میں وہ اپنے ہندوستان کے سفر کی وجہ سے جو بے انتہا آزمائش میں ڈالنے والا تھا۔ بہت کوفت اور تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔ سینٹ جیمس محل (ST. JAMES'S PALACE) میں ایک بڑی سرکاری دعوت کے موقع پر جو اس زمانہ میں جاپان کے ولیعہد شہزادہ کے اعزاز میں کی گئی تھی۔ جو موجودہ شہنشاہ جاپان ہیں میں پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) کے قریب بیٹھا تھا۔ مجھے اس وقت اُن کا یہ کہنا یاد ہے کہ اگر انگریز اور جاپانیوں کے باہمی میل کو تجدید کرنے کی درخواست جو جاپان نے کی ہے نامنظور کردی گئی (اور جو ولیعہد شہزادہ کی آمد کی اصلی وجہ تھی۔) تو اس صورت میں جاپان ہمارے قصور کو کبھی معاف نہیں کریگا ان کی آواز میں وہ مضبوط اور دور تک پہنچنے والی خصوصیت نہ تھی جو اُن کے باپ اور ان کے دادا کی آواز میں تھی۔ ان کا لہجہ ہمیشہ سے اپنے باپ اور دادا کے لہجے کے مقابلہ میں ہلکا اور رُکا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنے باپ اور دادا کی طرح خلوص اور یقین کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ اور جو کچھ وہ کہتے تھے اسکی اہمیت پر عقیدہ رکھتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے درمیانی زمانہ میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ پرنس آف ویلز (PRINCE OF WALES) جہاں کہیں جاتے ہیں وہیں پر

اپنے دوست بنا لیتے ہیں۔ یہ کوئی رسمی تعریف نہ تھی بلکہ ایک سچی بات کا سیدھا سادا بیان تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ اُن کی بے انتہا اور ناقابل مدافعت کشش کا سبب کیا تھا جو عوام کی ہمدردی اور تعریف اسی طرح حاصل کرتی تھی جس طرح کہ وہ چند طاقتور آدمیوں کا احترام حاصل کرتی تھی؟۔

اخبار ٹائمس (THE TIMES) کے نامہ نگار نے جو اُن کے ساتھ اُن کے بہت سے سفروں میں سے ایک سفر میں رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس بات کا اصلی سبب معلوم کر لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پرنس آف ویلز ایک فنکار ہیں۔ اس میں اُن کے مزاج کا اصلی بھید پوشیدہ ہے اور اسی میں اُن کی افسوسناک حالت اور ان کے بڑے کارناموں کا راز بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیدائشی طور پر فنکار تھے۔ وہ اسی طرح پر لاکھوں آدمیوں کی محبت اور توجہ کو حاصل کر لیتے تھے جس طرح کہ صرف بڑے سے بڑا فنکار ہی کر سکتا ہے یہ بات کسی ڈرامہ والی یا معجزہ والی خصوصیت کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ جس چیز کو وہ دوسروں کے اندر سے لیتے تھے اور جس چیز کو وہ اُنکے اندر پیدا کرتے تھے اسی چیز کو وہ خود اپنے اندر رکھ کر نئے طریقہ پر دوسروں کے سامنے پیش کرتے تھے اور وہی چیز اُن کو دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے تمام سرکاری سفروں میں جہاں ان کو بہت سی عام ملاقاتیں کرنی پڑتی تھیں اُنکی بہت زیادہ قوت صرف ہو جاتی تھی۔ جب کبھی وہ اپنی گاڑی میں ایک طویل ہوا خوری کرنے کے بعد واپس آتے تھے جس کے دوران میں ہزاروں آدمی ان کا خوشی کے ساتھ استقبال کرتے تھے تو اس کی وجہ سے جو تھکن وہ محسوس کرتے تھے اس کے اسباب محض جسمانی تھکاوٹ کے علاوہ بہت زیادہ گہرے ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ' نیکی' دراصل ان کے اندر سے نکل کر باہر جا پہنچی ہے چونکہ ان سب آدمیوں کے ساتھ جو بڑے شوق سے اُن کی آہستہ آہستہ چلنے والی گاڑی کو گھیر لیتے تھے وہ ایک گہری جذباتی دماغی اور

روحانی ہم آہنگی کا تعلق پیدا کر لیتے تھے۔

۱۹۳۶ء کے ابتدائی موسم بہار میں مجھ کو پہلی مرتبہ ان کی تخت نشینی کے بعد ان سے شرف باریابی حاصل ہوا۔ وہ میری تازہ اور اُس زمانہ کی کارروائیوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گذشتہ چند سالوں سے میں ہتھیاروں کو کم کرنے والی کانفرنس (DISARMAMENT CONFERENCE) میں اور لیگ کی اسمبلی کے (ASSEMBLY OF THE LEAGUE) مختلف اور مسلسل اجلاسوں میں ہندوستان کا خاص ڈیلی گیٹ (DELEGATE) رہ چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ دنیا کے معاملات کی روز افزوں پرخطر حالت سے میں بہت زیادہ پریشان تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس مصیبت کے گہرے احساس کا بار مجھ پر تھا جس کو دور کرنے کی ہم کوشش کر رہے تھے اور اسی طرح پر ہم میں سے بہت سے آدمی تھے جو کسی حد تک ان سالوں میں پردہ کے پیچھے کام کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں اس پوشیدہ زخم سے واقف تھا جو بین الاقوامی اور خاص طور پر یورپ کی سیاست کے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں اُس حالت سے بھی خوفزدہ تھا جس کو امریکہ کی غفلت اور بے توجہی کہہ سکتے تھے۔ اور اس چیز سے بھی خوفزدہ تھا جس کو ہم اُس زمانہ میں روس کا بارودی منصوبہ (RUSSIA'S GUNPOWDER PLOT) کہتے تھے اور جس کے ہوتے ہوئے روس (RUSSIA) کی یہ مفروضہ تجویز تھی کہ ایسی جنگ کے ذریعہ سے مالداری کے نظام کو بالکل تباہ کر دیا جائے جس میں سوویٹ یونین (SOVIET UNION) کسی طرف سے شامل نہ ہو گا۔ مگر جس کے ختم ہونے پر وہ ایک نفع حاصل کرنے والے اور کل اختیارات رکھنے والے ثالث کی حیثیت سے ظاہر ہو گا۔

وہ رئیس لوگ جو بادشاہ سلامت سے ملنے کے لئے آئے تھے اور انڈیا آفس کے وہ عہدہ دار جو میرے ساتھ آئے تھے یہ امید کر رہے تھے کہ میری ملاقات معمولی۔ سرسری اور مختصر قسم کی ہو گی۔ مگر وہ برآمدہ والے کمرہ میں ڈیڑھ گھنٹہ

یا اس سے زیادہ دیر تک بیٹھے ہوئے ٹھنڈ کھاتے رہے اور میں بادشاہ سلامت کے پاس رہا جہاں پر انہوں نے مجھ سے ایسے کھوج نکالنے والے گہرے اور پُرراز معلومات جرح کے سوالات کئے جن کا مجھ کو اپنی زندگی میں کبھی تجربہ نہ ہوا تھا آخر کار میں ملاقات کے کمرہ سے باہر آیا اور میرے دل میں اُن کی تعریف کے جذبات بھرے ہوئے تھے جو صرف ان کے اُس علم کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے جو انہوں نے تمام سرکاری اور کابینہ کے کاغذات کو بہت وسیع اور گہری نگاہ سے پڑھنے کے بعد حاصل کیا تھا بلکہ اس سے زیادہ اُن کے نقطۂ نظر کی اہمیت اور اُن کی نگاہ کی رسائی کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں میری ملاقات چند مرتبہ بادشاہ سلامت سے ہوئی جو پرائیویٹ تفریحی پارٹیوں میں یا کسی گہرے دوست کے مکان پر لنچ میں ہوا کرتی تھی بڑے جلسوں میں جہاں پر بہت سے معمولی آدمی بھی ہوتے تھے مجھ پر بادشاہ سلامت کی اس خصوصیت کا بڑا اثر پڑا کہ ان میں چھچھورا پن بالکل نہ تھا متانت اور سنجیدگی بہت زیادہ تھی اور وہ اپنے فرائض پر پوری توجہ دیتے تھے میری ملاقات کے بعد جب کبھی میں اُن سے پرائیویٹ اور غیر سرکاری موقعوں پر ان مہینوں کے اندر ملا تو میں نے دیکھا کہ مسز ولیس سمپسن (MRS. WALLIS SIMPSON) جو اب ڈچز آف ونڈسر (DUCHESS OF WINDSOR) کہلاتی ہیں اُن کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ مسز سمپسن مجھ کو ایسی ہی ذہین معلوم ہوئیں جیسی کہ وہ دلفریب تھیں۔ اُن کی معلومات بہت زیادہ تھی جو قابل تعریف تھی۔ ان کے اندر بھی چھچھورا پن بالکل نہ پایا جاتا تھا اور وہ بہت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ اس بات کی کوشاں رہتی تھیں کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو ملک معظم کے نقطۂ نظر سے مطابق کریں۔ دو مختلف مکانات پر میں اُن سے لنچ پر ملا اور ہر مرتبہ ہمارے میزبان اور ان کی بیوی کے علاوہ جو شخص وہاں موجود تھے وہ صرف میرے پرانے دوست فلپ کیر مارکواس آف لوتھین (PHILIP KERR, MARQESS OF LOTHIAN) جو خود ایک جوشیلے اور

مستقل طور پر روحانی نور کے تلاش کرنے والے آدمی تھے۔ اس وجہ سے ہماری گفتگو کا عام انداز ایسا سنجیدہ اور ایسا غور و فکر والا ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ سنجیدہ ہونا ممکن نہ تھا۔

قدرتی طور پر نہ تو بادشاہ سلامت نے اور نہ مسز سمپسن نے کبھی اپنے ذاتی معاملات کا مجھ سے ذکر کیا اور نہ اس کے متعلق ان کی کوئی بات میرے سننے میں آئی مگر عام طور پر یہ ضرور تھا کہ لندن میں اس سال جہاں کہیں کوئی شخص جاتا تھا اس کے متعلق کانا پھوسی اور افواہیں بہت زیادہ پھیلی ہوئی پاتا تھا۔

میں نے اس دلخراش گفتگو کا حال بیان کر دیا ہے جو میں نے ملکہ میری (QUEENMARY) سے اس وقت کی جب میں جنیوا (GENEVA) سے لندن (LONDON) واپس آیا اسی سال کے آخر میں اور جہاں تک مجھے خیال ہے جولائی کا مہینہ تھا۔ ملکہ میری (QUEEN MARY) کے ایک بڑے دوست نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ زار و قطار رویا کرتی تھیں جب ان کو اس پوشیدہ اور ناگفتہ مصیبت کا خیال آتا تھا جو ان کے بہت زیادہ پیارے بیٹے پر آنے والی تھی۔

اسی نازک زمانہ کے دوران میں لارڈ وگرم (LORD WIGRAM) نے جب صرف ہم دونوں ایک جگہ لنچ کھا رہے تھے مجھ سے ایسی بات کہی جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ شاہ ایڈورڈ ہشتم (EDWARD VIII) میں وہ بات پائی جاتی ہے جس سے وہ ہمارے ملک کی تاریخ میں سب سے بڑے بادشاہ ہوں گے اپنی دلفریبی اور ذاتی وقار کی وجہ سے وہ ساری آبادی کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں خواہ وہ آبادی کسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہو۔

لارڈ وگرام (LORD WIGRAM) نے بہر حال اپنے طویل اور گہرے تجربہ کے بعد یہ بات کہی تھی۔ وہ شاہ جارج پنجم (GEORGE V) کے

ؔ وہ بعد میں ملک معظم کے سفیر ہو کر واشنگٹن (WASHINGTON) چلے گئے تھے اور ان کا انتقال سنہ ۱۹۴۰ء میں ہو گیا۔

پرائیویٹ سکریٹری رہ چکے تھے۔ اُن کا تقرر لارڈ اسٹیم فورڈہم (STAMFORDHAM) کی جگہ پر ہوا تھا اور وہ ایک خاموش۔ عقلمند اور وفادار مشیر اور دوست ثابت ہوئے۔ مگر درباری آدمی ہونے سے پہلے وہ ہندوستانی فوج میں ایک افسر کی حیثیت سے ملازمت کر چکے تھے اور اس کے بعد جس زمانہ میں لارڈ کرزن (GURZON) وائسرائے تھے وہ ان کے اسٹاف میں رہے تھے ان کا یہ منصفانہ اور غیر جذباتی فیصلہ مجھے بہت کافی اہمیت کا معلوم ہوا۔ تاہم میں نے دیکھا کہ جب وہ باتیں کر رہے تھے تو وہ اپنے اندر بہت سخت اور بے انتہا تکلیف دہ اور بے چین کرنے والے جذبات کو دبا رہے تھے۔

اُس خزاں کے موسم تک میں جنیوا (GENEVA) میں واپس آگیا۔ ایک مرتبہ بادشاہ سلامت نے مجھ سے ٹیلیفون پر بات کی۔ ہماری گفتگو لازمی طور پر بہت احتیاط کے ساتھ کی گئی تھی۔ تاہم مجھے اس گہرے رنج کا ایک مرتبہ پھر احساس ہوا اور اُن کی زندگی اور اُن کے ملک کی زندگی کے ڈرامے میں جو پیچیدگی پیدا ہونے والی تھی اور جس کا تکلیف دہ انجام اس وقت اتنا قریب آگیا تھا اُس کا احساس بھی پھر ایک مرتبہ ہوا۔ اُن کے قطعی اور ناقابل منسوخی فیصلہ کی تکمیل اور تیزی پوری طرح پر المناک تھی۔

اس واقعہ کو اب برسوں ہو گئے ہیں اور دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء کے ابتدائی ہفتوں میں جو غمناک واقعات پیش آئے ان کے متعلق لازمی طور پر ان سالوں نے ہمارے اندر ایک نیا نقطۂ نظر پیدا کر دیا ہے۔ شاہ ایڈورڈ ہشتم (EDWARD VIII) کے تخت چھوڑنے کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی جارج ششم (GEORGE VI) کے نام سے تخت پر بیٹھے۔ ہم سب کو بہت شکر گذاری اور خوشی کے ساتھ اُس بے لوث اور مستقل خدمت کی بڑی مقدار کا احساس ہے جو انہوں نے اپنی سولہ سال کی حکومت میں اپنے ملک کے لئے اور انسانی آزادی کے لئے انجام دی ہے اور ہم کو اُن کے کیریکٹر کی خاموش اور بے انتہا خوبی کا بھی احساس ہے جو اُن کے والد کی

خوبیوں کی مانند ہے۔ جارج ششم ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشگوار شادی کی برکت سے فیضیاب ہوئے تھے۔ جیسا کہ ان کے بڑے بھائی نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ چھپی ہوئی پبلک تقریر میں بہت زور کے ساتھ ظاہر کیا تھا۔ اُن کی مہربان بیوی جو اب ملکہ ایلیزبتھ (ELIZABETH) یعنی 'رانی ماتا' ہیں قومی خدمات کے لئے ایسی ہی مستقل مزاج اور بے نفس تھیں جیسے کہ وہ خود تھے۔ ان بہت سے آزمائشی سالوں میں جن میں دوسری عالمگیر جنگ کے خطرات اور پرجوش حالات پائے جاتے تھے اور جنگ کے بعد والے زمانہ میں جب بہت دور رس تمدنی اور اقتصادی تبدیلی پیدا ہوئی ملکہ ایلیزبتھ ہمیشہ اپنے شوہر کو مدد اور سہارا دینے کے لئے ان کے ساتھ رہتی تھیں۔

اب ایک پیاری دلکش نوجوان ملکہ کامن ویلتھ (COMMON HEALTH) کی صدر ہونے کی حیثیت سے حکومت کر رہی ہے۔ وہ اپنا فرض پورا کرنے میں سب سے اعلیٰ قسم کی دماغی اور روحانی خصوصیات کام میں لاتی ہے اور یہ بات اب واضح ہو گئی ہے کہ اس نے ساری دنیا میں اپنی رعایا کی گہری وفاداری اور عقیدت مندی حاصل کر لی ہے۔ اس کو اپنے شوہر کی مستقل محبت سے مدد ملتی ہے اور اس کا گھر خاموش اور محبت آمیز گھریلو زندگی کا بہترین نمونہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے اس کے باپ کا گھر تھا۔ برطانیہ کی طویل اور پُراز واقعات تاریخ میں ایلیزبتھ (ELIZABETH) کے نئے شاندار دور حکومت کے علامات بہت مبارک طریقہ پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ برطانیہ اور کامن ویلتھ میں (COMMONWEALTH) تاجداری کی رسم بہت خاموشی اور شان کے ساتھ اپنی سخت ترین آزمائش کے بعد بھی اب تک زندہ چلی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی وجہ سے ہم کو پشیمان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اگر ایڈورڈ۔ ڈیوک آف ونڈسر (EDWARD) DUKE OF WINDSOR)

اور ان کی ڈچز (DUCHESS) کے قصہ پر اس طرح غور کیا جائے کہ وہ اپنی طرز کا ایک انسانی واقعہ ہے اور اس کے قانونی اور سیاسی نتائج کو بالکل علیحدہ کر دیا جائے تو یہ قصہ دنیا کے بہت بڑے عشقیہ افسانوں میں شمار کیا جائے گا فارسی اور عربی افسانوں کے غیر فانی۔ المناک اور خوشگوار قصوں سے اس کا مقابلہ کیجئے۔ انیتھونی اور کلیوپیٹرا (ANTHONY AND CLEOPATRA) رومیو اور جولیٹ (ROMEO AND JULIET) کے قصوں سے اس کا مقابلہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کیا وہ شاید ان سب سے زیادہ باا ثر اور دل ہلا دینے والا قصہ معلوم نہیں ہوتا ہے؟۔

جب میں اپنے مذہبی خیالات بیان کر رہا تھا تو میں نے حافظ شیرازی کا ایک شعر پڑھا تھا جس کا یہ مطلب تھا کہ جن لوگوں کو روح مقدس کی (HOLY SPIRIT) وہ مہربانی اور مدد عطا نہیں کی جاتی ہے جس سے اُس 'الہی وجود' کے ساتھ براہ راست تعلق حاصل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ہم زندہ ہیں۔ ہم حرکت کرتے ہیں اور ہمارا وجود قائم ہے۔ تو وہ لوگ پھر بھی متبرک اور خالص فرحت اس طرح پر حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ انسانی محبت اور انسانی صحبت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جائیں۔ یہ ایسی چیز ہے جو آسانی کے ساتھ یا بلا دقت کے حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ ساری عمر کی وابستگی کا نتیجہ ہوتی ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کی محبت اور خدمت کے لئے جو کچھ اس کے پاس ہے۔ جو کچھ وہ جانتا ہے اور جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے سب ایک ساتھ لگا دیتا ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ سابق ملک معظم شاہ ایڈورڈ ہشتم کو جنہوں نے بہت کچھ کھویا اور بہت زیادہ قربانی کی ایک دیرپا اور ہمہ گیر محبت کی برکت اور روشنی عطا کی گئی تھی گو وہ برکت اور روشنی اعلیٰ قسم کی نہ تھی مگر پھر بھی کمتر درجہ کی اور ایسی تھی کہ جس کو کسی طرح بے وقعت شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اِس غمناک مگر موثر کہانی میں مجھے ایک ذاتی آخری تحریر کا اضافہ کرنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے موسم خزاں میں میرا قیام اسی زمانہ میں برلن (BERLIN) میں تھا جب ڈیوک اور ڈچز آف ونڈسر (DUKE AND DUCESS OF WINDSOR) وہاں پر مقیم تھے۔ میں اُن سے ملنے کے لئے گیا اور وہاں پر اُن سے میری بہت طویل۔ بے انتہا پُرخلوص اور بے انتہا راز کھولنے والی گفتگو ہوئی۔ مجھ پر اس واضح اور صاف طور پر سچی اور پُرخلوص وفاداری اور دلدادگی کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ جس کے ساتھ ڈیوک (DUKE) اپنے بھائی کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اُن کا ذکر بادشاہ کہہ کر کرتے تھے۔ اُن کی باتوں کا سارا انداز ایسا تھا جیسا کہ ایک رعایا کے دلدادہ آدمی کا اپنے بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سال کے آخر میں جب میں لندن میں تھا مجھے شاہ جارج ششم سے شرف باریابی حاصل ہوا۔ شاہی محل میں میری طلبی کا ظاہری سبب یہ تھا کہ میں ملک معظم سے اپنی اس ملاقات کا حال بیان کروں جو میں نے ہٹلر (HITLER) سے کی تھی۔ قبل اس کے کہ میں وہاں سے رخصت ہوں بادشاہ سلامت نے مجھ سے دریافت کیا کہ "کیا آپ میرے بھائی سے ملے؟" اس پر میں نے ان سے اس گفتگو کا خلاصہ بیان کیا جو ڈیوک آف ونڈسر (DUKE OF WINDSOR) سے ہوئی تھی اور میں نے ڈیوک (DUKE) کی وفاداری کی گرمجوشی اور واضح خلوص پر بہت زور دیا۔ بادشاہ سلامت پر اس بات کا بہت گہرا اثر ہوا کہ اُن کے بڑے بھائی نے اپنی نئی حالت کو پوری طرح پر اور رضامندی کے ساتھ منظور کر لیا تھا۔ وہ دراصل اتنے متاثر ہوئے تھے کہ میرے اوپر خود اس کا ایسا ہی اثر پڑا۔

کیا ہم امن کو قائم رکھ سکتے ہیں یا آخر میں لازمی طور پر پھر جنگ شروع ہوگی؟ یہ وہ سوال تھا جو ہر سال جنیوا (GENEVA) کے مقام پر ہمارے سامنے آتا تھا۔ اس کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے اور اس طریقہ کو سمجھنے کے لئے جس پر ہم میں سے ہر ایک انفرادی حیثیت سے یا اپنے ملکوں کے نمائندوں کی

حیثیت سے اپنا اپنا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کے بہت سے حصہ کی چھان بین کی جائے۔ میونخ (MUNICH) پر اکثر مسلسل اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ تسلی دینے کا واحد۔ بے مثال اور غیر ضروری کام تھا۔ اور نیول چیمبرلین (NEVILLE CHAMBERLAIN) پر جو برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ جن کا نام ہمیشہ کے لئے میونخ (MUNICH) کے ساتھ وابستہ ہے جو اس کو اپنی سب سے بڑی فتح سمجھتے تھے اور جن کو آخر میں معلوم ہوا کہ وہ ان کا سب سے بڑا المناک واقعہ تھا۔ بڑے بے تکے اور بے انتہا غضبناک الفاظ میں اعتراضات کئے گئے ہیں۔ مگر یہ بات معلوم کرنی ہے کہ حقیقت میں "مجرم آدمی" کون تھے جن کا جانب دار پروپیگنڈے نے ایسی بدگوئی کے ساتھ پیچھا کیا ہے؟ میونخ (MUNICH) پر جو سطحی "الزام" لگایا جاتا ہے اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کے اصلی اسباب کیا تھے؟

ہم کو سب سے پہلے اس کی چھان بین کرنی ہے کہ گذشتہ زمانہ میں جرمنی کے تعلقات بقیہ یورپ کے ساتھ کیسے تھے۔ ہم کو اس نامناسب۔ جھوٹے اور غیر منصفانہ دعوی پر از سر نو نظر ڈالنی ہے جو پہلی عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر کیا گیا اور جو ورسیلز (VESAILLES) کے صلح نامہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا کہ جرمنی اور صرف جرمنی ہی پر جنگ کا سارا جرم عائد ہوتا ہے۔ اس جرم کی خواہ کسی سختی کے ساتھ تقسیم کی جائے۔ وہ کسی طرح بھی پورے طور پر صرف جرمنی ہی پر عائد نہیں ہوتا ہے۔ اس کی تقریباً نصف ذمہ داری روس (RUSSIA) عائد ہوتی ہے اسولسکی (ISVOLSKY) جیسے آدمی کی اس حماقت۔ ناقابلیت۔ مجنونانہ امنگ اور بدلہ لینے والی خود اعتمادی کا کیا علاج ہے جس نے پیرس (PARIS) میں روس کا سفیر (CZARIST AMBASSADOR) ہونے کی حیثیت سے یہ جملہ مجھ سے کہا اور صرف مجھ سے ہی نہیں بلکہ اس نے ہر شخص سے کہا

جس سے وہ کہہ سکتا تھا کہ "سیسٹ ماگوایر" (CESTMAGUERRE) اسی طرح پر 'سازونوو' (SAZUNOV) کی احمقانہ غرور والی باتوں کا کیا علاج ہے جو وہ کیا کرتے تھے اور یہ وہ کمزور اور بیوقوف آدمی تھا جو ایسے آدمیوں کی تمام تنبیہوں کے باوجود جو اُس سے زیادہ قابل تھے مثلاً وٹ (WITTE) اور روسن (ROSEN) ایسی جنگ سے نہیں رُکا جس کی وہ امید رکھتا تھا اور جو اس کے ملک اس کے شہنشاہ اور خود اُس کے طبقہ والے آدمیوں کو تباہ کرنے والی تھی۔

بہر حال جنگ کے ختم ہونے پر فاتح قوموں کے لاکھوں آدمیوں کے نزدیک جو اپنے پروپیگنڈے کی وجہ سے اندھے ہو رہے تھے۔ شاہ پرست جرمنی آسانی کے ساتھ ایک قربانی کا بکرا معلوم ہوتی تھی۔ جرمنی پر یہ داغ لگایا گیا کہ صرف وہ ہی واحد مجرم تھی۔ اور پھر قبل اس کے کہ ورسیلز کے صلحنامہ (VERSAILLESTREATY) پر دستخطوں کی روشنائی خشک ہو جائے سیاسی خیالات میں ایک اہم تبدیلی پیدا ہوئی۔ برطانیہ کے بائیں بازو والے دماغدار آدمیوں نے جن پر جون مینارڈ کینس (JOHNMAYNARD KEYNES) کی صاف طور پر موثر تحریروں کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ یہ معلوم کیا کہ ان کے ضمیر ورسیلز (VERSAILLES) کی بے انصافی کی وجہ سے بے چین تھے۔ اور اس اقبال کی وجہ سے بہت بے چین تھے جو اُس صلح نامہ میں جرمنی کے نمائندوں کے جبریہ دستخط حاصل کرنے کے بعد لکھ دیا گیا تھا کہ صرف جرمنی ہی پر پہلی عالمگیر جنگ کے تمام خطرات اور مصیبتوں کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جب تک ہٹلر (HITLER) برسر اقتدار رہا یہ لوگ بہت بلند آواز سے ۱۹۱۹ء کے صلحنامہ پر اعتراضات کرتے تھے۔

صلح نامہ ورسیلز (VERSAILLESTREATY) کے متعلق جو شبہات تھے اور جو نہ صرف اُس کی معقولیت پر تھے بلکہ اس کے اخلاقی پہلو پر بھی تھے وہ کسی طرح پر برطانیہ کے بائیں بازو والے اونچے طبقہ کے آدمیوں تک ہی محدود نہ تھے۔ داہنے بازو والے بہت سے دیانتدار سیاسی مفکر۔ جو شاید زیادہ تر

عملی آدمی تھے اور جو نتیجہ کو "طاقتور سیاسیات" کے لحاظ سے دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے - اس بات کے حق بجانب ہونے پر سخت شبہات رکھتے تھے کہ وہ حالت قائم رکھی جائے جس کی بنیاد جھوٹ پر رکھی گئی اور جو شاید جنگ ہی کے بدلے میں قائم رہ سکتی تھی لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کے دستور پر بھی جو صلح نامہ ورسیلز (VERSAILLES TREATY) کا ایک جزو تھا اسی قسم کے اعتراضات کئے گئے - اس دستور میں لیگ کو قانونی طور پر یہ قطعی اختیار دیا گیا تھا کہ وہ سب غلطیوں کو صحیح کر دے - چیزوں کے اس افسوسناک نظام کو بالکل توڑ دے اور اس کی جگہ ایسی چیز لائے. جو دل کی خواہش کے زیادہ قریب ہو مگر لیگ کے واقعی طرز عمل سے واقف ہونے کے بعد یہ بات بہت جلد واضح ہو گئی کہ اس کا دستور ایسا نرم اور لچک دار تھا کہ لیگ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی غلطی کو خواہ وہ کیسی ہی سخت اور علانیہ ہو درست کر سکے -

جو حالت اس وقت تھی اس کے قائم رہنے کے لئے سب اسباب موجود تھے لیگ کے ذریعہ سے ملکی حدود کی صحیح درستی حاصل کرنے اور متضاد قومی مطالبات کے طے کرنے کا ایسا ہی امکان تھا جیسے کہ سنہ ۱۸۲۰ء کے دارالامرا (HOUSE OF LORDS) میں کسی ایسے قانون پاس کرانے کا تھا - جس میں عام طور پر سب لوگوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہو - جنگ کے بعد والے فوری زمانہ میں جو خیالی منصوبوں والے آدمی تھے وہ لیگ کے دستور کی پرستش کرتے تھے مگر بہت سے بتوں کی طرح اس کے پاؤں بھی مٹی کے بنے ہوئے تھے - وہ حقیقت میں سکندر اول کے اُس مقدس اتحاد (ALEXANDER I's HOLY ALLIANCE) کا اعادہ تھا جو سنہ ۱۸۱۵ء میں کیا گیا تھا - گو بظاہر وہ اُس نام سے نہ تھا - وہ میٹرنک (METTERNICH) کا نظام تھا جس کو جمہوریت اور آزادی کا لباس اور اور ایک مقدس لفظ "خود اختیاری" کا لباس نئی طرح پہنایا گیا تھا - مگر اس نظام کی ترتیب اس طرح پر کی گئی تھی کہ اس میں قوموں کے مالدار آدمی سب

باتوں کو اپنی مرضی کے مطابق کرلیں اور مفلس آدمیوں کو اپنی کمتر حیثیت کو بدلنے کی امید صرف اس بات میں تھی کہ یا تو وہ مالدار آدمیوں کے درمیان اختلاف پیدا کریں یا خود اپنی فوجی طاقت بہت محنت کے ساتھ اور خفیہ طور پر اتنی بڑھالیں کہ وہ اس قابل ہوجائیں کہ براہ راست اور علانیہ حملہ کرسکیں۔ لیگ کی ناکامیابی ایسی ہی مستقل تھی جیسی کہ وہ بظاہر نمودار تھی۔ یہ ایسی بات تھی جس کو میں نے خود لارڈ ہیلی فیکس (HALIFAX) سے کہا تھا۔ جب وہ خارجی امور کے سکرٹری تھے۔ یعنی یہ کہ "آپ سُوار کے کان سے ریشم کی تھیلی نہیں بنا سکتے"

اس قسم کی کمزوریاں زیادہ عرصہ تک نہیں چھپائی جا سکتی تھیں۔ گران چیکو (GRANCHACO) کا وہ خون آلود جھگڑا جو بولویا (BOLVIA) اور پیرگی (PARAGUAY) کے درمیان چل رہا تھا۔ ایسے علاقہ میں تھا جو بہت دور تھا۔ اور جو اُس وقت جنگی مصلحتوں کے اعتبار سے کچھ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ مگر جو مشکلات اس نے پیدا کی تھیں وہ حقیقی اور خطرناک تھیں اور ہم میں سے وہ لوگ جو مسئلہ کے مناسب اور منصفانہ طے کرانے میں کوئی حصہ رکھتے تھے ان مشکلات سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔

اس کے بعد وہ طویل چین اور جاپان کی مصیبت شروع ہوئی اس میں معاملہ شروع ہی سے صفائی کے برعکس تھا۔ اس صدی کے شروع میں زار والے روس (CZARIST RUSSIA) کے خلاف جاپان کے کامیاب حملہ کے بعد جاپانیوں نے اپنے لئے منچوریا (MANCHURIA) میں ایک خاص اور طاقتور درجہ حاصل کرلیا تھا جو پورٹ آرتھر (PORTARTHUR) سے لے کر خود پیکنگ (PEKING) کی دیواروں کے قریب تک پھیلا ہوا تھا جہاں پر چین کی خودمختار حکومت ضرور تسلیم کی جاتی تھی مگر ملک میں جاپان کا انتظام جاری تھا اور جاپان اس کو ایسے ناجائز طریقہ پر استعمال کرتا تھا جیسے کہ وہ جاپان کا زیر نگرانی ملک ہے (PROTECTORATE) شمالی چین کے جنگی سردار ٹوکیو (TOKYO) کے ساتھ بسمارک (BISMARCK) کے

الفاظ میں ایک "تار برقی" کا تعلق رکھتے تھے۔ جو دراصل ٹیلیفون اور ریڈیو کا بھی مکمل اور مسلسل تعلق تھا۔ باوجودیکہ چین برسوں سے اپنی اندرونی جنگ کی وجہ سے درہم برہم ہو رہا تھا۔ مگر جب جاپان کی امنگوں کی حد اور ان کا تعین ظاہر ہو گیا تو یہ تعلق زیادہ سے زیادہ تلخی کے ساتھ مخالفانہ ہوتا چلا گیا عرصہ تک یہ بات رائج رہی کہ چین اور جاپان کے اختلافات کا ذکر معمولی طور پر خوش اخلاقی کے ساتھ کیا جائے۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ وہ اختلافات دراصل جنگ کی صورت اختیار کر چکے تھے جن کو ختم کرنے کے لئے ہم نے جو جنیوا (GENEVA) میں نبھے کوشش کی تھی۔

لیگ کے نقطۂ نظر سے چین کا قانونی معاملہ ایسا صحیح تھا جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ جاپان کو چین میں سوائے ان رعایتوں کے مثلاً۔ بندرگاہ ریلوے لائن۔ تجارتی کارخانے اور مختلف مراکز۔ اور کوئی حق حاصل نہ تھا جو اس کو چین کی طرف سے حاصل ہوئی تھیں یا جن کو جاپان نے روس (RUSSIA) سے جیت کر لیا تھا اور جو روس کو (RUSSIA) چین نے اپنی رضامندی سے دبدی تھیں۔ جاپان کے ملکی توسیع کے جھوٹے دعوے۔ خواہ وہ علانیہ تھے یا درپردہ۔ ایسے تھے جن میں قانونی انصاف کا ایک ذرہ بھی نہ پایا جاتا تھا۔

مگر جب لیگ نے جاپان کو لعنت ملامت کی اور مداخلت کرنے کی کوشش کی تو جاپان کے حکمرانوں کو ایسا معلوم ہوا ہے جیسے کہ 'توا' کڑھائی سے یہ کہہ رہا ہے کہ تو کالی ہے۔ جاپان کے اعتراضات یہ تھے۔ اٹھارھویں صدی میں برطانیہ نے ہندوستان میں جو قبضہ حاصل کیا تھا۔ اس کا کیا ہوگا؟ کیا جاپان کے لوگ بیسویں صدی میں ٹھیک وہی کام نہیں کر رہے ہیں جو اس قسم کے ملک جیسے کہ برطانیہ اور فرانس اپنی سلطنتوں کو بنانے کے لئے ایک یا دو صدی پہلے کر چکے تھے؟ جاپان کے لوگ اس دعوے کو کبھی منظور نہ کریں گے اور نہ وہ اس کو منظور کر سکتے تھے کہ لیگ کے دستور کی وجہ سے ایک نئی دنیا

وجود میں آ گئی تھی اور اس کے ساتھ ایک نئی بین الاقوامی اخلاقیت پیدا ہو گئی تھی جو سب قوموں کے لئے قابل پابندی تھی۔ جس کے ماتحت کسی سیاسی تبدیلی کو پیدا کرنے کا صرف یہ طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ لیگ کی طویل پیچیدہ اور چکر دینے والی مشین کے ذریعہ سے کی جائے۔ انجیل کے الفاظ میں یہ بات زیادہ آسان تھی کہ اونٹ کسی سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے بہ نسبت اس کے کہ جاپان شمالی ایشیائی علاقہ میں اپنی واقعی حیثیت کو لیگ سے قانونی طریقہ پر تسلیم کرا لے۔ جاپان کے طاقتور لوگوں نے کہا کہ اب ہرگز نہ ہوگا اور بے بس آدمیوں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ لڑکر اندر گھس جائیں یا دھوکہ دے کر اس 'نہیں کرنے والی' دیوار پر قابو پالیں۔

جب چین اور جاپان کا جھگڑا لیگ کے سامنے لایا گیا تو میں اپنی طرف سے سر جون سائمن (JOHN SIMON) سے ملا جو اس وقت برطانیہ کے خارجی امور کے سکرٹری تھے اور میں نے اُن سے کہا کہ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ بہ حیثیت ہندوستانی نمائندہ کے اور بہ حیثیت ایک ایشیائی کے یہ میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہو میں چین اور جاپان کے درمیان گفتگو کرا کر ایک براہ راست سمجھوتہ کرا دوں۔ جون سائمن (JOHN SIMON) پر بہت سے حلقوں میں بری طرح حملے کئے گئے تھے مگر وہ ایک سیاست دان کا دماغ رکھتے تھے۔ ایک دفتری عہدہ دار کا دماغ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے فوراً یہ محسوس کیا کہ گو ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری حاصل نہ تھی کسی ہندوستانی نمائندہ کا اس طرح علیحدہ ہو کر کوئی کام کرنا بالکل غیر معمولی معلوم ہوگا جب تک کہ اس کو برطانیہ کی علانیہ تائید حاصل نہ ہو مگر کسی خالص ایشیائی جھگڑے میں کسی ایشیائی بچولئے کا پڑنا بہت کافی اہمیت رکھے گا۔ اس لئے دونوں نے مجھے اختیار دے دیا کہ میں جو کچھ کر سکتا تھا اس پر توجہ دوں۔ میں نے چین اور جاپان کے نمائندوں سے چند موقعوں

گفتگو کی۔ ایک آخری موقعہ پر میں نے چین اور جاپان کے وفود کے صدروں کو ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ ان میں کوئی سمجھوتہ کرانے کی انتہائی کوشش کی جائے ہم تینوں کے فوٹو ایک جگہ پر لیئے گئے تھے۔

بہر حال اخباروں کے فوٹو گرافروں کی چمکدار نمائش سے بہت زیادہ اہم کام کرنے کی ضرورت تھی۔ صلح کی بات چیت ناکامیاب رہی۔ اس کے بعد ایشیا کے اندر لڑائیاں از سر نو بڑے پیمانہ پر شروع ہوگئیں۔ چین کا معاملہ شنگھائی (SHANGHHI) اور وسط چین میں پوری جنگ بنگیا۔ آخر کار جاپان نے لیگ کو چھوڑ دیا۔ منچوریا (MANCHURIA) چین سے علیحدہ کر دیا گیا اور جاپانیوں نے منچوریا میں ایک فرضی بادشاہ بنا دیا جو قدیم شاہانہ منچو (MANCHU) خاندان کی اولاد کا ایک شخص تھا اور یہ وہ شخص تھا جو لوگوں کے نزدیک حقداری کے اعتبار سے چین کا شہنشاہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد وسط چین میں جاپانیوں اور جنرل چیانگ کی شیک (CHIANGKAISHEK) کی فوجوں کے درمیان لڑائی برابر جاری رہی جب تک کہ ۱۹۴۱ء میں پرل ہاربر (PEARLHARBOUR) پر جاپان کے حملہ کرنے سے دوسری عالمگیر جنگ مشرق بعید تک پھیل گئی۔

شخصیتیں اور پالیسیاں (POLICIES) اُن مشکل سالوں میں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ جب ہم بہت سے مسلسل مسائل اور نازک واقعات سے لڑ رہے تھے تو مجھے جنیوا (GENEVA) میں بہت سے قابل قدر آدمیوں کو جاننے کا موقعہ ملا۔ لیگ کے پہلے جنرل سکرٹری سر ارک ڈرمنڈ (SIRERICDRUMMOND) تھے جو ایک مشکل اور تقریباً ناممکن صورت حالات میں بہترین قسم کے آدمی تھے۔ ان کو صرف اس بات کا ہی احساس نہ تھا کہ کسی بحث کے ہمیشہ دو پہلو ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ہر مسئلہ کو اس کے سب پہلوؤں پر نظر ڈال کر دیکھا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اپنی بہت سی گفتگوؤں کے

درمیان لیگ کے ہر معمولی کام یا فیصلہ کی پیچیدگی اور اس کے دور رس نتائج کا میں نے اندازہ کرنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی تالاب پر بیٹھے ہوئے ہمیشہ اس کی لہروں کو چوڑا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں جو اس کے اندر چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے ڈالنے سے پیدا ہوتی تھیں۔ مگر مجھے یہ خیال نہیں پیدا کرنا چاہیئے کہ ارک ڈرمنڈ (ERIC DRUMMOND) بین الاقوامی معاملات میں عدم جنبش کے حامی تھے۔ یا اس زمانہ کی حالت کو ہٹ دھرمی کے ساتھ قائم رکھنا پسند کرتے تھے۔ میں یہ بات صاف طور پر کہتا ہوں کہ کسی شخص نے تاریخ کی سبق آموز باتوں کا ان سے بہتر طریقہ پر اندازہ نہیں کیا تھا۔ مثلاً کسی شخص نے ان سے زیادہ واضح طور پر یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ سکندر اول (ALEXANDER I) اور میٹرنک (METTERNICH) نے جو کچھ قائم کرنے کی کوشش کی اس کے باوجود وہ یورپین نظام جو ۱۸۱۵ء میں قائم ہوا تھا ۱۸۳۰ء تک ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ تقریباً ایسی حالت پیدا ہو گئی تھی جس میں کوئی باضابطہ حکومت اور انتظام باقی نہ رہا تھا۔ ڈرمنڈ (DRUMMOND) کا دماغ بہت لچک دار تھا اور ان میں اثر ڈالنے کی قوتیں بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے ایسے جھگڑے جو بہت سنگین ہو سکتے تھے محض ان کی مصلحت آمیز قابلیت اور تیز پیش بینی کے استعمال کرنے سے ان کے دفتر ہی میں طے ہو جاتے تھے۔ بہر حال ان کا اثر اور ان کے اختیارات محدود تھے۔ چونکہ یہ قدیم روایت کہ مستقل عہدہ داروں کو اپنی ذاتی رائے نہیں رکھنی چاہیئے۔ قومی دائرہ سے بڑھ کر بین الاقوامی دائرہ تک منتقل ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے ان کو بہ حیثیت سکرٹری جنرل کے یہ حق نہ تھا کہ وہ خود اپنی پالیسی کی ابتدا کریں اور اس کو از سر نو چلائیں۔

برونِنگ (BRUNING) جو جرمنی کا چانسلر (CHANCELLOR) تھا ایک درماندہ اور غمزدہ آدمی تھا۔ وہ ایک پُرخلوص عیسائی تھا۔ ایک دلدادہ

رومن کیتھولک (ROMAN CATHOLIC) تھا۔ ہماری مصیبتوں کی وجہ سے اُس کے صحیح عیسوی ضمیر پر بظاہر بہت بار تھا۔ اور یہ بار بہ حیثیت ایک جرمن کے اس کی وطن پرستی کی وجہ سے تھا اور اُن روزافزوں مشکلات کی وجہ سے تھا جو جرمنی کی جمہوریت قائم رکھنے میں تھیں۔ یہ بار نازیوں (NAZIS) کی بڑھتی ہوئی دھمکیوں کی وجہ سے تھا اور بوڑھے ہنڈنبرگ (HINDENBURG) کو اس جمہوریت سے جو لگاؤ تھا جس نے اس کو اپنا صدر منتخب کیا تھا اس میں روزافزوں کمزوری پیدا ہونے کی وجہ سے تھا۔ زیکوسلوویکیا (CZECHOSLOVAKIA) کا "بینس" (BENES) اپنے مختلف طریقہ پر کچھ اس سے کم غمناک آدمی نہ تھا۔ اُس کو اُن خطرات کا پورا احساس تھا جو اُس کے ملک کے لئے پیش آنے والے تھے۔ چند مرتبہ کوفی (COFFEE) پیتے وقت یا لنچ پر اُس نے مجھ سے اپنی تکلیفوں اور مشکلات کا ذکر کیا۔ وہ جانتا تھا کہ زیکوسلوویکیا (CZECHOSLOVAKIA) میں جرمنوں کی قلیت کو خوش رکھنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ اُن پر اس بات پر زور ڈالا جائے کہ وہ اپنے اُن خوابوں کو چھوڑ دیں جن میں وہ ساری دنیا پر جرمنی کی حکومت دیکھتے تھے اور وہ لوگ ملک کے دوسرے قومی فرقوں کے ساتھ ساتھ وفادار اور پرخلوص شہریوں کی طرح ہو جائیں مگر وہ سمجھتا تھا کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ بہرحال وہ اس سے بڑی امیدیں لگائے بیٹھا رہا۔ مگر جب کبھی وہ سوڈیٹن لینڈ (SUDETENLAND) میں ایسے مقامات پر جاتا تھا جیسے کہ کارلسبیڈ (CARLSBAD) یا میرین بیڈ (MARIENBAD) تو وہاں پر اس کو اپنی پالیسی کی حدود اور اس کی واقعی ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چونکہ اُن علاقوں میں جو زیک لوگ (CZECHS) رہتے تھے گو وہ اقلیت میں تھے مگر وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ سیاسیات میں اور اقتصادیات میں اور تعلیمی اور لسانی رکاوٹیں پیدا کر کے جرمنی زبان بولنے والی اکثریت پر اپنی فوقیت کا اظہار کریں۔ "بینس" (BENES) کی مثال اس طریقہ کی

بہترین مثال تھی جس پر ایک نیک نیت سیاسی لیڈر اپنے پیروی کرنے والوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ اُس کے واضح اور پُر خلوص ارادوں کے مطابق عمل کریں۔

اُن سالوں میں جنیوا (GENEVA) کے اندر میرا سابقہ اس شخص سے پڑا جو اُس زمانہ میں اپنی بڑی زندگی شروع کرنے والا تھا یعنی مسٹر انیتھونی ایڈن (ANTHONYEDEN) ہمارے درمیان ہمدردی اور مفاہمت کا ایک فوری سبب یہ تھا کہ پہلی عالمگیر جنگ کے فوراً بعد وہ مضمون جس میں انہوں نے آکسفورڈ (OXFORD) سے اعزازی ڈگری حاصل کی تھی وہ مشرقی زبانوں کا مضمون تھا انہوں نے فارسی کا مطالعہ کیا تھا اور میرے قدیم دوست ڈاکٹر ای۔ جی۔ براؤن (E.G.BROWNE) سے واقف تھے جو مشرقیات کے ماہر اور فارسی کے مستند استاد تھے اور عربی کے پروفیسر تھے۔ یہ مشترکہ دوستی اسلامی ادب نظریات اور فلسفہ کے متعلق ہمارا مشترکہ علم۔ سمجھ اور باہمی احساس ایسی مخصوص باندھنے والی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے ہمارا تعلق اُس سے زیادہ قریب تر ہوگیا جو اُن قدرتی تعلقات اور سوشل نزدیکی کی وجہ سے ہوسکتا تھا جو ایک برطانوی گورنمنٹ کے نمائندہ اور ایک ہندوستان کے نمائندہ کے درمیان لیگ کی اسمبلی کے کسی اجلاس میں قدرتی طور پر ممکن تھا۔ یہ اس شخص کے لئے مشکل نہیں ہے جس نے میری طرح گذشتہ اور موجودہ مشہور سیاست دانوں کی زندگیوں کو غور سے دیکھا ہے کہ وہ مسٹر ایڈن (EDEN) کی آخری اور شاندار قسمت کا پہلے سے اندازہ لگالے۔ آج کے دن میں بہت سے دوسرے آدمیوں کے ساتھ اس دعا میں شریک ہوتا ہوں کہ جب آخر کار بڑی ضرورت کا زمانہ آتا ہے اور وہ سب سے بڑے رتبہ پر پہنچ جاتے ہیں تو اُن کو وہ صحت اور وہ قوت پوری طرح پر دوبارہ حاصل ہو جائے گی جس کو انہوں نے گذشتہ چند سالوں میں بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ملک اور عام انسانیت کی خدمت

کے لئے خرچ کیا ہے۔

دوسرا بڑا خطرناک واقعہ جس کا مقابلہ لیگ کو کرنا پڑا وہ سنہ ۱۹۳۵ء میں ایتھوپیا (ETHOPIA) پر اٹلی کا حملہ تھا۔ یہ چین اور جاپان کے جھگڑے سے زیادہ خطرناک اعلان تھا چونکہ بہر حال جاپان کی حرکتیں خواہ کتنی ہی سخت اور زیادتی والی تھیں مگر پھر بھی اُن میں کچھ ایسی باتیں شامل تھیں جو حالات کی تفصیل کرتی تھیں گو وہ حالات کو درست کرنے والی نہ تھیں۔ اس وجہ سے جیساکہ میں ذکر کرچکا ہوں یہ بات بڑی حکومتوں میں سے کسی حکومت کے لئے ناممکن ہو گئی کہ وہ اس کو ایک سیدھا اور صاف معاملہ سمجھ کر طے کر دیں۔ تمام مختلف رعایتیں جن میں 'حیثیت' کے متعلق سب قسم کے قانونی شبہات موجود تھے۔ اور جاپانیوں کا کوریا (KOREA) پر قبضہ کرنے کے بعد سے) یالو (YALU) دریا کے کنارے پر ایک مشترکہ سرحد قائم کرنا بذات خود جھگڑا کرنے کے ایسے موقعے تھے جن میں سیاسی مصلحتوں سے غیر مطمئن ہونا فوجی حملہ کرنے کے لئے ایک عذر بنایا جاسکتا تھا اور عام طور پر وہ عذر اسی طرح بنایا گیا۔ اخلاقی اعتبار سے یہ تمام حالت اس قسم کی تھی کہ قدرتی طور پر اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر یہ حالت صدیوں تک جاری رہنے کے بعد قائم ہو گئی تھی اور اس میں کم از کم احترام کی عارضی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

اٹلی کے پاس اس قسم کے کوئی موقعے یا سہولتیں نہ تھیں جن سے وہ ایتھوپیا (ETHOPIA) پر اپنے ظالمانہ اور شاہانہ منصوبوں کو معقول بنا کر پیش کرسکے۔ اٹلی کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اگر اس کے آدمیوں کو اٹلی والوں کی حیثیت سے باقی رہنا ہے تو اس کو اپنی روز افزوں آبادی کے لئے رہنے کی زمین کی سخت ضرورت ہے۔ لیبیا (LIBYA) میں اس کے امکانات بہت کم تھے کہ اس کو اچھی طرح اور بڑے پیمانہ پر استعمال کیا جائے اور وہاں کوئی کالونی (COLONY) بنائی جائے۔ بحر روم کے کنارے پر

اِس طویل علاقے میں زرخیز رقبے محدود تھے اور جنگل بہت وسیع تھا۔ اس وجہ سے اٹلی کی زائد آبادی کے لئے صرف ان دو امکانات میں سے ایک امکان رہ گیا تھا۔ یا تو اٹلی کے آدمی بحر اٹلانٹک (ATLANTIC) کے پار شمالی یا جنوبی امریکہ کو منتقل ہو جائیں یا بحر روم کے آس پاس ملکوں میں چلے جائیں۔ مثلاً مصر، مراکو، ٹیونیسیا اور الجیریا۔ اور اس طرح پر بہ حیثیت شہری ہونے کے اٹلی کے ہاتھ سے بالکل نکل جائیں یا وہ اٹلی میں ہی رہیں اور ہمیشہ زندگی کے معیار سے نیچے رہیں۔ لاکھوں آدمی اس کی محدود زمین کے لئے برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے اور اُن کا معیار زندگی اُن کے مغربی یورپین ہمسایوں کے معیار زندگی سے بہت زیادہ نیچے درجہ کا تھا اور وہ اس قوم کے بالکل نامناسب تھا جو شاہانہ روم (IMPERIAL ROME) کی جانشین ہوئی تھی۔

مسولینی (MUSSOLINI) نے اپنے ارادوں کو راز میں نہیں رکھا۔ اس نے تمام اٹلی کے شہروں اور قصبوں میں جوش میں لانے والی تقریریں کیں اور اس کی خوش بیانی نے ہزاروں آدمیوں کو جذباتی جوش اور ہمدردی کے لئے تیار کر دیا۔ بین الاقوامی سیاست کے لحاظ سے اُس نے ایک سے زیادہ تنبیہ دی۔ جو بہر حال ایسے الفاظ میں تھی جو اتنے زیادہ مشتبہ تھے کہ اُن سے وہ اس قابل نہ ہو سکا کہ فرانس اور برطانیہ کی اس خاموشی کی تعبیر کر سکے جس کے ساتھ انھوں نے اس کے الفاظ کا اس طرح استقبال کیا جس سے اُن کی رضامندی ظاہر ہوتی تھی۔ اگرچہ اُس میں اُس کے لئے کوئی براہ راست ہمت افزائی کا پہلو شامل نہ تھا۔ مسولینی کا دماغ جس طرح کام کر رہا تھا اُس کا دھندلا پس منظر خواہ کچھ ہی ہو مگر ۱۹۳۵ء کے تمام موسم گرما میں اتھوپیا (ETHOPIA) کی آزاد اور خود مختار حکومت کو فوجی طاقت کے ذریعہ سے فتح کرنے اور اپنے قبضہ میں لانے کے لئے اُس کی تیاریوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو کھلم کھلا طریقہ پر لڑائی کرنے کے لئے کی جا رہی تھیں اور جو ایسے عذروں کے ساتھ کی جا رہی تھیں جو بے انتہا کمزور تھے۔ ایتھوپیا (ETHOPIA) والوں کو اس افسوسناک حالت کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ ان دو باتوں میں سے ایک بات کو اختیار کریں۔ یعنی یا تو مسولینی کے الٹی میٹم کو

(ULTIMATUM) منظور کر لیں یا اس کو نامنظور کر کے ایسی مایوس کن لڑائی لڑیں جس کا انجام اُن کے لئے صرف مکمل فوجی شکست اور اطاعت ہو سکتا تھا۔

اس طرح پر لیگ کو ایک مایوس کن مشکل حالت میں زبردستی داخل کر دیا گیا برطانیہ اور فرانس کے درمیان بلکہ درحقیقت دنیا کے بہت بڑے حصہ میں وہ گہرا اور مصیبت ناک اختلاف رائے پیدا ہو گیا جو دوسری عالمگیر جنگ کے شروع ہونے تک جو چار سال بعد ہوئی بہت افسوسناک نتائج کے ساتھ قائم رہنے والا تھا۔ دو ملکوں میں یعنی سوویٹ روس (U.S.S.R) اور نازی جرمنی (NAZI GERMANY) میں کسی اختلاف رائے کے اظہار کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ روس کی (RUSSIA) پالیسی سیدھی سادی اور ایک بات پر جمنے والی تھی۔ لٹونیو و (LITVINOV) نے روس (RUSSIA) کے اس اصول کا اعلان کر دیا تھا کہ " صلح ناقابل تقسیم " ہے کیمونسٹ پالیسی میں (COMMUNIST POLICY) کتنی ہی کمزوریاں اور خامیاں کیوں نہ ہوں مگر اس میں تقریباً ہمیشہ سے عقیدہ اور عمل کے درمیان ایک قسم کا معقول اتحاد باقی رہا ہے۔ نازیوں (NAZIS) کو یہ اعلیٰ درجہ کا موقعہ ملا کہ وہ بڑی طاقتوں کے درمیان جو کچھ اتفاق باقی رہ گیا تھا اس کو توڑ ڈالیں۔ یہ وہ طاقتیں تھیں جو پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی پر فتح حاصل کر چکی تھیں اور جنہوں نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اپنی فتح کو صلح نامہ ورسیلز (VERSAILLES TREATY) کے اندر تحفظی شرائط تحریر کر کے مستقل بنا لیں۔ وہ طاقتیں اتنی ہوشیار ضرور تھیں کہ انہوں نے زور کے ساتھ اس بات کا اعلان نہیں کیا کہ وہ مطمئن تھیں۔ اس وجہ سے برطانیہ اور فرانس کے عام آدمی جرمن رویہ کے پوشیدہ خطرات سے اسی طرح بے خبر تھے جس طرح پر وہ ان پوشیدہ خطرات کا اندازہ نہیں کرتے تھے جو روس کی (RUSSIA) مجروح نیکی کے اظہار میں پائے جاتے تھے۔

برطانیہ میں گڑبڑ اور عدم استقلال غمناکی کے ساتھ ظاہر ہو رہے تھے ایسے پرانے طرز کے شاہ پرستوں کی حقیقت بینی پائی جاتی تھی۔ جیسے کہ لارڈ لائیڈ (LORD LLOYD) جو بحری لیگ کے (PRESIDENT OF THE NAVAL LEAGUE) صدر تھے۔ (گو وہ حقیقت بینی بالکل غلط تھی

جیساکہ دوسری عالمگیر جنگ کی بحری تاریخ ثابت کرنے والی تھی) اور جو اس بات پر بحث کرتے تھے کہ شاہی بحری فوج برسوں تک ہتھیاروں کی کمی اور مالی مشکلات کی وجہ سے اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ وہ اس علانیہ جنگ میں شریک ہونے کا خطرہ برداشت نہیں کر سکتی تھی جو اٹلی کے ظالمانہ حملہ کے خلاف کسی سخت اور جائز کارروائی کرنے کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ اس وجہ سے وہ کسی مستقل پالیسی کے خلاف تھے۔

دوسری قسم کے خیالات کے آدمی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اٹلی کو ناراض کرنا "اس کو جرمنی کی گود میں دھکیل دینا" ہوگا۔ یہ جملہ وہی ہے جو اس زمانہ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کو اس عذر میں اس بات کی کافی معقول وجہ معلوم ہوتی تھی کہ مسولینی (MUSSOLINI) کی زیادتیوں کو تسلیم کرلیا جائے۔ دوسرے اور آدمی ایسے تھے جن کو ان انتظامات میں جو بعد کو "ہور لاول" انتظامات کے نام سے مشہور ہوئے (HOARE-LAVAL ARRANGEMENTS) ایسا عملی سیاسی طریقہ نظر آتا تھا جس میں بچت کی صورت پیدا ہوتی تھی اور جو باہر نکل جانے کا راستہ تیار کرتا تھا۔

جنیوا (GENEVA) میں اس آسان کامیابی پر جو حملہ کرنے کی اس شرمناک پالیسی کو حاصل ہوتی تھی جو کرایہ پر رکھی ہوئی فوجوں کے طریق عمل سے ہوتی تھی بہت گہری اور دور تک پھیلی ہوئی ناخوشی اور احساس ذلت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ بین الاقوامی تعلقات اور پروپیگنڈے کے لئے یہ بیسویں صدی کا طریق عمل تھا۔

میں اپنے دوست مسٹر ایڈن (EDEN) سے ملا اور میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ بین الاقوامی سیاسیات کی بنیاد انصاف پر رکھی جائے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لیگ درحقیقت ایسی ہی ہو جائے جیسی کہ وہ شمار کی جاتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لیگ کو ان قوموں کی حقیقی سوسائٹی بننے کا موقع دیں جو صحیح اور غلط معاملات کو خود اپنے درمیان طے کیا کریں تو آپ کے لئے آج کل ایک بڑا صاف معاملہ موجود ہے جس کو لازمی طور پر طے کرنا چاہیئے۔ اس میں کسی قسم کے معقول عذر کی گنجائش نہیں ہے۔ ایتھوپیا (ETHOPIA) میں اٹلی کی کوئی اقلیت بڑی تعداد میں ایسی نہیں ہے جو اپنی آزادی

یا شہری اور اقتصادی حقوق سے محروم کی گئی ہو۔ یہ معاملہ بالکل علانیہ اور ناقابل معافی زیادتی اور ظلم کا ہے اور اس کا علاج ہمارے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ ہم کو اس وقت کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم نہر سوئز کو بند کر دیں (SUEZ CANAL) یا اگر ہم کو امتناعی قانون لازمی طور پہ پاس کرنے ہیں تو ان کو تیل کے متعلق بھی استعمال کرنا چاہیئے اور اس طرح پر ان کو 'حقیقت' بنا دینا اور ان میں کچھ زور پیدا کرنا ہے۔ مگر میں اب بھی یہی خیال کرتا ہوں کہ اس کا بہترین حل یہ ہی ہے کہ نہر سوئز کو بند کرنے کے لئے لیگ ایک سادہ اور متفقہ تجویز پاس کر دے۔

اس کے بجائے ہم نے یہ دیکھا کہ ہم امتناعی قوانین کے لئے تجاویز پاس کر رہے تھے جو میرے نزدیک احمقانہ اور بیکار بات تھی۔ پھر بھی باوجودیکہ ہم جانتے تھے کہ وہ بیکار ہیں مگر ہم کو ان کی تائید میں رائے دینی پڑتی تھی۔ چونکہ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو اس سے یہ معلوم ہوتا کہ ہم اٹلی کی زیادتی کو معاف کر رہے ہیں۔ مگر وہ امتناعی قانون جس سے کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا یعنی پٹرول بند کرنے کا قانون روک دیا گیا تھا۔ مجھ کو یہ بات پہلے سے نظر آ رہی تھی کہ اس وقت سے آئندہ کے لئے یہ لازمی ہو گیا کہ ایک ایسا تلخ دن ضرور آئے گا کہ ہم میں سے وہ لوگ جو لیگ کے متعلق کسی زمانہ میں بہت بڑی امیدیں رکھتے تھے۔ ان کو لیگ کی اسمبلی (ASSEMBLY) میں جانا پڑے گا اور اپنے دلوں میں بہت تکلیف محسوس کر کے یہ کہنا پڑے گا کہ ان امتناعی قوانین کو منسوخ کر دیا جائے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا اقبال کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے کہ جب وقت آ جائے گا کہ ہم ایتھوپیا (ETHOPIA) میں اٹلی کی فتح کو تسلیم کر لیں تو ہمارے لئے یہ بہتر ہو گا کہ ہم اپنے فخر اور اپنے غصہ کو پی جائیں اور اس کو اچھے انداز کے ساتھ پئیں۔

یہ ایک اہم پہلو اس بات کا تھا کہ تسلی اور تسکین دینے کی پالیسی اور اس پر عمل کرنے کو ترقی دی جائے۔ یہ ایسی مثال تھی جس میں تسلی دینا اور ظالم سے مصالحت کرنا اخلاقی اعتبار سے غلط تھے۔ اگر بڑی طاقتوں نے ایک مرتبہ اس معاملہ میں تسلی اور تسکین سے کام لیا جو نہایت خراب اور بے انصافی کا معاملہ تھا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جلد

یادیریں ہم کو ایک نئی قسم کی تسکین اور تسلّی کا نوالہ مجبوراً نگلنا پڑے گا۔ وہ یا تو چین میں جاپان کی مداخلت کا معاملہ ہو گا۔ جس میں تاریخی اور قانونی اعتبار سے بہت سی خامیاں تھیں۔ یا وہ کسی قسم کی جرمن زیادتی و ظلم کا معاملہ ہو گا جس میں یہ عذر پیش کئے جائیں گے کہ اقلیتوں پر مصیبت آرہی ہے اور عوام کا مطالبہ ہے کہ دوبارہ پھر سب کو متحد کر لیا جائے اور اس طرح پر قانونی جواز اور اخلاقیات کی تمام مناسب صورتیں پیش کی جائیں گی۔

کیا یہ سب باتیں پوری طرح پر مناسب اور حق بجانب تھیں؟ اس اہم اور پُرخلوص شبہ کی وجہ سے مختلف قوموں کے لئے فرداً فرداً اور لیگ کی اسمبلی کے لئے (ASSEMBLY) مجموعی حیثیت سے صلحنامہ ورسلیز (VERSAILLES TREATY) پر دستخط ہونے کے کچھ عرصہ بعد جرمنی کے ساتھ تعلقات پیچیدہ ہو گئے۔ اس باب کے شروع میں مَیں نے اُن لازمی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے جو فاتح حکومتوں کے صاحب الرائے اور با اثر حلقوں کی ذہنیت اور نقطۂ نظر میں جرمنی کے ساتھ برتاؤ کرنے کے لئے پیدا ہوئیں اور یہ تبدیلیاں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ برطانیہ میں اور اس سے کم پیمانہ پر امریکہ اور اٹلی میں ظاہر ہوئی تھیں۔

اب عام طور پر میں برطانیہ اور برطانیہ کے آدمیوں کی بہت تعریف کرتا ہوں مگر میری سب سے بڑی تعریف اور احترام اُن کی ایک مستقل خصوصیت کے لئے مخصوص ہے جو اُن کے اندر پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُن کی آبادی کے ایک بڑے اور عام طور پر با اثر حصہ میں ایک بہت زیادہ حسّاس ضمیر پایا جاتا ہے جو اُن کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ کسی غیر منصفانہ یا ظالمانہ کام یا پالیسی کو ایک قومی ذمہ داری کی حیثیت سے منظور کر لیں خواہ وہ کام یا پالیسی ملک کی مادی بہتری کے لئے کتنی ہی مفید معلوم ہوتی ہو۔ اس میں شک نہیں ہے کہ برطانیہ کی تاریخ میں بے رحمی ظلم اور ملک گیری کے دَور رہے ہیں مگر کیا کوئی تندرست اور طاقتور قوم ایسی ہوئی ہے جو اپنی طویل قومی زندگی میں اس قسم کے دَوروں سے نہ گذری ہو؟ مگر برطانوی

کیریکٹر اور برطانوی طرز زندگی کے لئے یہ بات بنیادی طور پر لازمی ہے کہ ضمیر کی یہ آواز ہمیشہ سنائی دیتی ہے گو وہ شروع میں ہلکی اور تھوڑی ہو اور صرف چند آدمیوں سے متعلق ہو مگر آخر میں اُس کی وجہ سے اکثریت پر اثر ڈالا گیا ہے زندہ رہنے کے لئے سخت کشمکش کرنے کا برہنہ ضابطۂ عمل جس کا یہ دعویٰ ہے کہ زندگی صرف اس طرح پر قائم رہتی ہے کہ جو ہستیاں سب سے زیادہ موزوں اور بہترین قسم کی ہیں وہ باقی رہتی ہیں۔ برطانوی نقطۂ نظر کے مطابق ایک زیادہ بلند اور زیادہ شریف جذبہ کی بنیاد پر پہلے سے زیادہ بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ وہی بات ہے جو ملکۂ وکٹوریہ کے دور حکومت کے بڑے سائنس دان پروفیسر ٹی ایچ ہکسلے (T.H.HUXLEY) نے ایک مشہور تقریر کے اندر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کہی تھی۔ ضمیر کی یہ خصوصیت برطانوی لوگوں میں اور اُن کے بھائیوں میں جو امریکہ میں ہیں ایسے استقلال کے ساتھ ظاہر ہوتی رہی ہے جو کسی دوسری بڑی قوم میں جس کو میں جانتا ہوں نہیں پائی گئی ہے۔

انسانی قوم کے بہت بڑے حصہ میں بیرونی واقعات کے متعلق اس قسم کا ضابطہ پسند ضمیر ایک ذاتی اور انفرادی معاملہ ہوا کرتا ہے۔ مگر انگلستان میں یہ چیز عرصہ سے ایک قومی ملکیت چلی آرہی ہے اور یہی بات امریکہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ میرا یقین ہے کہ یہ حالت کوایکر سوسائٹی (QUAKERS) کے اثر کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ وہ لوگ ہمیشہ سے تعداد میں ایک چھوٹی سی اقلیت ہوتے تھے مگر انہوں نے انیسویں صدی سے لے کر آئندہ تک ایسا اخلاقی اور روحانی اثر ڈالا ہے جو ان کی تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ دوسری مختلف عقائد رکھنے والی جماعتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے بعد یہ اثر اس زمانہ میں بھی تمام آبادی کے اندر پھیل گیا تھا جب برطانیہ کی صنعتی اور تجارتی وسعت وطن میں اور سمندر پار ملکوں میں سب سے بڑے پیمانہ پر تھی اور برطانیہ کی پالیسی اور اعمال پر اس اثر کی قوت اور استقلال کا نتیجہ بہت زیادہ نمایاں رہ چکا ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے درمیانی زمانہ میں جس شخص نے جرمنی کے متعلق اکثر اور بہت زور کے ساتھ ان ضمیر والے ضابطوں کو منہ سے نکالا وہ لائیڈ جارج (LLOYD GEORGE) تھا۔ اخبارات میں اُن رسالوں کے اندر اس تحریک میں کافی قوت اور اثر پیدا ہو گیا تھا اور وہ خاص طور پر اس طریقہ کی طرف لوگوں کی توجہ مجتمع کرتی تھی جس پر جرمنی کو اس کی کالونیوں سے محروم کیا گیا تھا۔ جے۔ ایل گاروِن (J.L. GARVIN) اور دوسرے آدمیوں نے اپنی تقریروں میں اس بات پر زور دیا کہ جرمنی کو ایک یا دو کالونیاں جن سے وہ محروم کر دیا گیا ہے واپس کر دی جائیں برطانیہ والے اس قسم کے اقدام کے عملی امکانات اور اس کی خیالی خوبی سے بے خبر نہ تھے۔

اب یہ صورت تھی کہ جس طرح پر برطانیہ میں اس قسم کے ضمیر والے شبہات اس حالت کو قائم رکھنے کی معقولیت کے متعلق پائے جاتے تھے جو صلحنامہ امن (PEACE TREATY) کے ذریعہ سے عائد کی گئی تھی۔ جرمنی کی رائے ورسیلز (VERSAILLES) کے متعلق شروع سے یہ تھی کہ وہ ڈکٹیٹ (DIKTAT) تھا جس پر لازمی طور سے دھوکا دے کر قابو پانا چاہئے۔ اس پر اعتراض کرنا چاہئے اور آخر میں اس کو ہر ذریعہ سے جو جرمنی والوں کے لئے ممکن تھا ختم کر دینا چاہئے عام طور پر جرمنی والوں کا یہ خیال نہ تھا کہ صرف انہوں ہی نے جنگ کی تھی نہ یہ کہ دراصل ان کو شکست ہوئی تھی۔ اس وجہ سے جب جرمنی مہذب قوموں کے حلقہ میں دوبارہ داخل ہو گیا تو ہٹلر (HITLER) کے عروج سے بہت پہلے سب بڑے معاملات میں جرمنی کا رویہ ایسا ہو گیا تھا جس میں کافی تنبیہ پائی جاتی تھی صلحنامہ لوکارنو (LOKARNO TREATY) کی شرائط اس گرمجوشی اور خوش بینی کے باوجود جس کے ساتھ ان کا اعلان کیا گیا تھا صرف اس بات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتی تھیں کہ جنگ کو محض اس وجہ سے ترک کیا جائے کہ وہ مغرب میں جھگڑوں کو طے کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ جرمنی کے جو مطالبات پولینڈ (POLAND) کے مقابلہ میں تھے اُن کا

وضاحت کے ساتھ یقین کئے بغیر ان کو چھوڑ دیا گیا تھا۔

صلح نامہ لوکارنو (LOCARNO) کے کچھ عرصہ بعد لارڈ ڈی ابیرنن (D'ABERNON) جو برلن میں (BERLIN) بڑے برطانوی سفیر تھے اور جو معہ اپنی خوب صورت بیوی کے عرصہ سے میرے بہت زیادہ پیارے اور گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مونٹے کارلو (MONTE CARLO) میں اس زمانہ میں مقیم تھے جب اسٹرلیسمین (STRESEMANN) وہاں آئے تھے۔ لارڈ ڈی ابیرنن نے (D'ABERNON) نے مجھ سے کہا کہ میں اسٹرلیسمین (STRESEMANN) سے ہوٹل میٹروپول (METROPOLE) میں ایک لنچ پر ملوں جس میں ہم تینوں کے علاوہ جو دوسرا آدمی موجود تھا وہ اسٹرلیسمین کا سکرٹری تھا۔ اسٹرلیسمین (STRESEMANN) نے (شکار سے پہلے) جھاڑی کے چاروں طرف کھٹکا نہیں کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ جنگ کے بعد والے زمانہ میں چند عام اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ مثلاً سب یورپین قوموں کو آزادی ہوگی کہ اگر وہ چاہیں تو متحد ہو جائیں کولونیوں (COLONIES) کو اپنے معاملات خود طے کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ قومی اقلیتیں اپنے مادری ملکوں سے علیحدہ کر دی جائیں گی۔ انہوں نے کہا کہ یہ اصول جوگوسلیویا (JUGOSLAVIA) اٹلی (ITALY) اور زیکوسلاویکیا (CZECHOSLOVAKIA) میں استعمال کئے گئے ہیں اور اب صلح نامہ لوکارنو (LOCARNO) کا مطلب یہ تھا کہ یہی اصول وسیع کرنے کے بعد لازمی طور پر جرمنی کے ساتھ پرامن طریقوں پر برتے جائیں۔ صلح نامہ لوکارنو (LOCARNO) نے مکمل اور قطعی طور پر اس بے انصافی کی درستی کر دی تھی جو ۱۸۷۱ء میں جرمنی کے ایلسیس لورین (ALSACE-LORRAINE) پر قبضہ کرنے میں ہوتی تھی۔ اس کے بعد جرمنی کو مغربی یورپ میں کوئی مزید مطالبات کرنے کا حق نہیں رہا تھا۔ اسٹرلیسمین (STRESEMANN) نے کسی قسم کی دھمکیاں نہیں دیں اور اس کے دلائل انصاف اور مناسب طریق عمل کی بنیادوں پر مبنی تھے۔

"درستی کرنا" دراصل وہ خیال تھا جو برسوں تک جرمنی کے سیاستدانوں اور بین الاقوامی مدبروں کے دماغوں میں جما رہا اور ان کو تکلیف پہنچاتا رہا۔ جنیوا (GENEVA) کے مقام پر انہوں نے دن رات اور وقت بے وقت اس کا پروپگنڈا کیا۔ مجھے خود اپنے ذاتی تجربہ سے کم از کم ایک مثال یاد ہے کہ وقت یا مقام کی مناسبت کا لحاظ کئے بغیر زور کے ساتھ آگے بڑھایا گیا۔ ایک بڑی سرکاری دعوت میں جب ہر شخص مکمل شام کا لباس پہنے ہوئے تھا اور وہ بہت سخت ضابطہ کا موقعہ تھا۔ اس وقت ایم ٹارڈیو (M.TARDIEU) پر جو اس زمانہ میں اسمبلی میں فرانسیسی وفد کے لیڈر تھے سب لوگوں کے سامنے ان کے مخالف ساتھی نے جو جرمنی کی طرف سے آئے تھے نہایت سختی کے ساتھ اعتراضات کئے۔

ہتھیاروں کو کم کرنے والی کانفرنس کے ناکامیاب ہونے پر جرمنی والوں کو یہ موقعہ ملا کہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ یہ موضوع کہ صلحنامہ ورسلیز (VERSAILLES) کا مطلب یہ تھا کہ ایسا قدم اٹھایا جائے گا جس سے مختلف موقعوں میں عام طور پر اور رفتہ رفتہ ہتھیاروں کی کمی ہوتی چلی جائے مگر اقوام متحدہ نے اپنے ان وعدوں کو توڑ ڈالا جو انہوں نے اس وقت کئے تھے۔ اس وجہ سے جرمنی والوں کو بہانہ مل گیا کہ وہ دوبارہ ہتھیاروں کو مہیا کریں۔

۱۹۳۳ء سے لے کر آئندہ زمانہ تک ہٹلر (HITLER) صرف ان ہی باتوں کو زور سے دہرا رہا جو اس کے جمہوری اور غیر انقلابی پیشتر و اکثر اس سے پہلے کہہ چکے تھے۔ ہٹلر نے یہ باتیں شرمیلی کانا پھوسی کے ساتھ نہیں کیں بلکہ عام طور پر گفتگو کرنے کے انداز میں اعلان کے ساتھ کہیں۔ اس کے مطالبات میں کوئی چیز خاص طور پر مقصد کے لحاظ سے نئی نہ تھی۔ جو کچھ نیا تھا وہ اس کا وہ غاصبانہ۔ ظالمانہ اور وحشیانہ طریقہ تھا جس پر اس نے وہ مطالبات پیش کئے۔ اس کے مطالبات ایسے ہی مبہم اور اسی طرح پر دھمکی کے ساتھ غیر معین تھے جس طرح پر اس کے پیش رو سرداروں نے کئے تھے مگر اس نے چند مخصوص اور مقررہ باتیں بھی کہیں۔ اس نے کہا کہ دوسری جنگ ایسی چیز تھی جس کی ضرورت وہ سب سے آخر میں محسوس کرتا تھا۔ وہ جرمنی والوں کا مزید خون بہانا نہیں

چاہتا تھا۔ جرمنی کے آدمی پہلی عالمگیر جنگ کی خوفناک خونریزی سے نجات نہیں پا چکے تھے۔ اُس نے کہا کہ جو مطالبات اس نے پیش کئے تھے وہ معمولی اور معقول تھے میں ۱۹۳۷ء کے موسم خزاں میں خود برلن (BERLIN) گیا اور اس سے ملا۔ یہ ملاقات برطانوی دفتر خارجہ کی تحریک پر نہ تھی مگر جو کچھ میں کر رہا تھا اس کا ان کو پورا علم تھا۔ اس وقت تک ہٹلر نے مطالبات کی ایک اچھی خاصی مفصل فہرست بنالی تھی مثلاً یہ کہ اگر اسٹریا کے آدمیوں کی عام رائے شماری سے یہ ظاہر ہو کہ اُن کی اکثریت اسٹریا اور جرمنی کو متحد کرنے کے حق میں ہے تو اسٹریا اور جرمنی کے الحاق کی اجازت دی جائے۔ یہ کہ زیک لوگوں (CZECHS) اور جرمنی بولنے والے فرقہ کے تعلقات جو سوڈیٹن لینڈ (SUDETENLAND) میں رہتے ہیں اسی قسم کے ہونے چاہئیں جیسے کہ برطانیہ اور آئرلینڈ کی آزاد حکومت کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اور یہ کہ جرمنی کو نوآبادیوں میں سلطنت قائم کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ اگر یہ حق ان ملکوں میں نہ ہو جہاں وہ پہلے تھا تو دوسرے مقامات پر ان کے مساوی ملکوں میں ملنا چاہیئے۔ اس کی یہ رائے تھی کہ ٹنگانیکا پر (TANGANYIKA) قبضہ کرنے کا جرمنی کو اخلاقی حق حاصل تھا۔ چونکہ افریقہ کے سپاہی بہت بہادری کے ساتھ جرمنی کی طرف سے لڑے تھے اور اس وجہ سے جرمنی کی حکومت لازمی طور پر ان کے لئے پسندیدہ اور ہر دلعزیز تھی۔ مگر اس نے اس بات کی کوئی دھمکی نہ دی کہ وہ اسی امر متنازعہ پر جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

چھ مہینے بعد ساری تصویر بہت تیزی کے ساتھ بدل گئی۔ نازی لوگ (NAZIS) اسٹریا میں داخل ہو گئے اور ہٹلر کی (HITLER) تعریف بہت جوش کے ساتھ اس کے مادری قصبہ لنز (LINZ) اور وائینا (VIENNA) میں کی گئی۔ سوڈیٹن (SUDETEN) کا معاملہ اب زیادہ دور اور قابل بحث نہیں رہا تھا۔

۱۹۳۸ء کے موسم گرما کے شروع میں ایک خطرناک واقعہ پیش آیا۔ سارے یورپ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جرمنی کی فوجیں بڑے پیمانہ پر زیکوسلاویکیا کی سرحد پر جمع ہو رہی تھیں ایک سخت ہفتہ تک سیاسی لیڈر اور سرکاری ملازم سفارتخانوں

اور خارجی وزارت کے دفتروں میں بہت بے چینی کے ساتھ کام میں لگے رہے وہ خطرناک واقعہ بغیر کسی معینہ شعلہ باری کے یونہی گذر گیا۔ مگر اُس نے اُس بیماری کی گہرائی اور نقصان رسانی کو ظاہر کر دیا جس میں یورپ مبتلا ہو گیا تھا۔ مسٹر ایڈن نے (EDEN) دفتر خارجہ سے استعفٰی دے دیا تھا اور ان کی جگہ لارڈ ہیلی فیکس (HALIFAX) جو پہلے وائسرائے رہ چکے تھے مقرر کئے گئے تھے۔ بہر حال مسٹر نیول چمبرلین (MR NEVILLE CHAMBERLAIN) جو وزیر اعظم تھے امور خارجہ کی بہت اچھی طرح نگرانی کرتے تھے۔ یہ وہ شخص تھے جنہوں نے بالکل انصاف کے ساتھ لیگ کی اُس پالیسی کے متعلق جس کی بنا پر اٹلی کے خلاف امتناعی قوانین پاس کئے گئے تھے یہ کہا تھا کہ وہ "گرمیوں کے موسم کا جنون" ہے۔ اب اسی شخص نے بڑی محنت اور خلوص کے ساتھ یہ کوشش کی کہ اُن مشکلات اور خطرات کو عملی طور پر کم کیا جائے جو یورپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ خاص مسائل کے خاص حل معلوم کئے جائیں اور اگر ضرورت ہو تو امن کی ایک نئی عمارت ایک ایک اینٹ کر کے از سر نو تعمیر کی جائے۔ اسی قسم کا خاص مسئلہ وہ شکایتیں تھیں جو سوڈیٹن (SUDETEN) کے جرمن لوگوں کو پیدا ہو گئی تھیں۔

کونریڈ ہنلین (KONRAD HENLEIN) جو سوڈیٹن لینڈ (SUDETENLAND) میں نازیوں کے لیڈر اور اُن کی طرف سے بولنے والے تھے اُس موسم گرما میں انگلستان آئے اور سر برآوردہ برطانوی سیاست دانوں کے سامنے انہوں نے اپنا معاملہ پیش کیا۔ مسٹر چمبرلین (CHAMBERLAIN) کی تجویز پر اور حکومت پراگ (PRAGUE GOVERNMENT) کی رضامندی سے لارڈ رنسیمن (LORD RUNCIMAN) جو لبرل پارٹی کے ایک سر برآوردہ ممبر تھے۔ بے داغ شہرت رکھنے والے سابق وزیر کابینہ تھے اور سیاسی اور اقتصادی معاملات میں سمجھوتہ کرانے والے کی حیثیت سے کافی عرصہ تک کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ایک چھوٹے سے وفد کے صدر بنا کر "زیکوسلاویکیا" (CZECHOSLOVAKIA) اس غرض سے بھیجے گئے کہ سوڈیٹن (SUDETEN) کے جرمن لوگوں کے مستقبل کا تمام مسئلہ اپنی

تحقیقات میں لائیں اور اگر ممکن ہو تو اس کا کوئی حل پیش کریں۔ کسی فوجی دھمکی سے بالکل قطع نظر کرکے لارڈ رنسیمن (LORD RUNCIMAN) کا وفد بلاشبہ یہ بات معلوم کرنے کے لئے گیا تھا کہ سوڈٹین لینڈ (SUDETENLAND) میں عام رائے شماری کا نتیجہ کیا ہوگا۔

انگلستان میں یہ رائے بہت زبردست اور بااثر طریقہ پر پھیلی ہوئی تھی کہ جرمنی کے مطالبات کا حقیقی مگر پر امن منصفانہ اور مستقل تصفیہ کر دیا جائے۔ ان لوگوں میں جو اس تصفیہ کو حاصل کرنے کی کوشش سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے میرے ایک قدیم اور پُرخلوص دوست تھے۔ اتفاق سے برطانیہ کے دوسر برآوردہ سفیر جو برلن (BERLIN) میں تھے میرے گہرے اور قابل قدر دوست رہ چکے تھے۔ میں لارڈ ڈی ابیرنن (D'ABERNON) کا ذکر کر چکا ہوں جن کو میں ۱۹۰۰ء کے شروع سے اچھی طرح پر جانتا تھا اب برطانوی سفیر سر نیول ہنڈرسن تھے (SIR NEVILE HENDERSON) ۱۹۱۲ء میں جب وہ سینٹ پٹرس برگ (ST. PETERSBURG) میں برطانوی سفارتخانہ کے ایک جونیئر عہدہ دار تھے۔ میری اور اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور ہم میں ایک پرجوش اور قائم رہنے والی دوستی پیدا ہوگئی تھی۔ چند سال بعد پیرس (PARIS) میں وہ اور میں دونوں اس خوشگوار۔ ادبی مذاق رکھنے والے فنونِ لطیفہ کے شوقین تفریح باز اور مہذب آدمیوں کی ایک مختصر اور بال دار جماعت کے ممبر تھے جس میں زیادہ تر امریکہ کے آدمی شریک تھے اور جن کا ذکر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ اس کے بعد پھر ہم دونوں مصر میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ہماری پہلی ملاقات سے چوتھائی صدی بعد وہ ایک بین الاقوامی مدبر کی حیثیت سے اپنی زندگی کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے اور جن کو ایسی ذمہ داری دی گئی تھی جو بے مثل اہمیت رکھ سکتی تھی جیسا کہ خود اُن کی خود نوشتہ سوانحعمری کے بیان سے بہت صفائی کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہے۔ جب وہ برلن (BERLIN) پہنچ گئے تھے تو میری اور ان کی ملاقات چند مرتبہ ہوئی۔ انہوں نے مجھ کو یقین دلایا کہ کارلس بیڈ (CARLSBAD) اور میرین بیڈ

(MARIENBAD) میں انہوں نے خود جاکر دیکھا تھا کہ وہاں پر لوگوں کے جذبات بہت زیادہ جرمنی والوں کی موافقت میں تھے۔ اور ان کو یقین تھا کہ منصفانہ عام رائے شماری یہ ظاہر کرے گی کہ وہاں کی بڑی اکثریت جرمنی سے اتحاد کرنے کے حق میں ہے۔

تقریباً تمام مشورے جن کو برطانوی کابینہ نے غور سے سنا اسی طرز کے تھے کنزرویٹیو پارٹی (CONSERVATIVE PARTY) کی اکثریت کابینہ کی تائید کرتی تھی اور اسی طرح پر "شہر" میں اس کی تائید پائی جاتی تھی۔ اخبارات میں جو سب سے زیادہ زوردار اور بااثر تائید اس بات کی کی جاتی تھی کہ جرمنی کے مطالبات کا مناسب اور منصفانہ تصفیہ کیا جائے اور خود سوڈیٹین لینڈ (SUDETENLAND) کے باشندوں کے مطالبات کا اسی طرح تصفیہ کیا جائے۔ وہ تائید اخبار "دی ٹائمس" (THE TIMES) کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ اس بڑے اخبار نے اپنی خود نوشتہ تاریخ میں جو حال میں شائع ہوئی ہے بہت صفائی اور ایمان داری کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے کہ 'میونچ' کے تمام خطرناک واقعہ میں (MUNICH CRISIS) اس نے کیا کام کیا تھا۔ جو رویہ اخبار "دی ٹائمس" (THE TIMES) نے اختیار کیا تھا۔ اس کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے کوئی تحریک نہ تھی۔ مگر اس واقعہ کے خلاف برطانیہ اور سمندر پار ملکوں میں عام طور پہ یقین پھیلا ہوا تھا جیوفرے ڈاسن (GEOFFREY DAWSON) جو ایڈیٹر تھے اور روبن بیرنگٹن وارڈ (ROBIN BARRINGTON-WARD) جو ان کے نائب تھے اور آخر میں اُن کے جانشین ہوئے۔ یہ دونوں اب مرچکے ہیں۔ خود اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ جو ہتہ لال اور فیصلہ کے بالکل آزاد طریقوں پر حاصل ہوا تھا کہ یہ صرف مصلحت اور دور اندیشی کی بات نہ تھی بلکہ یہ ایمانداری اور انصاف کی بات تھی کہ جرمنی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اگر ضرورت ہو تو اس کو دور رس رعایتیں دے کر حاصل کرنا چاہیئے اور ان کو امید تھی کہ اس قسم کا سمجھوتہ جنگ کی ابتدا کو روکے گا۔

جو لوگ میونچ (MUNICH) کی حمایت کرتے تھے اُن کے استدلال میں

کچھ عرصہ سے عجیب تبدیلی ہوگئی ہے جیسا کہ اخبار ڈیلی ٹیلیگراف (DAILYTELEGRAPH) کے ایک نامہ نگار نے ۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں ثابت کیا ہے۔ اب اس طرح بحث کرنے کا فیشن ہوگیا ہے کہ میونچ (MUNICH) کا کارنامہ اخلاقی وجوہ پر حق بجانب نہ تھا بلکہ وہ فوجی وجوہ پر حق بجانب تھا چونکہ وہ جنگی مصلحتوں اور فوجی نقل وحرکت کی اس ضرورت کی وجہ سے تھا جو اس لئے پیدا ہوئی کہ برطانیہ کے اندر خشکی اور سمندر کی لڑائی میں اور سب سے زیادہ ہوائی لڑائی میں کمزوری پائی جاتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اس طرح پر مختصر کرکے کہی جاسکتی ہے کہ یہ میونچ (MUNICH) کا بنایا ہوا اور وقتی ضرورت و الانظر یاتی اسکول ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جو بعد میں اس لئے گھڑا گیا کہ اس کو آئندہ واقعات کے نمونہ سے مطابق بنادیا جائے یہ وہ استدلال نہ تھا جو اس وقت استعمال کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں میونچ کا واقعہ (MUNICH) ایک اخلاقی مسئلہ کی طرح بیان کیا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کے ممبروں سے اور دوسرے سربرآوردہ آدمیوں سے جو تصفیہ کرانا چاہتے تھے میں نے جس طرح پر اس کا ذکر سنا ہے اور جس طرح پر خود میں اس کو پورے خلوص کے ساتھ سمجھتا تھا وہ حسب ذیل تھا:

> "کیا برطانیہ اس جنگ کرنے میں حق بجانب ہوگا جو اس لئے کی جائے کہ زیکوسلاوکیا (CZECHOSLOVAKIA) کے جرمن لوگوں کو اس بات سے روکے کہ وہ عام رائے شماری کے بعد اپنی مرضی کا اظہار کریں اور اس کے نتیجہ میں ان کو مجبور کرے کہ وہ زیک (CZECH) حکومت کی ماتحتی میں رہیں؟"

اب ان تمام گذشتہ واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ میرے دل میں اس خیال کی تائید کا اثر بہت خاموشی کے ساتھ ہوا کہ اُن علاقوں میں جہاں جرمن لوگوں کی اکثریت تھی ان کو زیک لوگوں (CZECHS) سے علیحدہ کردیا جائے اور یہ خیال میرے دل میں اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ہندوستان

میں مسلم ہندو مسئلہ سے میرا ذاتی اور گہرا تعلق تھا اور میں اس کو بہت اچھی طرح پر سمجھتا تھا۔ یہ مسئلہ بہت بڑے پیمانہ پر (جرمن۔زیک مسئلہ سے) ایسی صحیح مشابہت رکھتا تھا جس کا مشکل سے یقین آسکتا ہے۔ وہاں چھوٹے پیمانہ پر وہی ہو رہا تھا جو تقریباً دس سال بعد ہندوستان میں ہونے والا تھا۔ کونارڈ ہنلین نے (KONARD HENLEIN) اس وقت وہی آخری فیصلہ کن کام کیا (گو تاریخ نے آگے چل کر اس کو بالکل گمنام کر دیا) جو پاکستان اور بھارت کے تنازعہ میں جناح (JINNAH) نے کیا۔

میرے شعوری احساس کا غیر شعوری پس منظر اس زمانہ میں خواہ کچھ ہی تھا مگر مجھے اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ میں کس جگہ پر کھڑا تھا اور میری کیا رائے تھی جیوفرے ڈاسن (GEOFFREY DAWSON) کی فرمائش پر میں نے اخبار دی ٹائمس (THE TIMES) کے لئے ایک مضمون لکھا جو اس کے ایڈیٹوریل والے صفحہ پر شائع ہونے کے قابل تھا اور اس میں اس تصفیہ کی بے لاگ تعریف کی گئی تھی جس کو لے کر مسٹر چمبرلین (MR. CHAMBERLAIN) جرمنی سے اپنے آخری سفر کے بعد واپس آئے تھے اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ واپسی بڑی شاندار تھی اور اس پر نہایت پرجوش مبارک بادی دی گئی تھی۔ اس لئے میں میونچ (MUNICH) کا بہت پختہ اور علانیہ تائید کرنے والا تھا اور اسی حیثیت سے میں تاریخ کے سامنے پیش ہوتا ہوں۔ اب ان تمام سالوں کے بعد اور اس وقت سے اب تک خطرناک اور تکلیف دہ واقعات کے بعد میں بلا تامل یہ بات کہتا ہوں کہ خدا کا شکر ہے کہ ۱۹۳۸ء میں ہم لوگوں نے جنگ شروع نہیں کی۔ اس سوال سے بالکل قطع نظر کرکے جو بہت زیادہ قابل بحث ہے کہ فوجی تیاری تھی یا نہ تھی۔ اگر برطانیہ ۱۹۳۸ء میں جنگ شروع کر دیتا تو اخلاقی اعتبار سے اس فیصلہ کے حق بجانب ہونے پر ہمیشہ کے لئے شبہات باقی رہتے اور شبہ کی وجہ سے جنگ کے کرنے اور اس کے ختم کرنے کے متعلق اخلاقی بے اطمینانی پیدا ہو جاتی۔ تاریخ کے نقطہ نظر سے

یہ دیکھا جاتا کہ برطانیہ نے جنگ اس وجہ سے نہیں کی کہ اس کے سامنے کوئی واضح باعزت اور قطعی طور پر ناقابل دفع تنازعہ موجود تھا بلکہ محض اس وجہ سے کی کہ اس وقت کی موجودہ حالت کو قائم رکھا جائے اور اس عام رائے شماری کو روکا جائے جس کی بناء پر کسی علاقہ میں رہنے والی قومی اکثریت اس بات کی کوشش کرے کہ وہ اُن لوگوں سے متحد ہو جائے جو خون۔ زبان اور کلچر کے اعتبار سے اُس کے بھائی ہیں۔

اس زمانہ کی بہت سی تفصیلات کے چاروں طرف فراموشی کا ہلکا کہر چھا گیا ہے میونخ (MUNICH) کے تصفیہ کا ایک اہم مگر اکثر بھولا ہوا حصہ جس طرح پر وہ مسٹر چمبرلین (MR. CHAMBERLAIN) نے طے کیا تھا یہ تھا کہ زیکوسلاویکیا (CZECHOSLOVAKIA) کے اُن مشکوک رقبوں میں جہاں پر دونوں قومیں ملی جلی رہی تھیں عام رائے شماری ہونی چاہیئے۔ آئندہ واقعات کی مصیبت کے زمانہ میں یہ اہم تجویز فراموش کردی گئی اور عام رائے شماری کبھی نہ ہوئی۔ شاید یہ بات بحث میں لائی جاسکے کہ اس کا نتیجہ ہر حالت میں ایسا ہوتا جیساکہ پہلے سے معلوم ہو چکا تھا۔

شاید ایسا ہی ہو۔ مگر میں اب صرف اتنا جانتا ہوں کہ ۱۹۳۸ء کے اس موسم خزاں میں بہت سے دوسرے آدمیوں کی طرح مجھے بھی یہ دھوکا تھا کہ ہم کو درحقیقت "اپنے زمانہ میں امن" حاصل ہونے والا تھا۔ نیول چمبرلین (NEVILLE CHAMBERLAIN) جنہوں نے یہ بات پیدا کی تھی۔ ہمارے ہیرو (HERO) تھے۔ اور کچھ عرصہ کے لئے اُن کی اتنی زیادہ تعریف کی گئی تھی جو اُن سے پہلے یا اُن کے بعد اب تک بہت کم سیاستدانوں کے لئے کی جا چکی ہے۔

وہ بہت افسوسناک مختصر زمانہ تھا۔ خواہ ہٹلر (HITLER) نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کے طریقے استعمال کئے ہوں مگر اس وقت تک اُس نے اپنے مطالبات کی بنیاد خود اختیاری کے اُن اصول پر رکھی تھی جو امن کے صلحناموں اور لیگ آف نیشنز کے دستور میں درج تھے۔ ۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں اُس نے تعظیم و تکریم کے پردہ کو چاک کر ڈالا۔ اس کی قومیں زیکوسلاویکیا (CZECHOSLOVAKIA) کے

باقی ماندہ ملک میں داخل ہوگئیں اور اُس ملک کو جرمن حکومت کا زیرِ نگرانی علاقہ شمار کر لیا گیا اور بیرن وون نیوراڈٹ (BARON VON NEURADT) جو نازیوں کے عروج کے زمانہ سے اب تک زندہ چلا آرہا تھا۔ پریگ (PRAGUE) روانہ کر دیا گیا تاکہ وہاں پر بہ حیثیت ایک محافظ کے اس ملک پر حکومت کرے۔ جس پر در اصل قبضہ کر لیا گیا تھا اور جس کو پوری طرح پر مطیع بنا لیا گیا تھا۔

اس واقعہ نے تاریخ کی نظر میں جرمنی کے معاملہ کی تمام اخلاقی بنیاد کو صرف ایک ضرب لگا کر برباد کر دیا اور اس نے ایک مشترکہ تجویز میں بہت سے اُن آدمیوں کو متفق کر دیا جو ۱۹۳۷-۳۸ء میں مختلف رائیں رکھتے تھے۔ اب اس معاملہ کے متعلق کوئی شبہ باقی نہ رہا اور اس کے متعلق کسی قسم کے سوالات نہ رہے۔ یہ بات ہر شخص پر اچھی طرح واضح ہوگئی۔ اُن لوگوں پر بھی جو ایک سال پیشتر میونچ (MUNICH) کے سب سے زیادہ پکے حامی رہ چکے تھے کہ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر کی (HITLER) جنگ ظلم اور زیادتی کا سوچا اور سمجھا ہوا کام تھا۔ بہر حال وہ صرف ہٹلر (HITLER) کی جنگ نہ تھی۔ نہایت افسوسناک اصلیت یہ ہے کہ وہ جرمن قوم کی جنگ تھی۔ اس مرتبہ الزام کا عائد کرنا صحیح ہے۔ بہت بڑی اکثریت میں جرمن قوم ہٹلر کی اس کوشش میں اس کے ساتھ تھی کہ یا تو اُس کے "نئے دور" کو جو ایک ہزار سال تک قائم رہنے والا تھا دنیا پر زبردستی عائد کیا جائے۔ یا ساری یورپین تہذیب کو تباہ و برباد کر کے اُس کو ویگنر (WAGNER) کے آخری انتہائی عروج کی صورت میں اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ ہٹلر (HITLER) کو قتل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مگر فضول گفتگو سے آگے بڑھ کر جو واقعہ پیش آیا وہ ۲۰ جولائی ۱۹۴۴ء کا ہنگامہ تھا۔ جو سینئر فوجی افسروں کی ایک جماعت کا کام تھا اور جو تقریباً کامیاب ہوگیا تھا۔ اُن آدمیوں کی جو اس میں شریک تھے پر خلوص وطن پرستی۔ شانداری اور سخت تکلیف کے اندر اُن کی ہمت و دلیری کے باوجود یہ کوشش بھی اُس وقت تک نہیں کی گئی تھی جب تک نازیوں کی شکست کے متعلق بالکل یقین ہوگیا تھا فوجی افسروں میں سے

کسی ایک نے بھی ۱۹۳۹ء میں یا ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں جب مرکزی طاقتیں دنیا پر چھارہی تھیں اپنی انگلی نہیں اٹھائی۔ ان لوگوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے مکمل شکست کا خطرہ ضروری تھا۔ اگر ذمہ داری کے صحیح اور مستقل احساس نے اُن لوگوں میں حرکت پیدا کی ہوتی تو وہ اس بات کی سازش نہ کرتے کہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں جنگ کے نتائج کو دور کریں بلکہ وہ ۱۹۳۹ء میں جنگ کے شروع ہونے کو روکتے۔

اِس پر کوئی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں مٹھی بھر سپاہیوں کے ہنگامہ برپا کرنے سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چونکہ پھر بھی اسی وقت جرمن قوم جنگ شروع کر دیتی۔

اگر ایسا ہی ہے تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ اگر جرمن قوم کے سب مطالبات پورے کر دینے کے بعد بھی اس قوم نے سوچ سمجھ کر امن کی بجائے جنگ کا اور مشترکہ خوشحالی کی بجائے ظالمانہ فتح کا انتخاب کیا تو یہ جرمنی پر سب سے زیادہ مکمل الزام ہے۔ اس میں ہر اُس انتقامی کام کا جو اس کے خلاف کیا گیا پورا جواز موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ جرمنی کو مشرق سے بالکل علیحدہ کر دینا اُس کے مقبوضہ علاقہ کا ختم ہو جانا اور اس کے شہروں کا برباد کرنا۔

یہ بحث ایک قدم اور آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ ڈینزگ (DANZIG) کے متعلق کیا ہوا؟۔ وہ جرمنی کا ایک شہر تھا۔ اُس میں اصول رائے شماری عامہ کیوں استعمال نہیں کیا گیا؟۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ ڈینزگ (DANZIG) کا معاملہ اٹھاتے وقت یا پولینڈ (POLAND) کے لئے اپنے مطالبات پیش کرنے میں جرمنی نے کبھی عام رائے شماری کو نہ چاہا اور نہ کبھی اس کو طلب کیا جب رِبن ٹروپ (RIBBENTROP) نے جو ہٹلر (HITLER) کا وزیر خارجہ تھا اُن مطالبات کا باقاعدہ اظہار کیا تو اُس نے اس کو کس طرح پر کیا؟ بجائے اس کے کہ وہ کوئی ایسا مناسب قدم اٹھائے جس سے صلح کی بات چیت عام طور پر شروع کی جاتی ہے۔ اس نے میرے دوست

سر نیول ہنڈرسن (SIRNEVILEHENDERSON) کو بلایا اور ان کو ایسا سین (SCENE) دکھایا جو اتنا ہی افسوسناک تھا جتنا کہ وہ بیکار اور بیہودہ تھا۔ بہت تیزی اور سختی کے ساتھ اس نے جرمن زبان میں اپنا الٹی میٹم (ULTIMATUM) اُس سفیر کے سامنے ایسے مجنونانہ اور بے پرواہ طریقہ پر پڑھا جیسے کہ کوئی مجرم اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی عدم موجودگی کا عذر پیش کرے۔ اس کے بعد ہنڈرسن کے ہاتھ میں وہ دستاویز دیئے بغیر تاکہ وہ اس کو پڑھ سکیں وہ فوراً واپس چلا گیا۔ اس وجہ سے یہ سب کارروائی ایک مجرم کا عذر عدم موجودگی تھا۔ جیساکہ ہنڈرسن نے اس کی تعبیر کی۔ ۱۹۳۹ء میں جرمنی کی ذہنیت مجرمانہ حماقت کی ذہنیت اور جوا کھیلنے والے کا فخر تھا۔ اب یہ کہنا کہ یہ ہٹلر (HITLER) کی جنگ تھی۔ نازیوں کی جنگ تھی۔ فوجی افسروں کی جنگ تھی۔ مٹھی بھر آدمیوں کی جنگ تھی۔ سچ بات کو چھپانا ہے۔ دراصل یہ جرمن قوم کی جنگ تھی جس کے لئے ان کی بہت بڑی اکثریت لازمی طور پر ذمہ دار قرار دینی چاہیئے۔ اور یہ ذمہ داری خاص طور پر اس کے حکمران طبقوں پر عائد ہوتی ہے۔

کیا اس میں کوئی اخلاقی پہلو ہے؟ کیا اس کا کوئی معقول جواب ہے؟ میں نے جرمن لوگوں کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ اُن کی تمام بڑی خصوصیات کے باوجود اُن کی قابلیت سخت کام کے لئے اُن کی اہلیت۔ اُن کی تنظیم۔ اُن کی ذہانت اور تعلیم کے لئے اُن کا جذباتی شوق۔ ان سب باتوں کے باوجود اُن کے کیریکٹر میں ایسی قدیم افسانوں والی اور خود کو قربان کرنے والی رگ پائی جاتی ہے جو محض کامیابی سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ دوسری عالمگیر جنگ شاید اس وجہ سے کی گئی کہ دوسری قومیں ویگنر (WAGNER) کے حالات کو بھول چکی تھیں۔

۱۸۷۱ء کے بعد بسمارک (BISMARCK) نے بار بار یہی کہا کہ "ہم مطمئن ہیں" ۱۹۳۸ء کے بعد یقینی طور پر یہ وہی بات ہے جو حقیقی طور پر جرمنی کے لیڈروں اور عام آدمیوں کو کہنا چاہیئے تھی۔ اسی طرح خیال کرتے ہوئے نیول چیمبرلین کا

(NEVILE CHAMBERLAIN) یہ یقین تھا کہ انہوں نے ہمارے اس زمانہ میں امن و سکون کو خرید کر لیا تھا۔ اس کی بجائے ایک سال سے کم عرصہ کے بعد وہ ایک غمگین اور سنجیدہ آواز کے ساتھ یہ کہنے لگے کہ "ہم صرف بُری چیزوں سے کے خلاف جنگ کر رہے ہیں"۔ ایسا کیوں ہوا؟ کیا یہ سب اُس وگنیر (WAGNERIAN) والی اور موت چاہنے والی 'رگ' کی وجہ سے نہیں ہوا جس نے ایک مسلمہ طور پر مہذب قوم کو ایسی بے انتہا زور و شور والی ظالمانہ جنگ کی طرف دھکیل دیا جو کبھی نہ کی گئی تھی۔ کم از کم اب اقوام متحدہ کی طرف سے ایک شخص بھی اپنے ضمیر میں کوئی خلش نہ پائے گا اور اُس کو اس میں کوئی شبہ نہ ہوگا کہ ہم لڑنے میں حق بجانب تھے۔ یہ درحاصل "نیک جنگ" تھی۔

مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہوتی ہے کہ جنیوا (GENEVA) میں جو کام میں نے کیا تھا وہ بغیر قدر کے نہ رہا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں مجھے متفقہ طور پر لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کا صدر منتخب کر لیا۔ جب اُس سال کا اجلاس ختم ہوا۔ تو مجھ سے کہا گیا کہ میں دوسرے سال کے لئے صدارت کو جاری رکھوں جب تک کہ سنہ ۱۹۳۸ء کا اجلاس شروع کیا جائے۔ یہ بہت کمیاب اعزاز تھا اور یہ بڑی ذمہ داری کی بات تھی۔ چونکہ ایسی صورت میں میرا فرض ہوتا کہ اگر اس کی ضرورت آپڑتی تو میں ایک خاص اجلاس طلب کروں اور اس کی صدارت کروں۔

اس بین الاقوامی میدان میں میرے کام نے اور لیگ کا صدر ہونے کی حیثیت سے اُس سال میرے انتہائی عروج نے میری پیاری والدہ صاحبہ کو خاص طور پر خوشی دی تھی۔ جب میں پہلی مرتبہ جنیوا (GENEVA) گیا تھا تو اُن کی عمر اسی سال سے زیادہ تھی۔ اور وہ مسلسل دلچسپی کے ساتھ میرے وہاں کے کام سے واقفیت رکھتی تھیں۔ ہر سال جب میں ہندوستان جایا کرتا تھا تو ہم دونوں اس کے متعلق اسی طرح کھل کر اور تفصیل کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کہ اپنی ساری زندگی میں ہم اپنی دلچسپیوں۔ خوشیوں اور رنجوں میں شریک رہتے تھے۔ بہت عرصہ تک انہوں نے اپنی تندرستی قائم رکھی اور اس کے ساتھ اُن کی سب قوتیں قائم رہیں۔ زندگی

اور اس کے سب تعلقات کے لئے اُن کا گہرا شوق باقی رہا۔ خواہ وہ پبلک اور سیاسی کاموں کے متعلق تھا یا خاندان اور گھریلو معاملات کے متعلق تھا۔ جب اسمبلی (ASSEMBLY) کا ۱۹۳۷ء والا اجلاس ختم ہوا تو میں جنوبی فرانس میں اپنے مکان کو چلا گیا۔ اس وقت یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ میری والدہ صاحبہ کی تندرستی ایسی ہوگئی تھی جس سے کوئی خاص فکر اور بے چینی پیدا ہو (اس وقت اُن کی عمر اٹھاسیؔ سال کی تھی) اور درحقیقت اُن کی حالت ایسی تھی بھی نہیں چونکہ وہ حسب معمول اپنی زندگی خوشگوار اور پُرسکون طریقہ پر بسر کر رہی تھیں۔

انہوں نے میرے دونوں بیٹوں ۔ علی اور صدرالدین کو دیکھا تھا۔ اُن میں سے صدرالدین ایک چھوٹا لڑکا ہونے کی حیثیت سے میری والدہ کے لئے خاص خوشی اور سکون کا سبب تھا۔ یہ بات دونوں مقامات پر رہی یعنی جب وہ یورپ آئیں اور اس موسم گرما میں جب صدرالدین اور اس کی ماں ان کے ساتھ لبنان (LEBNON) میں رہے۔ صدرالدین ہی میرے بڑے بھائی کا نام تھا جو بچپن میں مر گئے تھے اور اس وجہ سے خاص طور پر میری والدہ کا دل خوش رہتا تھا انہوں نے اپنے پر پوتوں کو۔ یعنی علی کے دونوں بیٹوں ۔ کریم اور امین کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ اُن کے متعلق سب کچھ واقفیت رکھتی تھیں اور انہوں نے اُن دونوں کے نام منتخب کئے تھے۔ ان میں سے چھوٹے بیٹے کا وہی نام تھا جو میری والدہ کے بھائی کا تھا جن کا انتقال جوانی کی عمر میں ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیان ہوگیا تھا جیسا کہ میں تحریر کرچکا ہوں میری والدہ میری پہلی جوبلی کے موقعہ پر موجود تھیں اور اُن کو مبارکبادی کے اس تار سے خاص طور پر خوشی ہوئی تھی جو لارڈ وگرم (LORD WIGRAM) نے شاہ جارج پنجم کی طرف سے میرے پاس بھیجا تھا۔ یہ تار ٹھیک اُس وقت موصول ہوا جب بادشاہ کی وفات کی خبر سُنکر ہم نے اپنی خوشی منانے کی رسموں کو ختم کر دیا تھا۔ والدہ صاحبہ جو بہت شوقین ۔ محبت کرنے والی ۔ نیک عادت والی اور ہر نئے واقعہ اور نئی دلچسپی سے باخبر ہونے والی تھیں۔ اپنی زندگی کے

آخری سالوں میں ایسی ہو گئی تھیں جو اُن سب آدمیوں کے درمیان جو اُن کو جانتے تھے خوشی اور نیکی کا احساس نور کی شعاعوں کی طرح پھیلا دیتی تھیں۔

یہ ۱۹۳۷ء کے آخر میں ہوا کہ مجھے ہندوستان سے ایک تار موصول ہوا جس میں یہ تھا کہ والدہ صاحبہ بہت سخت بیمار ہیں اور مجھے بہت جلد اُن کے پاس پہنچ جانا چاہیئے۔ میں فوراً ہندوستان کے لئے ہوائی جہاز میں روانہ ہو گیا۔ یہ اُس زمانہ کا سب سے زیادہ تیز ہوائی جہاز تھا جو ساڑھے تین روز میں بمبئی پہنچ گیا۔

والدہ صاحبہ نے اپنی تمام عمر مشرقی طریقہ پر غسل کرنے کی عادت قائم رکھی تھی ہندوستان میں ہمارے ہر گھر کے اندر مشرقی طریقہ کا غسل خانہ ہوتا تھا جس میں ہر قسم کا سامان ہمیشہ رہتا تھا۔ جس کی دیواروں میں مناسب قسم کے آتشدان ہوتے تھے۔ جس کے لئے پانی کا انتظام بہت ٹھیک رہتا تھا۔ اور جس کے اندر غسل خانہ کی انتہائی تکمیل کے لئے ایک گرم پانی کا تالاب اور ایک چھوٹا سا اور بہت سرد پانی کا تالاب ہوا کرتا تھا۔ والدہ صاحبہ ہر ہفتہ باقاعدہ طریقہ پر غسل کرتی تھیں جس کے ساتھ ترکی اور ایرانی مالش کی تمام قدیم روایاتی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اُن کے پاس ایک ہاتھوں کو ملنے والی اور ایک پیروں کو ملنے والی خادمہ ہوا کرتی تھی اور مشرقی طریقہ پر وہ اپنے بالوں میں مہندی کا خضاب کیا کرتی تھیں۔ ایک دن نومبر کے مہینہ میں جب وہ غسل کر کے آئیں تو اُن پر ایک دورہ پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گئیں مگر اس کے بعد سے اُن کی دماغی قوتیں کمزور ہو گئیں اور اُن کا حافظہ جاتا رہا۔ سوائے اس کے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ایسی ہو جاتی تھیں کہ اُن کے دماغ میں صفائی اور اُن کی نگاہ میں شناخت پیدا ہو جائے۔

وہ ہمارے اُس مکان میں تھیں جو ملابار پہاڑی پر تھا۔ اُن کے ڈاکٹر نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ مجھ کو اُن کے اندر بہت بڑی تبدیلی لازمی طور پر ملے گی۔ یہ ڈاکٹر اتفاقاً میرے دادا کے ایرانی مریدوں میں سے ایک کی اولاد میں سے تھے۔ جو انڈین میڈیکل سروس کے ممبر ہو گئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ والدہ صاحبہ کی جسمانی صحت

بہت اچھی معلوم ہوتی تھی - مگر دماغی بگاڑ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ سوائے اُس وقفۂ سکون کے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ میں تقریباً اپنا تمام وقت اُن کے پاس گذارتا تھا۔ اور مجھے اُس وقت بڑی خوشی ہوتی تھی جب وہ کبھی کبھی مجھ کو اچھی طرح پہچان لیتی تھیں اور مجھ سے باتیں کرتی تھیں۔

والدہ صاحبہ اپنی ساری طویل زندگی میں ایک سادہ اور پُرخلوص خواہش اپنے دل میں رکھتی تھیں اور وہ یہ تھی کہ جب وقت آئے اور اُن کی وفات ہو جائے تو وہ مسلم زمین پر دفن کی جائیں جس سے اُن کا یہ مطلب تھا کہ ایسی زمین ہو جہاں کہ ایک آزاد اور خودمختار مسلم حکومت پائی جائے۔ اس کے ساتھ ایک اور تمنا بھی ہمرشتہ تھی - وہ یہ کہ مرنے کے بعد وہ میرے والد صاحب کے قریب رکھی جائیں جن سے ان کو بہت گہری محبت تھی اور جن کے لئے اُن کی وفات کے وقت سے جس کو پچاس سال سے زائد عرصہ ہوا۔ وہ اتنا گہرا مستقل اور باثر سوگ منایا کرتی تھیں جتنا کہ ملکۂ وکٹوریہ اپنے پیارے شوہر پرنس البرٹ (PRINCE ALBERT) کے لئے منایا کرتی تھیں۔

جتنا جلد مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے یہ تیاریاں کیں کہ والدہ صاحبہ کو عراق لے جاؤں جہاں ایک آزاد مسلم حکومت پائی جاتی تھی اور جہاں پر میرے والد صاحب نجف (NEJEF) کے مقام پر کربلا کے قریب دفن تھے۔ والدہ صاحبہ کے وہاں سفر کرنے میں بظاہر کافی مشکلات اور پیچیدہ مسائل موجود تھے۔ ڈاکٹری مشورہ کی بناء پر ہوا کے ذریعے سے سفر کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ میں ہمیشہ اس بات کو یقین کے ساتھ مانتا رہا ہوں کہ گو بغداد کے دوروزہ سفر میں مختلف مقامات پر ٹھہرنا پڑتا مگر والدہ صاحبہ کے لئے ہوائی جہاز کا سفر سمندری سفر سے بہتر نہ ہوتا۔ بہر حال ایسا ہوا کہ وہ کشتی کے ذریعہ سے بصرہ (BASRA) کو گئیں اور وہاں سے ریل گاڑی کے ذریعہ سے بغداد پہنچیں۔ اس عرصہ میں میں قاہرہ چلا گیا (CAIRO) اور وہاں سے میں ہوائی جہاز میں بغداد کو واپس ہوا۔ وہاں پر میں نے والدہ صاحبہ کو اپنے ایک رشتہ کے بھائی

آغا مصطفیٰ خاں کے مکان پر پایا جو "خادین" کی مقدس درگاہ کے قریب تھا۔
جب میں والدہ صاحبہ کے بستر کے قریب پہنچا تو اس کے چند منٹ بعد اُن کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے مجھ کو پہچان لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اُس طریقہ پر جس کو سب سچے مسلمان جانتے ہیں جو رسول کی مثال کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو زندہ آدمیوں کے درمیان سے الگ ہو کر ایک محفوظ اور خاموش سفر کرنا چاہتے ہیں۔ سکون اور فرحت اور وہ آخری "وصال اعلیٰ" حاصل کر لیا جس کی سب تمنّا کرتے ہیں۔ اسمٰعیلی روایات کے بموجب میں اُن کے جنازہ کے ساتھ اُن کی آخری آرام گاہ تک نہیں گیا۔ مگر چند بھتیجوں۔ بھانجوں اور رشتہ کے بھائیوں نے اُن کو محبت کے ساتھ میرے والد صاحب کے قریب رکھ دیا اور اس طرح پر وہ دونوں آخر کار پھر ایک جگہ ہو گئے جس کے لئے عرصہ تک والدہ صاحبہ کی پر جوش خواہش رہ چکی تھی۔

باب نمبر ۱۲

دوسری عالمگیر جنگ

دوسری عالمگیر جنگ کا شروع ہونا میرے لئے میری زندگی بھر کی امیدوں کا ختم ہو جانا تھا۔ جنیوا (GENEVA) میں لیگ آف نیشنز کا بڑا محل جس کا افتتاح میں نے کیا تھا بالکل ویران اور خالی ہو گیا تھا اور بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا خلا اور اس کی خاموشی خاص علامت رکھتی تھیں۔ بہر حال میں اس وقت سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) میں تھا۔ جب ۱۹۳۹ء کی موسم گرما کے آخر اور موسم خزاں کے شروع میں ہٹلر (HITLER) کی فوجوں نے پولینڈ (POLAND) پر حملہ کیا اور برطانیہ و فرانس ایک نسل کے دوران میں دوسری مرتبہ ظالم اور فتح کی بھوکی جرمنی کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔

جنگ کے شروع ہونے کے کچھ عرصہ بعد جب میں مستقل طور پر سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) میں سکونت کرتا تھا۔ سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے اس زمانہ کے مشکل اور نازک حالات کی وجہ سے مجھ سے کہا تھا کہ میں ہر قسم کی سیاسی تحریک سے اجتناب کروں۔ مگر یہ شرط ستمبر ۱۹۳۹ء میں عائد نہ کی گئی تھی۔ اس وجہ سے میں نے ہر مقام پر اپنے مریدوں کے نام اعلانی احکام روانہ کر دئے تھے کہ وہ ہر قسم کی امداد جو وہ کر سکتے تھے برطانیہ اور فرانس کی حمایت کے لئے کریں۔ اس وقت بہر حال میرے لئے کسی بین الاقوامی یا سیاسی تحریک کا موقعہ نہ تھا جس طرح میں نے

پہلی عالمگیر جنگ کے زمانہ میں کیا تھا۔ اس مرتبہ کوئی بڑی مسلم حکومت جنگ میں شریک نہ تھی جیسا کہ پہلی جنگ میں سلطنت عثمانیہ رہ چکی تھی۔ مسلمانوں کا کوئی خلیفہ نہ تھا اور جہاد کرنے کے لئے کوئی اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ میرے فرائض اور میری ذمہ داریاں کسی دوسرے پرائیویٹ شہری کے فرائض اور ذمہ داریوں سے نہ کچھ زیادہ تھیں اور نہ کم تھیں۔

اس زمانہ میں میرے پاس گھوڑوں کی کافی تعداد سدھانے کے لئے تھی اور ایک اصطبل بھی تھا۔ جنگجو ملکوں میں کسی پیمانہ پر جنگ کے دوران میں اور غالباً جنگ کے بعد ایک طویل عرصہ تک گھوڑ دوڑ بظاہر بند کر دی گئی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں بہر حال اٹلی جنگجو ملک نہ تھا۔ میرے خیال میں آیا کہ میں ایسا معاملہ کرنے کے قابل ہو سکتا تھا جو حکومت اٹلی کے لئے غیر مفید نہ ہوگا اور جس میں اگر مجھ کو نفع ہوا جس کی مجھ کو امید تھی تو اس سے مجھ کو کافی بڑی رقم مل جائے گی جس کو میں برطانیہ کے جنگی قرضہ میں لگا دوں گا۔ اس وجہ سے میں اپنی بیوی کے ساتھ فلورینس (FLORENCE) گیا اور اپنے سب گھوڑے حکومت اٹلی کو فروخت کرنے کی تجویز پیش کی۔ میں نے دیکھا کہ میری تجویز کو باثر آدمیوں کے درمیان کافی تائید حاصل ہوئی۔ خاص طور پر ان لوگوں کے درمیان جو یہ چاہتے تھے کہ اٹلی جنگ سے علیحدہ رہے۔ سیانو (CIANO) نے خود اس کی حمایت کی جیسا کہ مجھ کو بعد میں معلوم ہوا۔ بہر حال جب یہ معاملہ سب سے اونچے درجہ پر پہنچ گیا اور اس کی تکمیل ہونے والی تھی۔ مسولینی (MUSSOLINI) نے خود اس کو روک دیا۔

میرے نزدیک اس سے مسولینی (MUSSOLINI) کے ارادے صاف طور پر ظاہر ہوتے تھے۔ چونکہ اس بڑی رقم کے علاوہ جو میں نے طلب کی تھی میں نے دو شرطیں اور عائد کی تھیں وہ یہ کہ روپیہ فوراً ادا کیا جائے گا مگر گھوڑے اس وقت تک اٹلی ہی میں نہ بھیجے جائیں گے جب تک کہ جنگ ختم نہ ہو جائے۔

قبل اس کے کہ میں نے یہ تجویز حکومت اٹلی کے پاس بھیجی۔ میں نے اپنے سانڈ

گھوڑے اور گھوڑیاں برطانیہ کے فوجی اصطبل میں دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ مجھے شاید یہ بتا دینا چاہیئے کہ اُس زمانہ میں میرے اصطبلوں کی ملکیت میں میرے بیٹے علی کا کوئی حصہ نہ تھا اور اس وجہ سے میں آزاد تھا کہ کسی دوسرے شخص سے مشورہ کئے بغیر میں جو چاہوں ٹھیک اسی طرح کروں۔ برطانیہ کے لئے میری تجویز کے جو شرائط تھے وہ ان شرائط سے بہر حال مختلف تھے جو بعد میں حکومت اٹلی کے لئے میں نے پیش کئے۔ میں نے اپنے تمام اصطبل کے لئے جس کے اندر بہرام، محمود اور دوڑ کا ہر گھوڑا شامل تھا جو میرے پاس تھا۔ میں نے اُن کی اصلی قیمت کا دسواں حصہ بھی طلب نہیں کیا تھا۔ وہ اس قیمت کے پانچویں حصہ سے کم تھا جو مجھ کو حکومت اٹلی سے ملنے والی تھی۔ برطانیہ کی وزارت کاشتکاری نے بہر حال ایسے وجوہ کی بناء پر جن کو وہ لوگ ہی اچھی طرح پر جانتے تھے اس تجویز کو رد کر دیا۔ جو میرا الیقین ہے کہ بے مثل تھی اور جو اُس کاشتکاری کے لئے بھی بہت بڑے فائدہ کی چیز ہوتی جو امن اور جنگ کے زمانہ میں برطانیہ کے نہایت اہم حرفتوں میں شمار ہوتی تھی۔ میں آج تک برطانیہ کے اس فیصلہ کو نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ان لوگوں نے اس بات کی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ اُن گھوڑوں کو دیکھ بھی لیں جو اُن کو بطور عطیہ کے دئیے جا رہے تھے۔

میں سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء کے موسم سرما میں ہندوستان گیا اور وہاں پر میں نے چند مہینے گذارے جن میں دہلی کے اندر میں نے سیر کی اور وائسرائے لارڈ لنلتھگو (LORD LINLITHGOW) کے پاس قیام کیا۔ حکومت اٹلی سے اپنے معاملہ کی ناکامیابی کا میں نے اُن سے ذکر کیا۔ اپریل میں جیسا کہ برسوں سے میرا معمول رہا تھا میں اپنی بیوی اور اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ جنوبی فرانس میں انٹیب (ANTIBES) کے مقام پر اپنے بنگلہ میں چلا گیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی مئی اور جون کے خوفناک اور بدلنے والے واقعات پر مجھ کو بہت سے دوسرے آدمیوں کی طرح بہت تعجب ہوا اور اُن کا سامنا مجھ کو خلاف امید کرنا پڑا۔ جنیوا (GENEVA) میں برسوں تک قیام کرنے پر میں بہت سے فرانسیسی سیاست دانوں سے واقف ہو گیا تھا اور اس سارے زمانہ میں

فرانسیسی فوج کی قوت کے متعلق اُن کا اعتماد اتنا اعلیٰ اور اتنا نا قابل جنبش تھا کہ جب دریائے راین (RHINE) سے لے کر چینل (CHANNEL) تک تقریباً تمام جنگی محاذ پر فرانس والوں کو شکست ہوئی اور نازیوں (NAZIS) کی موٹر والی فوجیں فرانس کے جنوب اور مغرب کی سمت میں داخل ہو گئیں تو مجھ کو ایسا صدمہ پہنچا اور ایسی مایوسی ہوئی جو یقین سے باہر ہے۔ جب اٹلی نے اقوام متحدہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور فرانس کی حکومت نے پیرس (PARIS) کو ایک غیر محفوظ شہر کی طرح چھوڑ کر بورڈو (BURDEAUX) میں جاکر پناہ لی تو میں نے دیکھا کہ ہم کو اس بات کا خطرہ تھا کہ ہم ایک پوری طرح شکست کھائے ہوئے ملک میں جال کے اندر پھنس کر رہ جائیں گے جتنی جلد مجھ سے ہو سکا میں اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ اُس تقریباً آخری دروازہ سے جو باقی رہ گیا تھا فرانس کے باہر اس کے ختم ہونے سے پہلے سوئٹزرلینڈ کی (SWITZERLAND) طرف روانہ ہوا۔ میرے بیٹے علی نے برطانیہ کے ایک والنٹیئر فوجی رسالہ میں کمیشن حاصل کر لیا تھا اور سرکاری منظوری کے بعد وہ فرانس والوں کے ساتھ لگا یا گیا تھا۔ اس وقت وہ اُن کی فوجوں کے ساتھ شام (SYRIA) میں تھا۔ میرے بیٹے کی بیوی اپنے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ قاہرہ (CAIRO) میں تھی۔

غیر جانبدار سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) پناہ لینے کی جگہ تھی مگر چند سالوں سے وہ ایک علیحدہ کیا ہوا اور تنہا مقام پناہ تھا۔ سیاسی کاموں میں حصہ لینے کی میرے لئے ممانعت تھی۔ میں بیرونی دنیا کے بہت سے تعلقات سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا تھا اور ان سالوں میں میری خطرناک علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُس زمانہ میں جو ہم سب کے لئے بہت مشکل اور صبر آزما تھا۔ جنیوا (GENEVA) میں برطانیہ کے کونسل جنرل مسٹر ہنری لونگسٹن (MR. HENRY LIVINGSTON) اور اُن کے ساتھی سے جو زیورچ (ZURICH) میں تھے مجھے بڑی مدد ملی اور وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔

میری بیماری کے اسباب چند سال پیشتر پیدا ہو گئے تھے۔ تقریباً ۱۹۳۵ء

سے مجھے کچھ اندرونی تکلیف کے علامات محسوس ہوتے تھے مگر مختلف ڈاکٹروں کو جن کا مشورہ میں نے لیا اُن علامات میں کوئی خاص خطرہ نظر نہیں آیا۔ ۱۹۴۲ء میں سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) کے اندر میں نے بہت سے مشہور ڈاکٹروں کا مشورہ لیا۔ میں نے معائنہ پر معائنہ کرایا اور ڈاکٹروں کی رائے روز بروز زیادہ سے زیادہ خطرناک ہوتی گئی جس میں اس بات کا کافی سے زیادہ اشارہ تھا کہ وہ ورم جو میری تکلیف کا باعث تھا مہلک قسم کا ہو سکتا ہے۔ اُس کی جگہ بہرحال ایسی تھی کہ وہاں پر آپریشن کرنا ان کے نزدیک خطرناک تھا۔ خون کا نکلنا تقریباً روزانہ تجربہ کی بات تھی۔ میری طاقت رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی اور اس وجہ سے میں بہت مایوس اور دل شکستہ ہو گیا تھا۔ صرف جنگ کے بعد جب میں پیرس (PARIS) جانے کے قابل ہو گیا تو وہاں کے بڑے فرانسیسی ڈاکٹر پروفیسر فرینکو دی گارڈ ڈی ایلین (FRANCOIS DE GAUDARD D'ALLAINES) نے میرا اوپریشن کیا اور اُس ورم کی گانٹھ کو نکال کر یہ معلوم کیا کہ وہ مہلک نہ تھی۔ اس سے بہرحال میری تکلیف پوری طور پر ختم نہیں ہوئی۔ اپنی بیماری کے دوروں کے متعلق جو اس کے بعد پڑتے رہے ہیں۔ آئندہ کچھ حال بیان کروں گا۔

اس عرصہ میں جب مجھے سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) میں قیام کرنا پڑا۔ میری پرائیویٹ زندگی میں ایک بہت گہری اور اہم تبدیلی واقع ہوئی۔ میں نے اس سے پیشتر ان اختلافات کا حوالہ دے دیا ہے جو شادی کے متعلق عیسائی اور مسلم نقطہ نظر میں پائے جاتے ہیں اور اُن غلط فہمیوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جو ان اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کی پرورش عیسائی روایات کے ماحول میں ہوئی ہے جس میں شادی کا مذہبی اور عقیدت مندانہ تخیل پایا جاتا ہے ان کے لئے شادی کے اسلامی تخیل کی عملی اور معاہدہ والی بنیاد کا سمجھنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کے لئے مغرب کے اُن قوموں کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے۔ جو ایک ناخوشگوار شادی کو جاری رکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور زنا کاری کے مصنوعی اور طے کردہ گناہ کے ارتکاب پر

اصرار کرتے ہیں تاکہ وہ اس بناء پر اس مصاحبت کو ختم کردیں جو در اصل ناقابل برداشت ہو چکی ہے اور اس طرح پر دونوں شریکوں کو اپنی زندگی کا نیا دور شروع کرنے کی اجازت دے دیں۔

شادی کے اعتبار سے میری تیسری بیوی پرنسس اینڈری (PRINCESS ANDREE) اور میں دونوں علیحدہ ہو گئے۔ حالانکہ ہماری محبت اور ایک دوسرے کے لئے ہمارا احترام اور سچی دوستی کسی طرح پر کمزور نہ ہوئی تھیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ ہمارے لئے بہتر ہوگا کہ ہم اپنے ازدواجی تعلقات کو بدل کر اُن کو خالص محبت کے تعلقات بنالیں۔ اور اُن حالات کی بناء پر باہمی رضامندی کے ساتھ ہم نے سنہ ۱۹۳۲ء میں جنیوا (GENEVA) کے مقام پر عدالت دیوانی سے طلاق حاصل کرلی۔

چند ہفتہ کے بعد میں نے اپنی موجودہ بیوی سے شادی کرلی جن سے میں پہلی مرتبہ قاہرہ میں مل چکا تھا اور جن سے میری واقفیت برسوں سے تھی۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ شادی مکمل طور پر خوشگوار شادی ہوتی ہے جس میں روحانی دماغی اور جذباتی اعتبار سے فریقین کے درمیان مکمل اتحاد اور سمجھوتہ پایا جائے تو ہماری شادی اسی قسم کی ہے۔

بہ حیثیت ایک نیک مسلمان کے میں نے کبھی کسی عیسائی عورت سے یہ نہیں کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے لئے اپنا مذہب بدل دے۔ چونکہ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ عیسائی اور یہودی اور بعض اصول کے مطابق پارسی اور مہذب ہندو جو توحید کے ماننے والے ہیں مسلمانوں کے ساتھ شادی کرسکتے ہیں اور اپنے خاص مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں۔ میں نے اپنی موجودہ بیوی کے دماغ پر کوئی اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اس کوشش کے بغیر وہ جس زمانہ میں قاہرہ میں رہتی تھیں اسی وقت اسلام قبول کرچکی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند محرکات اور جذبات میں سے ہر ایک نے اُن کے مسلمان ہونے میں اپنا کام کیا۔ مثلاً جمعہ کی نماز کے دن مسلمان عقیدتمندوں کا خاموش اظہار جذبات۔ ظاہری تصنع۔ تعصب اور قومی غرور کا بالکل نہ ہونا جو اسلام کے

عمل اور تعلیم کی بنیادی چیز ہے اور وہ خاموش اور سکون بخش حسن یعنی ایسا حسن جو روحانی بھی معلوم ہوتا ہے اور جسمانی بھی۔ جو اس قسم کی مسجدوں میں پایا جاتا ہے جیسی کہ قاہرہ میں سلطان حسن کی مسجد ہے۔

ہماری شادی اس زمانہ میں اس وقت ہوئی جب مجھے اپنی بیوی کی مدد اور سمجھ کی بہت سخت ضرورت تھی۔ حال کے سالوں میں میری شدید علالت کے دوران میں وہ میرے لئے بڑی زبردست امداد کا باعث اور مجھ کو آرام و تسکین دینے والی ثابت ہوئی ہیں۔ مجھ کو آخرکار وہ حقیقی اور تعجب خیز پناہ کا مقام عطا کیا گیا جس میں میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی کے اندر اور اُن کے ساتھ رہنے سے مجھے دماغ اور روح کا سچا اتحاد مل گیا۔

جنگ کے سالوں میں میرا سیاسی کام جس میں کوئی اہمیت تھی صرف اس کے متعلق تھا کہ ۱۹۴۱ء میں اتحادی قوتیں ایران میں داخل ہوگئی تھیں جس میں دو باتوں کے ارادے پائے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ روس کی حکومت کے ساتھ آمد و رفت کا ایسا راستہ نکال لیں جو اُس راستہ سے کم خطرناک ہو جو شمالی قطب والے قافلے مرمانسک (MURMANSK) اور آرک اینجل (ARKANGEL) کے مقامات سے گذر کر طے کرتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ ایران کو مرکزی قوتوں کی سازش اور جاسوسی کا ایسا اڈہ بننے سے روکا جائے جو مشرق قریب میں اقوام متحدہ کے خلاف ہو۔ اس کام کی وجہ سے جو بلاشبہ جنگ کی مصلحتوں کے لحاظ سے بہت ضروری تھا۔ اس مشہور بادشاہ رضا شاہ کو تخت سے اُتارنا پڑا اور اس نے ایران اور مغرب کے تعلقات میں اُس بے چینی۔ ناراضگی اور دل شکستگی کے طویل زمانہ کو بہت جلد پیدا کر دیا جو اگست ۱۹۵۳ء کے واقعات میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ (اور یہی ہم کو امید تھی۔)

اس وجہ سے قبل اس کے کہ میں اُس اقدام کا ذکر کروں جس کے ذریعہ سے میں نے رضا شاہ کی طرف سے اس کے ملک میں اتحادی قوتوں کے کام کو بہتر بنانے کی

کوشش کی - یہ موقعہ کے مناسب ہوگا کہ میں رضا شاہ کے کیریکٹر کا جن سے میں خوب واقف تھا ایک مختصر خاکہ پیش کروں۔ گو رضا شاہ نے اپنی مغربی تعلیم و تربیت روسی افسروں کی ماتحتی میں پائی تھی مگر وہ خالص ایرانی نسل سے تھے جو ملک کے شمال میں رہتی تھی اور یہ وہ خطہ تھا جس کے باشندوں نے اپنا خون جنوب کے قبیلوں سے نہیں ملایا تھا اور نہ اُن ترکی قبیلوں سے ملایا تھا جو گذشتہ بڑی نقل و حرکت کے زمانہ میں ایران کے اندر مقیم ہوگئے تھے۔ وہ خاندانی نام یعنی پہلوی جو رضا شاہ نے رکھا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اُن کی اصلی نسل خالص آریہ اور ایرانی تھی۔

جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں۔ میری قریب رشتہ داری میرے خاندان کے دونوں طرف سے گذشتہ قاچار حکمران خاندان سے پائی جاتی ہے جس کی ابتدا ترکوں سے ہوئی تھی مگر جس کا خون مختلف نسلوں میں قدرتی طور پر بہت وسعت کے ساتھ ایرانی خون سے مل گیا تھا جن کی عورتوں سے حکمران خاندان کے افراد نے شادیاں کرلی تھیں۔

رضا شاہ پہلوی بڑے قد و قامت کا آدمی تھا جس کی قوت اُس کی زندگی کے بہترین زمانہ میں اخلاقی اور جسمانی دونوں قسم کی تھی۔ اُس کی تربیت ایک فوجی سوار کی حیثیت سے ہوئی تھی اور اُس نے محض اپنی قابلیت۔ کیریکٹر کی مضبوطی اور اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے بہت جلد ترقی کی جس طرح اُس سے پہلے نادر شاہ نے کی تھی اور آخرکار احمد شاہ کی حکومت میں جو قاچار خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ وزیر جنگ ہوگیا۔ احمد شاہ کی ہمت افزائی کی وجہ سے وہ وزیراعظم اور ایران کا اصلی ڈکٹیٹر (DICTATOR) ہوگیا۔ اُس کی بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ ایران کو صحیح طریقہ پر آزاد ملک بنادے جس میں وہ اس سیاسی اختیار اور حکومت سے نجات حاصل کرلے جو باہر سے اُس پر عائد کی گئی تھی اور جو فی الواقع موجود تھی۔ گو قانونی اعتبار سے اس کا وجود نہ تھا۔ روس اور برطانیہ کے مسلسل دباؤ اور ان دو ملکوں کے تصادم مفاد سے

آزاد ہو جائے۔ جو کچھ مجھے رضا شاہ کے متعلق معلوم ہے اس کی بناء پر مجھے عرصہ سے اس بات کا یقین ہے کہ اگر احمد شاہ اپنے ملک کے انتظام اور بہ حیثیت بادشاہ کے اپنے فرائض میں معمولی دلچسپی کا اظہار بھی کرتے تو رضا شاہ کو تخت لینے کی کوئی خواہش نہ ہوتی۔

احمد شاہ کی کہانی بہت غمگین تھی اور وہ غیر مایوس نہ تھی۔ وہ بے انتہا ذہین نوجوان آدمی تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ مشرقی اور مغربی کلچر کا وسیع علم رکھنے والا۔ اور تاریخ سیاسیات اور اقتصادی نظریات کا بہت اچھا مطالعہ کئے ہوئے تھا مگر اُس کا دماغ اور اس کی قابلیتیں ایک گہری اور اندر سرایت کرنے والی بے دینی کی وجہ سے بگڑ کر ختم ہو گئی تھیں۔ اُس کو یہ یقین نہ تھا کہ کوشش۔ ذہانت اور ان سب صفات کے استعمال کرنے سے جو اس کے اندر تھیں وہ اپنے تخت اور اپنی حکومت کو خوش حال اور مستقل نہ بنا سکتا تھا۔ زندگی کے قدرتی میلانات سے اُس کی عجیب بے حسی کا ایک ثبوت یہ تھا کہ باوجودیکہ اُس کے اولاد تھی مگر اُس نے اپنے بھائی کو تخت کا وارث اور ولیعہد رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ میں اُس سے بہ حیثیت ایک قریبی رشتہ دار کے اور بہ حیثیت ایک دوست کے اچھی طرح پر واقف تھا۔ ہم دونوں کے تعلقات نہایت اعلیٰ قسم کے تھے اور ہم اکثر ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ یہ بات بہرحال واضح تھی کہ اُس کو اپنے تاج کی زیادہ پروا نہ تھی یا یوں کہیئے کہ اُس کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ وہ اپنی تقدیر کے ہوتے ہوئے کوئی مفید کام انجام دے سکتا ہے یا کوئی ایسی چیز کر سکتا ہے جس سے اُس کے ملک میں حالات بہتر کر دئے جائیں۔ اُس نے اپنی ساری توجہ اپنی اولاد اور اپنی ماں اور کسی حد تک اپنے بھائی کے لئے سرمایہ جمع کرنے میں لگائی۔ اس نے امریکہ میں بڑی ہوشیاری سے ساتھ روپیہ لگایا اور اُس نے بہت احتیاط اور استقلال کے ساتھ اپنی پرائیویٹ دولت پیدا کی۔ اپنے ذاتی معاملات کا انتظام کرنے میں وہ جتنا باسلیقہ تھا اُتنی کے برابر وہ بہ حیثیت بادشاہ کے اپنے فرائض ادا کرنے میں شکستہ دل اور مایوس تھا۔

اُس کا انجام قبل از وقت آگیا۔ وہ بے انتہا موٹا تھا اور اُس نے اپنا وزن کم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ بہر حال انتہائی حدود تک پہنچ گیا اور اُس نے اپنا وزن کم کر کے آدھا کر لیا جس سے اُس کی صحت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس کا انتقال پیرس (PARIS) میں ایک امریکی شفاخانہ کے اندر اُس وقت ہوا جب وہ بالکل نوجوان آدمی تھا۔ مگر اس سے پیشتر وہ اپنا تخت کھو چکا تھا۔ بار بار اُس سے اصرار کیا گیا کہ وہ ایران واپس چلا جائے۔ اُس نے اپنی حکومت کے کسی مطالبہ کی پروا نہ کی اور مجھ جیسے دوستوں کی با فکر نصیحت کی طرف سے غفلت برتی اور صاف طور پر اپنے فرائض پر واپس آنے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں رضا شاہ پہلوی تاریخی اور دستوری اعتبار سے بالکل حق بجانب تھا کہ اُس تاج اور اُن ذمہ داریوں کو سنبھالے جو اُس آدمی نے چھوڑ دی تھیں جس کے چارج میں وہ دی گئی تھیں۔ اس وجہ سے میں نے سب سے پہلے اس کو اپنے احترام کا اور اس کی مبارک اور خوش حال حکومت کے لئے اپنی دعاؤں کا پیام بھیجا۔

رضا شاہ ایک قابل حکمران تھا اور ایسا وطن پرست تھا جس کو اس بات سے حقیقی سخت تکلیف پہنچتی تھی کہ وہ اپنے ملک کو ایسا دیکھے جو شاید دنیا کی تمام آزاد اور خود مختار قوموں میں سب سے پیچھے تھا۔ وہ بہت ہوشیاری اور دلیری کے ساتھ تجدید کرنے والا تھا۔ سب سے پہلے وہ اسلام کو جیسا کہ وہ ایران میں رائج تھا ان توہمات اور اُن نیم بت پرستی کے خیالات اور اعمال سے آزاد کرانے میں مصروف ہوا جو ہمارے مذہب کے سچے اصول کے خلاف مذہبی قانون دانوں نے ایران میں جاری کئے تھے جو اس کے ذریعہ سے عوام کو جاہل اپنے مفاد کو محفوظ اور اپنی قوت کو اعلیٰ درجہ پر رکھتے تھے۔ قاچار خاندان کی حکومت نے اپنی حالت کو قائم رکھنے کی غرض سے خود کو اس متعصب نیم پرستی سے وابستہ کر لیا تھا اور انہوں نے آپس میں مل کر ایران کی نوجوان نسل کو اس بات سے روک رکھا تھا کہ وہ یورپ اور امریکہ جا کر ان چیزوں سے اپنے دماغ اور اپنی دستکاری اور فنون کو

آراستہ کریں جو صنعت وحرفت اور سائنس کے انقلاب نے پیدا کی تھیں۔ رضاشاہ اس سے الگ ہوگیا۔ اُس نے اپنے ملک کے دروازے جدید سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کھول دئیے اور ایران کے طالب علموں کی بڑی تعداد یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کو بھیجی۔ اُس نے عورتوں کی تعلیم اور آزادی کو بڑھایا اور پردہ کے خطرناک رواج کو ختم کر دیا۔ اُس نے قومی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ خاص طور پر قالین بننے کی صنعت کو جس کو وہ دوبارہ اسی بلند معیار پر لے آیا جو صفوی دور حکومت کی بہترین روایات کے مطابق تھا۔ فی الواقع وہ ایران میں کمال اتاترک کا ثانی تھا۔ مگر اس طویل اور خود کردہ تاریکی اور جہالت کی وجہ سے جو قاچار سلطنت اور اس کے معاونوں نے پیدا کی تھی۔ رضاشاہ کا کام اتاترک کے کام سے بہت زیادہ مشکل ہوگیا تھا۔

وہ اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں کسی بیرونی حکومت کے دخل دینے کی کوشش پر بہت سخت جذبہ کے ساتھ غصہ کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ برطانیہ اور روس دونوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کو بہت سی باتوں کی وجہ سے مدد ملی۔ مثلاً یہ کہ پہلی عالمگیر جنگ نے دونوں کو بہت زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ یہ کہ برطانیہ کی شاہانہ اور اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی تمنائیں اور پالیسیاں (POLICIES) اتنی گھٹ گئی تھیں کہ وہ تقریباً ختم ہونے والی تھیں اور یہ کہ روس (RUSSIA) جو پنج سالہ منصوبہ کے ذریعہ سے اور از سرِ نو تعمیر کے اُن وسیع کاموں کے ذریعہ سے جو اس منصوبہ سے متعلق تھے۔ اپنی نئی حکومت کو مضبوط بنانے میں مصروف تھا۔ اُس وقت اس بات کی کوئی خواہش نہ رکھتا تھا کہ مغربی ایشیا میں زار (TSAR) کی توسیع ملک کی پالیسی پر پھر عمل کرے۔

ان حالات کی وجہ سے جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو رضاشاہ نے یہ کوشش کی جیساکہ دوسرے ملکوں کے حکمرانوں نے کی تھی جو خاص اپنے اندرونی معاملات کے طے کرنے میں مصروف تھے۔ کہ آخر تک ایران کو جنگ سے الگ

رکھا جائے۔ مگر ہر حالت میں انسان تجویز کیا کرتا ہے اور خدائے تعالےٰ اس کو طے کرتا ہے۔

جب تک کہ ۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں جرمنی نے اس پر حملہ کیا۔ ایران کے لئے غیر جانبداری ناممکن نہ تھی۔ اُس کے بعد جب جنگی اعتبار سے اُس کی اہمیت بڑھ گئی تو بہر حال اُس کی حالت روز بروز ایسی ہوگئی کہ اس پر آسانی سے حملہ کیا جاسکے مشرق بعید میں جنگ شروع ہونے اور اس جنگ میں مکمل طور پر امریکہ کی شرکت کرنے سے پیشتر بھی اتحادی طاقتوں کو امریکہ کی امداد مقداریں برابر بڑھتی جارہی تھی۔ قرضہ کی امداد کی وجہ سے نہایت اہم فوجی سامان اور دوسری قسم کی چیزوں کا ایک وسیع راستہ پیدا ہوگیا تھا اور یہ طے کرلیا گیا تھا کہ اس سامان کا ایک حصہ جتنی جلد ممکن ہو روس (RUSSIA) کو منتقل کردیا جائے گا۔

یورپ کے کسی راستہ سے روس (RUSSIA) تک پہنچنا بہر حال ناممکن تھا۔ جرمن لوگ سمندر اور خشکی کے ہر راستہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سمندر کے قافلوں کی ایک خاص تعداد شمالی قطب کے راستہ سے روانہ کی گئی جس میں برطانیہ اور امریکہ کے آدمیوں کی بے انتہا موتیں ہوئیں۔ اور وہ سامان جس کے لانے میں اتنا زیادہ دینا پڑا روس (RUSSIA) نے بددلی کے ساتھ وصول کیا اور اس پر شکریہ کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ سرکاری عملہ کے افسروں نے اسی وجہ سے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ ایران کے راستہ سے ایک کم خطرناک اور کم خرچہ والی سڑک تیار کی جائے۔

رضا شاہ اپنے ملک کی آزادی کو جو مشکل سے حاصل ہوئی تھی بہت فخر کے ساتھ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ برطانیہ اور روس دونوں (RUSSIA) کے تسلی بخش رویہ سے جس کا انہوں نے مقابلہ کیا تھا اور جرمنی کی فوجی کامیابی کی وسعت اور ظاہری گہرائی کی وجہ سے وہ دھوکے میں آگئے تھے۔ اور اب اتحادی طاقتوں کو وہ سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے جو انہوں نے طلب کی تھیں بالکل کوئی کام کرنے کو تیار نہ تھے ان کی رائے میں ان سہولتوں کا مطلب یہ ہوگا کہ ایران کی غیر جانبداری ختم ہوگئی۔

اتحادی طاقتیں جنگ کے اس نازک موقعہ پر بہت سخت کشمکش میں مبتلا تھیں وہ ایسا کر سکتی تھیں اور بہرحال انہوں نے ایسا ہی کیا کہ فوجی طاقت کا ایک فوجی مظاہرہ اس کام کے لئے جمع کیا کہ ایران کو یہ موقعہ ہرگز نہ دیا جائے کہ وہ ان کے مطالبات کو موثر طریقہ پر ادا کرے۔ ایک مختصر فوج جو ہندوستان سے بھیجی گئی تھی ایران میں داخل ہوگئی۔ میں نے جو اُس وقت ایک دور مقام پر سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) میں تھا فوراً اس کا اندازہ کیا کہ رضا شاہ نے کس سختی کے ساتھ اپنی حالت کو خطرہ میں ڈال لیا تھا۔ جنیوا (GENEVA) میں ملک معظم کے کونسل جنرل (CONSULGENERAL) کے ذریعہ سے میں نے دفتر خارجہ کی اجازت طلب کی کہ میں رضا شاہ سے خط و کتابت کروں۔ چونکہ ہمارے تعلقات نہ صرف ان کی تخت نشینی کے وقت بلکہ اس کے بعد مسلسل طور پر ہمیشہ سے بہت زیادہ دوستانہ رہ چکے تھے اس لئے مجھے کچھ امید تھی کہ وہ میری نصیحت کو غور سے سنیں گے۔ ایک طویل تار کے ذریعہ سے میں نے اُن سے التجا کی کہ وہ اس بات کو یقینی سمجھیں کہ اُن کا تخت خطرہ میں تھا اور یہ کہ اگر وہ اپنے عدم شرکت کے رویہ پر اڑے رہے تو اُن کو مجبوراً تخت چھوڑنا پڑے گا اور ایران بجائے اس کے کہ ایک باعزت معاون کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو۔ ایک محتاج ماتحت کی حیثیت سے زبردستی جنگ میں لایا جائے گا۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے یہ علم نہیں ہے کہ میرا تار ان کے پاس اتنی جلد پہنچ گیا کہ اُن کو اُس پر غور کرنے کا کچھ وقت مل سکے۔ مجھ کو اُس کے بھیجنے کے لئے دفتر خارجہ کی اجازت کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس نازک موقعہ پر واقعات کی رفتار بہت تیز تھی اور مجھے اندیشہ ہے کہ غالباً میرا تار اُن کے پاس دیر میں پہنچا اور اس وقت تک اُن کا تخت چھوڑنا ضروری ہو چکا تھا بہرحال اس واقعہ سے کچھ تسلی ہوتی ہے جیسا کہ مجھ سے بعد میں اُس آدمی نے کہا جو اُسوقت اُن کا درباری وزیر تھا اور جس کے ہاتھ میں بڑے اختیارات تھے کہ میرے تار کے دوسرے حصہ کا جس میں اُن سے التجا کی تھی کہ وہ اتحادی طاقتوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوں۔ ضرور کچھ اثر ہوا۔ بادشاہ کے رخصت ہونے کے بعد ایران کے لوگ خود

بات کر سکتے تھے۔ ایران کی سلطنت محفوظ رہی اور موجودہ شہنشاہ جو رضا شاہ کے بیٹے ہیں با امن طریقہ پر تخت نشین ہو گئے۔ رضا شاہ جلاوطن کر دیئے گئے پہلے وہ مورشیس (MAURITIUS) بھیجے گئے اور وہاں سے جونس برگ (JOHANNESBURG) بھیجدیئے گئے جہاں پر اس کے بعد بہت جلد ان کا انتقال ہو گیا۔ اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ وہ شکستہ دل ہو کر مرے۔

جنگ کے سال ختم ہو گئے۔ سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) اور اس کے باہر والی دنیا کے ساتھ آمد و رفت کی سہولتیں ایک طویل زمانہ تک بے انتہا محدود رہیں بڑے موقعوں پر مثلاً ڈربی گھوڑ دوڑ (THE SUBSTITUTE DERBY) کی بجائے میں سفیر صاحب کی مہربانی سے کبھی کبھی کوئی تار بھیجنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ انگلستان کو جانے والے پرائیویٹ تار دو ہفتہ یا اس سے زیادہ وقت لیتے تھے اور اکثر وہ بالکل نہیں سنے جاتے تھے۔ میں نے انتظام کر کے یہ معلوم کیا کہ میرے دو گھوڑے ڈربی (DERBY) کی دوڑ میں دوسرے اور تیسرے نمبر پر آئے تھے۔ اور مجھے یہ بھی خبر ملی کہ تہران جس کو میرے بیٹے علی نے مجھے عاریتاً دے دیا تھا ۱۹۴۴ء کی ڈربی (DERBY) میں دوسرے نمبر پر آیا۔ ۱۹۴۴ء کے آخر میں جب فرانس کا بڑا حصہ آزاد ہو گیا تو چیزیں بہت زیادہ آسانی کے ساتھ آنے لگیں اور سینٹ لیجر (ST. LEGER) میں تہران کی کامیابی کا حال میں نے فوراً سن لیا۔ جنگ کے تمام زمانہ میں میری دلچسپی کے یہ کام قابل آدمیوں کے ہاتھ میں تھے۔ میرے موجودہ ایجنٹ (AGENT) کے باپ یعنی مسٹر نسبت ویڈنگٹن (MR. NESBIT WADDINGTON) میرے اصطبل کی نگرانی کرتے تھے۔ اور گھوڑ دوڑ کے متعلق میرے سب کاموں کی نگرانی مسٹر فرینک بٹرس (MR. FRANK BUTTERS) نیو مارکیٹ (NEWMARKET) میں کرتے تھے۔ جنگ کے بعد رفتہ رفتہ میں نے اپنے اصطبل کا اور اپنے زیر تربیت دوڑ کے گھوڑوں کا انتظام دوبارہ شروع کر دیا اور ۱۹۴۷ء تک ان سب کا انتظام پھر میرے ہاتھ میں آ گیا۔

سنہ ۱۹۴۵ء کے شروع میں میری طویل گوشہ نشینی ختم ہو گئی۔ سر ڈف کوپر (SIRDUFECOOPER) نے جو پیرس (PARIS) میں برطانوی سفیر تھے۔ فرانس کی پولیس کا خاص انتظام میری حفاظت کے لئے کرا دیا۔ باوجودیکہ اس وقت تک ملک کے بڑے حصہ میں بدنظمی اور غیر قانونی حالت پھیلی ہوئی تھی جس میں جرمنی کے سپاہی آزادی کے ساتھ پھرتے تھے اور ہتھیار بند گروہ لوٹ مار کرتے تھے۔ میں اور میری بیوی مارسیلز (MARSEILLES) تک بلا کسی حادثہ کے پہنچ گئے۔ مارسائی (MARSEILLES) میں ہم امریکہ کی فوج اور اس کے سینئر (SENIOR) افسروں کے مہمان رہے۔ مارسائی سے ہم نے ایک برطانوی فوجی ہوائی جہاز میں قاہرہ (CAIRO) کو اپنا راستہ لیا۔

باوجودیکہ سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد سے مشرق وسطیٰ کے سب حملوں کے لئے برطانوی جنرل ہیڈ کوارٹر (G.H.Q) قاہرہ (CAIRO) میں قائم کیا گیا تھا۔ اور باوجودیکہ برطانوی فوج کی ایک وسیع جماعت اس شہر کے اندر اور اس کے چاروں طرف تھی۔ تاہم جنگی نقصانات کے علامات وہاں پر ظاہر نہ تھے۔ وہاں کی سوشل زندگی ہمیشہ سے بہت مختلف تھی۔ وہاں پر متعدد زبانیں بولی جاتی تھیں اور وہاں بہت سے کام کئے جاتے تھے۔ برطانوی سفارت خانہ میں آخری پروکونسل (PRO-CONSUL) لارڈ کلیرن (LORD KILLEARN) جو پیشتر سر مائلس لیمپسن (SIR MILES LAMPSON) کہلاتے تھے صدارت کر رہے تھے۔ یہ وہ شخص تھے جو اپنی زندگی کے شروع میں انگلستان اور مصر کے صلح نامہ سنہ ۱۹۳۶ء کے لئے سب سے پہلے ذمہ دار تھے۔ بڑے مکانات۔ ہوٹلوں۔ جزیرہ (GEZIRA) اور گارڈن سٹی (GARDEN CITY) کے کمروں کے بڑے بڑے اور نئے بلاکوں (BLOCKS) کے اندر اور اُن کے چاروں طرف۔ ایک مصروف اور عیش پرست سوشل زندگی کے آثار چڑھاؤ پائے جاتے تھے۔ انگلستان اور مصر کے تعلقات جن میں سطحی درستی اور خوشگواری کا پہلو پایا جاتا تھا روز افزوں کشیدگی کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

مصر کے دربار اور سیاسی حلقوں میں میرے بے شمار دوست اور شناسا

ؔ جو بعد میں لارڈ نورویچ (LORDNORWICH) ہو گئے تھے۔

موجود تھے جن میں اکثر شاہی خاندان کے افراد شامل تھے۔ میری رائے میں تین آدمی سرسری ذکر سے زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔ یعنی شاہ فاروق جن سے میں پہلی مرتبہ اُس وقت ملا جب وہ پورے جوان آدمی تھے۔ اُن کے وزیراعظم نحس پاشا اور ان کے ولی عہد پرنس محمد علی۔

پرنس محمد علی اور میں پنتالیس سے برابر دوست چلے آرہے ہیں۔ میں جب ۱۸۹۸ء میں پہلی مرتبہ لندن گیا تو وہ اور میں ایک ہی ہوٹل میں یعنی پکڈلی (PICCADILLY) کے اس قدیم آلبرمیل (ALBERMALE) ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ ونڈسر محل (WINDSORCASTLE) میں ملکۂ وکٹوریہ (QUEENVICTORIA) کے مہمان کی حیثیت سے انہوں نے اُس زمانہ سے کچھ پہلے یا کچھ بعد کھانا کھایا تھا جب مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہوا تھا۔ اس واقعہ سے پچپن سال بعد یہ عجیب اور خوشگوار اتفاق ہوا ہے کہ ملکۂ ایلزبتھ ثانی (QUEENELIZABETH II) کی تاج پوشی کے سال میں وہ اور میں جو کھانے پر ملکۂ وکٹوریہ کے مہمان رہ چکے تھے اُسی موسم گرما میں ان کی لکڑپوتی کے مہمان چاء پر ہوئے۔ زمانہ کے اس بڑے دوران میں پرنس محمد علی اور میں بہت پکے اور گہرے دوست رہے ہیں۔

اُن کی شخصیت بہت دلفریب اور ہمہ گیر ہے۔ خدیو مصر کا چھوٹا بھائی ہونے کی حیثیت سے مصر کی زندگی اور سیاسیات پر ایک طویل عرصہ تک انہوں نے اپنا خاموش اور تسکین بخش مگر نہایت زبردست اثر ڈالا تھا جو زیادہ تر پس پردہ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنی شادی کبھی نہیں کی چونکہ (یہ ہمیشہ کہا گیا) ان کی رائے یہ ہے کہ ان کی صحت اتنی زیادہ قوی نہیں ہے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ایک خاندان کی بنیاد ڈالنے میں حق بجانب ہوں گے۔ تاہم ان کی قوت اور ان کی زندہ دلی بہت زیادہ ہے جس طرح ان کی اسپرٹ (SPIRIT) حساس ہے اور اُن کا دماغ طاقتور ہے۔ وہ اپنی تمام زندگی میں ایک پُرخلوص اور نیک مسلمان رہے ہیں۔ وہ مکہ کو حج کے لئے جا چکے ہیں۔ وہ اسلامی کلچر پر بہت گہرا عبور رکھتے ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ

انہوں نے اسلام پر رسالوں کا ایک سلسلہ تصنیف کیا جس میں اسلام کا مفہوم اور بنی نوع انسان کے لئے اس کا روحانی پیام ظاہر کیا۔ اس کی بہت سی کاپیوں کے متعلق انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں یورپ میں تقسیم کروں۔ وہ چند زبانوں میں گفتگو کرتے ہیں۔ عربی اور ترکی سے لے کر انگریزی۔ فرانسیسی اور جرمنی زبانوں تک اور ان کے علاوہ ایک یا دو زبانوں تک۔ مصر کے متعلق ان کا مفصل تاریخی علم دراصل غیر معمولی ہے۔ خواہ وہ علم مملوکوں کے (MAMELUKES) زمانہ کے متعلق ہو یا خود اُن کے پر دادا محمد علی فاتح کے زمانہ کا ہو۔ ان کے دوست اور ان کے مداحوں کی ایک بڑی جماعت ہے جو نہ صرف ان کے ہموطنوں اور ان کے ہم مذہبوں میں پائی جاتی ہے بلکہ وہ مصر کی متعدد بیرونی کالونیوں (COLONIES) اور اقلیت والی جماعتوں میں بھی پائی جاتی ہے جو برطانوی۔ فرانسیسی۔ یہودی۔ یونانی اور قبطی لوگوں پر مشتمل ہیں مصر کے باہر سب مشرقی مسلم ملکوں میں۔ یورپ میں اور امریکہ میں انہوں نے عزت حاصل کر لی ہے وہ اپنی ساری زندگی میں برطانیہ کے برطانوی کیریکٹر اور طرز زندگی کے بہت بڑے مداح رہے ہیں اور بہت سے انقلابات اور مایوسیوں کے زمانہ میں وہ انگلستان اور مصر کی دوستی اور سمجھوتہ کے بہت پکے حامی رہے ہیں مصر میں بادشاہ کی حکومت ختم ہونے اور وہاں پر نیا دورِ حکومت قائم ہونے پر وہ اپنی خوشی سے بلا کسی تلخی اور ناراضگی کے جلا وطن ہو کر چلے گئے اور ان کی یہ خواہش رہی کہ مصر اور اس کے باشندے اپنے نئے حکمرانوں کی ماتحتی میں مسلسل اور روز افزوں خوش حالی حاصل کرتے رہیں۔ مگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ خود بہت زیادہ عمر رکھنے کی وجہ سے ایسی قوت نہ رکھتے تھے جس سے وہ (مصر کی ترقی میں) اپنا حصہ ادا کریں۔ انہوں نے اپنا محل اپنا مشہور اور خوبصورت نباتی باغ اور فنکاری کی چیزوں کا شاہانہ مجموعہ ایک وقف کی صورت میں چھوڑا ہے جو ان کی موت کے بعد ایک قومی عجائب خانہ ہو جائے گا۔ اب وہ اپنی خوش اور خاموش ضعیفی کی عمر میں اپنا گرمیوں کا موسم سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) میں اور اپنا سردیوں کا موسم فرانس یا اٹلی کے 'ریویرا' (RIVIERA) میں گذارتے ہیں۔ خدا کرے

وہ عرصہ تک اپنی پرسکون گوشہ نشینی کا لطف اٹھاتے رہیں گا۔

نحس پاشا سے میں پہلی مرتبہ اُس وقت ملا تھا جب مصر لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) میں شامل ہوا تھا۔ وہ جنیوا (GENEVA) آئے تھے اور میں نے ہندوستان کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی دعوت کی تھی۔ بہ حیثیت ایک سیاستدان کے ان کی عرصہ تک قائم رہنے والی کامیابی کی وجہ ان کی قوت تقریر تھی اور حکومت کا وہ جادو تھا جو وہ اپنے ہموطنوں کے عام آدمیوں پر چلا سکتے تھے۔ جب آپ پہلی مرتبہ اُن سے ملیں گے تو اُن کی یہ صفات ظاہر نہ ہوں گی۔ قدرت کا یہ عجیب پر بذاق کرشمہ رہا ہے کہ گو تاریخ میں وہ ایسے سیاست دان کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے جو اپنے اس بادشاہ سے سخت مخالفت رکھتے تھے جس کے وہ ملازم تھے۔ تاہم وہ فی الواقع سر سے پاؤں تک مکمل طور پر شخصی حکومت کے حامی تھے۔

بیگم نحس پاشا نے مجھے بتایا کہ وہ عقیدت کتنی گہری تھی جو اُن کے شوہر شاہ فاروق کے لئے رکھتے تھے اور اس عقیدت کے ساتھ ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ بادشاہ کی سب سے بہتر خدمت اس طرح پر ہوگی کہ اُن کو ہمیشہ اُن حدود کی یاد دلائی جائے جو اُن کے اختیارات کو بہ حیثیت دستوری بادشاہ کے گھیرے ہوئے تھیں۔ یہ بلاشبہ ایک وزیر کے جائز فرائض میں سے ہے۔ مگر جیسا کہ مسٹر گلیڈ اسٹون (MR. GLADSTONE) نے ملکۂ وکٹوریہ (QUEEN VICTORIA) کے ساتھ اپنی طویل مگر بہت سختی کے ساتھ باضابطہ مصاحبت کے زمانہ میں معلوم کیا۔ برطانیہ میں بھی وہ مشیر جو ہمیشہ اپنے بادشاہ کو یہ بتاتا رہتا ہے کہ اُن کو کیا کام نہیں کرنا چاہیئے۔ اپنے بادشاہ کے لئے ایسا ہر دلعزیز نہیں ہوتا ہے جیسا کہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو اپنی ذمہ داریوں کے متعلق اتنی سخت اور تکلیف دہ رائے نہیں رکھتے ہیں۔ نحس پاشا کی یہ خصوصیت محض سطحی نہ تھی بلکہ ایک بنیادی اصول تھا جس پر وہ استقلال کے ساتھ اور بغیر انحراف کے عمل کرتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ سے زیادہ اُن کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "بادشاہ حکومت کرتا ہے مگر وہ انتظام نہیں کرتا ہے۔"

(LE-ROI-REGNE, MAISILNE-GOUVERNE-PAS).

اِس میں شبہ نہیں ہے کہ ایسے نوجوان اور طاقتور بادشاہ کے لئے جیسے کہ شاہ فاروق تھے یہ بات لازی طور پر تکلیف دہ ہوگی کہ اُن کو اس کثرت کے ساتھ مشورہ لینا پڑے۔ بادشاہ اپنے وزیر اعظم کے ساتھ تمام مروجہ اخلاق کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مثلاً میں نے اکثر دیکھا کہ وہ دونوں اوپرا (OPERA) میں شاہی بکس (ROYALBOX) کے اندر ایک دوسرے کے برابر بیٹھے ہوئے ہیں مگر یہ بات ہمیشہ محسوس کی جاتی تھی کہ اُن با اخلاق رسمیات کے پیچھے ایک خلیج تھی جس پر پل نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ بادشاہ اپنی طرف سے ایک گہری اور ناگفتہ ناراضگی اپنے دل میں رکھتے تھے اور نحس پاشا کو اپنی طرف سے یہ افسوس تھا کہ اُن کی وفاداری اور اُن کی عقیدتمندی کی قدر نہیں کی جاتی تھی۔

خود شاہ فاروق کا کیا حال تھا؟ میرا خیال ہے کہ میرے لئے جیسا کہ بہت سے دوسرے آدمیوں کے لئے ہے وہ چیز جو اس غمگین مگر قابل قدر آدمی کے کیریکٹر میں تھی ہمیشہ ایک قسم کا معمہ رہے گی۔ اُن کے اندر بہت سی ناقابل فہم متضاد باتیں پائی جاتی ہیں مگر پھر بھی ان سب کی پشت پر ایک بڑی دلفریب کشش اور ایک حقیقی اور موثر سادگی پائی جاتی تھی۔ ان کے والد کا انتقال اسوقت ہوگیا تھا جب وہ ایک لڑکے ہی تھے۔ ان کی والدہ فوراً اپنے ملک سے باہر چلی گئیں اور کم عمر فاروق اپنے والدین کی محبت اور اثر سے محروم ہوگئے۔ وہ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجے گئے مگر ہر اعتبار سے وہ ایک وسیع دیہاتی مکان میں قیدی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کو ممانعت تھی کہ وہ باہر یا اِدھر اُدھر جائیں اور ان لوگوں سے آزادی کے ساتھ ملیں جن کے درمیان وہ رہتے تھے۔ یہ احکام اُن کے والد نے اس احتیاطی خوف کی وجہ سے دے رکھے تھے کہ شاید اُن کا لڑکا اس طرز پر نشوونما نہ پاسکے جو انہوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ اسکول میں اُن کی کوئی مناسب تربیت نہیں ہوئی اور وہ کبھی یونیورسٹی میں داخل نہ ہوئے۔ انہوں نے

'وولوچ' (WOOLWICH) کے مقام پر رائل ملٹری اکیڈمی میں صرف چند مہینے (ROYHLMILITARYACADEMY) گذارے۔ بہرحال ان کی قدرتی قابلیتوں کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے چچا پرنس محمد علی کی طرح وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے اور ہمہ گیر زباندان ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ انہوں نے ہمیشہ سے اُس تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے رکاوٹ محسوس کی ہے جو ان کے درجہ اور اُنکی قابلیتوں دونوں کے لئے موزوں تھی۔ اُس نے اُن کے اندر ایک قسم کا احساس کمتری پیدا کردیا ہوگا۔ جب وہ مسلسل طور پر اپنے آپ کو سب قوموں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نیز باکمال آدمیوں کی صحبت میں پاتے تھے۔ جس سے کہ ان کو لازمی طور سے واسطہ پڑتا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ اس بدقسمتی کے پس منظر میں اُن عادتوں کے حقیقی اسباب پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اور اُس قماربازی کی وجہ سے جس پر اس سختی سے ساتھ ملامت کی جاتی تھی اور اُن طویل بے غرض گھنٹوں کی وجہ سے جو ہوٹلوں اور شبانہ کلب گھروں میں تفریح حاصل کرنے کے لئے ضائع کئے جاتے تھے۔ اُن کے ملک میں اُن پر اعتراضات کئے جاتے تھے اور ملک کے باہر اُن کی بدنامی ہوتی تھی افسوس ہے کہ اس بات سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ یہ تمام وقت بیکار ضائع کیا جاتا تھا۔ اُن کی حرکتوں کا پرغم اور بے مقصد خلا بہرحال اس طرح پر سمجھایا جاسکتا ہے گو اُس کو معاف نہیں کیا جاسکتا کہ بچپن میں ان کی تنظیمی تربیت نہیں ہوئی تھی اور اس واقعہ سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ کسی شخص نے اُن کو یہ بات سکھانے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ "انسان کی خاص دولت وقت ہے" اور یہ کہ اگر انسان وقت کو بیکار کھوتا ہے تو وہ اپنے سب سے بڑے سرمایہ کو کھو بیٹھتا ہے جو دوبارہ کبھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اُن کے عیوب کے خلاف میں اُن کی اچھی خصوصیات کے ظاہر کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ مثلاً ایک نیک مسلمان کی حیثیت سے اُن کی پارسائی۔ شراب سے اُن کی نفرت (ان سب باتوں کے باوجود جو اُن کے مخالف معترضین نے اُنکے متعلق کہی ہیں،

ان کا اخلاق اور مہربانی خاص طور پر غریبوں کے ساتھ مسکین کاشتکاروں اور ملازموں کے ساتھ۔ ان کی وطن پرستی اور اپنے ملک پر اُن کا فخر یہ آخری خصوصیت میرے علم میں اُن کی شخصیت کی بڑی خصوصیت تھی۔ وہ اپنے سر کے تاج سے لے کر اپنے پیروں کے تلووں تک مصری ہیں۔ وہ اس بات پر بہت گرمی کے ساتھ ناراض ہوتے تھے۔ اگر کسی ذریعہ سے یہ کہا جائے کہ مصر یا مصر کے آدمی دنیا کے کسی ملک یا کسی قوم سے کمتر ہیں یا کسی زمانہ میں کمتر رہ چکے ہیں۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی قوم کی عظمت کو جو محمد علی اور ابراہیم پاشا کے زمانہ میں تھی دوبارہ حاصل کرلیں۔ وہ اپنے دادا خدیو اسمٰعیل کے دور میں جو نصب العین اور کارنامے تھے ان پر بے انتہا فخر کرتے تھے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بہت سے مختلف اور متضاد عناصر سے بنا ہوا ہے۔ کسی ایک انسان میں یہ آمیزش شاید ہی اتنی زیادہ پیچیدہ اور اتنی متضاد ہوگی جتنی کہ اس بدبخت مگر نیک طبیعت اور قابل بادشاہ کے اندر تھی۔ اپنی حکومت کے آخری زمانہ تک جب کہ بدترین نقصان کیا جا چکا تھا۔ وراثت کے امکانات کی بابت غیر یقینی حالات نے اس کے دربار کے اندر اور اس کے چاروں طرف خفیہ کارروائی۔ سازش اور شبہات کی فضا پیدا کر دی تھی۔ اُن کے والد ایسے تخت پر بیٹھے تھے جو خالی رہ گیا تھا چونکہ ان کے رشتہ کے بھائی خدیو عباس حلمی تخت نشینی کے مستحق شمار نہیں کئے گئے تھے اور دوسرے ظاہری دعویدار یعنی سلطان حسین کے بڑے بیٹے کی نسبت "محافظ حکومتوں" کا خیال تھا کہ وہ موزوں آدمی نہیں ہیں۔ شاہ فاروق خود اکلوتے بیٹے تھے اپنی دوسری شادی تک اُن کے کوئی بیٹا نہ تھا اُن کو جسمانی حفاظت کے متعلق بڑی محتاط بے چینی تھی جو اپنی طرز پر ایسی مکر آلود اور خفیہ تھی جیسا کہ قتل کئے جانے کا براہ راست اور علانیہ خوف ہوتا ہے۔

شاہ فاروق کی مخالفت اپنے وزیروں کے ساتھ بہت طویل اور مستقل تھی اُن کو اس بات کا یقین تھا جس طرح کہ اُن سے پہلے اُن کے والد کو تھا کہ مصر میں

سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ بادشاہ کی طرف سے ایک مضبوط اور با اختیار حکومت کی جائے اور بادشاہ کی ہدایتوں پر عمل کیا جائے۔ مگر وفد پارٹی اُن کو ایک ربڑ کی مہر کا بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے جذبات کے لحاظ سے بہت سختی کے ساتھ قوم پرست تھی مگر بڑے بڑے خود غرض سرمایہ داروں اور صنعت و حرفت والوں کے مفاد کی نمائندہ تھی۔ وہاں پر سیاستدانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جو بادشاہ کے معاون اور آلۂ کار کی حیثیت سے تھی اور جو اپنے اختیارات اور ترقی حاصل کرنے کے لئے بادشاہ کی طرف نظر رکھتی تھی۔ جب کبھی بادشاہ اور وفد پارٹی متفق ہو کر کام نہیں کر سکتے تھے تو اس جماعت کا کوئی آدمی جو اس وقت "بادشاہ کی آزاد سیاسی پارٹی" کہلاتی تھی۔ نئی حکومت بنانے کے لئے بلایا جاتا تھا اور وہ حکومت جو اُس وقت تک قائم رہتی تھی جب تک دوسرے بڑے اور فیصلہ کُن نازک واقعات پیش آئیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ فوج میں بھی یہی چالیں چلا کرتے تھے اور یہی ترکیبیں استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے منظور نظر ملازموں کو ترقیاں دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے افسر لوگوں میں ناقابلِ معافی ناراضگی پیدا ہو جاتی تھی۔

ایلیکشن میں وفد پارٹی کی آخری بڑی کامیابی کی وجہ سے نحس پاشا اور اُن کے دوست دوبارہ برسر اقتدار ہوگئے۔ یہ اس وقت ہوا جب سیاستدانوں کی آخری امکانی ردّوبدل جو وفد پارٹی کے خلاف کی گئی تھی ناکامیاب ہوگئی بادشاہ کی ہمت بہت زیادہ ٹوٹ گئی اور وہ تھک کر ایک غمگین اور بذب حال کی پناہ لینے لگے۔ جس میں مایوس کُن بد بینی شامل تھی۔ تخت چھوڑنے سے پہلے جب وہ آخری مرتبہ یورپ گئے تھے۔ اس وقت میری ملاقات اُن سے ہوئی تھی اور مجھے فوراً اُن کے اندر ایک بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔ اُن پہ مایوس تقدیر پرستی کی ذہنیت گھیرے ہوئے تھی جس میں اس قسم کی باتوں کی فضا پائی جاتی تھی کہ " میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا ہوں۔ بہت اچھا

تو پھر اُن لوگوں کو جو وہ چاہیں کرنے دو"۔ یہ بات آخرکار لازمی طور سے اُن کی شکست اور تنزل کا باعث ہونے والی تھی۔ انہوں نے خاص اپنے طریقہ پر یہ کوشش کی تھی کہ وہ اپنی قوم کی مدد کریں اور ان کی حالت کو بہتر بنائیں۔ اور اب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ناکامیاب ہوگئے تھے۔ اس موقعہ پر مجھے احمد شاہ کا واقعہ بہت اچھی طرح یاد آگیا جو ایران میں قاچار خاندان کے سب سے آخری بادشاہ تھے۔ شاہ فاروق نے احمد شاہ کی طرح ایک گہری اور شکست خوردہ تقدیر پرستی قبول کرلی تھی اور وہ اپنے فرائض پورا کرنے اور اپنی قوم کی خدمت کرنے کے لئے اپنی طاقت کے بھروسہ کو کھو بیٹھے تھے قاچار خاندان کی طرح وہ خاندانی حکومت جو محمد علی نے قائم کی تھی ختم ہوگئی۔ اور دونوں ملکوں میں حکومت سیاست دانوں کو منتقل نہیں ہوئی بلکہ فوج کو منتقل ہوگئی۔

اب شاہ فاروق کے چاروں طرف ایک مایوس کن غمگینی کا عالم نظر آتا ہے۔ اپنے چچا اور سابق ولیعہد پرنس محمد علی کے برعکس یہ بات لازمی ہے کہ قدرتی حالات کے درمیان اُن کو ایک طویل عمر سے واسطہ پڑے گا۔ اب ان کے مشاغل کیا ہوں گے؟ کہاں پر اور کس طرح پر وہ اس قابل ہوسکیں گے کہ اپنے لئے ایک ایسی نئی زندگی بنالیں جس میں اُن کو خودعزت اور خودداری حاصل ہو اور جس میں وہ اپنے ہم جنس آدمیوں کے لئے کچھ مفید ثابت ہوسکیں۔ موجودہ حالت میں یہ دیکھنا بے انتہا تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یورپ کے ایک شہر سے دوسرے شہر کو بلا سہارے اور بلا مقصد کے راستہ طے کررہے ہیں یہ تکلیف اس بات کو جانتے ہوئے اور زیادہ تیز ہوجاتی ہے کہ اگر شاہ فاروق کو جوانی میں مناسب ہدایت مل جاتی تو ان میں یہ اہلیت تھی کہ وہ مصر کے ایک اچھے اور وطن پرست بلکہ شاید ایک بہت بڑے بادشاہ بن جاتے۔

میری امامت کی وراثت حاصل کرنے اور گدی پر بیٹھنے کی ساٹھویں برسی سنہ ۱۹۴۵ء میں واقع ہوئی مگر دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر جو تکلیف دہ حالات تھے

اُن میں نہ یہ ممکن تھا اور نہ مناسب تھا کہ میری ڈائمنڈ جوبلی (DIAMOND JUBILEE) کی رسم منانے کے لئے کوئی طویل انتظامات کئے جائیں۔ اس لئے ہم نے یہ طے کیا کہ صرف دو مقامات پر رسوم ادا کئے جائیں۔ ایک بمبئی میں مارچ ۱۹۳۶ء میں ہو جہاں پر ہیروں میں تولنے کی رسم ادا کی جائے۔ اور دوسری پانچ مہینے بعد دارالسلام میں ہو اور وہاں پر بھی ہیرے استعمال کئے جائیں۔

جب وہ وقت آیا تو دنیا کے حالات کچھ بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور سفر کرنے میں لڑائی کے آخری مہینہ کی نسبت کچھ کم مشکلات نہ تھیں۔ بہر حال میرے مریدوں کی ایک شاندار نمائندہ جماعت ایک عجیب اور کم از کم میرے لئے بالکل ناقابل فراموش موقعہ پر جمع ہوئی۔ اسماعیلی لوگ تمام مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ سے آئے تھے۔ وسط ایشیا اور چین سے۔ شام اور مصر سے۔ برما اور ملایا سے۔ اور ہزاروں میرے ہندوستانی مرید بھی آئے تھے۔ ہندوستان کے بہت سے حکمران شہزادوں نے اپنی موجودگی سے میری عزت افزائی کی اور اسی طرح پر برطانوی راج کی آخری دھیمی روشنی کے پرشورش زمانہ میں برطانیہ کے سینئر عہدہ داروں نے کیا۔ ساری اسلامی دنیا سے۔ تمام آزاد مسلم قوموں کے حکمرانوں کی طرف سے اور وائسرائے کی طرف سے میرے اوپر تاروں اور مبارک بادی کے خطوط کی بارش ہو رہی تھی۔ میں اس لحاظ سے ایک فخر کرنے والا اور خوش دل آدمی تھا کہ میں اس طرح پر ان لوگوں کے ساتھ دوبارہ متحد ہو گیا جن کے ساتھ برسوں تک میری محبت اور ذمہ داری اتنی گہری اور اتنی مسلسل رہ چکی تھی۔

میں امید کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسمی جشن اپنے وقت اور انتظام کے اعتبار سے بذاتِ خود اُس شرارت آمیز اور تکلیف دہ مگر چھوٹے سے قصہ کی مکمل اور موثر تر دید ثابت ہوا جو حال میں مشہور کیا گیا تھا۔ چند کام کرنے والے آدمیوں نے اس بات کا کھوج نکالا کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی زمانہ میں حکومتِ ہند سے میں نے یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی ملکی ریاست دے دی جائے اور میں والیانِ ملک کی جماعت میں شریک کر لیا جاؤں۔ اس درخواست کے

نامنظور ہونے پر اُن لوگوں نے یہ بالکل غلط اور مہمل نتیجہ نکالا کہ میں بہت ناراض ہوا اور یہ کہ اس ناراضگی کی وجہ سے میں نے وہ تمام اصول اور نصب العین ترک کر دیئے جو میں نے اپنی تمام عمر بڑی قدر و محبت کے ساتھ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ یہ بات سچ سے اتنی زیادہ دور تھی کہ اور کوئی بات اس سے زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔

جو بات دراصل واقع ہوئی وہ اس طرح پر تھی کہ عرصہ سے اسماعیلی فرقہ کو یہ احساس تھا کہ اُن کو ایک قومی وطن ملنے کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی بڑی اور طاقتور ریاست نہ ہوگی بلکہ ایسی چیز ہوگی جو ٹینجیر (TANGIER) یا ویٹیکن (VATICAN) کے طرز پر ہوگی۔ یعنی زمین کا ایسا خطہ جو خاص اسماعیلیوں ہی کا ہو جس کو ساری دنیا کے اسماعیلی لوگ ہمیشہ کے لئے خاص اپنا کہہ سکیں۔ جہاں پر وہ اپنے رواج و رسوم کے مطابق عمل کر سکیں۔ اپنے قوانین جاری کر سکیں اور مادی اعتبار سے خاص اپنا مالیاتی مرکز بنا سکیں جس میں خاص اُن ہی لوگوں کے بینک (BANKS) ہوں۔ روپیہ لگانے کے ٹرسٹ ہوں۔ بیمہ کی اسکیمیں ہوں۔ بہبودی اور پرائیویٹ فنڈ کے انتظامات ہوں کسی ملکی ریاست کا خیال میرے لئے کبھی خاص طور پر قابلِ پسندیدگی نہ تھا۔ مگر اس معاملہ میں اسمٰعیلی جذبات اتنے قوی تھے کہ میں نے ان کی وجہ سے حکومت ہند تک رسائی کی۔ ان دلائل کی وجہ سے جو میرے نزدیک یقینی طور پر بالکل مناسب اور منصفانہ تھے۔ حکومت ہند کو ہماری درخواست منظور کرنے کا کوئی امکان نظر نہ آسکا۔ یہ خیال کہ انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ میں نے وہ درخواست کیوں پیش کی یا یہ کہ مجھ کو اُن کے انکار سے تکلیف پہنچی یا مایوسی ہوئی بالکل غلط اور وہم پرستی کا خیال ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے اس بات کا عملی ثبوت یقینی طور پر اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ۱۹۳۹ء کے بعد سے میں نے برطانیہ کی جنگی کوشش کے لئے ہر قسم کی مدد کی جو مالی بھی تھی اور ہر طریقہ پر تھی جو میرے امکان میں تھا۔ ایک ایک پیسہ جو میں لندن میں بچا سکا یا چندہ میں جمع کر سکا میں نے مختلف جنگی قرضوں میں لگا دیا۔ اور مجھے

معلوم ہے کہ نہ تو انگلستان کی بینک نہ وہاں کا خزانہ میری امداد کی اس حد سے نا واقف تھا جو میں دے سکتا تھا۔

جہاں تک برطانیہ اور ہندوستان میں برطانیہ کے حکمرانوں کا تعلق ہے میری ڈائمنڈ جوبلی کے موقعہ پر اُن کی امداد اُن کی مہربانی اور ان کا لحاظ غیر محدود تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سر اسٹیفورڈ کرپس (SIR STAFFORD CRIPPS) کی امداد اور دلچسپی جو اُسوقت وزیر مال تھے ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو ہم ان رسوم کو کبھی ادا نہ کر سکتے تھے۔ سب سرکاری عہدہ داروں نے وزیر سے لے کر نیچے تک ہم کو اس کام میں ہر ممکنی سہولت دی (جس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ حفاظت کی محتاط تدابیر کیجائیں) کہ ہم اُن ہیروں کو پہلے ہندوستان لے جائیں اور پھر ہندوستان سے افریقہ لے جائیں۔ اُن سینکڑوں پیامات میں جو مجھے موصول ہوئے۔ والسرائے کا ذاتی پیام مبارکبادی قابل یاد تھا۔ اور چند ماہ کے بعد بالکل یہی قصہ مشرقی افریقہ میں رہا۔ وہاں پر زنجبار کے ریزیڈنٹ (RESIDENT OF ZANZIBAR) ٹنگانیکا (TANGANYIKA) کینیا (KENYA) اور یوگنڈا (UGANDA) کے گورنروں کی اور ایسی اہم شخصیت کی جیسے کہ خود مسٹر کریچ جونس (MR. CREECH - JONES) تھے اور جو کالونیوں کے سکریٹری آف اسٹیٹ (SECRETARY OF STATE FOR THE COLONIES) تھے۔ موجودگی کی وجہ سے تولنے کی رسم میں عزت افزائی ہوئی۔ اس تمام زمانہ میں جب میرا قیام افریقہ میں رہا گورنروں نے اور برطانیہ کے سب سینئر عہدہ داروں نے جن سے میرا واسطہ پڑا بے انتہا مہماں نوازی اور مہربانی کے ساتھ میرا استقبال کیا اور میری ضیافت کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس واقعہ سے ایک جھوٹی خبر کی تردید ہو جائے گی۔

ہندوستان میں جو خوشی منائی گئی اس میں ایک نہایت نازک اور اہم پہلو تھا اُن ہیروں کی قیمت کی برابر ایک رقم جو پانچ لاکھ پونڈ سے زیادہ تھی جمع کی گئی تھی اور ایک غیر مشروط عطیہ کی صورت میں میرے سامنے پیش کی گئی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ

بڑی رقم اسماعیلی فرقہ کی بہتری کے لئے اُس سارے ملک میں جو اُسوقت غیر منقسم ہندوستان تھا استعمال کی جائے۔ وہ خاص اسکیم جو میرے ذہن میں تھی ایک ٹرسٹ کے متعلق تھی جو اسی طرز کا ہو جس کو اسماعیلیوں نے افریقہ میں قائم کیا تھا جس کا کچھ ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور جو حقیقت میں اُن دوستانہ جماعتوں سے (FRIENDLY SOCIETIES) غیر مشابہ نہیں ہے۔ جنہوں نے برطانوی زندگی میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے۔ میری رائے ہے کہ ایسی تاجر اور زراعت پیشہ جماعت کے لئے جیسی کہ اسماعیلیوں کی بڑی اکثریت ہے۔ اس قسم کا ادارہ جس میں بہبودی کے کام دوراندیشی۔ مالی مشورہ۔ امداد۔ قرض اور رہن وغیرہ کے کاموں کے ساتھ جمع کئے جائیں ایک معمولی خیراتی فنڈ کی نسبت بہت زیادہ اہم اور زیادہ موزوں ہے۔

ہندوستان میں بہرحال دوسری قسم کے خیالات پھیلے ہوئے تھے میں نے روپیہ کو واپس کر دیا اور اس کے متعلق یہ مشورہ دیا کہ وہ اُن لوگوں کو دے دیا جائے جنہوں نے اس کو چندہ میں ادا کیا تھا۔ مگر میں نے اپنے اس مشورہ کو بہ حیثیت امام کے حکمیہ طور پر قابلِ تعمیل نہیں بنایا۔ یہ بات طے کی گئی کہ ایک باضابطہ خیراتی ٹرسٹ قائم کیا جائے مگر میں یہ بات بہت زور کے ساتھ کہے دیتا ہوں کہ اس فیصلہ میں میرا کوئی حصہ نہ تھا اور اس کے لئے میری کوئی ذمہ داری تھی۔ اور اسی وجہ سے اس کا یہی نتیجہ ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا اور جو مجھ کو پہلے سے نظر آ رہا تھا چونکہ اس قسم کا نتیجہ مشرقی ممالک میں غیر معمولی نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ وہ ٹرسٹ کچھ کام کرنا شروع کرے۔ بمبئی کے اسماعیلیوں کے درمیان مختلف پارٹیوں میں طویل اور تباہ کن خرچ والی مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ مجھے بہرحال اب بھی امید ہے کہ جب سب مقدمے طے ہو جائیں گے تو کم از کم آدھی رقم جو چندہ میں آئی تھی اس مقدمہ بازی میں خرچ نہ ہوئی ہوگی۔ اور وہ اسماعیلیوں کے درمیان خیراتی کاموں میں لگانے کے لئے موجود ہوگی۔

خود مجھ پر بعض مرتبہ یہ اعتراض ہوا ہے کہ میں نے بڑے پیمانہ پر خیراتی کاموں کی

امداد اور ہمت افزائی نہیں کی مثلاً چھوٹے اور بڑے شفاخانوں کی۔ اسکولوں کی۔ طالب علموں کو وظیفے دینے کی۔ اور عام طور پر خیراتی اداروں اور ان کی تنظیم کی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اسماعیلی جماعتیں ایک خاص نوعیت کی بنی ہوئی ہیں۔ بہت سے اسماعیلی تاجر اور درمیانی طبقہ کے آدمی ہیں۔ دوسرے لوگ معافیدار کاشتکار ہیں جو اس سوسائٹی کی مانند ہیں جو روس (RUSSIA) کی تاریخ میں "کولک" (KULAKS) کے نام سے مشہور ہے اُن کا نقطۂ نظر بے انتہا شخصی اور انفرادی ہے جو بہت سی صدیوں میں حاصل ہوا ہے اور وہ ترقی پاتا رہا ہے۔ وہ بہبودی کے کام جو باہر سے اُن پر زبردستی ڈالے جائیں اُن کی سوسائٹی کے ڈھانچے کے مطابق نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی کفایت شعاری اور ذاتی امداد کے کاموں میں ایک دوسرے سے مل کر کام کرنا سیکھیں اور جو کچھ وہ اپنے گھروں میں اور بہ حیثیت افراد کے عمل کریں اُس کو اپنی پوری جماعت تک پہنچادیں۔ یہ بات اس طرح پر حاصل نہ ہوگی کہ وہ معمولی انتظامات کئے جائیں جو عام طور پر خیراتی اور بہبودی کے کام کہے جاتے ہیں۔ اور جو یورپ کے بہت سے ملکوں میں وہاں کے نظام حیات کا جزو ہیں۔ میں سچے دل سے اس بات کا یقین رکھتا ہوں کہ بینک کے معاملات میں اور تجارتی معاملات میں باہمی تعاون۔ روپے کے جمع کرنے اور اُس کو بطور قرض دینے میں۔ عمارات کے سلسلہ میں اور کاشتکاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا ایسا راستہ ہے جو اُن کو اقتصادی تمدنی اور کلچر کی ترقی کی طرف لے جائے گا۔ اور اُس سے اُن کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے وہ بہتر زندگی حاصل ہوگی جس کو اُن کی قابلیتیں اور اُن کی نیک خصوصیات یقینی طور پر حاصل کر سکتی ہیں۔

ان کاموں کی بنیادیں برطانوی مشرقی افریقہ اور مڈگاسکر (MADAGASCAR) میں بہت اچھے اور صحیح طور پر قائم کر دی گئی ہیں۔ اور مجھے اس بات کی پوری امید ہے کہ سنہ ۱۹۶۰ء تک ہم کو کم از کم اس کوشش کا پھل ملنے لگے گا جس کو میں اپنے مریدوں کے

لئے اپنی دُنیوی اور مادی کوشش کہہ سکتا ہوں۔ مصر میں اور شام میں پاکستان۔ ہندوستان۔ ملایا اور پرتگالی مشرقی افریقہ میں یہ کام کرنا بہت زیادہ مشکل ہوگا میں بہر حال اب بھی اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ اور میری پلیٹینم جوبلی (PLATINUM JUBILEE) جو سنہ ۵۵-۱۹۵۴ء میں منائی جائے گی میری رائے میں اس بات کا بہت اچھا موقعہ دے گی کہ ہم ان ملکوں میں ان کوششوں کا تجربہ کریں جو ہم بڑی کامیابی کے ساتھ برطانوی مشرقی افریقہ میں شروع کر چکے ہیں۔

ہندوستان نے سنہ ۱۹۴۶ء میں اس مرض کی علامات کا اظہار کیا جو بہت نازک اور بگڑے ہوئے درجہ تک پہنچ گئی تھیں اور جس مرض کے دور کرنے کی پیش بینی کرنا تقریباً تیس سال پیشتر اس روز سے ممکن ہو گیا تھا جب کہ مونٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات (MONTAGUE-CHFLMSFORD REFORMS) کی اشاعت کی گئی۔

روحانی اتحاد اور تسلسل کا وہ احساس جس نے میری جوانی کے زمانہ میں اور اس سے بہت پہلے برطانوی حکومت کو ہندوستان میں قائم رکھا تھا۔ اور جس نے اس حکومت کو اس کا اخلاقی رگ وریشہ اور اخلاقی پشت وپناہ اور نیز اُسکی قابلیت اور تکمیل کی ظاہری علامات دے رکھی تھیں اب پورے طور پر ختم ہو چکا تھا۔ وہ احمقانہ تضاد جس نے سنہ ۱۹۱۷ء کے بعد سے ہندوستان میں برطانیہ کی اخلاقی اور عملی حالت کے استقلال اور پختگی کو تباہ کر دیا تھا اب اپنا لازمی اور آخری محصول زبردستی وصول کر رہا تھا۔ "ہندوستان چھوڑ دو" یہ دو الفاظ جو اکثر کلکتہ - دہلی اور بمبئی کی اور ہر دوسرے بڑے شہر کی دیواروں پر لکھے ہوئے ملتے تھے۔ اب صرف شورش پسندوں کی 'کیلا کانٹی' شمار نہ کئے جاتے تھے۔ اُن سے اب ایک خواہش اور ارادہ کا اظہار ہوتا تھا۔ برطانیہ کے لوگ ہندوستان چھوڑ کر جا رہے تھے اب خاص مسئلہ اُن کی روانگی کی رفتار کا رہ گیا تھا کہ وہ تیز ہوگی یا سست ہوگی۔ اب صرف یہ سوالات رہ گئے تھے کہ وہ کب اور کس طرح جائیں گے۔ انگریزوں کے صرف

مٹھی بھر آدمی جو سب ملا کر دو ہزار سے کم ہوں گے اب انڈین سول سروس میں باقی رہ گئے تھے مگر اختیارات اب بھی اُن ہی لوگوں کے ہاتھ میں مرکزی حیثیت سے پائے جاتے تھے اور جب تک وہ لوگ ہندوستان کے عوام کو جواب دہ نہ تھے بلکہ پارلیمنٹ کو اور برطانیہ کے عوام کو جواب دہ تھے۔ اُس وقت تک ہندوستان آزاد اور خود مختار نہیں تھا۔

دوسری عالمگیر جنگ نے ہندوستان پر اس سے قبل والی جنگ کی نسبت بہت زیادہ قریب اور بہت زیادہ گہرا اثر ڈالا تھا۔ ۱۹۴۲ء کی پہلے چھ مہینوں میں تمام جنوب و مشرقی ایشیا جس میں برما (BURMA) بھی شامل تھا جاپانیوں نے فتح کر لیا۔ حملہ کا طوفان ہندوستان کی سرحد تک آ گیا تھا اور جاپان کے بم پھینکنے والے جہاز کلکتہ کے اوپر نظر آنے لگے تھے گو ان کا بہت کم اثر لیا جاتا تھا۔ ہندوستان نے تقریباً بیس لاکھ فوج جمع کی اور اس کو اتحادیوں کی طرف لڑنے کے لئے جنگ کے میدان میں بھیجا۔ یہ تاریخ میں سب سے بڑی والنٹیر فوج تھی (VOLUNTEER ARMY) ہندوستان کی فوجی اور غیر فوجی قوموں کے متعلق برطانیہ کا عجیب اور غلط نظریہ بالکل ختم ہو گیا۔ بنگال اور جنوب ہند کے بہت سے علاقوں کے آدمیوں نے لڑنے والے رسالوں کے ساتھ بہادری سے خدمات انجام دیں۔ مشرق وسطیٰ میں مشرقی افریقہ میں اور اٹلی میں ہندوستان کی فوجیں برسوں تک برطانیہ اور کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) کی لڑنے والی فوجوں کا لازمی اور اہم جزو تھیں۔ آخری فتح کے لئے اُن کی امداد کی بڑی قدر و قیمت جنگ کی فوجی تاریخ میں غیر فانی طور پر لکھی ہوئی ہے۔ یہ امداد کیرن کی جنگ سے لے کر (BATTLE OF KEREN) مارشل کیسل رنگ (MARSHAL KESSELRING) کی شمالی اٹلی سے آخری واپسی تک جو چار سال بعد ہوئی۔ برابر دی گئی۔ ہندوستان کے افسروں نے جو کنگس کمیشن (KING'S COMMISSION) رکھتے تھے ہمیشہ بار بار اپنی بہادری۔ اپنے دماغ کی تیزی اپنی لیڈری اور بڑا اونچا کمانڈ کرنے کے لئے اپنی اہلیت کا ثبوت دیا۔ جنگ کے آخری

دوروں میں ہندوستان ۴۵-۱۹۴۴ء کے جنوب مشرقی ایشیائی حملوں کا مخصوص اڈہ تھا جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن (LORD MOUNTBATTEN) کے اعلیٰ کمانڈ کے ماتحت تھے اور جنہوں نے جاپانیوں کو برما کے نیچے کی طرف بہت تباہ کن پسپائی کے ساتھ نکال دیا تھا اور جن کی وجہ سے جاپان کو آخری شکست دینے میں بہت بڑی مدد ملی۔

تاہم جنگ کرنے کے تمام طریقے اور اس کی فوجی مصلحتوں کے متعلق ہندوستان کی رائے کو کوئی دخل نہ تھا۔ اس کے بہت سے ممتاز سیاسی لیڈر برسوں سے سیاسی حراست میں پڑے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۲ء کے موسم بہار میں جنگ کے انتہائی عروج پر سر اسٹیفورڈ کرپس (SIR STAFFORD CRIPPS) ایک برطانوی مشن کے صدر ہو کر ہندوستان آئے تاکہ اس زمانہ کے عظیم مسائل کے پس منظر کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ایک قابل عمل اسکیم نکالنے کی کوشش کریں۔ کرپس کا مشن (CRIPPS MISSION) ناکامیاب ہوگیا اور وہ سب سے زیادہ سخت چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا یعنی اس واقعہ کی وجہ سے کہ برطانیہ کے لوگ اور ہندو نمائندے دونوں اس برصغیر کے اتحاد کو قائم رکھنے کی امید رکھتے تھے (۱۹۴۲ء کے حالات کے مطابق جہاں تک برطانیہ کے آدمیوں کا تعلق تھا وہ اتحاد ہندوستانی فوج کے متعلق بالکل نہ تھا) مگر اس اتحاد کو حاصل کرنے کے لئے جو قیمت ادا کرنی پڑتی تھی اُس کو کوئی مسلمان منظور نہیں کر سکتا تھا۔ اور اُس وقت تک مسلمانوں کی رائے عامہ بہت زور کے ساتھ مسٹر ایم۔ اے جناح قائد اعظم کی قیادت میں بالکل مستحکم اور متحد ہوگئی تھی۔ مسٹر جناح نے یہ بات کرپس (CRIPPS) پر پورے طور پہ واضح کردی کہ متحدہ ہندوستان کا کوئی دستور جو تقریباً دس کروڑ مسلمانوں کو مطمئن نہ کرے کبھی منظور نہ کیا جائے گا اور یہ کہ اس دستور سے مسلمانوں کی مخالفت صرف اس وقت ختم ہوگی جب اُن کو قتل کر دیا جائے گا۔ جب مسلمان یہ نعرہ لگاتے تھے کہ "موت لیں گے یا آزادی" تو اُن کا جو مطلب تھا وہ صاف ظاہر ہونا تھا۔

کرپس مشن (CRIPPS MISSION) کے ناکامیاب ہونے پر تین سال سے زائد عرصہ تک سیاسی ضیق کا زمانہ رہا جس میں سیاسی اعتبار سے کوئی کام نہ ہوا۔ ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال سے یہ ظاہر ہوا کہ ہندوستان کے اقتصادیات کی بنیادیں کتنی نازک اور کتنی کمزور تھیں۔ لارڈ لنلتھگو (LORD LINLITHGOW) کی جگہ فیلڈ مارشل لارڈ ویول (FIELD MARSHAL LORD WAVELL) وائسرائے ہو گئے تھے۔ جنگ کے ختم ہونے پر تمام ہندوستان میں سیاسی بخار بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ تمام ایشیا میں قوم پرستی کے جذبہ کی اُبھرتی ہوئی لہر پائی جاتی تھی۔ نوآبادیوں کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینے کی خواہش بہت تیز اور بہت اصرار کرنے والی ہو گئی تھی۔ جاپان کی فتوحات کے بہت سے فوجی اور تمدنی نتائج خواہ کتنے ہی قابل نفرت تھے مگر ان سے ایک اہم نتیجہ حاصل ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ انہوں نے تمام جنوب و مشرقی ایشیا کے کروڑوں آدمیوں کو یہ بات ثابت کر کے دکھا دی کہ ان کے یورپین آقا ناقابل شکست نہ تھے۔ کروڑں آدمیوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ایک ایشیائی قوم نے تین سال سے زائد عرصہ تک ایک بڑے رقبہ میں جو کوریا (KOREA) سے نیوگنی (NEW GUINEA) تک اور آسام (ASSAM) کی سرحد سے وسطی بحرالکاہل (CENTRAL PACIFIC.) تک پھیلا ہوا تھا، امریکہ برطانیہ اور کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) فرانس اور ہالینڈ کی مشترکہ قوت کا مقابلہ کیا تھا اور ان کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس سبق کا اثر اتنا روشن اور اتنا زوردار تھا کہ اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندوستان میں اب اس کا کوئی ذکر نہ تھا کہ پانچ یا دس سال کا عبوری زمانہ گذارا جائے۔ اگر حکومت خود اختیاری نہ دی جائے گی اور وہ بھی مستقبل میں نہیں اور ان شرائط پر نہیں جو برطانیہ مقرر کرے بلکہ فوراً اُن شرائط پر جس کو ہندوستان کے آدمی زیادہ تر خود اپنے اوپر لگائیں تو اُس کے لئے ہندوستان کی کشاکش بہت حقیقی۔ فوری اور خونریز ہو گی۔ اس جذبہ کی گہرائی اور وسعت کی

سب سے زیادہ واضح علامت جو ایسے آدمی کو نظر آتی تھی جو میری طرح برسوں باہر رہ کر واپس آیا تھا یہ تھی کہ نہ صرف برطانیہ کی سیاسی سرداری کے خلاف بلکہ ہر چیز کے خلاف جو برطانوی تھی۔ مثلاً انگریزی زبان۔ انگریزی عادات اور رسوم سگریٹ کے پائپ۔ وھسکی اور سوڈا۔ یورپ کے سوٹ۔ کالر اور ٹائی کے خلاف دشمنی اور نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں تک اُن ہندوستانی آدمیوں کو بھی جنہوں نے یہ عادات قبول کر رکھی تھیں بعض مقامات پر حقیقی خطرہ کی حالت میں رہنا پڑتا تھا جیساکہ مشہور ہے اس واقعہ سے اصلی حالت ہر شخص پر ظاہر ہوگئی۔

برطانیہ کو اپنی طرف سے اب نہ یہ خواہش رہی تھی نہ اس میں یہ طاقت تھی کہ ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف اپنے قبضہ میں رکھے۔ جنگ کے طویل دباؤ سے بہت زیادہ کمزور ہو جانے پر اور اس کے سمندر پار مطالبات کے بڑھ جانے پر برطانیہ جو کسی زمانہ میں دنیا کو قرض دینے والی قوم تھی اب تقریباً ہر قوم کی مقروض معلوم ہوتی تھی۔ فتح ضرور یقینی ہوگئی تھی مگر یہ دنیا کی سرداری کھو کر حاصل ہوئی تھی۔ وطن میں برطانیہ کے آدمیوں کو اقتصادی تنگ حالی۔ چیزوں کی کمی۔ کھانے پینے میں سختی اور ریشن (RATION) کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور مشرق بعید کی جنگ کے ختم ہونے سے پہلے وہ مخلوط گورنمنٹ جس نے قوم کو فتح دلائی تھی ختم ہو چکی تھی اور لیبر پارٹی (LABOUR PARTY) نے پارلیمنٹ کی بڑی اکثریت کے ساتھ تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ حکومت حاصل کی تھی۔ مسٹر ایٹلی (MR. ATTLEE) نئے وزیر اعظم نے پندرہ یا سولہ سال پیشتر سائمن کمیشن (SIMON COMMISSION) میں اپنی ممبری کے زمانہ سے ہندوستان کے معاملات میں ایک گہری دلچسپی لے رکھی تھی۔ اپنے وطن میں تمدنی اور اقتصادی اصلاح کے پروگرام کے علاوہ لیبر پارٹی (LABOUR PARTY) نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ سمندر پار برطانیہ کی شاہی حکومت کو اُن سب مقامات پر ختم کر دے گی جہاں پر وہ ایسا کرنے کے قابل تھی۔ ہندوستان کے لئے آزادی دلانا لیبر پارٹی کے پروگرام میں برسوں سے ایک خاص جزو رہ چکا تھا۔ جن باتوں میں جنگ کے

زمانہ کی مخلوط گورنمنٹ ناکامیاب ہوگئی تھی اُن میں کامیاب ہونے کا اُسکی جانشین حکومت نے اپنے عہدہ کے ابتدائی سالوں کی زبردست خوش بینی کے جوش میں تہیہ ارادہ کرلیا تھا۔ کابینہ کا ایک مشن (CABINET MISSION) دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ یہ مشن لارڈ پیتھک لارینس (LORD PETHICK LAWRENCE) وزیر ہند اور مسٹر اے وی الیگزنڈر (A. V. ALEXANDER) وزیر دفاع[۵] کی سرکردگی میں تھا۔ اور اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وائسرائے۔ کمانڈر انچیف اور ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے یہ مشورہ کیا جائے کہ ہندوستانیوں کو کس طریقہ پر حکومت منتقل کی جائے۔

وہ سیاسی لیڈر جن پر آخری فیصلہ اور آخری اختیار منحصر تھا تعداد میں چار تھے۔ کانگریس کی طرف سے مہاتما گاندھی۔ مسٹر نہرو اور سردار ٹپیل تھے۔ اور مسلمانوں کی طرف سے مسٹر جناح قائد اعظم تھے۔ ان کے اتفاق یا اختلاف کی وجہ سے جو اقتصادی اور سیاسی واقعات عمل میں لائے جاتے ان پر اس برصغیر کا مستقبل منحصر تھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء اور سنہ ۱۹۴۷ء کے مشہور سالوں میں قائد اعظم کا شاندار اور تاریخ بنانے والا دور زندگی جو ایسے بے وقت ختم ہوگیا۔ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اب اُن کا شمار تاریخ کے آدمیوں میں ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اُن کی یاد غیر فانی ہے۔ ان سب سیاست دانوں میں جن سے مجھے اپنی زندگی میں واقفیت حاصل ہوچکی ہے یعنی کلیمینسو (CLEMENCEAU) لائڈ جارج (LLOYD GEORGE) چرچل (CHURCHILL) کرزن (CURZON) مسولینی (MUSSOLINI) مہاتما گاندھی (MAHATMA GANDHI) صرف جناح (JINNAH) ہی سب سے زیادہ قابل توجہ اور ممتاز تھے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی میری رائے میں کیریکٹر کی مضبوطی کے اعتبار سے اور پیش بینی اور استقلال کے اس عجیب مجموعہ کے اعتبار سے جو سیاسی ہنر ہے ان سے سبقت نہیں لے گیا تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بعض

---

[۵] یہ اب لارڈ الیگزنڈر آف ہلسبورو (LORD ALEXADER OF HILLSBOROUGH) ہیں۔

سیاست دانوں سے زیادہ خوش قسمت تھے مثلاً مسولینی (MUSSOLINI) کی نسبت جو مکمل ناکامیابی اور بے عزتی کی حالت میں تباہ ہو گیا۔ جناح بہت زیادہ خوش قسمت تھے۔ مگر کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جناح کی کامیابی سب خوش قسمتی کی وجہ سے تھی اور مسولینی (MUSSOLINI) کی ناکامیابی سب بدقسمتی کی وجہ سے تھی؟ اس میں اچھا اور بُرا فیصلہ کرنے کے جو اجزا شامل ہیں ان کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

میری واقفیت جناح سے برسوں تک رہی یعنی اُس وقت سے جب وہ انگلستان سے بمبئی آئے تاکہ وہاں پر وہ اپنی قانونی پریکٹس قائم کریں اور اُن کی موت تک میں اُن سے واقف تھا۔ مسولینی (MUSSOLINI) سے میری ملاقات صرف ایک مرتبہ ہوئی اور وہ ایک بڑا قابل یاد موقعہ تھا۔ یعنی روم (ROME) میں گھوڑ دوڑ کے میدان کے اندر ایک دن دوپہر بعد ان کی نشست پر یہ ملاقات ہوئی جب کہ انہوں نے پورے تین گھنٹہ تک بہت اچھی انگریزی میں مجھے ایک زور دار لکچر پلایا اور اس میں تعجب کی بات یہ تھی کہ ایسے شخص نے جو عام جلسوں میں "لاؤڈ اسپیکر" کی طرح بہت بلند آواز سے تقریر کیا کرتے تھے۔ اُس دن بہت نرم اور ہلکی آواز میں مجھ سے باتیں کیں اور اس وقت میں انہوں نے گھوڑ دوڑ کی طرف یا اُن آدمیوں کی طرف جو وہاں کھڑے تھے یا گھوڑ دوڑ کے میدان کی طرف ایک مرتبہ بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور مجھے بھی نہ تو گھوڑ دوڑ دیکھنے کا موقعہ دیا اور نہ اس بات کی اجازت دی کہ میں اُن سے بحث کرنے کے لئے اپنی زبان کھولوں۔ اِس کے باوجود میں ان دونوں میں ایک اہم مشابہت محسوس کرتا ہوں۔

ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی جوانی اور اپنے عروج کے زمانہ کے درمیان سیاسی رائے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتا رہا۔ مسولینی (MUSSOLINI) نے یہ سفر اس طرح طے کیا کہ وہ اس سوشلزم (SOCIALISM) سے چل کر جو کمیونزم (COMMUNLSM) کے قریب تھا فیسزم (FASCISM) جاری کرنے تک آ گئے یعنی مارکس (MARX) سے چل کر نیٹشے (NIETZSCHE) اور سورل (SOREL) تک۔

جناح اپنے ابتدائی دور میں سب مسلمان سیاسی لیڈروں کے درمیان ہندوستانی

قومیت کے جو کانگریس کے طرز پر تھی سب سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ ماننے والے اور حمایت کرنے والے تھے۔ اس قومیت کا آخری مقصد یہ تھا کہ ایک متحدہ ہندوستانی حکومت قائم ہو جائے۔ تاہم آخری چھان بین کے بعد یہ وہی شخص تھے جو سب سے پہلے اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ ہندوستان کی سلطنت پاکستان اور بھارت کی دو علاحدہ حکومتوں میں تقسیم ہو گئی۔ جس شخص نے اتنے طویل عرصہ تک ہندوستانی اتحاد کا تحفظ کیا تھا اور اس کے لئے پیروی کی تھی۔ اب وہی شخص تھا جس نے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندوستان کے دو ٹکڑوں میں ہر ممکن تعلق کو کاٹ دیا اور برطانیہ کی سخت مخالفت کے باوجود ہندوستانی فوج کو تقسیم کر دیا۔

گو یہ دونوں یعنی مسولینی (MUSSOLINI) اور جناح بہت سی سطحی خصوصیات میں ایک دوسرے سے مختلف تھے اور سب سے زیادہ اس بات میں مختلف تھے کہ ایک کو کامیابی ہوئی اور دوسرے کو ناکامیابی ہوئی اور یہ دونوں بظاہر بہت سی باتوں میں ایک دوسرے کے خلاف تھے مگر پھر بھی ان دونوں میں مستقل مزاجی کی ایک موثر اور عمر بھر قائم رہنے والی صفت پائی جاتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے سامنے ایک واحد راستہ دکھلانے والی روشنی تھی۔ اس روشنی کی پالیسی خواہ کچھ ہی ہو اس کا سیاسی فلسفہ جو اس کی تہ میں تھا خواہ کچھ ہی ہو۔ مگر جب تک وہ اس کے سر پہ تھا اور اس کو چلا رہا تھا وہ اس کی نظر میں کامیاب تھی اور اخلاقی اعتبار سے حق بجانب تھی۔ ان دونوں میں سے کسی کے اندر اس خصوصیت کو یہ کہکر نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں کہ یہ محض امنگ تھی۔ ہر ایک کے دل میں یہ گہرا اور ناقابل جنبش یقین جما ہوا تھا کہ وہ دوسرے آدمیوں سے بالاتر ہے اور یہ کہ اگر معاملات کی رہبری اس کے ہاتھ میں ہوگی اور سب کاموں میں آخری فیصلہ کا حکم دینا صرف اسی کے متعلق ہوگا تو ہر چیز بالکل ٹھیک رہے گی بلا اس لحاظ کے کہ سیاسی کاموں کے لئے کسی خیالی نظریہ کا ہونا یا نہ ہونا پایا جاتا ہے یا نہیں پایا جاتا ہے۔

یہ یقین خودستائی کا دھوکا نہ تھا۔ نہ اپنی شان کی نمائش تھی نہ سطحی غرور تھا۔

بلکہ اس کی جڑ اس بات کے اندر تھی کہ ہر شخص کو خاص اپنی قابلیت کا مکمل اور قطعی یقین تھا اور اس بات کا قطعی یقین تھا کہ چونکہ اس کو دوسرے آدمیوں کی نسبت زیادہ عقل عطا ہوئی ہے اس لئے یہ اس کی قوم کا فرض تھا بلکہ ساری ہی نوع انسان کا فرض تھا کہ اس کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ دوسروں کے لئے جس طرح وہ مناسب سمجھے کام کرے۔ کیا یہ اُسی قسم کا اعلیٰ اعتماد والا عقیدہ نہ تھا جس نے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی اور ایسے اصلاح کرنے والوں کی جیسے کہ لیوتھر (LUTHER) اور کالون (COLVIN) تھے رہبری کی اور ان کو اپنے درجہ پر قائم رکھا؟ اپنے زمانہ میں ہم نے کم از کم دو اور ایسے آدمی دیکھے ہیں جو اسی قسم کے محرک عقیدہ سے فیضیاب ہوئے ہیں جو قوموں کو ہلا ڈالتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اس مقصد کا جو ایک کے اندر بھلائی کے لئے تھا اور دوسرے کے اندر خطرناک برائی کے لئے تھا، احساس رکھتا تھا جو اُس کی ذات سے باہر تھا۔ ان میں سے ایک تو ہٹلر تھا (HITLER) جس نے اس "نئے دور" کا خواب دیکھا جو جرمنی کا پیدا کیا ہوا تھا اور جو ایک ہزار سال تک قائم رہنے والا تھا۔ اور دوسرا شخص مہاتما گاندھی تھے جو ایسے ہندوستان کا تصور رکھتے تھے جس کی ساری سوسائٹی اقتصادیات اور تمام زندگی چند امن پسند اخلاقی اصول پر منحصر ہوگی۔ ان اصول کا ظاہری وجود مہاتما کے لئے اُس ہر چیز سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا جو ان کے اندر تھی۔ دو عالمگیر جنگوں کے زمانہ میں برطانیہ کے دو لیڈر بھی ایسے آدمی تھے جو ایک لازمی اور دل خوش کن خود اعتمادی کی وجہ سے اپنی جگہ پر قائم رہے مگر یہ دونوں یعنی لائڈ جارج (LLOYD GEORGE) اور چرچل (CHURCHILL) اس کی قدرت نہ رکھتے تھے کہ اُن حدود سے تجاوز کر جائیں جو عملی حکومت چلانے کے لئے بر ... زندگی نے اور برطانیہ کے شہری پارلیمنٹ والے اخلاقی اور مذہبی روایات اور عقائد نے قائم کئے تھے۔

مسولینی (MUSSOLINI) اور جناح دونوں کے خیال میں وہ مخالفت جو کسی دوسرے کی طرف سے ہو۔ اس شخص کی رائے کا معاملہ نہ تھا جس کو سمجھوتہ کے ذریعہ سے یا صلح کی

بات چیت کرنے کے بعد ہموار کرلیا جائے بلکہ وہ اُن کے نزدیک ایک مقابلہ کا دعویٰ تھا جس کو اپنی بالاتر طاقت اور دوبینی کے ذریعہ سے مٹا دینا اور شکست دینا ضروری تھا ان میں سے ہرایک موقعہ پرست آدمی تھا چونکہ اس کی خوداعتمادی اور اس کی ناقابل جنبش قوت ارادی نے اُس کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ ہر نئے کام میں جو وہ شروع کرتا تھا صرف وہ خود ہی صحیح راستہ پر تھا اور وہ تنہا اعلیٰ طریقہ پر ٹھیک اور صحیح تھا ان میں سے کوئی بھی اس کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا کہ دوسروں پر بھروسہ کرے یا اپنے مطلب کو زیادہ واضح طور پر بیان کرے۔

مسولینی (MUSSOLINI) نے مارکسزم (MARXISM) کا طویل راستہ اس وجہ سے طے نہیں کیا کہ اس کو اصولی اعتبار سے کچھ شبہات اور اختلافات تھے بلکہ اس وجہ سے کیا کہ سوشلسٹ (SOCIALIST) سیاستدانوں اور نظریہ پسندوں کی دنیا میں جس کے اندر اس نے جلاوطن ہوکر اپنا شورش والا جوانی کا زمانہ لوزین (LAUSANNE) میں گذارا تھا۔ اصول اور نظریات عملی کامیابی کے راستہ میں، جو اس کے لئے اہمیت رکھتا تھا مستقل رکاوٹیں پیدا کرنے والے ہوتے تھے۔ عملی کامیابی وہ تھی جس میں بنیٹو مسولینی (BENITOMUSSOLINI) لیڈر ہوجاتا تھا۔ جب فیسزم (FASCISM) اٹلی میں پہلی مرتبہ بہ حیثیت ایک سیاسی تحریک کے ظاہر ہوا تو اُس وقت کوئی شخص نہ جانتا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ کوئی شخص اس کے اصول اور اس کے پروگرام کا تعین نہیں کرسکتا تھا چونکہ دراصل اُس کا کوئی اصول اور پروگرام نہیں تھا۔ مسولینی (MUSSOLINI) صرف یہ کہا کرتا تھا کہ "ہم کو ایک پارٹی بنانی چاہیئے اور اس کا نام فیسسٹ (FASCIST) رکھنا چاہیئے" جس کا یہ مطلب تھا کہ وہ سب کچھ تھی اور کچھ بھی نہ تھی۔ اس پارٹی کا واحد اصول اور اس کا خاص فرض یہ تھا کہ وہ اس کام کو کرے جو اس کا لیڈر کرنے کو کہے اور اس کا لیڈر اس بات پر جوشی کے ساتھ اپنے دل میں یقین رکھتا تھا اور اسی طرح ایک طویل عرصہ تک یقین کئے چلا گیا کہ ہر کام جو اُس کی پارٹی کرتی تھی نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوگا چونکہ ہر بات مسولینی کے (MUSSOLINI) دماغ میں آتی تھی اور مسولینی کے ذریعہ سے عمل میں لائی جاتی تھی۔

جناح نے اپنی ساری زندگی میں اسی قسم کی خصوصیت کا اظہار کیا۔ وہ کسی آدمی کو دماغی اعتبار سے۔ اختیارات کے اعتبار سے یا اخلاقی بلندی کے اعتبار سے اپنے سے بالاتر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ مستقل مزاج اور قابل نوجوان بیرسٹر جس نے تمام پیشین گوئی کرنے والے واقعات کے خلاف بغیر کسی اثر اور رسوخ کے اور بغیر موروثی دولت کے۔ چند سالوں کے اندر سب طرف سے گھیرنے والی مخالفت کے باوجود فتح حاصل کی۔ جب سیاسیات کی طرف متوجہ ہوا تو ہندوستانی قومیت کا حامی بن گیا۔ وہ کانگریس میں اس وجہ سے شریک ہوا کہ وہ بھی کانگرسی سیاست دانوں کی طرح یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو برطانیہ کی نوآبادیاتی اور شاہانہ حکومت سے آزاد کرایا جائے۔ اور اس وجہ سے شریک ہوا کہ اس کو یقین تھا کہ اگر اس کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ دیا جائے تو وہ خود اس کام کو کر سکتا تھا۔

مگر کانگریس کے ساتھ شریک ہونے پر جناح کی حالت ایسی تھی جیسے کہ مچھلی کی حالت پانی کے باہر ہوتی ہے۔ اس نے ہندوستان کی آزادی کا سردار اور رہنما بننے کے لئے کام کیا مگر سرداری اور رہنمائی کے متعلق جو اُس کے خیالات تھے وہ کانگریس کے دوسرے لیڈروں کے خیالات سے بہت زیادہ مختلف تھے۔ اس وجہ سے وہ وہاں سے واپس آ گیا اور اُن لوگوں کے ساتھ شامل ہو گیا جن سے اُس کا تعلق قومیت اور مذہب کی بندشوں کی وجہ سے تھا۔ اس زمانہ کی مسلم لیگ کے اندر وہ بہت سے لیڈروں کے درمیان ایک لیڈر برائے نام تھا مگر وہ اپنے عقائد اور اپنی پالیسی کو جاری کرنے کے قابل نہ تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے خیالات کا عام رویہ ان عقائد کے سخت خلاف تھا جو وہ اُس زمانہ میں رکھتا تھا جب وہ کانگریس کے حلقہ میں تھا۔ اس نے کانگریس کے لئے بہت محنت اور طاقت کے ساتھ کام کیا تھا۔ مگر اس کو اپنے نقطہ نظر سے ناکامیابی پر ناکامیابی ہوتی رہی۔ ایک آزاد سوسائٹی میں ایک سیاسی لیڈر کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اُس کے متعلق جو اس کے خیالات تھے وہ ان لوگوں کے خیالات سے مختلف تھے جن کے ساتھ وہ کام کرتا تھا اور ان دونوں قسم کے خیالات کے درمیان بہت

گہری خلیج تھی۔ جو آلے وہ استعمال کرتا تھا وہ ہمیشہ اُس کے ہاتھ میں ٹوٹ جاتے تھے چونکہ یہ بات ناممکن تھی کہ اُس پالیسی کو جو اس کے ذہن میں آتی تھی اس پالیسی کے ساتھ متفق بنایا جائے جوان کمیٹیوں (COMMITTEES) اور کاؤنسلوں (COUNCILS) میں جن کا وہ خود کو ممبر پاتا تھا سمجھوتہ کرکے اور صلح کی بات چیت کرکے زبردستی نکالی جاتی تھی۔ اس کو رکاوٹ پر رکاوٹ ملتی گئی اور اُسکی مایوسی اور بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ اُس کا یہ ارادہ "کہ اب دوبارہ واپسی نہ ہوگی" دراصل کانگریس کی اس اہم میٹنگ میں ہوا جو دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے اندر ہوئی جس میں دونوں نہرو۔ باپ اور بیٹے۔ پورا زور اور اختیار رکھتے تھے۔ وہاں پر جس طرح اس کا مغالطہ دور ہوا اور جو مایوسی اس کو ہوئی اس نے اس یقین کو پیدا کردیا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے مناسب اور منصفانہ برتاؤ پانے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

میں یہاں پر پھر اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ گول میز کانفرنسوں میں جناح نے مسلم وفد کے ممبر کی حیثیت سے بڑی وفاداری اور اعزاز کے ساتھ پورے زمانہ تک برابر حصہ لیا۔ جو کام انہوں نے وہاں کیا اس سے بہرحال ان کا وہ عقیدہ نہیں بدلا تھا جو وہ اپنے مقصد کے لئے اپنے طریقوں کے متعلق رکھتے تھے۔ برطانوی افسروں اور کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ برسوں تک بحث کرنے اور تصفیہ کی گفتگو کرنے کے بعد مسلمانوں کو جو احساس اپنی سیاسی ضرورتوں اور خواہشوں کا تھا وہ زیادہ مضبوط اور ترقی یافتہ ہوگیا تھا نہ اس وجہ سے مسلمانوں نے بہت ٹھیک کیا کہ جناح کی پیروی کی اور ان پر اپنا پورا بھروسہ رکھا۔

اُس زمانہ میں جب کہ تقریبًا دس کروڑ مسلمانوں کی یہ ذہنیت ہوتی جارہی تھی کہ "کوئی سمجھوتہ نہ کرو"۔ جناح یعنی وہ شخص جو "سمجھوتہ" کے لفظ کے معنے نہیں جانتے تھے نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اُن سب کی طرف سے جن کی قیادت کرنا اُن کی قسمت میں لکھا تھا وہاں پر اس لئے موجود تھے کہ اس موقعہ سے فائدہ اُٹھائیں جو زندگی بھر میں بلکہ شاید صدیوں میں صرف ایک ہی مرتبہ آتا ہے۔ اُن کے اندر تمام ہندوستان کے

مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کے عقائد اور جذبات ایسے مکمل طریقہ پر جمع ہوگئے تھے کہ وہ اس طرح پر کسی دوسرے شخص کے اندر نہیں ہو سکتے تھے۔

اسی وجہ سے وہ دلیری کے ساتھ باہر آئے اور یہ کہا کہ "ہم کو ایک مسلم پارٹی کی ضرورت ہے۔ ہم کو ایک متحدہ مسلم تنظیم کی ضرورت ہے جس کا ہر ممبر اپنی قوم۔ اپنا مذہب اور اپنی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہو۔

مگر اس تنظیم کا پروگرام کیا ہوگا۔ کون سی خاص اور مفصل تجاویز وہ اپنے مددگاروں کے سامنے رکھے۔ اس کا حملہ کس وقت شروع کیا جائے اور اس کی کیا شکل ہونی چاہئیے ان باتوں کا کوئی جواب جناح نے نہیں دیا۔ جو کچھ اُن کا مطلب تھا۔ حالانکہ انہوں نے کبھی اس کو عام طور پر ظاہر نہیں کیا۔ وہ یہ تھا کہ یہ سب معاملات اُن کے فیصلہ کے لئے چھوڑ دئے جائیں اور اس زمانہ تک چھوڑ دئے جائیں جب ان کا وقت آجائے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جب وہ خود یہ خیال کریں کہ ان کا وقت آگیا ہے۔

مسلم لیگ جیسی کہ وہ جناح کی قیادت میں ظاہر ہوئی ایسی تنظیم تھی جس کے ممبروں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ اگر ہندوستان کی آزادی اس طرح پر آگئی کہ مسلمانوں کی شخصیت اور اتحاد کے لئے مکمل اور مناسب تحفظ نہیں کیا گیا۔ یا ان اختلافات کا مناسب لحاظ نہیں رکھا گیا جو اسلامی کلچر۔ سوسائٹی مذہب اور تہذیب میں اور اُن کے ہندو مخالفوں میں پائے جاتے ہیں تو وہ فوراً اس کو روکنے کی کوشش کریں گے اور اس میں اپنی جان تک کھو دیں گے۔

جناح ہمیشہ اپنے مسلمان پیروی کرنے والوں کو یہی حکم دیتے تھے کہ "اپنی تنظیم اس طریقہ پر کرو جو میں نے مقرر کر دیا ہے۔ میری پیروی کرو۔ اگر ضرورت پڑے تو اعلیٰ درجہ کے موقعہ پر مرنے کے لئے تیار رہو۔ اور میں تم کو بتا دوں گا جب وہ وقت آجائے گا"

چند دماغ دار آدمی جو اس بات کو برداشت نہ کر سکے کہ جناح پر ایسا مذہب اعتماد کیا جائے اُن سے الگ ہو گئے۔ ان کا جو اعتراض جناح پر تھا وہ صرف اس آواز کا

اعادہ تھا کہ "کیا ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ کہاں اور کب ہوگا؟"

مجھے خود بھی یقین ہے کہ ۱۹۴۶ء تک بھی جناح کے دماغ میں اپنی منزل مقصود کا کوئی صاف اور آخری تصور موجود نہ تھا۔ اور ان کو اس کا احساس نہ تھا کہ بارہ مہینے کے اندر وہ ایک نئی قوم کے بانی ہوجائیں گے اور مسلمانوں کی ایسی بڑی حکومت کے بانی ہوں گے جو دنیا نے صدیوں سے نہیں دیکھی ہے۔ نہ خود جناح نہ کوئی اور شخص اس بات کا تصور کرسکتا تھا کہ تقدیر ایسا شاندار اور ایسا ناقابل یقین موقع اُنکے ہاتھ میں دے رہی تھی جیسا کہ ان کو اس وقت ملا جب برطانوی کابینہ کے مشن سے تصفیہ کی گفتگو اپنے نازک اور فیصلہ کن دوروں سے گذر رہی تھی اور جس نے ان کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن (LORD MOUNTBATTEN) کے آنے پر اپنی بات پہلے پیش کرنے کا حق دیا۔ پاکستان پیدا ہوگیا۔ ایک ایسی نئی قوم پیدا ہوگئی جس کی آبادی دنیا کے سب سے بڑی آبادی رکھنے والے ملکوں میں پانچویں درجہ پر ہے اور جس کے نوے فی صدی آدمی مسلمان ہیں اور یہ سب کچھ اس تنظیم کی وجہ سے ہوا جس کا صرف ایک اصول تھا جو ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ "اپنے لیڈر کی پیروی کرو"۔

جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ جناح نے ٹھیک وقت پر ٹھیک کام کیا۔ اگر مسولینی (MUSSOLINI) بھی اس وقت پر جب اس کو اعلیٰ درجہ کا موقعہ ملا تھا۔ بجائے غلط کے صحیح انتخاب کرتا تو اس کا انجام کتنا مختلف ہوتا۔ مگر اس کے لئے ایک مجرم کا انجام انتظار کر رہا تھا اور اس کی تقدیر میں ذلت اور خواری لکھی ہوئی تھی۔ اس کے برعکس جناح نے اس شخص کی حیثیت سے غیر فانی شہرت حاصل کی جس نے بغیر کسی بری۔ بحری یا ہوائی فوج کے اس اعتماد کی وجہ سے جو اُن کو عمر بھر خاص اپنے اوپر رہا اور جو ایک واحد دلیرانہ فیصلہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دس کروڑ سے زائد آدمیوں کی ایک بڑی سلطنت پیدا کر دی۔

میں جب ۱۹۴۶ء میں ہندوستان پہنچا تو یہ سب بڑے واقعات جاری تھے۔ گو برطانیہ میں بہر حال اس اصول کو اب عام طور پر سب نے تسلیم کر لیا تھا کہ

ہندوستان کو فوراً مکمل آزادی دے دی جائے مگر پھر بھی یہ بڑا سوال باقی تھا کہ کیا ہندوستان متحد رہے گا جس کی برّی۔ بحری اور ہوائی فوج ایک ہو گی یا یہ کہ اس برصغیر کی تقسیم ہونے والی تھی اور وہ تقسیم کتنی مکمل ہونے والی تھی؟ اسوقت یہ ہلکی سی امید بھی پائی جاتی تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یا شخصیتوں کے اعتبار سے قائداعظم اور مہاتما کے درمیان کسی قسم کے سمجھوتہ کا امکان پیدا ہو جائے اس قسم کے سمجھوتہ میں ان سوالات کے جوابات قدرتی طور پر پائے جاتے تھے جن کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔

میرے پرانے اور پیارے دوست ایوان شہزادگان کے صدر۔ نواب بھوپال میرے ساتھ مہاتما گاندھی سے ملنے کے لئے گئے تاکہ کسی سمجھوتہ پر آنے کے امکانات کی چھان بین کی جائے۔ نواب صاحب کو ایک یا دو دوسرے اہم معاملات پر بھی گفتگو کرنی تھی مثلاً آزاد ہندوستان میں حکمران شہزادوں اور ان کی ریاستوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ میرے لئے گفتگو کرنے کو جنوبی افریقہ میں ہندوستان کی جماعت کا سوال درپیش تھا۔ مہاتما سے ہماری طویل گفتگو دو مرتبہ ہوئی (دوسری گفتگو مہاتما کے ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوئی جو انہوں نے کمیونزم (COMMUNISM) کے متعلق استعمال کئے اور جن کو میں دوسرے مقام پر بیان کر چکا ہوں) اور اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ مہاتما اور جناح کے درمیان تصفیہ ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ مہاتما ایک واحد قوم رکھنے والے ہندوستان پر اس وقت بھی پختہ یقین رکھتے تھے۔ اور جناح اس سے زیادہ پختہ طور پر یہ رائے رکھتے تھے کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں میں نے مہاتما کو بتایا کہ برما کو ہندوستان سے الگ کرنے کے اصول کو تسلیم کرنے کے بعد ان کو دراصل یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمانوں کے وہ خطے جو شمال و مغرب اور شمال و مشرق میں ہیں اسی طرح الگ نہ کر دئے جائیں۔ چونکہ یہ صرف برطانیہ کی فتح کا نتیجہ تھا کہ یہ خطے برما کی طرح متحدہ ہندوستان کے حصے ہو گئے تھے۔ اسوجہ سے باقی ہندوستان کے ساتھ ان خطوں کو ملانے کا خیال محض عارضی اور چند روزہ تھا

بہرحال میری ان باتوں کا مہاتما پر کوئی اثر نہ ہوا اور میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔ نواب بھوپال کو میں نے وہیں چھوڑا تاکہ وہ شہزادوں کے معاملہ پر گفتگو کرلیں۔

پونا سے میں نئی دہلی پہنچ گیا۔ وہاں پر میں نے والسرائے لارڈ ویول (WAVELL) اور کمانڈر انچیف سر کلاڈ اوچنلیک (SIR CLAUDE AUCHINLECK) دونوں سے گفتگو کی۔ دونوں کو اس بات کے انصاف اور اس کی ضرورت کا بھی پورا یقین تھا کہ ہندوستان کو فوراً آزادی دے دی جائے۔ دونوں کا بہرحال یہ پختہ خیال تھا کہ ہندوستان کا اتحاد باقی رہے۔ یہ بلاشبہ اس وجہ سے تھا کہ فوجی دا ست آخر کار ان کے لئے سیاسی واقعات سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۶ء کا بڑا فوجی واقعہ یہ تھا کہ اس بڑے رقبہ میں جو خلیج فارس سے لے کر جاوا (JAVA) اور سماٹرا (SUMATRA) تک پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان کی حفاظتی فوجیں اور سب سے زیادہ خاص "ہندوستان کی فوج" موجود تھی۔ ایسا اتفاق ہوا کہ دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر لارڈ ویول (WAVELL) اور جنرل اوچنلیک (AUCHINLECK) دونوں نے بہ حیثیت کمانڈر انچیف کے ایک دوسرے کے بعد بلکہ دراصل ایک دوسرے کی جگہ بڑا حصہ اس کام میں لیا تھا کہ ہندوستان کی بری فوج۔ ہندوستان کی شاہی بحری فوج اور ہندوستان کی ہوائی فوج کو اس طرح تیار کریں کہ وہ بہت شاندار اور طاقتور ہو جائے۔ ان اعلیٰ طور پر سدھائی ہوئی اور نہایت اچھا سامان رکھنے والی فوج کا مسلسل اور متحدہ وجود برطانیہ کے لئے اور کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) کے لئے۔ مغربی اتحادیوں کے لئے اور اقوام متحدہ کے لئے جو قیمت اور اہمیت رکھتا تھا اس سے وہ دونوں خاص طور پر واقف تھے۔ ان کو ان خطروں کا بھی اندازہ تھا جو اس وقت پیدا ہوں گے جب ہندوستانی فوج کی تقسیم کر دی جائے گی۔ اس تقسیم سے صرف یہی نہ ہوگا کہ ان بعد میں پیدا ہونے والی حکومتوں کی دو فوجیں ایک دوسرے کو اپنے ملک کی سرحد پر بہت رقابت اور شبہ کی نگاہ سے دیکھیں بلکہ یہ بھی ہوگا کہ دنیا کی زمین کے ایک بڑے اور اہم حصہ میں ایک خطرناک خلا پیدا ہو جائے گا جس کی

اہمیت فوجی اعتبار سے بہت زیادہ ہوگی۔ اس وجہ سے ان دونوں نے کوشش کی کہ کوئی ایسا حل نکالیں جس سے ہندوستانی فوج کا اتحاد بغیر اس کو کمزور کئے باقی رہے یہ واقعہ کہ ان دونوں کو ناکامیابی ہوئی اور اُن سب لوگوں کو ناکامیابی ہوئی جنہوں نے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کوشش کی۔ مسلمانوں کے اس ارادہ کی وسعت اور پختگی کا ثبوت ہے جو انہوں نے ہر دلیل کے خلاف خواہ وہ کتنی ہی زوردار ہو اور ہر رکاوٹ کے خلاف خواہ وہ کتنی ہی سخت ہو اس بات کے لئے کر رکھا تھا کہ اپنے جائز حقوق اور مکمل سیاسی۔ مذہبی اور کلچر والی آزادی اور خود مختاری ضرور حاصل کر کے رہیں گے۔

جب میری ڈائمنڈ جوبلی کی رسوم ختم ہوگئیں تو میں یورپ واپس چلا گیا جسمانی اعتبار سے بہر حال میں اس وقت کمزور ہو رہا تھا۔ میری تندرستی بری طرح گر گئی تھی اور اس نے مجھے مہینوں تک کام کرنے کے لائق نہیں رکھا۔ پیرس (PARIS) میں پروفیسر فرانکوا ای ڈی گارڈ دی ایلنس نے (PRFESSoR FRANCOIS DE GAUDRAD D ALLAINES) جو کامیاب آپریشن (OPERATION) کیا تھا اس نے مجھ کو کم از کم ایک بڑے فکر کی بات سے نجات دلا دی تھی۔ مگر اس کے بعد بہت سے مہینے گذر جانے پر میں اس قابل ہوا کہ صرف جزوی طریقہ پر اپنے معمولی کاموں کو پھر انجام دے سکوں۔

اس اثنا میں ۱۹۴۷ء ہندوستان کی قسمت کے فیصلہ کا سال تھا۔ برطانوی کابینہ کے مشن (BRITISH CABINET MISSION) نے وہ تجویز پیش کی جو برطانیہ کی طرف سے ایک متفقہ ہندوستان کے لئے برطانیہ کی آخری چیز اور آخری تجویز ثابت ہوئی۔ وہ بہت ذہانت اور ہوشیاری کے ساتھ پیش کی ہوئی چیز تھی اور اگر ہندوستان میں اتفاق اور اتحاد کسی صورت میں ممکن ہو جاتا تو وہ چیز بہت مفید اور کارآمد تھی وہ ایک تین حلقوں والا دستور تھا جس میں ملک کے اُن تین بڑے حصوں میں جن میں برطانوی ہندوستان کو تقسیم کیا جاتا۔ خود مختاری کا سب سے زیادہ اونچا درجہ جو ممکن

ہوسکتا تھا شامل کیا گیا تھا۔ یعنی شمال و مغرب اور شمال و مشرق کے اُن رقبوں میں جن میں مسلم[۵] آبادی کی اکثریت تھی اور اس میں مرکز کے لئے بے انتہا محدود طریقہ پر صرف ضروری اختیارات جمع کئے گئے تھے جن میں امور خارجہ۔ فوج اور آمد و رفت کے بڑے وسائل شامل تھے۔

جناح نے دیکھا کہ اب موقعہ آگیا تھا اور انہوں نے بہت استقلال اور احتیاط کے ساتھ اس کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ انہوں نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ ہم کو برطانیہ کی اسکیم غیر مشروط طریقہ پر منظور ہے۔ اس ایک فیصلہ کے اندر جس میں اُن کی دور بینی۔ ہوشیاری اور بے مثل سیاسی اہلیت شامل تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے میرے اس دعوے کو صحیح ثابت کر دیا کہ وہ ان سیاست دانوں میں جن سے میری واقفیت تھی سب سے زیادہ قابل توجہ اور ممتاز سیاست دان تھے۔ یہ واقعہ ان کو بسمارک (BISMACK) کے درجہ پر لے آتا ہے۔

اِس نازک اور فیصلہ کن موقعہ پر جب جناح ایک چٹان کی طرح مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم تھے۔ کانگریس کے لیڈر مذبذب اور ڈھیلے ہو رہے تھے ایسی حماقت کے ساتھ جس کا یقین نہیں کیا جا سکتا انہوں نے برطانیہ کی تجاویز کو نامنظور کر دیا۔ یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ انہوں نے ان تجاویز کی بجائے مشکوک اور مشتبہ تجویزیں جو اُن کا معمول تھیں پیش کیں جنہوں نے اس اسکیم کو الیسا مرطوب اور بیکار بنا دیا کہ آگے چل کر اس کا تمام مقصد اور اثر ضائع ہو جاتا۔

اس وقت برطانیہ میں بہر حال جیسا کہ چند مرتبہ اعلیٰ موقعوں پر اس کی تاریخ میں پہلے ہو چکا ہے۔ بہترین قسم کی سیاست دانی پائی جاتی تھی جو جناح کی سیاست دانی سے متفق تھی۔ مسٹر ایٹلی (MR. ATTLEE) شروع ہی سے ہندوستان کے مسائل کا حل حاصل کرنے کی کوششوں میں بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اب اُس دلیری کے ساتھ جو تقریباً جناح کی دلیری کے برابر تھی انہوں نے وہ بنیادی اصول تسلیم کئے جن کے لئے مسلمانوں نے اتنے طویل عرصہ تک کوشش کی تھی۔ دونوں

---

۵ انگریزی کتاب میں غلطی سے "مسلم" کی جگہ "ہندو" چھپ گیا ہے۔

ہندوستانوں کے درمیان جو عرصہ سے بھولا ہوا مگر اہم اور بنیادی فرق تھا وہ اب تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس پر تیزی سے اور پختگی کے ساتھ عمل کیا گیا تھا. یہ بات طے کر لی گئی تھی کہ ہندوستان کو تقسیم کر دینا چاہیئے۔ قلم کی ایک تیز جنبش ہوئی اور دو مختلف مگر بڑی قومیں پیدا ہو گئیں۔ لارڈ ویول (LORD WAVELL) جنہوں نے اس معاملہ کی سب تکلیف برداشت کی تھی استعفٰے دے چکے تھے۔ ان کی جگہ وہ شاندار نوجوان۔ طاقتور۔ اور بہت اعلیٰ طریقہ سے اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے لارڈ ماؤنٹ بیٹن آف برما (LORD MOUNTBATTEN OF BURMA) مقرر کئے گئے اور ان کو یہ واضح ہدایت دی گئی کہ بے انتہا محدود وقت کے اندر ہندوستان میں برطانوی حکومت اور ذمہ داری کا خاتمہ عمل میں لائیں اور سب اختیارات پاکستان اور بھارت کی دو قائم مقام حکومتوں کو منتقل کر دیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن (LORD MOUNTBATTEN) نے خود حکومت چھوڑنے اور اس کے منتقل کرنے کے زمانہ کو مختصر کر دیا۔ حکومت کی آخری اور مکمل منتقلی کے لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ نئی دہلی اور شملہ میں ہر سینئر عہدہ دار کی میز پر اُن آخری چند مہینوں میں جنتری رکھی رہتی تھی جس میں اس اہم اور فیصلہ کن دن پر تنبیہ کے لئے نشان لگا رہتا تھا۔ اور اسی دن حکومت منتقل کر دی گئی۔ دونوں نئی قوموں نے حکومت کے کام سنبھال لئے اور کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) کے آزاد اور خود مختار ممبروں کی حیثیت سے دونوں حکومتیں قائم ہو گئیں۔

دردِ زہ کی تکلیفیں جو اس زبردست واقعہ کے ساتھ آئیں ان میں سے بعض تکلیفیں بہت خطرناک اور دکھ دینے والی تھیں۔ میری یہ خواہش نہیں ہے اور نہ یہ میرا مقصد ہے کہ میں ان تکلیفوں کا حال بیان کروں یا ان مسائل کو بیان کروں جو اُن حالات کا لازمی نتیجہ تھے۔ برطانیہ کی واپسی کے ایک بڑے اور دور رس نتیجہ کے متعلق مجھے ضرور کچھ اظہار خیال کرنا چاہیئے۔ چونکہ یہ انتقالِ حکومت بہت

جلد اور دراصل غیر مشروط طریقہ پر کیا گیا تھا۔ اس لئے اس نے ایک بڑا مسئلہ چھوڑ دیا جو برطانیہ کے لئے۔ بھارت کے لئے اور ایک مختصر حد تک پاکستان کے لئے ایک قسم کا بُرا قرضہ تھا۔ گو یہ تمام برصغیر شمال و مغربی سرحد سے لے کر راس کماری (CAPE COMORIN) تک کسی معمولی چھوٹی سی اٹلس (ATLAS) میں سرخ رنگ کے ساتھ ظاہر کیا جاتا تھا مگر یہ تمام وسیع رقبہ کسی صورت سے دراصل برطانوی نہ تھا۔ اس کے چاروں طرف بہت زیادہ تعداد میں آزاد اور انفرادی ریاستیں تھیں جن پر موروثی حکمران شہزادے حکومت کرتے تھے اور جو رقبہ میں اتنے بڑے ملکوں سے لے کر جیسے کہ کاشمیر۔ حیدرآباد یا ٹراونکور تھے۔ چند مربع میلوں اور صرف ایک قصبہ کے رقبہ تک سلسلہ وار چلی گئی تھیں۔

برطانوی راج کے قائم ہونے پر ان ریاستوں کے تعلقات اس راج کے ساتھ ایک صلح نامہ کے ذریعہ سے طے کر دیئے گئے تھے۔ جس کی رو سے برطانیہ نے بہ حیثیت اعلیٰ حکومت (PARAMOUNT POWER) کے ان ریاستوں کی آزادی اور خود مختار حیثیت کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ ایک مفصل اور نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کیا ہوا شرائط نامہ ان شہزادوں اور برطانوی راج کے درمیان تحریر کیا گیا تھا ملکہ وکٹوریہ کی طویل اور شاندار حکومت کے زمانہ میں اور اس کے بعد اس صدی کے شروع سالوں میں یہ پیچیدہ اور نازک انتظامات اپنی جگہ پر بہت موزونیت رکھتے تھے اب سے ایک صدی پیشتر برطانیہ میں اور اسی طرح ہندوستان میں بھی سوسائٹی کا نظام درجہ بدرجہ پہنچنے والا تھا۔ ہندوستان میں برطانیہ کے تمام قابل حکمرانوں کی یا شہزادوں کا نظام ٹھیک طرح پر برطانیہ کے اونچے درجہ کے رئیسوں سے مطابقت رکھتا تھا۔ اگر برطانیہ میں زمیندار اور خطاب یافتہ حکمران طبقہ نے یہ سیکھا تھا کہ ان کے ذاتی حقوق اور مقبوضات کی وجہ سے ان کو خاص فرائض اور ذمہ داریاں دی گئی تھیں تو اسی قسم کا سبق اور وہ طریق عمل جو اس سے پیدا ہوتا تھا ہندوستان میں ناممکن نہ تھا۔ اس زمانہ میں۔ وہ جمہوریت جو ووٹ دینے کے عام حق کی بنیاد پر

قائم ہوتی ہے اس نے برطانیہ میں ترقی پانا صرف شروع ہی کیا تھا۔ ہندوستان میں ایسی جمہوریت ایک دور کے خواب کی جھلک سی معلوم ہوتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں جو زبردست اخلاقی فضا پھیلی ہوئی تھی اس کے مطابق عوام کی یہی رائے تھی کہ ذمہ داری سنبھالنے کے لئے ان لوگوں سے زیادہ اور کون لوگ موزوں شمار کئے جا سکتے تھے جن کو وراثتاً فائق حقوق اور اختیارات عطا کئے گئے تھے؟ اسی وجہ سے ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں جو آزادی پرستی کا زمانہ تھا اس کے شباب پر برطانوی عہدہ داروں اور حکمرانوں کے تعلقات "شہزادوں کے نظام" کے ساتھ ایک واضح اور خوشگوار بنیاد پر قائم تھے۔ اور ان کے اندر بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو اچھی اور قابل قدر تھیں۔

اب جب کہ وہ تمام فضا جو اپنے آخری سالوں میں غیر معقول اور بے وقعت معلوم ہوتی تھی ختم ہو چکی ہے اور تاریخ کا ایک جزو بن گئی ہے۔ یہ بات بہت خوشگوار اور مفید ہوگی کہ اس فضا کے بعض پہلوؤں کو اور اس کی بعض شخصیتوں کو پھر یاد کیا جائے اپنی جوانی کے زمانہ میں مجھے لازمی طور پر بہت سے حکمران شہزادوں سے ملاقات کرنی پڑی۔ اور ان میں بعض اصحاب اُن لوگوں کے علاوہ جن کے نام اکثر مرتبہ اس کتاب میں آ چکے ہیں میرے عمر بھر کے دوست بن گئے۔

ان میں سب سے زیادہ مشہور بڑودہ کے مہاراجہ گیکوار تھے۔ میں پہلی مرتبہ اُن سے اپنے شروع بچپن کے زمانہ میں ملا تھا جب میرے والد صاحب زندہ تھے اور اپنی جوانی کے زمانہ میں میری ملاقات اُن سے اس وقت ہوا کرتی تھی جب کہ وہ بمبئی آیا کرتے تھے۔ جب میں پورا جوان ہو گیا اور ہم دونوں میں ایسی دوستی ہو گئی جو اُن کی موت تک باقی رہی اور وہ دوستی ان کی ممتاز اور قابل مہارانی تک پہنچ گئی تھی۔ وہ ابھی تک زندہ اور خوش و خرم ہیں۔[۵]

---

[۵] ان دونوں کی صاف اور عمدہ تصویریں جن پر افسانہ کا ایک ہلکا سا پردہ پڑا ہوا ہے۔ لوئی بروم فیلڈ (LOUIS BROMFIELD) کے ناول میں جس کا نام "دی رینس کیم" (THE RAINS CAME) ہے پائی جاتی ہیں۔

مہاراجہ گیکواڑ کے اندر کیریکٹر کی بہت مضبوط آزادی پائی جاتی تھی اور اُن کو اس کا احساس تھا کہ وہ عزت اور شان جو اُن کو وراثتاً ملی تھی اُس پر صرف ان ہی کا ذاتی حق نہ تھا بلکہ وہ اس نسل اور اس قوم کی لازمی خصوصیات تھیں جس سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے لئے ہندوستان ہمیشہ سب سے پہلے آتا تھا۔ اس کے ساتھ ان کی سادہ خودرو اور ہمہ گیر وفاداری ایسی تھی کہ اس کے مقابلہ میں نہ تو خاندان نہ طبقہ اور نہ مذہب ان کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتے تھے۔

پینتالیس سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا جب ۱۹۰۸ء کی گرمیوں میں وہ اور میں دونوں پونا کے اندر سر جارج کلارک (SIRGEORGECLARKE) کے مہمان تھے جو اس زمانہ میں بمبئی کے گورنر تھے۔ ایک روز رات کے وقت جب ہر شخص سو چکا تھا میں اور مہاراجہ بہت دیر تک بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ مجھے اب بھی وہ سب باتیں بہت اچھی طرح پر یاد ہیں جو انہوں نے اس وقت مجھ سے کہیں۔

انہوں نے کہا کہ "ہندوستان میں برطانوی حکومت محض ہندوستانی قوم کی کشاکش سے ختم نہیں ہوگی مگر دنیا کے حالات لازمی طور پر ایسے بنیادی طریقہ پر بدلیں گے کہ اس وقت کوئی چیز اُس حکومت کی مکمل فنا کو نہ روک سکے گی"۔

اس کے بعد انہوں نے ایک عجیب بات کا اضافہ کیا اور کہا کہ "سب سے پہلی چیز جو آپ کو انگریزوں کے جانے کے بعد کرنا پڑے گی یہ ہوگی کہ ان سب نزدی قسم کی ریاستوں کا خاتمہ کردو۔ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ جب تک یہ نام نہاد "نظام شہزادگان" ختم نہیں ہوتا ہے۔ اس وقت تک ہندوستانی قوم ہرگز نہیں بن سکتی۔ اس کا ختم ہونا ہندوستان کے لئے سب سے بہتر چیز ثابت ہوگی جو ہندوستان کو امکانی طور پر کبھی نصیب ہو سکتی ہو۔ جب تک یہ "نظام شہزادگان" باقی رہیگا اس وقت تک ایک ہندوستانی قوم ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اگر لارڈ ڈلہوزی (LORDDALHOUSLE) آدھا ہندوستان اس طرح پر لے لیتے کہ اس میں بہت سی چھوٹی ریاستوں کی خود مختاری یا ملکی حکومت کو ختم کردیتے یا اُس کو کم

کر دیتے تو شاید ایسی کوئی چیز پیدا ہو جاتی جو جرمن سلطنت کے طرز پر ہوتی جس میں مرکز کے اختیارات بہت کم ہوتے اور مقامی عدالتیں اور دارالسلطنت کے بہت سے شہر موجود ہوتے۔ مگر ڈلہوزی (DALHOUSIE) نے اس بات کے امکان کو بالکل ضائع کر دیا کہ یہ چھوٹی ریاستیں کسی زمانہ میں وفاقی دستور کی مفید شخصی حکومتیں بن جائیں۔"

اُن حالات کو دیکھتے ہوئے جو آخر میں واقع ہوئے۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرے وہ قدیم دوست ایسے ہی دوراندیش تھے جیسے کہ وہ خوش بیان تھے؟

شہزادوں میں میرے دوسرے اچھے دوست کپورتھلہ کے بڑے مہاراجہ تھے۔ ان کی مشہور خصوصیت ان کی فراخ دلی تھی۔ ان کی نابالغی کے زمانہ میں اُن کے ایک چچا اُن کے خطابات اور اُن کی جائیداد کے بہت سرگرم اور مخالف دعویدار تھے۔ جب مہاراجہ بالغ ہو گئے اور اپنی وراثت پر پوری طرح مستقل ہو گئے۔ تو انہوں نے اپنے اس خطرناک مخالف سے صلح کر لی اور وہ صلح صرف سطحی اور رسمی نہ تھی بلکہ بے انتہا جوش اور خلوص کے ساتھ کی گئی تھی۔ مہاراجہ اُن کو اکثر اپنے دارالسلطنت پر مدعو کیا کرتے تھے اور اُن کے ساتھ بہت محبت اور احترام کا برتاؤ کرتے تھے۔

مجھے ایک چھوٹا سا خوشگوار واقعہ جو انہوں نے مجھ سے اپنے متعلق بیان کیا اس وقت یاد آتا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں جب وہ بالکل جوان تھے اور پہلی مرتبہ یورپ گئے تھے تو انہوں نے کچھ عرصہ کے لئے روم میں (ROME) قیام کیا۔ ایک دن اٹلی کے بادشاہ امبرٹو (UMBERTO) اُن کے پاس بغیر اطلاع کے آ گئے۔ بادشاہ کا طرزِ عمل اس وقت بہت وحشیانہ۔ بے تکا اور سپاہیوں کا سا تھا۔ جب وہ مہاراجہ کے نشست کے کمرہ میں داخل ہوئے تو بادشاہ نے دیکھا کہ کمرہ کے اندر خوبصورت عورتوں کے بہت سے فوٹو موجود ہیں۔ اس پر سخت لہجہ میں چلا کر پوچھا کہ "یہ عورتیں کون ہیں؟" مہاراجہ نے جواب دیا کہ "جناب عالی۔ یہ سب میری بیویاں ہیں"۔ اس پر

بادشاہ مہاراجہ کی طرف چکر کاٹ کر آئے اور کہنے لگے کہ "میرے پاس بھی اتنی ہی عورتیں ہیں جتنی کہ آپ کے پاس ہیں۔ مگر ہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ میں اُن سب کو ایک جگہ نہیں رکھتا ہوں بلکہ ان کو مختلف مکانات میں رکھتا ہوں اور آپ اپنی سب عورتوں کو اپنے محل میں رکھتے ہیں۔"

سب باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے یعنی اُن کی کلچر کا۔ اُن کے بے عیب مذاق کا۔ اُن کے صائب اور ہموار فیصلہ کا۔ اُن کی زبردست اور رنگین شخصیت کا۔ میرا یہ یقین ہے کہ مہاراجہ کپورتھلہ۔ مہاراجہ بڑودہ کے بعد میرے زمانہ کے سب سے زیادہ سربرآوردہ والی ملک تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں میں وہ سیاسی بصیرت موجود تھی جس کی وجہ سے انہوں نے نظام شہزادگان کے ختم ہونے کے تاریخی اسباب کا اندازہ کر لیا اور اس کو بغیر کسی تلخی یا بددلی کے تسلیم کر لیا۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ یہی بات میرے دو دوسرے دوستوں کے لئے اتنی آسان ہو سکتی تھی حالانکہ وہ دونوں اپنے طریقہ پر بہت قابل تعریف۔ قابل اور ممتاز آدمی تھے۔ یعنی رنجیت سنگھ جی۔ مہاراجہ جام نگر۔ جو بہت شاندار اور محبوب قسم کے کھلاڑی ہیں۔ ہمیشہ کے سب سے بڑے کرکٹ کھیلنے والوں میں سے ہیں۔ بہت اعلیٰ اور فیاض میزبان ہیں۔ مگر ایسے شخص ہیں جن کو اپنے موروثی حقوق و فرائض کا بہت احساس ہے۔ اور دوسرے آدمی بیکانیر کے مہاراجہ ہیں۔ جو راجپوتوں کے راجپوت ہیں۔ جو اپنے آبائی خاندان پر بہت بلند اور تیز قسم کا فخر رکھتے ہیں۔ جن کے لئے نظام شہزادگان کے اختتام کا برداشت کرنا بہت زیادہ سخت اور دشوار ہوتا۔

مگر چند جامع فیصلوں کے ذریعہ سے جو جلد کئے گئے وہ نظام ختم ہو گیا پاکستان نے جس کو فوراً آزادی ملنے کے بعد بے شمار اہم فیصلے کرنے پڑے اس خاص مسئلہ کو جلد اور خوبی کے ساتھ حل کر لیا۔ یہ بھی قائداعظم کا ایک اور کارنامہ تھا۔ انہوں نے فوراً اس بات کا اعلان کر دیا کہ وہ خود اس نئی حکومت کے گورنر جنرل ہوں گے۔ اور وہ اپنی تقریباً ناقابل یقین بصیرت کی صفائی۔ اپنی سیاسی ہنرمندی اور بہترین کام

کے لئے اپنے عملی احساس کی وجہ سے جو بسمارک کا سا احساس تھا (BISMARKIANSENSE) اس قابل ہوگئے کہ خود اپنی تحریک پر ایسا انتظام کریں جو شہزادوں کے لئے نا قابل اطمینان نہ تھا اور جس نے شہزادوں کو پاکستان کے لئے تقویت کا ذریعہ بنا دیا۔

ہندوستان کو یہ کام زیادہ پیچیدہ اور زیادہ مشکل معلوم ہوا۔ حکومت کی برتری (PARAMOUNTCY) ختم ہو چکی تھی وہ صلح نامے جو شہزادوں سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی (EASTINDIACOMPANY) سے اور اس کے بعد برطانوی تاج سے کئے تھے اس بالاتر حکومت (PARAMOUNTPOWER) کے چلے جانے کے بعد بیکار ہوگئے تھے۔ قانون کے اعتبار سے وہ ریاستیں فوراً خود مختار اور آزاد ملکوں کی طرح پھر ہوگئی تھیں۔ مگر یہ ریاستیں ہندوستان کی وسیع نئی قوم کے سمندر میں جو ان کے چاروں طرف تھا جزیروں کے مانند واقع تھیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن (LORD MOUNTBATTEN) نے جو ہندوستان کی عارضی حکومت کی درخواست پر مختصر عبوری دور کے زمانہ میں پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے رہ گئے تھے۔ اس مسئلہ کا حل پیدا کرنے کی بہت کوشش کی اور اس کے لئے اپنی تمام ہوشیاری اور زور ڈالنے کی قوت خرچ کردی۔ سردار پٹیل (SARDARPATEL) جو ریاستوں کے محکمے کے وزیر تھے اس بات کا پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ اس مسئلہ کا حل نئے ہندوستان کے لئے قابل اطمینان ہونا چاہیے۔

شہزادوں کو جس نازک حالت کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ بغیر اپنی غمگینی کے نہ تھے مگر وہ ایسی تھی کہ اس کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ ان میں سے بہت کم شہزادے ایسے تھے جنہوں نے بری طرح یا ظلم کے ساتھ حکومت کی تھی۔ اُن کی ریاستوں میں ٹیکس عام طور پر اُس شرح سے زیادہ تھا جو اُن کے آس پاس والے برطانوی ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی اُن کی رعایا کو کم خرچہ پر بہت سے وہ فائدے حاصل ہو جاتے تھے جن کے لئے برطانوی ہندوستان کے ٹیکس دینے والے حکومت کو مال گذاری ادا کرتے تھے۔ ان شہزادوں کی بڑی اکثریت قابل محبت۔

ایماندار۔ نیک نیت اور شریف تھی مگر ان میں سے بہت کم ایسے تھے جن کو موجودہ دنیا کے سخت اور پیچیدہ مسائل کا مقابلہ کرنے کی تعلیم جدید طرز پر دی گئی تھی۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے رئیسانہ طبیعت رکھنے والے آدمی تھے۔ جو اکثر اچھا مطلب رکھتی تھی۔ مگر دماغی اور روحانی اعتبار سے وہ اس کے لئے موزوں نہ تھے کہ بہت جلد بیل گاڑی کی حالت سے گذر کر گیس والے ہوائی جہاز کی طرف آجائیں جو ہمارا زمانہ کہلاتا ہے اور وہ اپنی قابل قدر خصوصیات کی وجہ سے اتنے زیادہ تباہ ہوئے جتنا کہ وہ اپنی پابندیوں کی وجہ سے ہوئے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ بالاتر حکومت کے طویل عرصہ نے ان کو سیاسی اعتبار سے غیر ذمہ دار بنا دیا تھا وہ اپنی حکومت اور اپنے حکمران خاندان کو قائم رکھنے کے لئے خود اپنے اچھے برتاؤ اور اپنے اچھے انتظام پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی پشت پر ہمیشہ برطانیہ کی بالاتر حکومت کھڑی رہتی تھی۔ اگر کسی ریاست کے انتظام میں خرابی اور فضول خرچی پائی جاتی تھی تو اس کے لئے سب سے زیادہ بری بات صرف یہ ہوتی تھی کہ چند سال کے لئے وہ کسی سرکاری عہدہ دار کی نگرانی میں رہے جو دہلی سے روانہ کر دیا جاتا تھا۔ ایسی بدنظمی کا نتیجہ بھی جس سے بہت بڑی بدنامی ہوتی تھی صرف یہ ہوتا تھا کہ قصوروار شہزادہ پنشن لے کر اپنا تخت چھوڑ دے اور اس کے بعد فوراً اس کا وارث اس کا جانشین ہو جائے یہ شہزادے اپنے فائق حقوق حاصل کرنے میں بالکل محفوظ تھے مگر پھر بھی چونکہ ان کی قابلیتوں اور ان کی امنگوں کے لئے مناسب راستے نہیں ملتے تھے اسلئے ان میں اس بات کا امکان پایا جاتا تھا کہ وہ اپنی خود اعتمادی کو اور اپنی اس اہلیت کو جو لیڈرشپ کے لئے ضروری ہے کھو بیٹھیں اور اس وجہ سے ان کی رعایا کی نظروں میں اُن کا وقار کم ہوتا چلا گیا۔

جب اُس نازک حالت کا وقت آیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اس بالاتر حکومت کے بغیر رہ گئے تھے اور اس حکومت کی حفاظتی ضمانتیں اور حد بندیاں باقی نہ رہی تھیں تو اُن کیلئے بلکہ اُن میں سے بڑی اکثریت کیلئے اِس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اُن شرائط کو منظور کرلیں جو ہندستان کی حکومت نے

اُن کے سامنے پیش کیں - یہ شرائط مجموعی حیثیت سے غیر فیاضانہ نہ تھیں بشرطیکہ ہر شہزادہ دو اہم کام کر لیتا - ایک یہ کہ ہندوستانی حکومت سے اپنی ریاست کے فوری الحاق کا اختیار دیدے اور دوسرے یہ کہ سیاسی اختیارات منتقل کر دے - ایسا کرنے پر اُن کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اُن کو بہت بڑے اور ٹیکس سے مستثنیٰ وظیفے ملیں گے - وہ اپنی پرائیویٹ دولت - اراضیات اور محلات پر قابض رہیں گے - اور اپنے تمام اعزازات اور شان و شوکت کو برقرار رکھیں گے اس بات کو تقریباً سب شہزادوں نے نیک نیتی کے ساتھ منظور کر لیا - اُنکی ریاستیں نئے ہندوستان کا جزو بن گئیں اور بہت سی ریاستیں جن میں چھوٹی اور بڑی ریاستیں شامل تھیں - ملا کر بڑے نئے صوبے بنا دیئے گئے -

اس کام میں مستثنیات بہت کم تھے مگر وہ بہت تکلیف دہ تھے - اُن میں سے کشمیر کا معاملہ خاص طور پر مشہور اور اہم ہے - اس ریاست میں ایک ہندو شہزادے نے جس کی رعایا کا بہت بڑا حصہ مسلمان تھا بہت جلد بازی کے ساتھ اور ان اصول کے بالکل خلاف جو تقسیم کے وقت متفقہ طور پر طے کر لئے گئے تھے - اپنی ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کر لیا - ٹراونکور (TRAVANCORE) میں مہاراجہ اور اس کے وزیروں نے اپنے قانونی اور دستوری حقوق کی بنا پر مختصر سی مخالفت کی - مگر آخر میں خود اُس ریاست کی رعایا کے دباؤ کی وجہ سے مطیع ہو گئے - حیدر آباد کا معاملہ اس سے بہت کم خوشگوار طریقہ پر طے ہوا - نظام کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کے مشیر اس قابلیت کے آدمی تھے جیسے کہ سر والٹر مونکٹن (SIRWALTERMONCKTON) - بہر حال نظام کے اندر کمزوری اور ہٹ دھرمی ایسے مہلک طریقہ پر جمع ہو گئی تھیں جس نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس تصفیہ کو نا منظور کر دیں جو لارڈ ماونٹ بٹین (LORD MOUNTBATTEN) نے ان شرائط کے مطابق جو سر والٹر (SIRWALTER) نے طے کی تھیں تجویز کیا تھا اور جس سے حیدر آباد کو ایک بیچارگی کی حالت میں سب سے زیادہ فائدہ پہنچنے کا یقین تھا -

اس اڑنے والی حماقت کے نتیجے بہت مصیبت ناک بدقسمتی کے تھے۔ اس پر ہندوستان کی حکومت نے جلدی کیساتھ بہت سخت پولیس کی کارروائی کی جس سے حیدرآباد کی تمام امیدوں اور فائدوں پر بدقسمتی کی مصیبت چھاگئی۔

جوں جوں سال گذرتے جاتے ہیں۔ ہندوستان سے برطانیہ والوں کے چلے جانے کے وہ غیر محدود اثرات جو اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اُن اثرات سے کم نہیں ہیں جو براہ راست سیاسی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ حالت میں ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں اس معاملہ میں برطانیہ کا فیصلہ اور اُس کے مطابق عمل۔ یہ دونوں باتیں موجودہ تاریخ کے سب سے زیادہ اہم واقعات میں سے ایک واقعہ شمار کیا جاتا ہے پاکستان اور بھارت کی ریاستوں کو جو برطانیہ کے جانشین ہو تیں برطانیہ کا اپنی طرف سے اور مکمل طریقہ پر حکومت کا منتقل کر دینا ایسا ہے جس کے مقابلہ میں سرہنری کیمبل بنرمین (SIR HENRY CAMBELL-BANNERMAN) کا وہ فیاضانہ کام بھی جو انہوں نے جنوبی افریقہ کے متعلق کیا بالکل غیر اہم اور معمولی معلوم ہوتا ہے۔ اس معیار پر اس سے پہلے کبھی کوئی چیز واقع نہیں ہوئی مگر یہ سب کچھ برسوں کی ترقی اور کشمکش کی انتہا اور اُن کی تکمیل کا نتیجہ تھا۔

ابھی بہت کچھ کرنے کو باقی ہے۔ خاص طور پر اس کام کے لئے جو پاکستان اور بھارت کے باہمی تعلقات پر اثر ڈالتا ہے۔ تقسیم کے بعد والے سالوں میں یہ تعلقات اکثر ناگزیر طریقہ پر کشیدہ اور مشکل ہو گئے۔ مگر تاہم سخت سے سخت کشیدگی بھی مناسب حدود کے اندر رکھی گئی اور اُن دونوں قوموں میں سے کوئی بھی انتہائی رجوع پر نہیں پہنچی خواہ اس کے جذبات کتنے ہی زیادہ مشتعل کیوں نہ ہو گئے ہوں۔ درگذر کرنا اور اختلافات کو طے کرنا عارضی قسم کی دماغی حالتیں نہیں ہیں بلکہ وہ ایسی خصوصیات ہیں جو مشق کرنے سے حاصل ہوتی ہیں اور ان میں ترقی اور مضبوطی پیدا کی جا سکتی ہے۔

جب تقسیم ہونے والی تھی تو مدراس کے اُن زبردست سیاست دان نے جن کا نام مسٹر سی۔ آر۔ راج گوپال اچاریہ راجہ جی ہے اور جو بعد میں ہندوستان کے

گورنر جنرل رہے ۔ یہ عاقلانہ اور بروقت اعلان کیا کہ "اگر مسلمان فی الواقع جانا چاہتے ہیں تو اُن کو جانے دو اور اُن کی وہ سب چیزیں لے لو جن کے وہ مالک ہیں" یہ وہ ذہنیت ہے جو ان دونوں قوموں کے تعلقات کا پتہ دیتی ہے ۔

یہ بات ناممکن ثابت ہوئی کہ صبر کے ساتھ عارضی اتحاد کو قائم رکھا جائے علیحدہ ہونے پر باہمی مفاہمت اور فراخ دلی کے ترقی پانے کا موقع مل سکتا ہے پہلے تو یہ بہت نازک پودے کی طرح معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی تربیت بہت احتیاط اور عقلمندی کے ساتھ کرنے پر اگر اُن کی جڑیں گہری ہو گئی ہیں تو وہ ضرور پھلیں پھولیں گی ۔ کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) کی ممبری بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک غیر محسوس مگر نہایت اہم رشتہ پیدا کرتی ہے ۔ اس بات کی بہت قوی امید ہے کہ آئندہ چل کر ہمسایوں کی طرح رہنے کا احساس اتنی ترقی کر جائے گا کہ رفتہ رفتہ وقت گذرنے پر دونوں میں ایک دوستی اور اتفاق پیدا ہو جائے گا ۔ امن ۔ مشترکہ خوش حالی اور کروڑوں آدمیوں کے معیار زندگی میں ایک مشترکہ اور مستقل ترقی پوری طرح پر دونوں ملکوں کے فائدہ کی چیزیں ہیں ۔ آخر میں جیسا کہ مجھ کو پختہ یقین ہے ہندوستان کے برصغیر میں تقدیر کی کارفرمائیاں ایسی ثابت ہوں گی کہ ان سے فائدہ ہی پہنچے گا اور ان میں کسی قسم کی خرابی اور برائی نہ ہوگی ہم کو یہ امید رکھنی چاہیئے اور یہ ہی دعا کرنی چاہیئے کہ دونوں ملکوں کے درمیان باہمی احترام اور نیک نیتی کا تعلق ایک وسیع اور اہم علاقہ میں کروڑوں آدمیوں کی خوشگوار اور پُر امن ترقی بہت سے سالوں کے لئے محفوظ اور یقینی بنا دے گا ۔ اس وقت ہم میں سے بہت سے آدمیوں کی کوششیں جس میں مسلمان ۔ ہندو اور برطانیہ کے آدمی شریک ہیں نتیجے میں پورے طور پر حق بجانب ہوں گی ۔ ان کوششوں میں سخت محنت کے بہت سال گذرے

غلط فہمی اور تلخی کے دَور رہے۔ ایسی مشکلات پیش آئیں جن کو اب فراموش کیا جا چکا ہے۔ اور ایسے نازک معاملات پیش آئے جو عرصہ ہوا طے کئے جا چکے ہیں۔

باب نمبر ۱۴

جنگ کے بعد والے سالوں میں دوستوں اور خاندان کے ساتھ

میں نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنی طویل زندگی میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی پژمردہ اور مایوس نہیں ہوا۔ میرے لئے ہر دن اتنا چھوٹا رہا ہے۔ ہر گھنٹہ اتنا تیزی سے گذرنے والا اور ہر منٹ اس زندگی میں جس سے مجھ کو محبت ہے اتنا مصروف رہا ہے کہ میرے نزدیک وقت بہت تیز پروں کے ساتھ اڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو دماغ تندرستی اور بیماری میں ان چیزوں کے ساتھ مصروف رہتا ہے جو اس کے باہر ہیں اور جو اس کی ذات سے متعلق نہیں ہیں وہ سچی خوشی کا دائمی ذریعہ ہے۔ جیساکہ ہم اسلام کے مطابق خیال کرتے ہیں۔ معمولی عبادت میں محبوب کی پرستش انسانی شعور کے ہر گوشہ اور ہر خلا کو پُر کر دیتی ہے۔ روحانی وجدان کے شاذ واعلیٰ لمحات میں "آسمان کا نور" دل و دماغ کی اور تمام روشنیوں کو اندھا کر دیتا ہے اور وہ ہر دوسرے احساس اور ادراک کو مٹا دیتا ہے۔

حال کے سالوں میں دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام کے بعد سے مجھے بہت زیادہ بیماری ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بیماری اپنی نوعیت کے اعتبار سے اور وقت میں طوالت کے اعتبار سے مجھ کو مایوس کرنے کے لئے بہت کافی تھی مجھ پر تین بڑے اندرونی آپریشن ہو چکے ہیں۔ ان میں سے دو تو ایسے تھے جن کے

متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں زندہ رہنے کا امکان صرف پچاس فی صدی ہوتا ہے۔ میں مہینوں تک سخت قلبی تکلیف کی وجہ سے بستر پر لیٹا رہا ہوں۔ مگر پھر بھی میں کبھی مایوس اور پژمردہ نہیں ہوا۔ میں ایمانداری کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ میرا دماغ برابر ان چیزوں میں لگا رہا ہے جو مجھ سے باہر ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسلامی دنیا میں اسماعیلی جماعتوں کی کارگذاریوں میں نئے خیالات اور نئی تجویزوں کے طوفان کے ساتھ بہت بڑا اضافہ ہوگیا ہے اور میں ان کاموں سے بہت نزدیک اور ان میں بہت مصروفیت کے ساتھ شریک رہا ہوں۔ میں نے بہت زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ اپنے اس مطالعہ کے اندر میں نے بہت شوق کے ساتھ دنیا کے اُن نئے حصوں میں سفر کیا ہے جو سائنس کی تحقیقات نے کھول دیئے ہیں۔ جب میں تندرست ہوگیا تو میں نے اپنے پُرانے شوق یعنی گولف (GOLF) کی طرف رجوع کیا۔ گولف (GOLF) نے میرے دوستی اور شناسائی کی ایسی تجدید اور توسیع پیدا کی ہے جو ان تمام سالوں میں میرے لئے بہت مفید اور اہم ثابت ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے اُن گولف کھیلنے والوں (GOLFERS) کا خیال آتا ہے جن کو میں جانتا ہوں۔ مثلاً وہ خوش مزاج گرم دل اور فراخ دست لارڈ کیسل روس (LORDCASTLEROSSE) جن کے ساتھ اُن سالوں میں جو جنگ سے پہلے تھے میں اکثر کھیل چکا ہوں۔ وہ قابل جرنلسٹ (JOURNALIST) تھے۔ پُر مذاق اور بے انتہا پُر لطف گفتگو کرنے والے تھے ہر وقت اور ہر موقعہ پر ایک نعمت والے ساتھی تھے۔ یا میرے نیک اور عقلمند پُرانے دوست جے۔ ایچ ٹیلر (J.H-TAYLOR) جو کبھی کبھی میرے ساتھ سفر بھی کیا کرتے تھے۔ جو اکثر میرے مکان پر میرے مہمان رہا کرتے تھے جن کا میں بہت سے ہفتوں اور مہینوں تک شاگرد رہ چکا ہوں۔ ان کی شخصیت کیسی عجیب ہے۔ ان کا دماغ ایسا ہے جو زندگی کی خوشی اور اس کے متعلق تمام نئی باتوں کے لئے ہمیشہ کھلا ہوا رہتا ہے۔ یہ بات معلوم کر کے بہت خوشی ہوتی ہے

کہ اُن کی تندرستی بہت اچھی ہے اور وہ اپنے وطن ویسٹورڈ ہو (WESTWARD-HO) میں اپنے مکان پر اپنی ریٹائرڈ زندگی (RETIREMENT) جو اُن کے لئے حق بجانب ہے بہت اچھی طرح خوشی کے ساتھ بسر کر رہے ہیں۔ مجھے ہمیشہ اس بات سے اتفاقیہ طور پر خوشی ہوتی رہے گی کہ گولف (GOLF) کے ذریعہ سے میری ملاقات اس کھیل کے پیشہ ور آدمیوں میں سے اکثر ایسے آدمیوں سے ہوئی جیسے کہ جے۔ ایچ۔ ٹیلر (J.H.TAYLOR) جو خاص اور اعلیٰ قابلیت کے تھے اور ہر اعتبار سے اُن سب لوگوں کے لئے جو اُن سے ملتے تھے ایک نمونہ کے آدمی تھے۔

سفر کرنا ایک دوسرا مشغلہ ہے جس کو دوسری عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر میں نے اور میری بیوی نے خاص لطف اور خوشی کے ساتھ پھر شروع کیا ہے یہ اس وجہ سے شاید اور زیادہ پُر شوق ہو گیا ہے کہ اُن تاریک سالوں میں سفر کرنا ہمارے لئے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ہم اپنے مانوس مقامات پر دوبارہ گئے اور اُن میں ہم نے نئی دلکشی اور نئی خوبیاں معلوم کیں۔ ہم نے وہاں ایسی خوشی دیکھی جس کا اب تک پتہ نہ چلا تھا۔ مصر میں ہم نے پھر قاہرہ (CAIRO) کے لطف کا مزہ چکھا جس کے روشن اور صاف آسمان کے نیچے بہت سی تہذیبوں کے نمونے اور بہت قسموں کی دنیا جمع ہو گئی تھیں مثلاً لکسر (LUXOR) اور اس کی قدیم یادگاریں۔ اسوان (ASWAN) اور اس کی ہوا اور روشنی کی خاص خوبیاں۔ اور اسکندریہ (ALEXANDRIA) جو ایسا قدیم اور دلفریب شہر ہے جس کے اندر یونانی (GREEK) اور ٹالمی (PTOLEMAIC) تہذیب کے نمونے ایک بڑے اور پر شور موجودہ زمانہ کے مصری و لاونیتنی (EGYPTO-LEVANTINE) شہر اور بندرگاہ میں اور اس کے آس پاس آ کر مل گئے ہیں۔ ہندوستان میں ہم نے اس وسیع خطہ کے غیر محدود حسن اور عجائبات کو دوبارہ معلوم کیا مثلاً دارجلنگ (DARJEELING) کا بلند پہاڑی مقام اور ہمالیہ کی طرف سے ڈھکی ہوئی وسیع چوٹیوں پر سورج چھپنے اور سورج نکلنے کے وقت اس کی گلابی اور سرخ فضا کی خوبی جو یقین سے

بالاتر ہے۔ اور پھر لاہور کو لیجئے جس کی مسجدوں اور دوسری عمارتوں کو دہلی اور آگرہ کے مقابلہ میں اکثر وہ لوگ بھی عجیب طریقہ پر بھول جاتے ہیں جو مغل اور ہندوعرب کی تاریخ اور فن کے متعلق بہت زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ یورپ میں روم (ROME) کا وہ شاندار شہر اور وینس (VENICE) وہ خوش مذاق اور نمائشی شہر۔ گو ان دونوں شہروں کو میں عرصہ سے جانتا ہوں اور ان کو پسند کرتا ہوں مگر حال میں وہاں پر مجھے روشنی۔ رنگ اور عمارات کے اندر نئے اسرار اور نئی سحر کاریوں کا انکشاف ہوا۔

میں اپنی تمام زندگی میں مسلسل طور پر تھیٹر جانے والا رہا ہوں اور جیسا کہ میں نے ایک سابقہ باب میں ذکر کیا ہے میں گانا والے ڈرامہ (OPERA) کا بہت دلدادگی کے ساتھ شائق رہا ہوں۔ جب کبھی ممکن ہو اور جہاں کہیں میرا قیام ہو میں ضرور ہر اچھے ڈرامہ میں جہاں میں پہنچ سکتا ہوں چلا جاتا ہوں۔ روشنی کی ایک لہر نے میرے لئے جنگ کے ان طویل اور تاریک سالوں کو روشن کر دیا جب میں سوئٹزرلینڈ (SWITZERLAND) کے اندر مقید تھا اور جہاں پر میں بیرونی دنیا کے تقریباً ہر تعلق سے محروم تھا۔ زیورچ (ZURICH) کے میونسپل تھیٹر (MUNCIPALTHEATRE) میں ڈرامہ کے موسموں کا ایک عجیب سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کرسٹن فلیگ اسٹیڈ (KIRSTEN FLAGSTAD) جو عورتوں میں ایسی اعلیٰ قسم کی گویا عورت ہے جیسا کہ میرے نزدیک کیروسو (CARUSO) مردوں میں اعلیٰ قسم کا گویا مرد ہے۔ وہاں پر ہر سال اس لئے آیا کرتی تھی کہ ویگنر (WAGNERIAN) کے طریقہ پر اپنے شاندار کارناموں کو ظاہر کرے۔ اٹلی کے بعض بہترین گانے والے بھی مثلاً گگلی (GIGLI) وغیرہ ہر سال زیورچ (ZURICH) میں آیا کرتے تھے۔ ان قابل یاد موسموں میں ایک تقریباً بے مثل خوشی پائی جاتی تھی یعنی ایک شہر کے اندر قابلیت اور ذہانت کا جمع ہو جانا اور اس خوبی کے احساس کا موجود ہونا جو مستقل تھا اور ایسی فضا کے اندر باقی رہ چکا تھا جو بہت زیادہ وحشیانہ اور

خطرناک تھی اور اس دماغی اور حواس سے تعلق رکھنے والی ضیافت کا ہماری دوسری محرومیوں سے مقابلہ کرنا دبہت دل خوش کن تھا)

میرے پُرانے اور نئے دوست ایسے بھی ہیں جو میرے ساتھ زندگی کے اِس لطف میں اور پژمردگی سے مکمل نجات حاصل کرنے میں شریک رہے۔ مثلاً ذکر کرنے کے لئے ایلسا میکسویل (ELSA MAXWELL) پائی جاتی ہیں جن کے نام سے خوشی کا ایک اُبلتا ہوا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دوستی اور ان کی مہربانی ایسی تھی جس کی میں بہت زیادہ قدر کرتا ہوں اور جس کے لئے میں ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اُن کے اندر سچی فراوانی اور زندہ رہنے میں غیر محدود خوشی پائی جاتی ہے۔ وہ دوسروں کو دائمی خوشی دیتی ہیں اور چونکہ وہ دوسروں کو خوش رکھتی ہیں اس وجہ سے وہ خود بھی خوش رہتی ہیں۔ ایلسا میکسویل (ELSA MAXWELL) جو بہترین دوستوں میں سے ہیں اور جو اپنے دشمنوں کے لے (اگر انکا کوئی دشمن ہے بھی) سب سے زیادہ معاف کرنے والی ہیں۔ ان سب لوگوں کے لئے ایسا نمونہ پیش کرتی ہیں اور اُن سب کی ہمت افزائی کرتی ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ دوستانہ تعلقات اور باہمی میل جول کو بنی نوع انسان کے لئے خدا کی اچھی نعمتوں میں سے شمار کرنا چاہیئے اور اس کو اسی طرح منظور کرنا چاہیئے اور اُس کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک غمناک مجبوری کا کام ہے۔ جو ضرورت کے وقت جلدی سے کرلیا جائے

دو اور دوست جن کا یہاں پر ذکر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ چونکہ جنگ کے زمانہ سے وہ ہمارے بہت قریب آگئے ہیں۔ میرے قدیم گھوڑوں کو سدھانے والے فرینک بٹرس (FRANK BUTTERS) اور ان کی خوشدل اور دلیر بیوی ہیں۔ جنوبی فرانس میں ہم سے ان کی سالانہ ملاقات ایسی چیز تھی جس کے لئے ہر موسم خزاں میں ہماری یہ عادت ہوگئی تھی کہ ہم اس کا انتظار اس طرح پر کیا کرتے تھے جیسے کہ وہ آئندہ سال کے موسم بہار کی خاص خوشیوں میں سے تھی۔ اس بات کا افسوس ہے کہ فرینک بٹرس (FRANK BUTTERS) کی

صحت اتنی زیادہ خراب ہوگئی ہے کہ باوجودیکہ ہم برابر اپنے سالانہ دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں مگر مسز بٹرس (MRS - BUTTERS) ان کو نامنظور کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ہم ان دونوں کی عدم موجودگی کو بہت محسوس کرتے ہیں مگر اس غمگینی کی وجہ سے ہماری محبت ایسی دو بہترین انسانی ہستیوں سے کم نہیں ہوئی ہے جن سے بہتر ہم کو کسی زمانہ میں نہیں ملیں۔

جنگ کے بعد والے سالوں میں جو ایک نئے۔ اچھے اور مہربان دوست بنائے گئے وہ مسٹر چارلس گرے (CHARLESGREY) ہیں۔ وہ پیرس (PARIS) میں امریکی سفارت خانہ کے ایک رکن ہیں۔ وہ ایک خوشگوار اور کھلے ہوئے مزاج کے آدمی ہیں۔ بہت خوشدل۔ شریف اور ہمیشہ مدد کرنے والے آدمی ہیں۔ وہ فرانس کے اس مقولہ کا مجسمہ ہیں کہ "سب کو سمجھ لینا سب کو معاف کر دینا ہوتا ہے" کوئی شخص خوشی اور غم میں چارلس گرے (CHARLESGREY) سے بہتر ساتھی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ وہ بھی ایسے آدمی ہیں جو اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں کہ دوستی اور سوشل زندگی خدا کی دی ہوئی ہیں اور یہ کہ ہم کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے اور ان کو خوشی اور لطف کے ساتھ نہ کہ مجبوری اور پژمردگی کے ساتھ منظور کرنا چاہیئے۔ ایلسا میکسویل (ELSAMAXWELL) چارلس گرے (CARLESGREY) اور میں۔ ان تینوں کے اندر ایک خصوصیت مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے۔ جس کے متعلق میں خلوص کے ساتھ یقین رکھتا ہوں کہ وہ قابل رشک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگ یہ نہیں جانتے ہیں کہ پژمردگی اور مایوسی کیا چیز ہے۔

کینس کے ۱۹۵۳ء والے فلمی جشن (CANNES-FILMFESTIVAL) میں میری ملاقات مس اولیوا ڈی ہیوی لینڈ (MISSOLIVIADEHAVILLAND) سے ہوئی۔ وہ تھیٹر اور سینما کی ممتاز ایکٹریس ہے۔ وہ ایک ہوشیار اور دلچسپ شخصیت رکھنے والی عورت ہے جب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے طریقہ پر

حق کی تلاش کرنے والی ہے - میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ ان خوش قسمت لوگوں سے ہے جو خدا داد قابلیت رکھتے ہیں اور جو ایک فن کار اور ذاتی قسم کی اپنی خاص زندگی رکھتے ہیں جو بہت مکمل مصروف اور کامیاب ہوتی ہے اور وہ لوگ اس مصروف روزمرہ کی زندگی میں ہماری آجکل کی دنیا کے بنیادی معاملہ اور اہم مسئلہ کا بہت تیز اور مسلسل احساس رکھتے ہیں اور اُس غیر معمولی طاقت کا احساس رکھتے ہیں جو انسان نے قدرتی اشیاء کے اوپر حاصل کی ہے گو اس کے مقابلہ میں انسان کی جذباتی اور روحانی زندگی کی قدیم حدبندیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

میرے دوسرے نئے دوست مسٹر چارلس چیپلن (MR-CHARLESCHAPLIN) ہیں۔ میری واقفیت ان سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ وہ ہمارے زمانہ کے چند واقعی بڑے اور موجد فن کاروں میں سے ہیں - وہ بھی اپنے طرز پر حق کے متلاشی ہیں اور آجکل کے اختلافات اور تضادات کے درمیان ایک مفاہمت کرنے والی عقلمندی کی تلاش میں ایک زائر کی طرح سفر کر رہے ہیں۔ وہ اور میں دونوں بہت دیر تک اور بہت رات گئے تک اُن خوابوں کے متعلق جو ہمارے دلوں سے بہت قریب ہیں اور اُن پیچیدہ مسئلوں کے متعلق جو ہم کو تکلیف دیتے ہیں اور غمگین کرتے ہیں۔ گفتگو کرتے رہے ہیں۔ یہ بات کہ چیپلن (CHAPLIN) ایک باغی قسم کے آدمی ہیں بغیر کہے ہوئے ثابت ہوتی ہے - وہ اس حماقت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جو اتنی بڑی مادی طاقت کے مجموعوں کے درمیان موجودہ سوسائٹی کی کمزوری اور ناقابلیت میں پائی جاتی ہے -

میں اُس قسم کی باتوں کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جو چیپلن (CHAPLIN) جیسے آدمیوں کے دماغ کو زبردستی بغاوت اور جنون کی طرف لے جاتی ہیں۔ ورلڈ فوڈ اینڈ اگریکلچر آرگنائزیشن (WORLDFOODANDAGRICULTUREORGANIZATION) (یعنی غذا اور کاشتکاری کا عالمگیر ادارہ) کی ایک حالیہ رپورٹ میں یہ بات بلا شک و شبہ بیان کی گئی کہ انسانی ہستیوں کی بڑی اکثریت اب بھی بھوک کی لائن سے بہت نیچے اپنی

زندگی بسر کرتی ہے۔ جس کے نتیجے یہ ہوتے ہیں کہ اُن کی قوت ضائع ہوتی ہے۔ بیماری ہوتی ہے۔ کمانے اور پیدا کرنے کی قوت کم ہوتی ہے اور عمر میں اتنی زیادہ کمی ہو جاتی ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ دنیا کا موجودہ غذا پیدا کرنے کا تناسب اتنا کافی ہے کہ ہر انسانی ہستی کے لئے جو زندہ ہے مکمل طریقہ پر مناسب اور بھرپور کھانا یقینی طور پر فراہم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس غذا کی تقسیم ٹھیک طور پر کی جائے۔ (اور اس بات کو چھوڑ دیجئے کہ زمین کی حفاظت۔ اس کی زرخیزی اور کاشت کے بہتر طریقے استعمال کرنے پر اُن سب ترقیوں کے نتیجے کیا ہوں گے)

اگر اس بڑی رقم کا کچھ حصہ جو ہر سال ساری دنیا میں بالکل بیکار اور نہایت خطرناک طریقہ پر تباہ کرنے والے ہتھیاروں کے لئے استعمال کی جاتی ہے صرف ایک بڑے پیداواری منصوبہ کے لئے خرچ کیا جا سکے۔ مثلاً یوں کہیئے کہ پانی کے جمع کرنے میں بند اور عارضی جھیلیں بنانے میں اور دنیا کے وسیع اور خالی جنگلاتی رقبوں میں آبپاشی کے کام چلانے کے لئے خرچ کیا جا سکے تو ساری زراعتی پیداوار بہت وسعت اور تیزی کے ساتھ بڑھ جائے گی اور اس کی وجہ سے عام زندگی کا معیار بلند ہو جائے گا۔ میں نے اس موضوع کی طرف جس کے متعلق میں بہت زیادہ غور کر چکا ہوں۔ مسٹر چیپلن (CHAPLAIN) کی توجہ منعطف کرائی اور یہ معلوم کیا کہ اس پران کے خیالات بالکل ایسے ہی تھے جیسے کہ میرے خیالات تھے۔

چیپلن (CHAPLIN) کو بُرا کہنے والوں نے بہت زیادہ غیر محتاط الفاظ میں ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ کمیونزم (COMMUNISM) سے ہمدردی رکھتے ہیں میں نے کمیونزم کا ایک پہلو ظاہر کیا جس نے ان کو خوف زدہ کر دیا۔ وہ یہ کہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کمیونسٹ لوگوں کا (COMMUNIST) پروپیگنڈا یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ میں ماسکو (MOSCOW) کی اس رائے کا بڑے زور کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے دونوں اقتصادی اور تمدنی نظام ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ

امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ صرف اقتصادی بلکہ دماغی اور کلچر سے متعلق چیزوں کے باہمی تبادلہ کا نظام قائم رکھ سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی جیسا کہ چیپلن (CHAPLAIN) نے بہت غصہ کے ساتھ بیان کیا کمیونسٹ (COMMUNIST) لوگوں نے ایسا آہنی پردہ (IRONCURTAIN) قائم کر رکھا ہے جو ان دونوں دنیاؤں کے درمیان ایک حقیقی اور آزاد تبادلۂ خیالات کو روکتا ہے۔ وہ تحریر اور دوسرے فنون میں ایک آزاد باہمی لین دین کو بالکل ممنوع قرار دیتا ہے۔ طالب علموں اور سیاحوں کے آزاد اور بے روک ٹوک سفر کو منع کرتا ہے اور تمام معمولی طریقوں کو بند کرتا ہے جن کے ذریعہ سے ایک ملک یا ایک تہذیب کے آدمی دوسرے ملک کے آدمیوں کو جان سکیں اور سمجھ سکیں۔ چیپلن (CHAPLIN) نے کہا کہ صرف ایک طریقہ ہے جس سے ہمارے دونوں نظاموں کا ایک ساتھ قائم رہنا ممکن ہو جائے گا یا جس سے انسان کی تکلیفوں اور پیچیدہ معاملات کا قدرتی اور مناسب حل حاصل ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام سرحدیں سفر کرنے والوں کے لئے کھول دی جائیں۔ پاسپورٹ۔ سکہ جات پر کنٹرول اور دوسری پابندیاں سب سے کم درجہ پر لائی جائیں۔ ادبیات کا آزاد اور مکمل باہمی تبادلہ جو تعلیمی۔ صحافتی اور عام دلچسپی والا بھی ہو اور صنعت و حرفت اور سائنس کے مضامین کے متعلق بھی ہو دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جیسا کہ اس دور اور خوشگوار زمانہ میں تھا جو ۱۹۱۴ء سے پہلے تھا جاری کیا جائے۔

مسٹر چیپلن (CHAPLIN) کو بعض روحانی اور غیر مادی واقعات اور اُن کی مختلف قسموں سے دلچسپی ہے مثلاً کشف یعنی بغیر ظاہری ذرائع کے دور کی باتیں معلوم کرنا (TELEPATHY) انہوں نے مجھ سے آئینسٹائین (EINSTEIN) کے اس مطالبہ کا ذکر کیا کہ "دس سائنس دان ایک ہی وقت میں اور بالکل ایک سے حالات میں اس قسم کے ہر واقعہ کو جو پیش کیا جائے غور سے دیکھیں۔ اس وقت میں ان اظہارات کے متعلق یہ سمجھوں گا کہ وہ ثابت ہو چکے ہیں" اس بات پر

وہ اور میں دونوں متفق ہو گئے کہ اس قسم کے معیار آزمائش کو قائم کرنا اس تمام روحانی تحقیقات اور تجربہ کو ناممکن کر دے گا چونکہ یہ روحانی واقعات اور وہ قانون جس کے ماتحت یہ ظاہر ہوتے ہیں انسانی ہستیوں کے قبضہ میں نہیں ہیں۔ اور ان کے اشارہ اور حکم پر ظاہر نہیں ہوتے ہیں۔

میں اس کو حقیقی فخر اور خوشی کی بات خیال کرتا ہوں کہ میری ملاقات مسٹر چیپلن (CHAPLIN) اور ان کی خوب صورت تہذیب یافتہ نوجوان بیوی سے ہوئی۔ وہ ان کے خیالات کو ان کی دماغی اور روحانی خواہشوں کو اور ان کی تکمیل کو۔ اور اس حقیقی تکلیف کو جو ہمارے زمانہ کے اختلافات ان کو پہنچاتے ہیں۔ خوب سمجھتی ہے اور اُن سے پوری ہمدردی رکھتی ہے۔ خدا نے اپنے فضل سے خود مجھ کو وہ سب سے بڑی خدا کی نعمت عطا فرمائی ہے کہ مجھے ایسی بیوی دی ہے جو میرے دل و دماغ کی خوشیوں اور غموں کو پوری طرح پر سمجھتی ہے اس لئے مجھے اس خوشی کا اندازہ اچھی طرح پر ہو سکتا ہے۔ جو چیپلن (CHAPLIN) کو اپنی اُس خانگی زندگی میں ملتی ہے۔ جو میری زندگی سے بہت مشابہ ہے۔

کچھ عرصہ تک ایک مشہور اور خوبصورت نوجوان سینما کا ستارہ (STAROFTHESCREEN) میرے بیٹے کی بیوی تھی اور وہ میری پوتی کی ماں ہے (اس پوتی کو میں نے اسی وقت دیکھا تھا جب وہ ایک نوزائیدہ بچہ تھی) یعنی مس ریٹا ہیورتھ (MISSRITAHAYWORTH) میرے بیٹے علی کی دوسری بیوی۔

علی کی پہلی شادی مسز لول گینس (MRS. LOELGUINNESS) سے ہوئی۔ وہ ایک نوجوان انگریز عورت تھی۔ جو حسین۔ دلفریب۔ خوش مزاج اور اچھی نسل والی تھی اس کا پیدائشی نام جون یارڈ بلر (JOANYARDEBULLER) تھا اور وہ لارڈ چرسٹن (LORD CHURSTON) کی بیٹی تھی۔ اس شادی کے لئے میں نے اپنی مکمل اور محبت آمیز منظوری دے دی تھی۔ یہ شادی ۱۹۳۶ء میں ہوئی جب علی کی عمر پچیس سال کی تھی۔ میں نے اپنے بیٹے کی بیوی جون (JOAN) کو بہت پسند کیا

اور مجھے اُس سے بہت محبت تھی اور اب بھی ہے۔ اُس نے علی کے لئے دو بہت اچھے بیٹے پیدا کئے جو میرے پوتے ہیں۔ یہ لڑکے آجکل اسکول میں پڑھتے ہیں اور مناسب وقت پر وہ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں چلے جائیں گے۔ ہم کو امید ہے کہ ان میں سے بڑا لڑکا کریم جو ریاضی میں بہت امید افزا ذوق کا اظہار کرتا ہے ایم۔ آئی۔ ٹی (M.I.T) میں چلا جائے گا اور دوسرا لڑکا امین غالباً ہروارڈ کے قانونی مدرسہ (HARVARD LAW SCHOOL) میں جائے گا۔

اُن کی شادی جنگ کے اختتام تک مکمل طور پر خوشگوار رہی۔ وہ دونوں مشرق وسطیٰ میں تھے۔ پہلے مصر میں اور پھر شام میں۔ علی فوج میں کام کرتے تھے اور جون (JOAN) افسروں کی اُن بہت سی بیویوں میں سے ایک بیوی تھی جن کی اُس وقت قاہرہ (CAIRO) میں بھرمار تھی اور جو وہاں پر بے شمار تعداد میں پائی جاتی تھیں۔ جنگ کے بعد وہ دونوں یورپ کو واپس آگئے۔ اور جون (JOAN) نے ایک یا دو سال مشرقی افریقہ میں اپنے بچوں کے ساتھ گذارے۔ بہر حال وہ دونوں الگ ہوگئے اور مجھے اس کا بہت رنج ہوا۔ اُن دونوں میں اختلافات بڑھتے گئے اور وہ دونوں علیحدہ ہوگئے۔

اِس کے کچھ عرصہ بعد علی کچھ تجارتی کام کے لئے امریکہ چلے گئے اور وہاں پر ان کی ملاقات مس ہیورتھ (MISS HAYWORTH) سے ہوئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ دونوں بہت زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ اور ایک سنسنی خیز شہرت کی آگ اُن کے چاروں طرف پھیل گئی جس میں بے شمار گپ بازی اور قیاس آرائی پائی جاتی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے کان (CANNES) میں آئے میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ فی الواقع ایک دوسرے کے دلدادہ تھے اور ان دونوں نے جواب دیا کہ وہ دراصل ایسے ہی تھے۔ پس میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ جتنا جلد ممکن ہو شادی کرلیں۔

جب ان دونوں کی طلاق حاصل کرنے کی کارروائیاں مکمل ہوگئیں تو

ان کی شادی ہوگئی ۔ مگر یہ شادی ایسے حالات میں ہوئی جن میں شہرت کا بڑا شور رہا اور ایسا شور جو ہم نے پہلے کبھی اپنے خاندان میں نہیں دیکھا تھا۔ خود میری پہلی شادی جو ہندوستان میں ہوئی بہت طویل انتظامات کے ساتھ ہوئی تھی مگر اس کی رسوم سادہ اور غیر نمائشی تھیں مگر یہ شادی بہر حال بہت مختلف قسم کی تھی ۔ یہ ایک عجیب بے تکا۔ نیم شاہانہ اور نیم ہولی وڈ والا معاملہ (SEMI-HOLLYWOOD AFFAIR) تھا۔ میں نے اور میری بیوی نے اس شادی کی رسم میں اپنا کام کیا۔ گو ہم نے اُس فضا کو بہت ناپسند کیا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مس ہیورتھ (MISS HAYWORTH) بہت دلکش اور خوبصورت ہے مگر زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پایا تھا کہ مجھے اس بات کا خطرہ ہوا کہ میرے نزدیک وہ دونوں ٹھیک طور پر میل کھانے والا جوڑا بننے کے قابل نہ تھے۔ میرا بیٹا علی بے انتہا گرم دل والا آدمی ہے جو دوسروں کی خاطر و مدارات کرنا پسند کرتا ہے ۔ وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے دوست اس کو چاروں طرف سے گھیرے رہیں اور ان دوستوں کے ساتھ وہ دونوں ہاتھوں سے مہمان نوازی کا برتاؤ کرتا ہے۔ مس ہیورتھ (MISS HAYWORTH) بظاہر ایسی ہستی تھی جو اپنی عادی کو سکون و آرام کا ذریعہ خیال کرتی تھی جسمیں اُس کو اپنے اس کام کی جذباتی محنت و کوفت سے پناہ ملتی تھی جو وہ تھیٹر اور سینما میں کرتی تھی اور جس میں وہ تقریباً اپنے بچپن ہی سے لگی رہی تھی۔ ایسے دو آدمیوں کے لئے جن کی زندگی کے طریقے اس طرح ایک دوسرے کے بالکل خلاف اور برعکس ہوں شادی کا ناکامیاب ہونا لازمی اور ضروری تھا۔

بجائے اس کے کہ مس ہیورتھ (MISS HAYWORTH) اس معاملہ کو صاف دلی کے ساتھ اور علانیہ طور پر طے کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ یا تو علی یا میں اس کی بیٹی کو اس سے الگ کرنے کی کوشش کرینگے

گویا اس بچہ کو دراصل بھگا کر لے جائیں گے۔ اس وجہ سے وہ اس بچہ کو اپنے ساتھ لے کر کچھ غیر معمولی طریقہ پر میرے بیٹے سے الگ ہو کر بھاگ گئی۔

اگر مس ہیورتھ (MISS HAYWORTH) کچھ توجہ کرتی اور کچھ تکلیف گوارا کرتی تو وہ یہ معلوم کر سکتی تھی کہ فی الواقع اسماعیلی مذہبی قوانین کیا ہیں اور وہ قاعدوں کا مجموعہ کیا ہے جو ان معاملات میں میرے تمام مریدوں اور میرے خاندان والوں کے لئے نافذ ہے۔ اس ضابطہ کے مطابق چھوٹے بچوں کی نگرانی خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں قطعی طور پر اُن کی ماں کے سپرد کی جاتی ہے۔ طلاق کے واقعات اور اسباب خواہ کچھ ہی ہوں ان سے اس نگرانی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسوجہ سے جب تک کہ ہم میں مجرمانہ خصوصیات نہ پائی جائیں ہم کو کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہم اس بچہ یاسمین کو اس کی ماں سے لے لیں۔ جب لڑکے سات سال کے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے باپ کی نگرانی میں دیدئے جاتے ہیں۔ مگر لڑکیاں سن بلوغ تک اپنی ماں کی نگرانی میں رہتی ہیں۔ سن بلوغ کے بعد وہ آزاد ہوتی ہیں کہ اپنی زندگی کا جس طرح چاہیں انتخاب کریں۔ اس ضابطہ کے مطابق مس ہیورتھ (MISS HAYWORTH) کے لئے یقینی طور پر کافی تحفظ موجود تھا۔

میرا سوقت انڈیا اور پاکستان میں تھا جب میرے بیٹے کی خانگی زندگی میں وہ تکلیف دہ واقعہ آخری درجہ پر ترقی کر رہا تھا جب میں کان (CANNES) واپس پہنچا اسی دن رات کے وقت مس ہیورتھ (MISS HAYW ORTH) اپنے بچہ کو لے کر پیرس کو (PARIS) بھاگ گئی اور پھر پیرس سے امریکہ واپس چلی گئی۔ اُس نے مجھ کو اتنا موقعہ بھی نہ دیا کہ میں اس بچہ کو دیکھ بھی لوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اب وہ یورپ واپس آگئی ہے مگر وہ اپنے بچہ کو اس کے باپ کے خاندان والوں کو دکھانے کے لئے اپنے ساتھ نہیں لائی ہے۔

جس دن وہ اپنے بچہ کو لے کر رخصت ہو رہی تھی۔ میرے ملازموں میں سے ایک شریر آدمی نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ کیا ہو رہا تھا اور مجھ سے دریافت کیا

کہ اس کے متعلق اس کو کیا کرنا چاہیئے ۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ یہ ہمارا کام نہیں تھا چونکہ مس ہیورتھ (MISS HAYWORTH) کو اس کا پورا حق حاصل تھا کہ وہ اپنے بچہ کو جہاں جی چاہے لے جائے ۔ مگر وہ یقیناً ایسا کر سکتی تھی کہ کان (CANNES) سے پیرس کو روانگی میں کچھ تاخیر کر دے اور مجھے اس بچہ کو دیکھنے کا موقعہ دے ۔

میرے دوستوں اور میرے وکیلوں کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ مجھے اپنی پوتی کے مستقبل کے لئے کسی قسم کے وقف کا انتظام یا اس کے لئے کسی قسم کا بیمہ کر دینا چاہیئے تھا۔ ان کے دلائل گو وہ نیک نیتی کے ساتھ ہیں مگر غلطی پر ہیں ۔ انہوں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ اسلامی قانون کے مطابق مؤنث بچہ کی نگرانی سن بلوغ کے زمانہ تک قطعی طور پر اس کی ماں کے سپرد ہوتی ہے ۔ وہ لوگ اس بات کو بھی بھول گئے کہ اسلامی قانون میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعہ سے کسی بچہ کو اس کا باپ امکانی طور پر ناحق قرار دیدے اور وراثت سے محروم کر دے ۔ اگر میرا بیٹا علی مرنے والا ہو تو اس کو یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنی جائداد میں سے ایک تہائی سے زیادہ حصہ کو اپنے جائز وارثوں کے علاوہ کسی دوسرے کے نام وصیت کر جائے ۔ دو تہائی حصہ لازمی طور پر اس کے وارثوں کو ملے گا جن میں سے ایک وارث اس کی بیٹی یاسمین ہے اور وہ کسی طرح پر اس قاعدہ میں مداخلت نہیں کر سکتا ۔ مسلم قانون اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا ہے کہ کوئی وصیت کرنے والا کسی ایک جائز وارث کو دوسرے جائز وارث کا حق مار کر فائدہ پہنچائے ۔ اس وجہ سے میرے بیٹے علی کا انجام کچھ ہی ہو ۔ وہ بچی یاسمین لازمی طور پر اس جائداد میں سے جو وہ چھوڑتا ہے اپنا مناسب حصہ ضرور حاصل کرے گی ۔ جب تک سرمایہ داری یا ذاتی ملکیت کا کوئی نظام دنیا میں باقی ہے یہ بات خلاف قیاس ہے کہ علی کے پاس مرتے وقت ایک پیسہ بھی نہ ہوگا ۔ اس وجہ سے اس کی بیٹی کے لئے کسی مالی انتظام کے کرنے کی

کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ میں جہیز دینے اور شادی کے انتظامات و معاہدے کرنے کا قاعدہ جاری ہو رہا ہے۔ اس لئے جب وہ بچی اس عمر کی ہو جاتی ہے کہ اس کی شادی کی جائے تو میرا بیٹا یا میں اس کے لئے مناسب جہیز کا انتظام کر دینگے۔ جو اس شخص کی حیثیت کے مطابق ہوگا جس سے وہ شادی کرے گی۔

بالآخر میں اس بات کی امید رکھتا ہوں کہ آئندہ جب کبھی مس ہیورتھ (MISSHAYWORTH) یورپ آتی ہے تو وہ اپنی چھوٹی سی بیٹی کو اپنے ساتھ لے آتی ہے تاکہ اُس کے باپ کے خاندان والے اس کو دیکھ سکیں اور اس سے مل کر اپنا دل خوش کر سکیں۔

باب نمبر ۱۵

وہ آدمی جن سے میں واقف ہو چکا ہوں

وہ آدمی جن سے اپنی زندگی میں میری ملاقات ہو چکی ہے اور جن کو میں جانتا ہوں۔ میری یاد میں ایسی تیزی اور صفائی کے ساتھ قائم ہیں جو اس سے زیادہ ہے جو ان مذہبی اصول کی اشاعت میں پائی جاتی ہے جو میں نے سنے ہیں ۔ اُن نظریات میں پائی جاتی ہے جن کی بحث میں نے سنی ہے ان عملی حکمتوں میں پائی جاتی ہے جن کے متعلق مجھے علم ہے کہ وہ کس طرح بیان کی گئیں اور کس طرح ترک کر دی گئیں۔ خوبصورت اور تہذیب یافتہ عورتوں اور شاندار و مشہور مردوں کی دوستی کا لطف میں نے اٹھایا ہے جو میرے حافظہ کے گوشوں میں میرے لئے ایک ہجوم کی طرح جمع ہو رہے ہیں ۔

وہ سب سے زیادہ خوبصورت عورت جن سے میں اپنی زندگی میں واقف ہوا بلا شبہ لیڈی ڈی ابیرنن (LADY D'ABERNON) تھیں ۔ وہ پہلے لیڈی ہیلن ونسنٹ (LADY HELEN VINCENT) کہلاتی تھیں اور وہ برلن (BERLIN) میں برطانیہ کے بڑے سفیر کی بیوی تھیں۔ اُن کے حُسن کی شان دیکھنے میں بہت تعجب خیز تھی یعنی اُن کے رنگ کی چمک - اُن کے جسم کا کمال - اُن کے اعضاء کا نہایت نفیس ڈھال - اُن کے خط و خال کی بہترین اول درجہ والی خصوصیت اور اُن کے طرز ادا کی دلکشی اور فصاحت میں اُن کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ سے جانتا تھا۔

جب اُن کی عمر ستر سال کی تھی - اُس وقت بھی اُن کا یہ حال تھا کہ جب وہ کسی کمرہ میں آجاتی تھیں تو اس میں خواہ کتنی ہی کشش والی اور خوبصورت نوجوان عورتیں جمع ہوں - مگر پھر بھی ہر شخص کی آنکھ صرف ان کی طرف اُگ جاتی تھی - اُن کا حسن صرف جسمانی ہی نہ تھا بلکہ وہ بالکل پاک اور صاف تھیں - بہت سادہ - بے نفس - خوش مزاج - دلبر اور مہربان واقع ہوئی تھیں - گو لیڈی ڈی ابیرنن (LADY D'BERNON) سب سے زیادہ فوقیت رکھتی تھیں مگر ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی عورتیں تھیں جن کے حسن کو یاد کرنا دل کو خوش کرتا ہے مثلاً لیڈی کرزن (LADY CURZON) جو اب کاؤنٹیس ہنو (COUNTESS HOWE) کہلاتی ہیں میم لٹی لیر (MME, LETELIER) جو سویڈن کی رہنے والی (SWEDISH) ہیں اور جو تقریباً بچپن ہی سے ایک سربرآوردہ سوشل ہستی شمار کی جاتی ہیں - پرنسس کوٹوسود (PRINCESS KUTUSOV) امریکہ والی مسز اسپوٹیسوڈ (MRS. SPOTTISWOODE) جنہوں نے ایڈورڈ کے دور حکومت میں لندن کے اندر شور برپا کر دیا تھا اور جنہوں نے بیرن یوجین ڈی روتھس چائیلڈ (BARON EUGENE DE ROTHSCHILD) سے شادی کی تھی - مگر افسوس ہے کہ وہ اپنی نوجوانی کی عمر میں جب اُن کے لئے اپنے حسن اور اپنی دلکشی پر فخر کرنے کا زمانہ ابھی باقی تھا - انتقال کر گئیں -

میرے شناساؤں میں سب سے زیادہ شاندار گفتگو کرنے والا اوگسٹن برل (AUGUSTINE BIRREL) تھا - مجھے خبر ملی ہے کہ اب وہ ایسے زمانہ میں جو گفتگو کرنے کے فن کو زیادہ تر بھول چکا ہے تقریباً ایک افسانہ والی ہستی بن کر رہ گیا ہے اوسکر وائلڈ (OSCAR WILDE) سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی - چونکہ قبل اس کے کہ میں پہلی مرتبہ یورپ آیا اس کا افسوسناک تنزل اس کو گھیر چکا تھا - یہ تعجب کی بات ہے کہ اس کے قیدخانہ سے چھوٹ جانے کے بعد مجھے اس سے ملاقات کرنے کا ایک موقعہ ملا - اور وہ اس طرح ہوا کہ میری دوست لیڈی رپن (LADY RIPON) ان آدمیوں میں سے تھی جو اس کی بے عزتی کے بعد بھی اس کے

ساتھ وفادار رہے۔ ایک دن ۱۸۹۹ء میں پیرس (PARIS) کے اندر رٹز (RITZ) کے ہال (HALL) میں میری اُن سے مڈبھیڑ ہو گئی اور انہوں نے مجھے دعوت دی کہ میں اُن کے ساتھ اور ایک یا دوسرے مہمانوں کے ساتھ کیفے وائسنس (CAFE VOISINS) کے ایک پرائیویٹ کمرہ میں وائلڈ (WILDE) سے ملاقات کرنے کے لئے کھانا کھاؤں۔ مگر بدقسمتی سے ایسا ہوا کہ ایک اہم مقررہ کام کی وجہ سے جس کا میں پہلے وعدہ کرچکا تھا میں اس دعوت نامہ کو منظور نہ کرسکا۔

میں اپنے دوست والٹر بیری (WALTEBERRY) کا ذکر کرچکا ہوں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کسی سوسائٹی میں خواہ وہ کیسی ہی شاندار اور تہذیب یافتہ ہو اپنا سکہ جما لیتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اثر ڈالتے تھے۔ ایک دوسرے دوست جو اس سے مختلف زمانہ کے تھے اور جو اس سے بہت زیادہ مختلف پس منظر رکھتے تھے۔ ڈاکٹر رجلر شیکٹ (HJALMARSCHACHT) تھے۔ جو جرمنی کے مالی جادوگر تھے اور وہ اس قسم کے آدمی تھے کہ میں نے یہ دیکھا کہ جب کبھی میں ان سے ملا وہ کسی جلسہ کے سب آدمیوں کو اپنا گرویدہ اور مسخر بنا لیتے تھے۔

میں ایسی بہت سی عورتوں کو جانتا ہوں جو اپنی خوبصورتی کے ساتھ بڑی سوشل اہلیت اور گفتگو کرنے کی قابلیت رکھتی تھیں۔ اُن میں سے سب سے زیادہ مشہور مسز ایڈون مونٹیگ (MRS. EDWINMONTAGU) اور لیڈی ڈائنا ڈف کوپر (LADYDIANA DUFF COOPER) تھیں۔ میری دوست لیڈی کنارڈ (LADYCUNARD) بے مثل تھی۔ وہ ایسی مکمل شخصیت رکھتی تھی کہ اس سے بہتر میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ ایک دوسری افسانہ والی ہستی جس سے میں خوب واقف تھا کاؤنٹیس ڈی شیوگنی (COUNTESSEDECHEVIGNY) تھی۔ جس کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ پراوسٹ کی ڈچز ڈی گورمونٹ (PROUST'SDUCHESSEDEGUERMONT) کا اصل نمونہ۔ یا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ خاص اصلی نمونہ تھی۔ اس کے متعلق اس ناول نویس نے جو ایک نہایت اہم اور قابل یاد واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ کسی بڑی پارٹی کے موقعہ پر ہے

جو میرا خیال ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوئی تھی - وہ اس طرح پر تھا کہ اس موقعہ پر وہ بہت رنجیدہ اور منہمک معلوم ہو رہی تھی اور جب اس سے دریافت کیا گیا کہ اس کا کیا حال تھا تو اس نے جواب دیا کہ "چین کے حالات مجھے پریشان کرتے ہیں" مجھے یاد آتا ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ سے پہلے ان قدیم اور بظاہر بے فکری کے دنوں میں میری ملاقات ایک مرتبہ سے زیادہ کاؤنٹس ڈی شیوگنی (COUNTESSE DE CHEVIGNY) سے ہوئی اور میں نے دیکھا کہ کھانے کی میز پر سب شان و شوکت اور خوش دلی کے درمیان اس کے چہرہ پر وہی غمگین اور بار بار پیدا ہونے والے آثار پائے جاتے تھے - اگر میں اس وقت اس سے وجہ دریافت کرتا تو میں تعجب کے ساتھ کہتا ہوں کہ کیا وہ یہ جواب نہ دیتی کہ "جرمنی کے حالات مجھے پریشان کرتے ہیں" یا "اگادر کے حالات مجھے پریشان کرتے ہیں"؟ (ACADIR M'INQUIETE)

تھوڑا عرصہ ہوا کہ سنہ ۱۹۵۳ء کی گرمیوں میں میری ملاقات ایسے آدمی سے ہوئی جو اس زمانہ کے سب سے زیادہ ممتاز اور مشہور آدمیوں میں سے ہیں - یعنی شیخ کویت (SHEIKH OF KUWAIT) وہ ایک خوشگوار - ہوشیار - تہذیب یافتہ اور پرانے شریف آدمی ہیں اور وہ ایک دراصل تعجب خیز افسانہ کا ذاتی مجسمہ ہیں اور وہ افسانہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک دم ایسی حیرت میں ڈالنے والی ترقی کی جس سے ان کے پاس تقریباً بے شمار دولت آگئی - کویت (KUWAIT) میں تیل نکالنے کے چشمے حال ہی میں معلوم کئے گئے ہیں - مگر وہ بے انتہا دولت رکھتے ہیں - شیخ کو ان چشموں سے جو محصول ملتا ہے وہ فی الحال ان کو اور ان کی چھوٹی سی ریاست کو اتنا مالدار بنانے کے لئے کافی ہے کہ ان کی آمدنی پانچ کروڑ پونڈ سالانہ کے برابر ہو جاتی ہے - دولت کا یہ فوری ڈھیر ایسی جگہ پر آگیا ہے جو کل تک ایک چھوٹی سی غریب عرب ریاست تھی اگر وہ برائے نام برطانیہ کے زیر نگرانی تھی - مگر اُس نے ہمیشہ سے اپنی آزادی باقی رکھی اور اس وجہ سے اُس کے حکمران کو سلطان کا خطاب ملنا چاہیئے نہ کہ شیخ کا، بہت سی صدیوں سے اُس کی آبادی برابر مچھلی والوں - زمین کی کاشت کرنے والوں - یا

خانہ بدوش گلہ بانوں کی حیثیت سے اپنے منتقل پیشوں میں لگی رہی ہے صنعت و حرفت کی ضرورتوں نے جس کے ساتھ دوسری چیزوں سے فائدہ اٹھانا اور ملک کی توسیع کرنا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو ایک دم آگھیرا ہے اور اس کی وجہ سے ان کے طرز زندگی اور نقطۂ نظر میں بہت تیز اور مکمل انقلاب پیدا ہوگیا ہے۔

اس لئے یہ خاص طور پر خوش قسمتی کی بات ہے کہ خود شیخ بڑے عقلمند آدمی ہیں جن کے اندر یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ ان میں وہ ناقابل یقین اور صاف نگاہ رکھنے والی سمجھ موجود ہے جو یہ جانتی ہے کہ اس صنعتی اور دستکاری کے انقلاب کا کیا مطلب ہے اور اس کے ساتھ ہی ان میں خاص اپنی ذمہ داریوں کا بہت گہرا احساس موجود ہے۔ مجھے ان کی صحبت میں خاص طور پر خوشی ہوئی چونکہ ان کے اندر میں نے ایک ہم جنس ہستی پائی یعنی ایسی ہستی جس کے دماغ میں عرب اور اسلامی تاریخ و کلچر کا مکمل ذخیرہ موجود تھا اور جس کو عرب دنیا کے اس روحانی اتحاد کا صحیح اندازہ تھا جو اس کے موجودہ تقسیم شدہ حصوں اور مصیبتوں کی تہ میں پایا جاتا ہے۔

میں نے اکثر یہ خیال کیا ہے کہ آجکل کے عرب اور ۱۸۳۰ء کے جرمنی میں ایک عجیب مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ملک میں بہت سے سیاسی حصے دور حصے دور دور رہنے والی اقلیتیں جو بیرونی حکومت کے ماتحت ہیں شخصی حکومتوں اور جمہوریتوں کا ایک مخلوط مجموعہ اور ان سب کے ساتھ ایک مشترک زبان۔ ایک مشترک کلچر اور ایک مشترک مذہب کا زور۔ اور چونکہ وہ مشترک مذہب اسلام ہے۔ اس لئے وہ عیسائی اقلیتوں کو اپنے درمیان رکھنے میں کافی رواداری کرتا ہے اور ان کو عرب روایات۔ عرب کلچر اور عرب منصوبوں میں پورا حصہ لینے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ کون بتا سکتا ہے کہ عرب کی دنیا کس طرح ترقی کرے گی؟ مگر وائنا کی کانگریس (CONGRESS OF VIENNA) کے وقت جرمن تاریخ کے اس تعجب خیز راستہ کے متعلق کون پیشین گوئی کرسکتا تھا جو آئندہ صدی میں اس نے اختیار کیا؟

خود عرب کے جزیرہ نما کا وہ بلند اور مرکزی پلیٹو ز (PLATEAUS) عرب کی دنیا کا

دل ہے۔ اس مقام پر اسلام پیدا ہوا۔ یہاں سے اسلام کی توسیع ہوئی اور اس کی طویل لہر پیغمبر کی وفات کے بعد صدیوں تک باہر کی طرف پھیلتی رہی۔ وہ لہر عرب اور مسلم کلچر کو دنیا کے وسیع رقبوں تک لے گئی۔ ہندوستان تک اور چین تک جنوب مشرقی ایشیا تک قسطنطنیہ (BYZANTIUM) تک اور افریقہ کے نیچے حصہ تک اور یورپ کے اندرونی حصوں تک۔ یہ لہر صرف رونسس ویلس (RONCESVALLES) کے مقام پر آکر رکی۔ آئندہ صدیوں میں عرب ترقی کی ہر بڑی لہر عرب کے اسی بلند مقام سے چلتی رہی ہے۔ کیا یہ ساری روا‌ب ختم ہو چکی ہے؟ بہت کم آدمیوں کو یہ جرأت ہوگی کہ بھروسہ کے ساتھ یہ بات کہیں کہ وہ لہر اب ختم ہوگئی ہے۔ مگر آجکل کے حالات کی موجودگی میں جب دنیا پر سائنس اور صنعت وحرفت کی حکومت ہو رہی ہے۔ عرب کی آئندہ عظمت اور ترقی روحانی اور کلچر کے متعلق ہوگی۔ یہ بات اسلام سے بہت زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ چونکہ اسلام کے معنی ہی دراصل امن و اطمینان کے ہیں۔

عرب میں انقلاب کی بہت بڑی اور تعجب خیز حالتیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ اُن سالوں میں جب ان ملکوں پر سلطنت عثمانیہ کی حکومت کا آخری زوال ہو چکا تھا بہت خطرناک اور زبردست حملوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے بعد ابن سعود نے اس جزیرہ نما کے ایک بڑے حصہ پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ سعودی عرب کی سلطنت ان کی پیدا کی ہوئی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ہز میجسٹی شاہ عبدالعزیز (HIS MAJESTY KING ABDULAZIZ) حال کی صدیوں میں عرب کی سربرآوردہ شخصیتوں میں سے ہیں۔ ابن سعود بیٹوں کی ایک شاندار جماعت کے باپ ہیں جن کی تعداد تقریباً چالیس ہے۔ یہ سب بلند قامت۔ خوبصورت اور مردانگی قوت رکھنے والے آدمی ہیں۔ یہ موجودہ زمانہ میں اُن ڈاڑھی والے بہادر آدمیوں کا بدل ہیں جو الف لیلہ کے صفحات میں اکڑ کر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جن کو دیکھ کر بڑے قومی مرد کانپنے لگتے ہیں اور نوجوان لڑکیاں بیہوش ہو جاتی ہیں۔ مگر اُن کو محض

یہ کہکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ صرف ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کہانی کی کتاب میں ہوا کرتا ہے۔ ابن سعود کے بہت سے بیٹے اُن کی معرکہ آرا خصوصیات کے حامل ہیں۔ خواہ وہ عرب کا چمک دار لباس پہنے ہوئے ہوں یا یورپین کپڑے پہن رہے ہوں وہ کمیٹی کے کمروں میں۔ کانفرنس کے ہال کمروں میں لندن (LONDON) یا واشنگٹن (WASHINGTON) کے تفریحی ہوٹلوں کے کمروں میں ایسے ہی بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ نجد کے مقام پر اپنے باپ کے خیموں میں ہوتے ہیں۔

سعودی عرب کے لئے مغرب کا تجربہ حال ہی میں حاصل ہوا ہے۔ اور اس میں اسی قسم کی ہمہ گیر اور زور ڈالنے والی اہمیت پائی جاتی ہے جیسی کہ کویت (KUWAIT) کے لئے ہے۔ ابن سعود کی سلطنت میں جو تیل کے چشمے ہیں اُن کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ زرخیز ہیں۔ امریکہ والوں کی کوششیں اس کی اقتصادی حالت میں انقلاب پیدا کر رہی ہیں مگر وہ زبردست طاقت جو اس ترقی سے حاصل ہوتی ہے نہایت عقلمندی اور ہوشیاری کے طریقہ پر استعمال کی جا رہی ہے اور اس بات سے پروپیگنڈا کرنے والوں کا یہ لغو بیان بالکل بیکار ہو جاتا ہے کہ عرب کی اقتصادیات پر "شاہی حکومت" کے نتائج بہت نقصان پہنچانے والے ہیں۔ سعودی عرب کے ساتھ امریکہ کا برتاؤ ایسا ہے کہ اس سے ان ملکوں کے درمیان جو "پسماندہ" اور "ترقی یافتہ" کہلاتے ہیں۔ ایک قسم کے نئے اور نہایت موثر تعلقات کا نمونہ پیدا ہوتا ہے۔ وہاں پر انتہائی درجہ کی اقتصادی امداد و اعانت اور قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانا پایا جاتا ہے اور اس میں سیاسی مداخلت بالکل نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر ذاتی تعلقات میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں پر یہ سخت قاعدہ ہے کہ اگر کسی امریکہ والے کے متعلق جو سعودی عرب میں کام کر رہا ہے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ غریب سے غریب عرب کے ساتھ اخلاقی برتاؤ کرنے میں ناکامیاب رہا تو وہ فوراً اپنے وطن کو واپس بھیج دیا جاتا ہے اور اُس کی واپسی کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ اس طرح پر وہاں دونوں قوموں کے درمیان

اور اُن کے افراد کے درمیان اعتماد۔ نیک نیتی اور باہمی احترام کا احساس پیدا ہو رہا ہے جو بذات خود بے انتہا فائدہ کی بات ہے اور ان دوسری قوموں کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہے جو چار نقاطی اسکیم (POINT FOUR SCHEME) یا کولمبو پلین (COLOMBO PLAN) یا کسی دوسرے اسی قسم کے عالمگیر انتظامات سے مطابق اسی طرح ایک دوسرے سے واسطہ پیدا کرتی ہیں۔

جنگ کے اختتام کے بعد سے جب کبھی میری تندرستی کی حالت نے مجھے اجازت دی تو میں نے بہت زیادہ سفر کیا ہے۔ میں نے ان دو نئی اور آزاد قوموں کو دیکھا ہے جو اس ہندوستانی سلطنت کی جگہ آ گئی ہیں جس کو میں اپنے بچپن سے اب تک جانتا تھا۔ میں مصر اور مشرقی افریقہ۔ ایران اور برما جا چکا ہوں۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ختم ہونے سے پہلے ایک عجیب اور غلط رائے جس کا بہت زیادہ پروپیگنڈا کیا گیا تھا یہ تھی کہ ہندوستانیوں میں خود اپنے اوپر حکومت کرنے کی اہلیت نہیں ہے اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ اپنے معاملات کا خود انتظام کریں اور دنیا کی کونسلوں (COUNCILS) میں اپنا پورا حصہ لے سکیں۔ حال کے سالوں نے اس رائے کے صریح جھوٹ کو ثابت کر دیا ہے۔ دونوں ملکوں میں اُن کے سیاست دانوں۔ بڑے عہدیداروں اور بین الاقوامی کارکنوں نے خاص طور پر اپنے ملک کی خدمت کی ہے اور کامن ویلتھ (COMMONWEALTH) اور اقوام متحدہ (UNITED NATIONS) کے کام کے لئے ان کی خدمات بہت زیادہ اور مفید ثابت ہوئی ہیں۔

گو ایک قاتل نے مہاتما گاندھی کو ایسے وقت میں ختم کر دیا جب ان کے ملک کو ان کی بہت زیادہ ضرورت باقی تھی۔ مگر بھارت کی خدمت وفاداری کے ساتھ بہت سے شاندار اور وطن پرست مرد اور عورتوں نے کی ہے خاص طور پر سردار پٹیل نے۔ مسٹر نہرو نے اور ان کی قابل بہن مسز پنڈت نے۔ میرے تعلقات دہلی کی نئی حکومت کے ساتھ بہت گہرے اور پُر خلوص ہیں اور وہاں پر میرا استقبال

بہت مہربانی اور مہماں نوازی کے ساتھ کیا گیا۔ ہم سب کو اس بات کا برابر احساس ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں روز افزوں یقین اور خوبی عمل کے ساتھ ہندوستان نہایت اہم حصہ لیتا ہے اور اس کی کوشش کرتا ہے کہ مغرب اور ترقی پذیر ایشیا کے درمیان سمجھوتہ کا ایک پل ایسے طرز پر تیار کر دے جو دلیرانہ اور معقول دونوں قسم کا ہو۔

شروع ہی سے پاکستان کو اپنے ہمسایہ ملک کی نسبت بہت زیادہ مشکل کام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی اور دوسرے شہروں میں دونوں باتیں موجود تھیں یعنی ایک مضبوط و مستقل انتظام حکومت کی روایات اور اس کو قائم رکھنے کے لئے۔ عملہ۔ عمارات اور ساز و سامان کی سہولتیں۔ مگر پاکستان میں ہر حال ہر چیز اور حقیقت میں ہر چیز بالکل شروع سے تیار کرنی پڑی۔ ٹائپ کی مشینیں۔ قلم۔ کاغذ اور مسلوں کے طبلق موجود نہ تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ ان کو الگ الگ رکھتا تھا۔ ان دونوں میں عام طور پر کوئی بڑا شہر واقع نہ تھا۔ کراچی اور ڈھاکہ کا رقبہ راتوں رات دوگنا اور چوگنا ہو گیا۔ ہر چیز بنیادوں سے لے کر آخر تک تعمیر کرنی پڑی اور انتظام و حکومت کے لئے ہر معمولی سہولت از سر نو قائم کرنی پڑی۔

یہ بڑا کام غیر معمولی ہوشیاری اور استقلال کے ساتھ ہاتھ میں لیا گیا۔ پاکستان شروع ہی سے ایک کام چلاؤ معاملہ تھا۔ قائداعظم کی قابلیت کا ایک جزیہ بھی تھا کہ انہوں نے جس طرح خود پیغمبر اسلام نے کیا تھا اپنے حلقہ میں قابل اور دلدادہ آدمیوں کو کھینچ کر شامل کیا اور پاکستان کی مختصر زندگی کے دوران میں اس کی خدمت سب سے اعلیٰ اخلاقی اور دماغی قابلیت رکھنے والے مرد اور عورتوں نے کی ہے۔ یہ لوگ صرف ان ہی جماعتوں میں سے نہیں آئے جو پہلے سے مسٹر جناح کی پیروی کرنے والے تھے بلکہ ان لوگوں میں سے تھے جو ابتدائی زمانہ میں ان کی پالیسی (POLICY) پر سخت اعتراض کرتے تھے۔ ان کے کارناموں نے ان سب کو اس

کرنے والے لیڈروں کو جھوٹا بنا دیا جو اس نئی حکومت کے لئے سوائے مصیبت اور تباہی کے اور کسی بات کی پیشین گوئی نہ کرتے تھے۔

ان سب سے اول اور سب سے آگے دراصل قائداعظم کی بہن مس فاطمہ جناح تھیں جو برسوں تک ان کی ساتھی۔ دوست اور مددگار رہ چکی تھیں۔ جو لندن اور بمبئی میں ان کے گھر کا انتظام کرتی تھیں اور بعد میں کراچی کے اندر ان کے محل کا اور زیارت کے پہاڑی مقام پر ان کی موسم گرما کی قیام گاہ کا انتظام کرتی تھیں مس جناح کے اندر زیادہ تر اپنے مشہور بھائی کے کیریکٹر کی مضبوطی۔ ان کا اخلاق۔ ان کی آواز۔ ان کی مستقل مزاجی اور ان کی شکل وصورت کی شباہت پائی جاتی ہیں۔ اپنے بھائی کی موت کے بعد وہ اب بھی قومی زندگی میں سر برآوردہ ہیں اور کثیر تعداد میں وفاداری کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے موجود ہیں۔ وہ اپنے بھائی کی خداداد سلطنت کی اخلاقی اور سیاسی آزادی کے لئے ایک جوشیلے اور ہوشیار محافظ کی طرح کام کرتی ہیں۔

غلام محمد۔ موجودہ گورنر جنرل جن کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں اور عزت کرتے ہیں پہلے سے ایک تجارتی آدمی ہیں۔ وہ تاریخ اسلام کے ایک فاضل اور دلدادہ مطالعہ کرنے والے ہیں۔ اسلام کی شاندار ترقی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا تنزل اور اس کے متعلق یہ موجودہ امید رکھنا اور اس کے لئے یہ موقعہ ہونا کہ وہ ققنس کی طرح اپنے جسم کی جلی ہوئی خاک سے پھر پیدا ہوگا۔ ان سب باتوں کا انہوں نے بہت اچھا مطالعہ کیا ہے۔ گول میز کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں میں جو بعد کو ہوئیں میرے ایک سابقہ ممتاز ساتھی اور شریک کار۔ ظفراللہ خان۔ آجکل وزیر خارجہ ہیں۔ وہ بین الاقوامی میدان میں اپنی زبردست ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے تیز فہمی۔ مناظرانہ قابلیت اور وسیع تجربہ استعمال کرتے ہیں۔

اور قائداعظم کے وہ وفادار اور ہوشیار سیاسی مقلد لیاقت علی خان بھی تھے۔ قتل وغارت کا وہ طوفان جو چند سالوں سے مشرق میں زور مار رہا ہے

اس کے ایک اور افسوسناک شکار لیاقت علی خاں بھی ہو گئے۔ اُن کے بعد اُن کی بیوی موجود ہیں جو اپنی دلچسپیوں اور اپنے میدان عمل میں اپنے مضبوط اور محبوب شوہر سے کچھ کم قابل نہیں ہیں اور یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے کم وفادار اور دلدادہ نہیں ہیں۔ مگر لیاقت کو لوگ عرصہ دراز تک یاد کریں گے۔ چونکہ اگر قائداعظم کو کسی ابوبکر یا پیٹر (PETER) کی تلاش ہوتی تو اُن کو لیاقت علی خان سے بہتر کوئی دوسرا آدمی نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اُن کی خصوصیات شاندار یا نمائشی نہ تھیں بلکہ ان کے کیریکٹر کی مضبوطی بہت ٹھوس دیرپا اور بے انتہا وفاداری والی تھی۔ پاکستان کی دوسری سخت آزمائش کے موقعہ پر انہوں نے اپنی قابلیت کو ثابت کر کے دکھا دیا۔ قائداعظم کی وفات جو پاکستان کی بنیاد رکھنے کے بعد اتنی جلد واقع ہوئی۔ خود پیغمبر اسلام کی وفات سے بہت نمایاں طریقہ پر مشابہت رکھتی تھی جن کو ان کی دنیاوی فتوحات کی تکمیل اور کامیابی کے بعد خدائے تعالیٰ نے بہت جلد اپنے جوار رحمت میں لے لیا تھا۔ اسی طرح پر قائداعظم زندہ نہ رہے کہ زیادہ عرصہ تک اُس قومی بچہ کی نشوونما کی نگرانی کریں جس کے وہ باپ بن چکے تھے۔

مگر لیاقت ہر طریقہ پر ایک لائق جانشین ثابت ہوئے۔ تاہم وہ شخص جو قائد کے اتنا قریب رہ چکا تھا خود اتنی جلد مار دیا گیا۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ لیاقت نے اپنی جان خدا کے واسطے دے دی۔ جب اُن کے جسم سے روح نکل رہی تھی تو اُن کے آخری الفاظ یہ تھے (لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ) سوائے خدا کے اور کوئی خدا نہیں ہے اور محمد اس کے رسول ہیں۔

یہ اس شخص کا نقشہ ہے جس کی کامیابی موجودہ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہے۔ مجھے اور دوسرے آدمیوں کا خیال کر کے بھی خوشی ہوتی ہے مثلاً حبیب رحمت اللہ کا۔ جو ایک شاندار باپ کے شاندار بیٹے ہیں۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد لندن میں ہائی کمشنر (HIGH COMMISSIONER) کی حیثیت سے

وہ خاص ذمہ داری کا عہدہ رکھتے تھے۔ مسٹر اصفہانی کا جو اسی نازک زمانہ میں اپنے نئے ملک کی نمائندگی واشنگٹن (WASHINGTON) میں کرتے تھے۔ موجودہ وزیراعظم کا جو پہلے اٹاوہ (OTTAWA) میں ایک نہایت کامیاب ہائی کمشنر (HIGH COMMISSIONER) تھے۔ اور وہ نواب علی چودہری کے پوتے ہیں جو مسلم لیگ کے ابتدائی زمانہ میں میرے ساتھی اور شریک کار رہ چکے تھے۔ امجد علی کا جو بہت سالوں تک میرے اعزازی سکرٹری (HONORARY SECRETARY) رہے اور جنہوں نے نہایت مشکل اور محنت والی جگہ پر بڑی خدمت انجام دی۔ اور دوسرے محمد علی کا۔ جو اقتصادیات اور مالیات میں مشہور تجربہ کار ہیں۔

ان میں سے بہت سے آدمی نسبتاً کم عمر کے ہیں اور ان کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جو تجارتی اور کاروباری روایات رکھتے ہیں اور سیاسی و سرکاری روایات بہت کم رکھتے ہیں۔ اپنے نئے کاموں میں ان کا جوش۔ ان کی اہلیت اور ان کی کامیابی بہت قابل تعریف رہی ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو اس معاملہ میں اُن کی وطن پرستی نے ایک بڑے مقصد کے ساتھ ان کی وابستگی نے اور سب سے زیادہ ان کے مسلم عقیدہ نے اور ان کے اس احساس نے مدد پہنچائی ہے کہ خدا کے سامنے اُن کی ذمہ داری فوری اور مستقل قسم کی ہے۔

جنگ کے بعد میرا برما (BURMA) کا قیام جو میں نے ابھی حال میں کیا میرے لئے خاص طور پر ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ جیسا کہ میں پیشتر بتا چکا ہوں۔ میں نے برما میں بہت سال گذارے اپنے مریدوں کو یہ نصیحت کرنا شروع کیا تھا کہ وہ ہر ممکن طریقہ پر اُن لوگوں کے نقطۂ نظر۔ رسم و رواج۔ خواہشات اور طریق زندگی سے خود کو مطابق بنالیں جن کے درمیان وہ رہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے ہندوستانی اور عربی نام چھوڑ دیں اور برما کے نام رکھنا شروع کردیں۔ وہ برما کا لباس اور برما کی عادتیں اختیار کریں اور اپنے مذہب اور اس کے عملی طریقوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوسکے وہ اُس ملک میں گھل مل جائیں اور اسی ملک سے ساز کریں

جس کو انہوں نے لے پالک اولاد کی طرح اپنا بنالیا ہے۔ اب جب کہ برما کے آدمیوں نے اپنی آزادی پھر حاصل کرلی ہے۔ میری اس نصیحت نے اور اس مکمل اور وفادار طریقہ نے جس کے مطابق میرے مریدوں نے میری نصیحت پر عمل کیا ان کو بہت فائدہ پہنچایا۔ برما میں میرا اور میری بیوی کا استقبال وہاں کے صدر وزیر اعظم اور بہت سی دوسری سر برآوردہ اور مشہور شخصیتوں نے انتہائی مہربانی اور دوستی کے ساتھ کیا۔ برما ایک خوبصورت ملک ہے۔ اس کے آدمیوں میں ایک گہری پارسائی کے ساتھ۔ خوش مزاجی۔ شرافت اور بے انتہا مہمان نوازفیاضی بھی پائی جاتی ہے (دوسرے بہت کم ملکوں میں وزیر اعظم سے یہ التجا کی جاتی ہے کہ وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش نہ ہو اور جیسا کہ وہ چاہتا ہے سائل درویش کا گیروا لباس اور بھیک مانگنے کا پیالہ لے کر نہ بیٹھ جائے۔)

وہ دن خاص طور پر بڑے خوشگوار تھے جو ہم نے برما میں گذارے۔ وہ مہماں نوازی جو ہمارے ساتھ کی گئی شاید اس رات کو اپنے انتہائی درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ جب ہم کو یہ دعوت دی گئی کہ ہم اپنے کمروں پر برما کا وہ کھانا کھائیں جو ہمارے لئے خاص طور پر پریسیڈنٹ (PRESIDENT) کے محل میں تیار کیا گیا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے دو اے۔ ڈی۔ سی (A-D-C) اور چند ملازم اس انتظام کے ساتھ آئے کہ ان کے ساتھ تقریباً تیس قسم کے کھانے تھے۔ برما کے رہنے والے کسی طرح پر صرف ترکاری کھانے والے آدمی نہیں ہیں اور نہ وہ خاص طور پر اپنے کھانے کے معاملہ میں سختی کے ساتھ احتیاط کرنے والے آدمی ہیں۔ اس کھانے کی بہت سی چیزیں نہایت نفیس اور بہت غذائیت دینے والی تھیں۔ جب سب کھانے لگا دئے گئے تو ہم نے ان دونوں اے۔ ڈی۔ سی (A-D-C) سے کہا کہ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔ چند قسم کی چیزیں کھانے کے بعد ہم نے ان سے کہہ دیا کہ اب ہم فارغ ہو چکے۔

ان دونوں اے۔ ڈی۔ سی (A-D-C) دوستانہ طریقہ پر مسکرا کر کہا کہ

ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم یہاں خاص طور پر اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ ہم یہ دیکھتے رہیں کہ آپ ہر قسم کے کھانے کا تجربہ کرتے ہیں۔

اس قسم کی مہماں نوازی ناقابل مخالفت تھی۔ ہم نے پھر کھانا شروع کر دیا اور جتنی ہمت کے ساتھ ہم کر سکتے تھے۔ برابر اسی میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے پڈنگ (PUDDING) بھی کھائے۔ مٹھائیاں بھی کھائیں اور چاشنی میں پڑے ہوئے پھل بھی کھائے۔ میں بہر حال وکٹوریہ کے لندن میں رہ چکا تھا اور اس زمانہ کی طویل نہایت نفیس اور شاندار دعوتوں میں شریک ہو چکا تھا۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں ایسا کھانا نہیں دیکھا جو مختلف نوعیت اور خوش ذائقگی اور مزے داری کے اعتبار سے اس ڈنر (DINNER) کا مقابلہ کر سکے جو ہم کو برما کے پریسیڈنٹ (PRESIDENT) نے اس عنایت کے ساتھ دیا۔

شاہ ایران کی شادی میں شریک ہونے کے لئے میں فروری ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ ایران گیا جو بہت سی صدیوں تک میرے مورثوں کا وطن رہ چکا تھا۔ باوجودیکہ اپنے خاص حالات اور اپنی مصروفیت و منہمک زندگی کے فرائض کی وجہ سے میں اس وقت تک ایران کو نہ جا سکا جب میری عمر ستر سال سے زیادہ ہو گئی۔ مگر میں نے ہمیشہ اپنی ایرانی نسل پر بڑا فخر کیا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ میرے والد صاحب اور میری والدہ صاحبہ دونوں فتح علی شاہ کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں سے تھے۔ اور فتح علی شاہ ترکی نسل کے خالص قاچار تھے۔ وہ نقطۂ نظر لہٰذا گھر کا طرز زندگی جس کے مطابق میری پرورش کی گئی تقریباً پوری طرح ایرانی تھا۔

ان حالات کی وجہ سے میرا ایران کو جانا حقیقت میں اپنے وطن کو آنا تھا۔ شہنشاہ کے ذاتی مہمان ہونے کی حیثیت سے جو عنایت اور مہربانی کا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا گیا اس نے اس خوبصورت محل نے جو ہر امپیریل ہائنیس (HERIMPERIALHIGHNESS) شہزادی شمس نے (PRINCESS SHAMS) نہایت کرم کے ساتھ ہم کو استعمال کرنے کے لئے دے دیا تھا۔ ہماری آمد کو خاص طور پر با وقعت اور پر لطف بنا دیا۔

محلات (MAHHLAT) میں جو عرصہ تک میرے مورثوں کا وطن رہ چکا تھا میرا استقبال تمام ایران کے ہزاروں اسمٰعیلیوں نے کیا۔ یہ بات دیکھ کر بہت اچھا معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی سب عورتوں نے چادر اوڑھنا چھوڑ دیا تھا جو ایران میں ہندوستانی پردہ کی برابر ہے۔ ہم اصفہان کو بھی گئے مگر وہ زیادہ تر پرانی فیشن کا ہے۔ وہاں پر ہم نے دیکھا کہ چادر کثرت کے ساتھ اوڑھی جاتی تھی اور ہم کو بہت سے ایسے آدمیوں سے واسطہ پڑا جو لمبا اور اوپر تک بٹن رکھنے والا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جس کا رواج قاچار خاندان کی سلطنت کے زمانہ میں تھا تہران (TEHRAN) میں رضا شاہ کی تجدیدی پالیسی کے اثرات متعدد اور نمایاں ہیں۔ ایران کے رہنے والے عام طور پر کسی ہمسایہ ایشیائی قوم سے مشابہت نہیں رکھتے ہیں۔ معمولی شکل و صورت میں ان میں کے بہت سے آدمی جنوبی کوہ قاف کے رہنے والوں (SOUTHERN CAUCASIANS) سے ملتے جلتے ہیں ان کو دیکھکر یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ جنوبی کوہ قاف کے رہنے والے ہیں۔ اور آجکل شہروں کے اندر یورپین (EUROPEAN) لباس یا ایسا لباس۔ جو یورپین کہا جاتا ہے استعمال کرنے کی وجہ سے اور اس ظاہری حالت کی وجہ سے جس میں تقریباً ایک مایوس کن اور تباہ شدہ افلاس کے آثار پائے جاتے ہیں ایرانیوں کی ایسی گری ہوئی صورت ہوگئی ہے۔ جو روس (RUSSIA) کے متعلق سینما کی تصویروں میں دکھائی جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان میں سے بعض صورتیں دھوکا دینے والی ہیں۔ خاص طور پر وہاں کے افلاس کی صورت۔ ہر بات کا وزن کرتے ہوئے اور ہر آدمی کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایران کے عوام کی حالت یقینی طور پر ہندوستان اور چین کے عوام کی حالت سے بہتر ہے۔ گو ان کی زندگی کا معیار بظاہر اس معیار کی برابر نہیں ہے جو مغربی یورپ کے ممالک میں یا امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر خاص طور پر کھانے کے معاملہ میں ایران کے لوگ ایشیا کی بہت سی

قوموں کے آدمیوں سے بہتر ہیں۔ وہ صاف طور پر اس حد کے اوپر زندگی بسر کرتے ہیں جو خالی گذارا کرنے کی حد شمار کی جاتی ہے اور اس حد سے نیچے کبھی نہیں رہتے ہیں۔

ایران کے مسائل اور مشکلات کی گڑبڑ سے بالاتر ایک واقعہ بہت صاف طور پر نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر موجودہ شہنشاہ کو ان ہنگامہ خیز تبدیلیوں کے بعد جو حال میں ان پر گذر چکی ہیں اب آزادی کے ساتھ اختیارات دے دئے گئے اور وہ اس قابل ہوگئے کہ خود اپنے وزیروں اور شہریوں کا انتخاب کریں۔ اور اس معاملہ میں ان کے لئے ایک طرف سے قدامت پرستی اور دوسری طرف سے افراد پرستی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی ہیں۔ تو ایران اس قابل ہو جائے گا کہ اپنے اقتصادی اور تمدنی معیاروں کو بڑی ترقی پر پہنچا دے اور اپنی کافی بڑھتی ہوئی آبادی کی پرورش نہایت بہتر حالات میں کرے۔

اپنے حال کے کام اور تجربات کا یہ مختصر بیان مجھ کو اس واقعہ کا حوالہ دئے بغیر ختم نہیں کرنا چاہیئے جو ان سب واقعات سے بہت کم خوشگوار ہے جو حال میں میرے سامنے آئے ہیں۔ اگست ۱۹۴۹ء میں ایک دن صبح کے وقت میں اور میری بیوی کان (CANNES) کے قریب اپنے بنگلہ سے روانہ ہوئے تاکہ نیس (NICE) کے ہوائی اڈہ تک پہنچ کر وہاں سے ڈوول (DEAUVILLE) کے لئے ہوائی جہاز میں بیٹھ جائیں۔ ہمارا وزنی سامان سڑک کے راستہ سے ہماری دو موٹر کاروں میں ہمارے ملازموں کے ساتھ پہلے جا چکا تھا۔ اس وجہ سے میں۔ میری بیوی اور اُن کی ذاتی خادمہ مل فریڈا میر (MLLE. FRIEDA MEYER) ایک کار میں جو وہاں کے مقامی موٹر گھر سے کرایہ پر منگائی تھی روانہ ہوئے۔ میں ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میری بیوی اور ان کی خادمہ پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بنگلہ کے پھاٹک سے تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر پہاڑی سڑک بہت جلد موڑ کھاتی ہے اور دوسری چھوٹی سی سڑک ایک طرف کو شروع ہو جاتی ہے۔

جب ہم اُس موڑ پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک دوسری کار ہماری طرف کو اس موڑ کے برابر آ گئی جس سے یہ ہوا کہ نہ ہم وہاں سے آگے چل سکے اور نہ چھوٹی سڑک پر آسکے۔ تین آدمی جن کے منہ اور سر ڈھکے ہوئے تھے اور جو بہت زیادہ ہتھیاروں سے لدے ہوئے تھے کار میں سے باہر کودے اور ہم کو گھیر کر کھڑے ہو گئے (اُن تینوں کے پاس کم از کم دس بندوقیں تھیں) اُن میں سے ایک آدمی نے ہماری کار کے پچھلے ٹائر کاٹ ڈالے۔ انہوں نے اپنی بندوقوں کی نالیں کار کے اندر گھسا دی تھیں۔ ایک نال میری بیوی سے چند انچوں کے فاصلہ پر تھی اور دوسری نال میرے سینہ کے قریب تھی۔ خوف نے ہم میں سے کسی کو پریشان نہیں کیا۔ یعنی وہ خوف جس کو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں ہمارے پاس نہیں آیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ دیکھا کہ اس آدمی کے ہاتھ جو مجھے گھیرے ہوئے تھا بہت زور سے کانپ رہے تھے اور میں نے نہایت بے پروائی کے ساتھ یہ خیال کیا کہ "وہ بندوق اب غالباً چھوٹ جائے گی"۔ میری بیوی کی خادمہ نے اس واقعہ کے بعد اکثر مجھ سے یہ ذکر کیا ہے کہ اس وقت وہ یہ خیال کر رہی تھی (اور یہ خیال بھی بغیر کسی پریشانی کے تھا) کہ وہ آدمی کب پرنس صاحب (PRINCE) کو مار ڈالتا ہے۔ میری بیوی کو جو اپنی خادمہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کسی خطرہ یا خوف کا بالکل احساس نہ تھا۔

میں نے اپنے قدرتی لہجہ کی آواز میں ان لوگوں سے یہ کہا کہ "ہم کوئی مخالفت نہیں کریں گے اور جو کچھ تم چاہتے ہو وہ ہم تم کو دے دیں گے"۔

اُن میں سے ایک آدمی نے جواہرات کا وہ صندوق جو میری بیوی اپنی گود میں لئے ہوئے تھیں چھین لیا۔ جب وہ لوگ اپنی کار کی طرف واپس ہوئے تو اُس آدمی نے کہا کہ "مہربانی کر کے اب ہم کو جانے دیجئے"۔

جب وہ لوگ واپس ہو کر اپنی کار میں بیٹھنے والے تھے تو میری آواز نکلی اور مجھ میں ظرافت کا احساس پیدا ہوا اور مجھے کچھ مذاق کرنے کی سوجھی۔

میں نے چلا کر کہا "او ہو۔ واپس آ جاؤ۔ تم اپنی بخشش لینا بھول گئے"۔

اُن میں سے ایک آدمی دوڑ کر واپس آیا اور میں نے اُس کو مٹھی بھر کردہ فرنیک (FRANKS) دے دیئے جو میری جیب میں تھے۔ اور میں نے کہا کہ "یہ لو اپنی بخشش"۔

جب وہ اپنی کار کی طرف بھاگ کر واپس گیا تو وہ بار بار یہ کہتا ہوا گیا کہ "شکریہ۔ شکریہ"۔

ہم مکان پر واپس چلے گئے اور پولیس کو اور لائیڈس (LLOYDS) کو ٹیلیفون کیا۔ لائیڈس (LLOYDS) نے ہمارے مطالبہ کے متعلق بہت مکمل طریقہ پر اور کشادہ دلی کے ساتھ کام کیا۔ تقریباً چار سال گذرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں چھ آدمیوں پر مقدمہ قائم کیا گیا اُن میں سے تین آدمی مجرم قرار دیئے گئے اور ان کو سزا ہو گئی میرا خیال ہے کہ اس واقعہ کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایسا واقعہ تھا جو بہت ناخوشگوار تھا اور اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اور مجھ کو اپنے طویل تجربہ میں اس کی مثال کبھی نہیں ملتی ہے۔

باب نمبر ۱۶

مستقبل کی طرف

میں اپنی زندگی بھر آئندہ کی طرف دیکھتا رہا ہوں۔ بڑے پیمانہ پر پیشین گوئی کرنا ایسا ہی خطرناک ہے جیسا کہ وہ آسان ہے۔ صحیح پیشین گوئی کرنے کی بصیرت دنیا میں دراصل بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہ ایسی کمیاب چیز ہے جو ایسے زمانہ میں جیسا کہ ہمارا زمانہ ہے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس زمانہ میں سائنس (SCIENCE) نے ہمارے قبضہ میں وہ مادی اور قدرتی طاقتیں دے دی ہیں جو اب سے صرف پچاس سال سے پہلے کبھی خواب میں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ مگر چونکہ انسانی دماغ اور انسانی تخیل ابھی تک کسی طرح پر بھی اتنی مکمل ترقی نہیں کر چکا ہے کہ وہ ان غیر محدود قوتوں پر پورا قابو حاصل کرے جو انسانی ذہانت نے معلوم کر لی ہیں اور جو آزادی کے ساتھ استعمال کرنے کے قابل ثابت ہو چکی ہیں۔ اسلئے یہ کچھ زیادہ مشکل بات نہیں ہے کہ سائنس اور صنعت و حرفت کے اس زبردست انقلاب پر اور ان تمام حالات پر جو اس انقلاب کے ساتھ پیدا ہوں مختلف قوموں اور مختلف افراد کے کم از کم سیاسی اور تمدنی ردعمل کا پہلے سے کچھ اندازہ لگا لیا جائے

ہندوستان جو میری پیدائش اور میری پرورش کا ملک ہے صدیوں سے انتہائی افلاس مصیبت اور محتاجی کا ملک رہا ہے جہاں پر کروڑوں آدمی خالی گذارا کرنے کی حد سے بہت نیچے والی سطح پر پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی بسر کرتے ہیں۔

اپنا کام کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ گرم آب و ہوا۔ طویل عرصہ تک پانی کے بہاؤ کی وجہ سے زمین کا کٹنا اور اس کا خراب ہو جانا۔ کاشتکاری کے قدیم اور بے ہنر طریقے۔ ان سب باتوں نے ہندوستان کے مصیبت زدہ۔ صبر کرنے والے اور شریف مگر جاہل آدمیوں پر اپنا مضر اثر ڈالا ہے۔ مگر بہت خوفناک اور بہت بڑی رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے بعد ہندوستان کا کاشتکار ابھی تک زندہ ہے۔ اور اس کی نسل برابر بڑھتی گئی ہے۔ بہت سال گذرے کہ میں نے اپنی پہلی کتاب "انڈیا ان ٹرانزیشن" (INDIA IN TRANSITION) میں برطانوی حکومت کے ماتحت معمولی ہندوستانی کاشتکار کی روزانہ زندگی کا یہ ذکر اس طرح پر کیا ہے:۔

"کسی معمولی سال کے کسی معمولی دن میں گاؤں کا جو خاص منظر ہوتا ہے وہ لازمی طور پر آجکل بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ اب سے نصف صدی پہلے تھا۔ وہاں کی خاص ہوا جو کبھی گرم ہوتی ہے اور کبھی سرد وہاں کی یکساں زمین پر اس جلد ہونے والی صبح کے وقت کچھ ہلکی ہو کر تیزی کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ اور اس کے بعد بہت جلد وہاں پر آسمان کے کنارہ پر بھاری اور گرم سورج ظاہر ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے رہنے والے مرد، عورت۔ اور بچے پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے۔ دُبلے پتلے اور کمزور جو کم کھانا ملنے اور زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اپنی اصلی عمر کی نسبت زیادہ بوڑھے معلوم ہوتے ہیں صبح ہونے سے پہلے ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ اب وہ اپنا غریبی کھانا کھا چکتے ہیں۔ اس کھانے میں ایک قسم کا ٹھنڈا دلیہ ہوتا ہے جو لازمی طور پر بلا شکر یا دودھ کے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ننگے اور سخت پیروں کے ساتھ اپنے کھیتوں پر پہنچ جاتے ہیں اور فوراً اپنے کمزور مویشیوں کے ذریعہ سے زمین پر ہل چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ مویشی گھٹیا اور دوغلی نسل کے ہوتے ہیں اور عام طور پر یہ بچہ پیدا کرنے یا دودھ دینے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ دوپہر کے وقت یہ

لوگ کچھ آرام کرتے ہیں اور مٹھی بھر بھنا ہوا اناج یا بھنی ہوئی دال کھانے کی جگہ کھاکر پھر سورج چھپنے تک اسی زمین جوتنے کے سخت کام کو جاری رکھتے ہیں اس کے بعد شام کے وقت جب ٹھنڈ ہوجاتی ہے یہ لوگ تھک کر اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ ان کے گھر کا ہر فرد ملیریا (MALARIA) یا تھکن کی وجہ سے کانپتا ہوا اور گرا ہوا نظر آتا ہے۔ جو پانی وہ پیتے ہیں وغالبًا خراب اور بدبودار ہوتا ہے۔ ایک سخت قسم کی سیاہ یا سبز چپاتی کو زور سے چبا کر کھا لیتے ہیں پیپل کے درخت کے نیچے تھوڑی سی گپ بازی کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کا دن ختم ہوجاتا ہے۔ ان کی نیند ایسی ہوتی ہے جس سے ان کی طبیعت کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا ہے اور وہ ایسے مکانوں میں رہتے ہیں جو صحت کے اعتبار سے اتنے خراب ہوتے ہیں کہ ان کے اندر یورپ کا کوئی معقول کاشتکار اپنے مویشیوں کو بھی رکھنا پسند نہ کرے گا۔"

برطانوی راج ختم ہوچکا ہے۔ مگر اس زمانہ کی نسبت جب میں نے مندرجہ بالا الفاظ لکھے تھے زراعتی ہندوستان کے غریب کاشتکار کی زندگی اور اسکے حالات کی ضروریات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ تعلیم۔ تندرستی قائم رکھنے کے اصول۔ بہبودی کی اسکیموں (WELFARE SCHEMES) اور دیہات کی ترقی کے منصوبوں نے اس مسئلہ کی سطح کو اس سے زیادہ گہرا اور اس سے زیادہ کامیابی کے ساتھ نہیں کھودا ہے جتنا کہ خود کاشتکار کا لکڑی کا ہل ہندوستان کی سورج میں تپتی ہوئی زمین کو کھودتا ہے۔ اس کاشتکار کے شہری رشتہ دار کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے جو ایسے بڑے اور ہمیشہ بڑھنے والے تجارتی شہروں میں کام کرتا ہے جیسے کہ بمبئی یا کلکتہ۔ اپنے وطن کی فیکٹری میں وہ ہندوستان کا تجارتی مزدور بہت زیادہ خطرناک حالات کو برداشت کرتا ہے اور ان کو بالکل قدرتی سمجھ کر منظور کر لیتا ہے۔ دھواں اور زیادہ آبادی رکھنے والی مل (MILL) یا فیکٹری (FACTORY) سے وہ ہارا اور تھکا ہوا چلتا ہے اور اپنی اس جھونپڑی یا

کرایہ کی کوٹھری میں پہنچتا ہے جو اس کے گھر کا کام دیتی ہے اور اس میں بھی فیکٹری کی طرح بہت زیادہ آدمی رہتے ہیں اور وہ بھی بہت زیادہ غیر صحت بخش ہوتی ہے۔ اس کا کھانا جو اس کے گاؤں والے بھائی کے کھانے سے کچھ زیادہ مختلف قسموں کا ہوتا ہے مغربی معیار سے بہت افسوسناک طریقہ پر کم اور ناکافی ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک بڑے شہر کی روز افزوں دلچسپیاں اور تفریحات موجود ہوتی ہیں مگر یہ سب اس کے لئے کسی کام کی نہیں ہیں۔ اس کو خوشی اور آرام دینے والی چیزیں بہت کم ہوتی ہیں اور اس کے لئے عیش اور تفریح کی چیزیں بالکل موجود نہیں ہوتی ہیں۔

برطانوی حکومت کے زمانہ میں یہ بات نسبتاً آسان تھی کہ ہندوستان کی اقتصادی بدحالی کی ذمہ داری اپنے اوپر سے ٹال دی جائے اور سارا الزام شہنشاہیت کی لوٹ کھسوٹ پر رکھ کر یہ کہا جائے کہ جب ہم کو آزادی مل جائے گی تو ہم اقتصادی حالات کو ٹھیک کرلیں گے۔ بادشاہ پرست لوگ اب ہندوستان سے چلے گئے ہیں اور بیرونی لوٹ کھسوٹ کا زمانہ ختم ہوچکا ہے۔ مگر کیا اقتصادی بدحالی اور بے انصافی اتنی آسانی کے ساتھ ٹھیک کی جاسکتی ہے؟ ہندوستان کی آبادی مستقل طریقہ پر اور تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اس وجہ سے موجودہ رفتار کو دیکھکر یہ ممکن نہیں ہے کہ آبادی میں جو قدرتی اضافہ ہو رہا ہے اس کے نصف سے زائد حصہ کو اقتصادی اعتبار سے کھپایا جاسکے۔ ہندوستان میں چین کی طرح جو مشکل مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اقتصادی اعتبار سے کتنی آبادی کھپانے کی گنجائش ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ ہندوستان کی نسبت کم تکلیف دہ ہے چونکہ پاکستان میں بلوچستان کا ایسا وسیع رقبہ موجود ہے جو خالی پڑا ہوا ہے مگر جس میں زرخیزی کے امکانات ہیں اور جس کے اندر پاکستان کی فاضل آبادی بسائی جاسکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں اور اسی طرح چین میں تعلیم کی توسیع۔ ووٹ دینے کے طریقوں سے روز بروز

زیادہ ہونے والی واقفیت اور جمہوری حکومت چلانے کے طور اور طریقے وہاں کے آدمیوں میں اس بات کی پُرشوق اور زبردست کوششیں پیدا کریں گے کہ سیاسی طریقہ پر اپنے سخت اقتصادی معاملات کے حل معلوم کرلیں۔ ہندوستان میں اور چین میں کروڑوں انسانی ہستیاں انتہائی مصیبت کے حالات میں اپنی زندگی ختم کردیتی ہیں۔ انسانوں میں عوام کی یہ وسیع تعداد کب تک ان حالات کو برداشت کرے گی؟ جب ان میں اپنی سیاسی طاقت کا احساس پیدا ہونا شروع ہو جائے گا تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ لوگ سوشلزم (SOCIALISM) بلکہ درحقیقت کمیونزم (COMMUNISM) کی انتہائی صورت پیدا کرنے پر اصرار کریں گو یہ سوویٹ روس (SOVIET RUSSIAN) کے طرز پر نہ ہو اور سوویٹ کی قیادت (SOVIET LEADERSHIP) کے ماتحت نہ ہو؟ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس اصرار کے ظاہر کرنے اور اُس کے آثار نمایاں کرنے میں انقلابی صورت پیدا ہو جائے؟

مگر ہندوستان میں اور اسی طرح چین میں اگر آبادی کے ہر "ہوت والے آدمی" کو دولت سے محروم کردیا جائے۔ اور اس کو سب سے نیچے درجہ کے "بے ہوت والے آدمی" کے درجہ پر گھٹاکر رکھدیا جائے۔ گویا سب سے زیادہ غریب جھنگی یا قلی کے درجہ پر رکھدیا جائے۔ تب بھی زندگی کے عام معیار پر اور وہاں کی عام بدحالی پر اس کا اثر بہت معمولی اور برائے نام ہوگا۔ چونکہ دونوں ملکوں میں "ہوت والوں" کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر موجودہ دولت کی تقسیم کو سب سے زیادہ مکمل طریقہ پر بھی دوبارہ تقسیم کیا جائے تو اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ اس لئے اس کی اصلاح جو حقیقی اور مؤثر ثابت ہوسکے بہت زیادہ گہری حد تک پہنچنی چاہیئے۔ یہ ایسے خطرناک خیالات ہیں جو ہر اس شخص کو مایوس اور پژمردہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ جس کو ایشیا کے مسائل اور مشکلات کا اتنا علم ہے جو محض سطحی علم سے زیادہ ہے۔

آگے بڑھنے کے لئے ایک بڑا سیاسی قدم اٹھانا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو اٹھانا چاہیئے اور جس کا اثر وہاں کے آدمیوں کی زندگی اور خوش حالی پر بہت نمایاں ہوگا اور ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان ایک حقیقی اور دائمی "دوستانہ تعلقات کا رشتہ" (ENTENTECORDIALE) قائم کیا جائے۔ ایسا رشتہ جو برطانیہ اور فرانس کے درمیان ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک رہا۔ اس سے زیادہ ملتی جلتی مشابہت بلجیم (BELGIUM) اور ہالینڈ (HOLLAND) یا سوئیڈن (SWEDEN) اور نوروے (NORWAY) میں پائی جائے گی۔ وہاں پر خود مختار اور ہمسایہ حکومتوں کے دو جوڑے پائے جاتے ہیں جو کسی زمانہ میں ایک تھے مگر اب الگ ہو گئے ہیں۔ ہر ایک جوڑے میں۔ چھوٹی خود مختار قوم نے اپنی آزادی اس قوم سے الگ ہو کر حاصل کی جن کے ساتھ اس کے قدیم اور قریبا تاریخی اور سیاسی تعلقات تھے۔ نیچے والے ملکوں (یعنی بلجیم و ہالینڈ) کی علیحدگی بہر حال سب سے زیادہ قریبی مثال پیش کرتی ہے چونکہ وہ مذہبی اختلافات کی خاص وجوہ کی بناء پر عمل میں لائی گئی تھی۔ میں نے اس سے پیشتر یہ بیان کیا ہے کہ قدیم ہندوستانی سلطنت میں ہندو اور مسلم جماعتوں کی مشابہت ایسی تھی جیسے کہ سیام کے ان مشہور دو جوڑواں بچوں میں تھی (SIAMESETWINS) ہندو اور مسلمان الگ ہونے سے پہلے دراصل ایسے ہی جوڑواں بچے تھے جو تنہا چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے۔ اب چونکہ وہ الگ ہو گئے ہیں اس لئے یقینی طور پر ان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مصاحبوں اور دوستوں کی حیثیت سے چلیں جس سے دونوں کو فائدہ اور مدد پہنچے۔

اگر یہ حالت آگے چل کر پیدا ہونے والی ہے تو اس کے لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ خاص طور پر ہندوستان کی طرف سے نقطۂ نظر کی بہت گہری اور بنیادی تبدیلی پیدا کی جائے چونکہ ان دو حکومتوں میں جو اس برصغیر کے

اندر بعد میں قائم ہوئیں ہندوستان بڑی حکومت ہے۔ کیا یہ ہندوستان کا فرض نہیں ہے جس کو وہ پوری طرح ادا کرنے کے قابل ہے کہ وہ اس نئی قوم کا اعتماد حاصل کرے جو اب سے پہلے اس کے ساتھ ایک ناخوش ہم بستر ساتھی کی طرح رہ چکی تھی؟ اس کام کا ایک نہایت ضروری پہلو یہ ہے کہ عملی معاملات میں باہمی تعاون کیا جائے اور امداد پہنچائی جائے۔ اس کی ایک فوری مثال جو ایک دم دماغ میں آجاتی ہے یہ ہے کہ پانی پہنچانے کے ذریعوں پر کنٹرول (CONTROL) کرنے کے لئے ایک مشترکہ کمیشن قائم کیا جائے جس سے پاکستان کو یہ محسوس ہو کہ ہندوستان دراصل اس کی مدد اس معاملہ میں کر رہا ہے کہ وہ اپنے جنگلات کو کار آمد بنانے کے اہم مسئلہ کو تیار کر سکے۔ اور یہ کہ ہندوستان علانیہ یا خفیہ طور پر پاکستان کے لئے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح پر اس تکلیف دہ معاملہ میں جو پہلی دیسی ریاستوں کے الحاق سے متعلق ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہندوستان وہاں پر ایک منصفانہ رائے شماری کا انتظام کرانے میں حصہ لے اور پھر ایمان داری کے ساتھ اس رائے شماری کے نتیجہ کو قابل پابندی سمجھ کر منظور کرے۔

تاریخ ہندوستان کو ایک اور سبق دیتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی کمزور ہمسایہ پر اپنی طاقت استعمال کر کے دباؤ ڈالنا۔ خواہ وہ طاقت سیاسی ہو یا اقتصادی اور اخلاقی طاقت ہو۔ یا پروپیگنڈے کا پر شور ذریعہ استعمال کرنا۔ عقلمندی اور عاقبت اندیشی کے خلاف ہے۔ ہندوستان کو اب بھی اس کا اندازہ ہو رہا ہو گا کہ اس قسم کا دباؤ ڈالنے سے وہ کمزور ہمسایہ اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دوسری جگہ اپنے دوستوں کو تلاش کرے۔ سبب اور نتیجہ کے اس سلسلہ کی ایک قدیم اور اعلیٰ درجہ کی مثال اس رشتہ کے اندر پائی جاتی ہے جو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں فرانس اور جرمنی کے درمیان قائم تھا۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ کی مصیبت کے بعد فرانس نے درحقیقت جرمنی کے ساتھ نبھاؤ کرنے کی

کوشش کی مگر بلو (BULLOW) اور ہوسٹین (HOLSTEIN) کی جرمنی نے اس "تیسری جمہوریت" (THIRD REPUBLIC) کے ساتھ ایسی غاصبانہ اور غصہ دلانے والی پالیسی (POLICY) اختیار کی جس سے فرانس کو مسلسل خلش اور تکلیف ہوتی تھی اور جس کی وجہ سے فرانس اس بات پر مجبور ہوا کہ برطانیہ کی حمایت حاصل کرے۔

میں ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کو بہت سنجیدگی کے ساتھ متنبہ کرتا ہوں کہ وہ تاریخ کے اسباق پر غور کریں ایسا نہ ہو کہ وہ سبق ان کو ایشیا کی سرزمین پر اسی طرح دوبارہ پڑھنے پڑیں۔ جس طرح کہ یورپ میں ہو چکا ہے مگر ہندوستان کے لئے اس سے بہت زیادہ باقاعدہ اور بہت زیادہ شریفانہ راستہ موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان علانیہ مکمل اور پرخلوص طریقہ پر پاکستان سے میل پیدا کر کے ایشیا اور افریقہ کے سرحدی آدمیوں اور قوموں کے لئے ایسی اخلاقی اور سیاسی رہبری کرے جس سے ان ملکوں میں آئندہ برسوں تک امن واستقلال یقینی طور پر پیدا ہو جائے۔

میرا یہ خیال نہیں ہے کہ مشرق قریب کے ملکوں میں سوائے مصر کے جو امکانی مستثنیات میں سے ہے۔ آبادی کے ایسے مسائل موجود ہیں جن پر ہمت استقلال اور ذہانت کے ساتھ قابو نہ پایا جا سکے۔

ایسے ملکوں کے آدمیوں کو جیسے کہ ایران۔ عراق۔ شام۔ لبنان اور یمن جس چیز کی ضرورت ہے وہ علم ہے۔ یعنی جدید اصطلاحات کا علم۔ انجنیری کا علم (ENGINEERING) اور زراعت کا علم۔ ان ملکوں میں جگہ اور قدرتی وسائل بہت کافی ہیں۔ اگر سائنس کا استعمال وہاں مناسب طریقہ پر کیا جائے تو ان کی خالی زمینوں کو دوبارہ آباد کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے بنجر رقبوں کو سرسبز بنایا جا سکتا ہے۔ وہ نئے شہر آباد کر سکتے ہیں۔ اپنے کھیتوں کو زرخیز بنا سکتے ہیں تجارتی کاروبار شروع کر سکتے ہیں اور تجارتی کارخانے قائم کر سکتے ہیں اور اپنے انتہائی زرخیز معدنیات اور خام سامان کے امکانی فوائد کو ترقی دے سکتے ہیں

یہیں پر کسی زمانہ میں جنّت عدن (GARDEN OF EDEN) کا وجود تھا مورخوں اور آثار قدیمہ کے ماہروں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ علاقہ کسی زمانہ میں بہت زرخیز۔ مالدار اور زیادہ آبادی رکھنے والا تھا۔ وہ اسی طرح پر پھر ہو سکتا ہے۔ اگر وہ طاقتیں اور وہ ذرائع جو انسان کے پاس اب موجود ہیں مناسب طریقہ پر استعمال کئے جائیں۔

عرب کے ممالک صدیوں کی حماقت۔ بربادی اور فضول خرچی کی وجہ سے جس کی بنیاد جہالت پر تھی تباہ کر دئے گئے ہیں۔ ان کے آدمیوں کی قابل رحم حالت جو آجکل ہے وہ دراصل ان کے ماضی کی توہین ہے۔ اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے اسرائیل کی حکومت سے آگے جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمت اور مستقل ارادہ کے ساتھ اگر ہوشیاری اور سخت ضرورت بھی شامل ہو جائے تو اس سے کیسی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ عرب کے آدمی ذہانت اور اندرونی اہلیت میں دنیا کی اور کسی قوم سے ذرہ برابر کمتر نہیں ہیں۔ اگر صرف ایک نسل کے زمانہ میں سب کے لئے تعلیم کی حقیقی ضرورتوں پر مکمل اور پر خلوص توجہ دی جائے ان کے لئے سائنس کی۔ صنعت و حرفت کی اور نیز اسکول و کالج کی تعلیم۔ تربیت اور تنظیم پر توجہ دی جائے تو عرب کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کی کایا پلٹ کی جا سکتی ہے۔ اپنی مدد خود کرنا دوسروں کے امدادی عطیات سے بہت زیادہ بہتر ہے اور اس سے بہتر ہے کہ امریکہ اپنی فاضل پیداوار کو ہمیشہ باہر بھیجتا رہے۔ عرب کے لئے خطرہ کی بات صرف یہ ہے کہ وہ ایسی دنیا میں جو تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے مسلسل طور پر بے حس اور جاہل چلے جاتے ہیں اور تمدنی و اقتصادی نقطۂ نظر اور عملی طریقوں میں ہمارے زمانہ کی مخالف حقیقتوں سے ساز نہیں کرتے ہیں۔

مجھے اس کے متعلق کوئی خطرہ نہیں ہے کہ افریقہ میں برطانوی شاہی کالونیوں پر مستقبل کا اثر کیا ہوگا۔ ہم نے مغربی افریقہ میں برطانیہ عظمیٰ کے اعلیٰ کام کو دیکھا ہے

مشرقی اور وسطی افریقہ میں آجکل یورپ کی آبادی کی وجہ سے یہ مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے مجھے یقین ہے کہ مناسب اور اطمینان بخش طریقہ پر وہاں کا مسئلہ اس طرح طے ہوسکتا ہے کہ ان مختلف قوموں والی جماعتوں کے سب فرقے یعنی خاص افریقہ کے قدیم باشندے اور یورپ و ایشیا سے آکر وہاں بسنے والے آدمی اس سیدھے سادے اور بنیادی واقعہ کو سمجھ لیں کہ وہ سب کے سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور ان کی زندگی ایک دوسرے کی زندگی پر منحصر ہے۔ ان میں سے کوئی فرقہ بھی دوسرے فرقہ کو اپنے خیالات سے الگ نہیں کرسکتا۔ خواہ وہ خیالات گذشتہ ترقی میں حصہ لینے کے متعلق ہوں یا آئندہ زمانہ کے منصوبوں کے متعلق ہوں۔ باہر سے آکر بسنے والا خواہ وہ یورپ کا رہنے والا ہو یا ایشیا کا بغیر افریقہ والے کے اپنی خوشحالی کی کوئی امید نہیں رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح پر افریقہ والا بغیر یورپین کاشتکار یا ایشیائی سوداگر کے اپنا کام نہیں چلا سکتا ہے تاوقتیکہ اس کا معیار زندگی بہت نیچے نہ گرجائے اور اس کے ساتھ وہ تمام امیدیں ختم نہ ہوجائیں جو اس زمین کی قدرتی دولت کو بڑھانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے متعلق ہیں جہاں ان تینوں کا وطن ہے اور جہاں ان کو لازمی طور پر اپنی معاش پیدا کرنی ہے۔

مسلمان کے لئے اس معاملہ میں ایک خاموش مگر زبردست ہمت دلانے والا عنصر پایا جاتا ہے۔ جہاں کہیں دیسی آبادی مسلمانوں کی ہے وہاں پر نسلی مخالفت یا یورپین لوگوں کے خلاف تلخی کا احساس نمایاں طور پر بہت کم پایا جاتا ہے باوجودیکہ یورپین لوگ مالی اعتبار سے وہاں پر ظاہری فوقیت رکھتے ہیں۔ اسلام بہرحال ایسی زمین رکھتا ہے جس میں اس قسم کے جذبات جڑ نہیں پکڑتے ہیں یا آسانی سے سرسبز نہیں ہوتے ہیں۔ یہ کوئی سطحی اور تقدیر پرستی کی مجبور اور بے بس حالت نہیں ہے بلکہ یہ تعلیمات اسلام کے اندرونی جوہر میں ایک نہایت گہری چیز ہے اور وہ یہ بنیادی اعتقاد ہے کہ خدا کی نظروں میں بلا لحاظ رنگ یا قوم یا مالی حالت کے سب آدمی برابر ہیں۔ اس یقین کی وجہ سے ایسی ناقابل جنبش خودداری پیدا ہوتی ہے

جس کے سب سے گہرے اثرات انسانی دماغ کے نیم شعوری حصہ میں رہتے ہیں اور وہ اس بات کو روکتے ہیں کہ ایک انسان کے اندر دوسرے انسان کی مالی برتری دیکھ کر کسی قسم کا حسد یا احساس کمتری پیدا ہو اور اس کی تلخی میں اضافہ ہو۔

میں سچے دل سے یقین رکھتا ہوں کہ ان سب ملکوں میں اسلام وہ اہلیت رکھتا ہے کہ نہایت وسیع اہمیت کی اخلاقی اور روحانی طاقت بن جائے جس سے وہ ان جماعتوں کو قوت پہنچائے گا اور ان کو مضبوط اور مستقل بھی کر دے گا جن کے درمیان اس کی تبلیغ کی جاتی ہے اور اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ اسلام کے اس امکانی اندرونی اثر کو ہمیشہ کے لئے بھول جانا اور اسلام کی اس صحت بخش اور تخلیقی قوت کو بھول جانا جو جماعتوں کے لئے بھی مفید ہے اور افراد کے لئے بھی ایسا ہے جیسا کہ اس اہم چیز کو بھول جانا جو آج کی دنیا کے حقیقی امید افزا عناصر میں سے ہے۔

مگر امن یا جنگ کے اُس بار بار پیدا ہونے والے اور ناقابل حل مسئلہ کا کیا علاج ہے؟ حال کی تاریخ میں بہت کم زمانے اتنے تباہ کن اور مصیبتناک رہ چکے ہیں جتنا کہ "یہ مصیبت زدہ نصف صدی" کا زمانہ آ رہا ہے (یہ وہ فقرہ ہے جو سر ونسٹن چرچل (SIR WINSTON CHURCHILL) نے استعمال کیا ہے) کیا مصیبت کا یہ طویل زمانہ اب آخرکار ختم ہو چلا ہے؟

میں ہمہ تن ہو کر سرگرمی کے ساتھ صرف یہ امید کر سکتا ہوں کہ دراصل ایسا ہی ہوا ہے اور یہ مصیبت کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اور یہ کہ سب قومیں اور ان کے لیڈر سچے دل سے اور عملی طور پر نہ صرف یہ یقین رکھتے ہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ کا منفی پہلو یہ ہے کہ وہ انسانی تہذیب کو اور شاید درحقیقت کل بنی نوع انسان کو تباہ کر دے گی بلکہ وہ اس اثباتی نتیجہ پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اب یہ انسان کے قبضہ میں ہے کہ وہ بہت تیزی اور وسعت کے ساتھ تہذیب کو بڑھائے اور اس کو ترقی دے اور ان کروڑوں آدمیوں کی مادی خوش حالی میں اضافہ کرے جو آجکل "بے ہوت والے" آدمیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان قوموں اور افراد کے لئے

جو "بہے ہوت والے" ہیں جو موقعہ مل سکتا ہے وہ صرف امن کے قائم رہنے میں ہی مل سکتا ہے۔ اس تکلیف اور مصیبت کے بعد جو یورپ نے برداشت کی ہے اس کو دوبارہ قوت حاصل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ امن قائم کیا جائے۔ شمالی امریکہ یعنی یونائٹیڈ اسٹیٹس (UNITED STATES) اور کینیڈا (CANADA) کی تجارتی اور پیداواری اہلیت جواب بھی اتنی زیادہ ہے کہ اس سے پہلے دنیا میں کبھی نہیں ہوئی بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ شمالی امریکہ کو بازاروں کی ضرورت ہے اور بازاروں کا یہ مطلب ہے کہ امن قائم ہو یعنی بازار اسی وقت تک رہ سکتے ہیں جب تک امن رہے۔ افریقہ۔ ایشیا اور جنوبی امریکہ میں کم ترقی یافتہ ملکوں کو برسوں تک اس کی ضرورت ہے کہ اس میں وسیع اور مستقل پیمانہ پر روپیہ اور مالی امداد پہنچانے کا سلسلہ جاری رہے تاکہ وہ اپنے ذرائع آمد و رفت کو تیار کرسکیں اور ان کو ترقی دے سکیں۔ اپنے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھاسکیں۔ اور اپنے معیار زندگی کو بلند کرسکیں۔ اس پیمانہ پر اور اس غرض سے روپیہ لگانے کے لئے امن کی ضرورت ہے ایسے حالات کے مقابلہ میں اور ضرورتوں کے اتنے مختلف اور اتنے لازمی سلسلوں کی موجودگی میں جنگ کرنا پاگل پن شمار کیا جائے گا۔ مگر میں مجبوراً اس کا اقبال کرتا ہوں کہ اگر ہم گذشتہ پچاس سالوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ مندرجہ بالا واقعہ نے قوموں اور ان کے لیڈروں کو تباہ کن راستہ اختیار کرنے سے نہیں روکا ہے جب آخری آزمائش کا وقت آیا تو وہ سب خوش حالی اور امن و امان کی حفاظت جو بہت مشکل سے حاصل ہوئی تھیں اور انیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصہ میں وہ تمام شاندار اور جگانے والی امیدیں بیکار ہو کر رہ گئیں۔ غرور اور حماقت نے آدمیوں کے دلوں پر قابو پالیا۔ آجکل دنیا کی جو حالت ہے وہ اسی غرور اور حماقت کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ جرمنی نے عرصہ تک کیا اسی طرح اب روس (RUSSIA) مہذب دنیا کے سامنے وہ بڑا معمہ اور وہ پیچیدہ مسئلہ پیش کرتا ہے جس کے لئے کوئی معقول

اور اطمینان بخش حل نظر نہیں آتا ہے ۔ روس (RUSSIA) کے تکلیف دہ توازن میں ایک چیز ظاہر ہے اور سب کو معلوم ہے یعنی وہ چیز جس کے نتائج صرف خوشگوار پرامن اور خوش حالی دینے والے ہو سکتے ہیں ۔ دوسری چیز جو ایک دائمی نا معلوم حرف کی طرح ہے بہت خوفناک اور نا قابل قیاس ہے ۔ بہت عرصہ گذرا جب لارڈ پامرسٹن (LORDPALMERSTON) نے کہا تھا کہ روس (RUSSIA) کی تاریخ سے ہم کو یہ سبق ملا ہے کہ روس والوں کو لازمی طور پر پھیلنا چاہیئے اور وہ برابر پھیلتے رہیں گے جب تک کہ وہ ایسی طاقت کے مقابلہ میں نہ آ جائیں جو اتنی زبردست ہو کہ ان کو روک دے ۔ یہ طاقت کسی ایک قوم کی ہو یا مختلف قوموں کے اشتراک کی ہو ۔ ماسکو کی شاہی حکومت عظمیٰ (GRAND DUCHY OFMOSCOW) میں اپنے ابتدائی حالات کے زمانہ سے روس (RUSSIA) برابر مستقل طریقہ پر اور بغیر پشیمان ہوئے پھیلتا چلا گیا ہے کیا اس طرح پر پھیلنا اب بھی روس (RUSSIA) کی پالیسی (POLICY) کا سب سے بڑا محرک ہے ۔ اس کے لئے بعض ایسی مایوس کن علامات پائی جاتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پالیسی کمیونسٹ روس (COMMUNISTRUSSIA) کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک ایسی خصوصیت ہے جو اس میں اور زار والے روس (CZARISTRUSSIA) میں مشترک ہے اور یہ کہ اس کی توسیع کرنے کی بھوک ابھی تک بھری نہیں ہے ۔

مگر پھر بھی ایسا کیوں ہو؟ کیا اس سے زیادہ پُرامن واقعات اپنا کام نہیں کر رہے ہیں؟ روس (RUSSIA) کی خالی زمین کے قطعے جو اسی کی سرحدوں کے اندر واقع ہیں ان قطعوں سے بہت زیادہ بڑے ہیں جو برسوں تک ان مہم شروع کرنے والے آدمیوں کے سامنے آئے جنھوں نے اٹلانٹک سمندر کے کنارہ پر (ATLANTICSEABOARD) امریکہ کی ان ریاستہائے متحدہ کو پھیلا کر آباد کیا جو شروع میں بہت

چھوٹی اور غیر یقینی حالت میں تھیں۔ روس (RUSSIA) کو سمندر پار کولونیوں (COLONIES) کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس زمانہ میں ان کی ضرورت ہے جب کہ ہوائی آمد و رفت اتنی تیزی اور اتنے زور کے ساتھ ان ملکوں کے لئے ترقی کر گئی ہے جو "گرم سمندروں کی کھڑکیاں" کہلاتے تھے۔ اور جو کسی زمانہ میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ اگر اس کے لیڈروں کو حقیقی طور پر اس کا یقین دلایا جاسکے کہ روس کی جمہوریت (SOVIET UNION) کو کوئی شخص دھمکی نہیں دیتا ہے اور کوئی شخص اس کے خلاف ظالمانہ اور شاہانہ ملک گیری کے منصوبے تیار نہیں کرتا ہے تو اس کے آدمی صدیوں تک اس کی سرحدوں کے اندر ہی امن و سکون کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ کیا یہ حقیقی اور مفید خیالات کامیاب ثابت ہوں گے یا شکوک و شبہات۔ اندھی نفرت۔ غرور اور حماقت۔ نئی اور زیادہ خطرناک مصیبتیں پیدا کریں گے؟ جس طرح دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے جرمنی کے آدمیوں میں وہ خطرناک "ویگنر" والی (WAGNERIAN) خواہشِ موت پائی جاتی تھی جس نے ایک بڑی اور نہایت قابل قوم کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔ کیا اسی طرح پر سب آدمیوں کے دلوں میں کوئی تاریک شیطانی وسوسہ اور عیب موجود ہے جو اب بھی ان کو تباہی کی طرف دھکیلتا ہے۔؟ یہ ہمارے زمانہ کے سخت پیچیدہ مسائل ہیں اور ہم میں سے ہر ایک آدمی اُن کے لئے اپنے نئے جوابات تلاش کرتا ہے۔

مگر یہ امور متنازعہ اور یہ سوالات آدمیوں کی مجموعی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی قومی اور نسلی فرقوں کی بڑی جماعتوں سے متعلق ہیں سب سے بڑا فرقہ بہر حال صرف اُن افراد کا مجموعہ ہوتا ہے جو اس میں شامل ہیں۔ اگر یہ ممکن ہو کہ ایک آدمی کی خوشی کے اسباب پیدا کئے جائیں تو کم از کم اس آدمی کے اندر تاریک اور بدی کے جذبات پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ نیکی کی طاقت جو ایک

شخص کے اندر ہے آخر کار اس بدی کی طاقت پر غالب آجائے جو بہت سے آدمیوں کے اندر ہے؟

میں ہر اُس شخص سے جو میری اس کتاب کو پڑھتا ہے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ میرا پختہ اعتقاد ہے کہ انسان کو اس خداوندی نور کی چنگاری سے جو انسان کے اندر موجود ہے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیئے اور اس کو بے توجہی کے ساتھ بغیر ترقی دئے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ذاتی تکمیل اور اس دنیا سے جو ہمارے چاروں طرف ہے۔ انفرادی سازگاری کا راستہ نسبتاً اس آدمی کے لئے زیادہ آسان ہے جو میری طرح اس بات کا پختہ اور سچے دل سے یقین رکھتا ہے کہ "خدا کے فضل وکرم" نے خود انسان کے دل میں روشنی حاصل کرنے اور "حقیقت" سے اتصال کرنے کے امکانات پیدا کئے ہیں۔ یہ بات بہر حال بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ عقیدہ کی اہلیت کثیر تعداد کے اندر موجود نہیں ہے یہ کوشش کی جائے کہ ان بہت سے آدمیوں کو کچھ روحانی غذا ملنے کی امید ہے۔ جو ایسی چیز کی خواہش رکھتے ہیں جو اُن سے باہر اور بالاتر ہو۔ گو وہ چیز بہ ظاہر دوسرے درجہ کی معلوم ہوتی ہو۔ ان کے لئے یہ امکان ہے کہ وہ دنیا کی غیر محدود نوعیت اور اس کے حسن پر غور وفکر کرنے میں اپنی روح کی قوت۔ اپنا سکون اور اپنی فرحت حاصل کریں گے۔

انسانی زندگی کا تجزیہ کرنے کے آخری درجہ پر مجھے ایک مستقل سبق ملا ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس کو ہمیشہ ماسوئ نفس میں فنا ہو جانا چاہیئے۔ یعنی انسان کی اندرونی ذات کو ہمیشہ اپنے بیرونی مقصود کے اندر محو ہو جانا چاہیئے۔ اپنی معمولی محبت میں جو ہم کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے اور اپنے روزمرہ کے کام میں جو ہم اپنے ہاتھ یا دماغ سے کرتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے آدمی جلد اس بات کو معلوم کر لیتے ہیں کہ کسی قسم کا مستقل اطمینان اور

کسی قسم کا سکون جو ہم حاصل کر سکتے ہیں وہ اپنے آپ کو بھول جانے کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی اُس ہم آہنگی کے ساتھ جو جسم۔ دماغ اور روح کے درمیان پائی جائے اپنے نفس اور اپنی ذات کو بیرونی ہستی اور بیرونی مقصود کے اندر محو کر دینے سے یہ اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے۔ انسانی شعور کے سب سے بلند مقامات پر وہ سب آدمی جو ایک بالاتر وجود کو تسلیم کرتے ہیں اپنے اندرونی نفس کی حدبندیوں اور رُکاوٹوں سے اپنی عبادت کے وقت آزاد ہو جاتے ہیں اور اُس وقت آزاد ہو جاتے ہیں جب وہ اس لازوال اور باقی رہنے والی ہستی کی شاندار نورانیت کے سامنے اپنے وجدانی غور و فکر میں مصروف ہوتے ہیں جس کے اندر تمام دنیاوی اور مادی احساس جذب ہو جاتا ہے اور وہ خود لازوال اور ہمیشہ باقی رہنے والا بن جاتا ہے۔